دوتاج

مضامین خواجہ حسن نظامی

سی پارۂ دل

حصہ اوّل

ساتواں ایڈیشن قیمت دو روپے

اِنسَان کا نِسیَان

ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں کہ انسان خطا اور نسیان کا پتلا ہے جب اس کو گناہ اور نیکی کی طاقتیں دی گئی ہیں اور حافظہ کی قوت بھی دی گئی ہے اور بھول بھی اس کے خمیر میں رکھی گئی ہے تو نسیان اور خطا کو بُرا کہنا یا بُرا سمجھنا ایک خطا ہوگی۔

مجھے اپنے حافظہ اور یادداشت کی قوت پر بہت گھمنڈ تھا لیکن جب بڑھاپے کی عمر آئی تو وہ گھمنڈ جاتا رہا کیونکہ ہر سکنڈ کے بعد بھول جاتا ہوں البتہ بچپن کی سب باتیں حافظوں کی طرح یاد ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسیان انسان کے خمیر میں شامل نہیں ہے بلکہ جب انسان کے قوائے جسمانی میں کمزوری آتی ہے تو حافظہ کی قوت بھی کم ہو جاتی ہے ورنہ دراصل انسان حافظہ اور نیکی سے مرکب معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال میں نے سی پارۂ دل کتاب کی ان غلطیوں کو جو کاتبوں اور چھاپہ خانوں سے پچھلی کئی اشاعتوں میں ہوئی تھیں ایک برس کی محنت میں درست کیا تھا لیکن جب کتاب چھپ کے آئی تو حیران رہ گیا کہ صفحات کا شمار جن ہندسوں سے ہوتا ہے وہ غلط لگ گئے اور میں نے کتاب کو پڑھا مگر ہندسوں کو نہ دیکھا، کیونکہ ہندسے ایک حساب کی چیز ہیں اور میں حساب سے ایسا ہی ناواقف ہوں جیسے مسلمانوں کو خیال ہو گیا ہے کہ ہم حساب نہیں جانتے، لہٰذا اس کتاب کے ناظرین سے عرض ہے کہ وہ پہلے اس فہرست کو غور سے پڑھ لیں جس میں صحیح ہندسے لگائے گئے ہیں اور ہندسوں کی غلطیوں کو بتا دیا گیا ہے اور صحت نامہ کی موافق پہلے اپنی کتاب کے ہندسوں کی اصلاح کر لیں تاکہ کتاب پڑھنے کے وقت وہ اُلجھن نہ ہو جو مجھے ان غلطیوں سے ہوتی ہے۔

حسن نظامی دہلوی ۱۰/ جنوری ۱۹۳۶ء

۷۸۹

فہرست مضامین "سیپارۂ دل" حصہ اول

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	فہرست مضامین	۲ تا ۵
۱	دیباچہ۔ از مولانا مولوی عبد الحق صاحب بی اے سکرٹری انجمن ترقی اردو	۹
۲	دیباچہ۔ از میر غلام بھیک صاحب نیرنگ	۱۲
۳	خود خواجہ صاحب۔ از ملا محمد الواحدی صاحب	۱۵
	پہلی منزل	
	عبد و معبود کے راز و نیاز	
۴	مست الست کی دعا	۲۵
۵	آہ یہ خط	۲۷
۶	آہ	۳۰
۷	دعائے بیقراری اور دل آشفتہ کی بکاؤزاری	۳۲
۸	بھگت کے بس میں آ بھگوان	۳۴
۹	حروف کی دعا	۳۵
۱۰	موسمی دعائیں	۳۷
۱۱	آنسو بھری آنکھ کی التجا	۴۰
۱۲	جھولی والے فقیر کی بھیک	۴۱
۱۳	فلک پر	۴۴
۱۴	قدرت میرے ہاتھ میں	۴۵
۱۵	کعبہ والے خدا کو کیونکر پاؤں	۴۷
۱۶	طائر سبز فام کا پیام	۵۱
۱۷	تو ہی ہے اے خدا	۵۴
۱۸	بندوں کی دعا	۵۷
۱۹	طائر سیاہ فام	″
۲۰	سگنل کی لال آنکھ	۵۹
	دوسری منزل	
	ذوق و شوق، عشق و محبت، سوز و گداز، ارادت و عقیدت	
۲۱	حسن کا فرمان	۶۱
۲۲	منظر فراق یعنی وفات رسولؐ کا سین	۶۳
۲۳	اچھے بابل کیا لاڈلی بیٹی کو بھول گئے۔ امت کی سسرال سے مدنی میکہ کو ایک خط	۶۶
۲۴	ہم ہیں بالک ایک پتا کے	۶۹
۲۵	مدنی شیام سندر کی مرلی	۷۱
۲۶	حلقہ بگوش کا قلمی نذرانہ خواجہ کے دربار میں	۷۲
۲۷	اجمیری پہاڑ کا بولنا	۷۴
۲۸	آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشہ	۷۶

131280

Marfat.com

نمبرشمار	مضمون	صفحہ
۲۹	ٹھنڈا سانس	۷۷
۳۰	عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو	۷۹
۳۱	پیا اجمیری	۸۰
۳۲	پیکرِ امکاں کیوں دلگیر ہے!	۸۳
۳۳	پردیسی پیتم دیکھی تہاری پریت	۸۵
۳۴	رس کے بھرے تورے نین	۸۷
۳۵	اجمیری چنبیلی کا پھول	۹۰
۳۶	زلف کا ماجرا	۹۱
۳۷	چارۂ تشنہ لبی	۹۲
۳۸	اے دل مجھ پر آ	۹۳
۳۹	ہچکی	۹۵
۴۰	آغوشِ مہر میں شب عید	۹۷
	تیسری منزل	
	سرِ دلبراں در حدیث دیگراں	
۴۱	آنسو کی سرگذشت	۱۰۲
۴۲	لیمپ	۱۰۴
۴۳	مٹی کا تیل	۱۰۶
۴۴	عشقیہ آتشبازی	۱۰۸
۴۵	دیاسلائی	۱۱۰
۴۶	کھٹکا	۱۱۳
۴۷	خدائی گراموفون	۱۱۸
۴۸	مچھر	۱۱۹
۴۹	لا	۱۲۳
۵۰	مکھی	۱۲۶
۵۱	اُلّو	۱۳۱
۵۲	رسوائی کی من بھاتی غذا جو	۱۳۵
۵۳	پھولوں کے شکوے	۱۳۸
۵۴	ہولناک لکچر	۱۳۹
۵۵	خاکی جام	۱۴۲
۵۶	دوربین اور مکاشفاتِ غیب	۱۴۴
۵۷	گلاب تمہارا کیکر ہمارا	۱۴۷
۵۸	اوس	۱۵۰
۵۹	رمضان میں سیاہ و سفید ڈورے کی رہنمائی	۱۵۲
۶۰	گیان کتھا	۱۵۴
۶۱	ہردواری گنگا کے کنارے چناس ورتی	۱۵۶
۶۲	انگلی کا کشف	۱۵۹
۶۳	اینٹ چونے کا وصال	۱۶۱
۶۴	دوا کی شیشی کے باطنی اشارے	۱۶۴
۶۵	وحدت سوکام برف	۱۶۷
۶۶	دل ہاؤس	۱۷۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۶۷	نقطہ	۱۷۶	۸۷	دو تحفوں کی رسید	۲۰۰
۶۸	عرفان کی لکیر	۱۸۰	۸۸	شملہ کی دیبی ماتا	۲۰۲
۶۹	لالٹین	۱۸۵	۸۹	اپنا ماتم	۲۰۴
۷۰	بے تار کا تار	۱۸۷	۹۰	روح کا خول	۲۰۵
۷۱	سل اور دق کے عارفانہ نکات	۱۸۹	۹۱	دام مگس	۲۱۷
۷۲	الکبریت ما الکبریت	۱۵۴ مکرر		**چوتھی منزل**	
۷۳	لوہے کی طریقت	۱۵۶		**دین وملت**	
۷۴	پتھر کی طریقت	۱۶۰	۹۲	عورتیں کیا کر سکتی ہیں	۲۲۹
۷۵	کھوپری کی صدا	۱۶۲	۹۳	ایک ہے اور کچھ نہیں	۲۳۱
۷۶	الف خالی	۱۶۴	۹۴	دعا	۲۳۶
۷۷	یورش ارواح کی اجسام پر	۱۶۹	۹۵	گلیم درویشی کی تنگی	۲۴۱
۷۸	خطیب کاغذ فام	۱۷۱	۹۶	خوش خلقی	۲۵۵
۷۹	جھینگر کا جنازہ	۱۷۵	۹۷	خونی درویش	۲۶۱
۸۰	من کہ ایک دھوبی کا غذی گھاٹ پر	۱۷۷	۹۸	درویشی شہادت نامہ	۲۶۷
۸۱	سیم لا	۱۸۳	۹۹	مستانہ بزم مولود	۳۰۰
۸۲	حضرت کن	۱۸۴	۱۰۰	درویشی مرکز	۲۹۱
۸۳	روئی	۱۸۶	۱۰۱	رام اُپدیش	۲۹۳
۸۴	مستانہ بیمار کا خواب	۱۸۹	۱۰۲	استقبال رسولؐ	۲۹۶
۸۵	تنکے کا سلوک	۱۹۴	۱۰۳	دربار رسولؐ	۲۹۹
۸۶	دریائی سرنگ	۱۹۷	۱۰۴	فقیروں کی عید	۳۰۶

نوٹ صفحہ ۱۹۲ کے بعد نمبروں میں غلطی ہوگئی ہے بجائے ۱۹۳ کے ۱۵۴ سے سلسلہ شروع ہے۔

Marfat.com

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۰۵	عید میلاد الرسولؐ	۳۰۸	۱۲۳	تخت گاہ کے ایک تختہ کا پیام۔ دُوسرے کے نام	۳۶۱
۱۰۶	ایکو برہم دو تیونا ستی	۳۱۰	۱۲۴	درکار ہیں مستانے چند	۳۶۳
۱۰۷	السلام علیکم	۳۲۰	۱۲۵	غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا	۳۶۷
۱۰۸	مُرغ کی اذان	۳۲۱		**شذرات**	
۱۰۹	تیس راتوں کی شان	۳۲۲	۱۲۶	ہماری بُری نیکیاں	۳۷۳
۱۱۰	نئی روشنی کی دوزخ جنت	۳۲۳	۱۲۷	صبا نے کلیوں کو جگایا	۳۷۴
۱۱۱	شذرات	۳۲۹	۱۲۸	شمع کا مرقد زیبا	۳۷۴
	پانچویں منزل		۱۲۹	تغیرِ فطرت کا سبب	۳۷۵
	سیاست، معاشرت، تمدن		۱۳۰	جرمنی کا فلسفۂ کائنات	۳۷۵
۱۱۲	تاج اور کلاہ در دستی	۳۴۱	۱۳۱	آرام کہاں ہے؟	۳۷۷
۱۱۳	ٹھکانہ ایک بستر کا	۳۴۴	۱۳۲	روح و اجل کے دامن	۳۷۷
۱۱۴	چمار زادہ سید کی گود میں	۳۴۶	۱۳۳	مرچ پر کائی نہیں جمتی	۳۷۸
۱۱۵	جیبی گھڑی کی سازش	۳۴۷	۱۳۴	میں نہیں ڈوبا	۳۷۸
۱۱۶	چھکڑاؤں کی گاڑی	۳۵۰	۱۳۵	کچی نیند کی آنکھیں	۳۷۹
۱۱۷	پسینہ	۳۵۲	۱۳۶	عالم اسباب	۳۷۹
۱۱۸	پاؤں کا جیل خانہ	۳۵۴	۱۳۷	آخری دستخط	۳۸۱
۱۱۹	سوئی کی لن ترانی	۳۵۴	۱۳۸	طبع ثانی کا انجام	۳۸۴
۱۲۰	فٹ بال	۳۵۶			
۱۲۱	ہاتھ کی بغاوت	۳۵۷		**طبع ہفتم**	
۱۲۲	چائے سے گلے پر چھُری	۳۵۸			

Marfat.com

بیگم حسینہ صبا کی عمر زیادہ نہیں ہے

لیکن بیماریوں اور فکر نے پٹھے کمزور کر دئے ہیں اور تازہ خون بدن میں پیدا نہیں ہوتا اس واسطے چہرہ پر بڑھاپا معلوم ہونے لگا ہے۔ اگر بیگم حسینہ صبا طبی کمپنی کا بنایا ہوا فاسفورس کا تیل روزانہ رات کو سوتے وقت گھٹنے سے پاؤں تک مل لیا کریں۔ تو چند روز میں ان کے پٹھے مضبوط ہو جائیں گے۔ اور جسم میں تازہ خون پیدا ہونے لگے گا۔ اور چہرہ پر سرخی اور تازگی پیدا ہو جائیگی

فاسفورس کا تیل طبی کمپنی دہلی سے ملے گا

بڑی شیشی تین روپے کی (۳ عہ)

اس سے چھوٹی ایک روپیہ کی اور آٹھ آنے کی اور

چار آنہ (۴ر) کو بکتی ہے

بڑے شہروں میں ایجنٹ بھی ہیں

Marfat.com

اولاد کی سلامتی

خدا آپ کی اولاد کو زندہ سلامت رکھے۔ بعض لوگوں کے بچے زندہ نہیں رہتے سوکھ سوکھ کر مر جاتے ہیں۔ یا اچھے خاصے یکایک معمولی بیماری سے جان بحق ہو جاتے ہیں۔ اس بیماری کو مسان کی بیماری کہتے ہیں یہ بیماری ماں کی اندرونی کمزوری سے ہوتی ہے اگر بچوں کی مائیں حمل کے زمانہ میں رات کو سوتے وقت طبی کمپنی دہلی کا بنایا ہوا فاسفورس کا تیل مل لیا کریں تو بچے پیدا ہونے کے بعد ہلاکت سے محفوظ رہیں گے۔ بچوں کی پیدائش کے بعد ان کے جسم پر بھی روزانہ رات کو فاسفورس کا تیل مل دیا کیجئے۔ پھر ان کو کبھی نہ کوئی بیماری ہوگی نہ مسان کا حملہ ہوگا۔ کیونکہ فاسفورس کا تیل بدن میں جذب ہو کر بے حد طاقت ور بنا دیتا ہے۔

بڑی شیشی تین روپے کی اور اس سے چھوٹی ایک روپیہ کی اور آٹھ آنے کی اور

چار آنے دہری کی

پتہ :۔ طبی کمپنی دہلی

Marfat.com

اولاد کی مراد حاصل ہو گئی

اگر کسی کے ہاں اولاد نہ ہوتی ہو یا حمل قائم نہ رہتا ہو اور ضائع ہو جاتا ہو تو طبی کمپنی دہلی سے فاسفورس کا تیل منگا کر زیر ناف اور پشت پر مالش کرائیے تاکہ پٹھوں کی کمزوری دور ہو جائے اور فاسفورس اندر جذب ہو کر اندرونی قوت پیدا کر دے جس کی حمل قائم ہونے اور قائم رہنے میں ضرورت ہوتی ہے تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ چالیس دن تک یہ تیل ملا جائے تو اولاد کی مراد ضرور حاصل ہو جائے گی۔

پتہ:۔ طبی کمپنی دہلی اور اس کے ایجنٹ

بڑی شیشی تین روپے ۳ کی

اس سے چھوٹی شیشیاں ایک روپے کی اور

آٹھ آنے اور چار آنے (۸؍ ۴؍) کی ہیں۔

دیباچہ

از واقفِ اسرار انشا پردازی جناب مولانا مولوی عبدالحق صاحب بی اے سیکرٹری انجمن ترقی اردو و افسر محکمۂ تعلیم اقلیم دکن

اردو زبان میں نثر کا دور تھوڑے ہی عرصہ سے شروع ہوا ہے۔ اسکی ابتدا بھی مثل بعض زبانوں کے شاعری ہی سے ہوئی اور کیوں نہ ہوتی۔ اس نے برج بھاشا کا دودھ پیا ہے جو گویا شاعری ہی کیلئے بنی تھی سب سے پہلے میر امن نے نثر کا سکہ جمایا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی کتاب اب بھی اپنے رنگ میں بے مثل ہے۔ اس کے بعد مرزا نوشہ پھر سید احمد خان، مولانا حالی، نذیر احمد، مولانا آزاد اور مولینا شبلی نے اس کا وہ مرتبہ بڑھایا کہ نثر نظم پر سبقت لے گئی۔

آجکل خواجہ حسن نظامی صاحب نے اس میدان میں اشہب قلم دوڑایا ہے اور کوس اَلْنَثْرُ نَثْرِی بجایا ہے۔ ان کا رنگ سب سے نرالا ہے بعض کہتے ہیں کہ آزاد کا رنگ اڑایا ہے، یہ صحیح نہیں اس میں شک نہیں کہ آزاد کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ورنہ اصل میں اس سے بالکل الگ ہے آزاد میں تصنع زیادہ ہے خواجہ صاحب کے جملے اور فقرے بھی اگرچہ فکر و تراش سے خالی نہیں ہوتے لیکن اسے اس خوبی سے چھپایا ہے کہ بے تکلفی اور بیساختہ پن قربان ہو ہو جاتا ہے بلکہ دیکھا جائے تو خواجہ صاحب کا رنگ مرزا غالب سے بہت ملتا جلتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ظرافت کی چاشنی نہیں مگر اسکی بجائے سوز و گداز ہے مرزا کے فقرے ظرافت کے ساتھ محبت میں گھلے ہوئے ہوتے ہیں خواجہ صاحب کے مضمون درد سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی عبارت میں چرچلا پن ہے جو سیدھی سادی بات کو پھول کی طرح شگفتہ کر دیتا ہے۔ مرزا ایک فقرے راسی ترکیب لفظی یا ایک جملے میں وہ کچھ کہہ جاتے ہیں کہ آدمی مزا لیتا رہے خواجہ صاحب اپنے مضمون میں ایک ایک جزو کو الگ کر دکھاتے اور وہ گلکاری کرتے ہیں کہ آدمی عش عش کرے۔

Marfat.com

جو حکیمانہ اسرار اور فلسفیانہ نکات چاہتے ہیں، یہ تحریریں اُن کیلئے نہیں یہ اُن کے لئے ہیں جو دل رکھتے ہیں، جو عقل و حکمت سے رازِ دہر کی جستجو میں ہیں ان کی نظروں میں شاید یہ نہ جچیں گی لیکن جو در دِ دل اور عشق و محبت کے توسل سے وہاں پہنچنا چاہتے ہیں گُ نہیں اس میں لطف آئے گا۔

یہ اخلاقی مضامین نہیں لیکن اخلاق کا رنگ ان سے ٹپکتا ہے۔ ان میں تصوف کا دعوٰے نہیں لیکن تصوف کی بُو ان میں پائی جاتی ہے۔ یہ معاشرتی تحریریں نہیں لیکن معاشرت کی اصلاح ان میں نظر آتی ہے۔ یہ حکیمانہ رسائل نہیں لیکن حکمت ان کی تہہ میں ہے۔ ہر کوچہ کی سیر کی ہے اور ہر گلی کی خاک چھانی ہے۔ کہی اور اُن کہی سب کچھ کہدی ہے۔ آگے پڑھنے اور سمجھنے والے کی صلاحیت پر موقوف ہے۔

ان مضامین میں کہیں خواجہ صاحب کسی سے باتیں کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہیں وہ اپنے سے ہمکلام ہیں، کہیں رازو نیاز ہے کہیں دردِ دل کی داستان ہے اور اپنا اور ہمارا دُکھڑا رو رہے ہیں۔ کون ہے جو "ایک عرب کے گھر" کو دل تھامے بغیر پڑھ سکتا ہے؟ کہیں تخیل کا زور عرش تک لے گیا ہے کہیں نثر میں وہ شاعری کی شان دکھائی ہے کہ نظم مقفّٰی پر پیچ ہے۔ کہیں ذرے کو آفتاب بنایا ہے اور کہیں آفتاب کو خاک۔ غرض عجیب گلدستہ ہے جس میں ہر رنگ کے پھول اور ہر پھول میں نئی خوشبو ہے۔ گو سب کچھ ہے مگر سُر وہی ہے اور لے میں فرق نہیں آیا ہے۔

لیکن معترض یہ پوچھتا ہے کہ آخر اس کی غرض کیا ہے؟ خواجہ صاحب کیا چاہتے ہیں؟ ان کا منشا کیا ہے؟ کیا کوئی خاص غرض و غایت بھی ہے یا یونہی تک بے تک جو جی میں آتا ہے کہے چلے جاتے ہیں۔ وہ جواب دیتے ہیں کہ "میں مدینہ نگری سے پریم کا سندیسا لایا ہوں۔" اور یہ کہہ کے چپ ہو جاتے ہیں اور ان کی چپ سے جی گھبراتا ہے۔

بعض لوگ کہیں کہیں مضمون کی طوالت سے گھبرائینگے کہیں کہیں وہ بظاہر بے ربطی سی پائینگے

Marfat.com

کہیں مضمون وطرزِ تحریر کی یکسانی سے اُکتائیں گے کہیں عامیانہ باتوں پر ناک بھوں چڑھائیں گے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ انہی عامیانہ باتوں میں کام کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ عرفی نے خوب کہا ہے۔ ع

اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

ہاں نظر ہونی چاہیئے۔ ؎

اُس کی خوبی کے تو کیا کہنے مگر
دیکھنے والے کو دیکھا چاہیئے　داغ

آپ پڑھ کے دیکھیئے اور خود اندازہ کیجئے۔ کسی کے کہنے پر نہ جایئے جی کو لگے تو کہنے والے کی محنت کی داد دیجئے نہیں تو خاموش ہو رہیئے۔ شاید ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔

زبان کی نسبت کچھ کہنا فضول ہے۔ ظاہر ہے، عیاں ہے۔ ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ میں اچھی اردو سیکھنا چاہتا ہوں، کیا پڑھوں؟ میں نے کہا اگر تم صاف ستھری اور نکھری ہوئی اردو اور دلّی کی اصل زبان پڑھنا اور سیکھنا چاہتے ہو تو خواجہ حسن نظامی صاحب کی تحریر پڑھو کہ زبان کے مزے کے ساتھ دلی کیفیات اور جذبات کا لطف بھی آئے اس میں کسے انکار ہو سکتا ہے؟

آجکل اپنی جہالت چھپانے یا اپنی علمیت جتانے کے لئے خواہ مخواہ بعض لوگ عربی فارسی ترکیبوں اور مشکل اور دقیق الفاظ کا بوجھ بچاری اردو کی گردن پر ڈال دیتے ہیں کہ وہ اس کی متحمل نہیں ہوتی۔ یہ اردو کی ترقی نہیں، تنزل ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اردو سب میں مقبول ہو۔ مگر ان تحریروں سے وہ مردود ہوتی ہے۔ جو فصاحت سادگی میں ہے وہاں پیچیدہ اور مغلق تحریروں میں کہاں۔ یہ گر کوئی خواجہ صاحب سے سیکھے۔

میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ عقل نے اجازت نہیں دی اور مصلحت نے قلم روک دیا اور کہا "بس"

عبدالحق

دیباچہ طبع اول

از جناب مولوی غلام بھیک صاحب بی اے فقیر اللہ شاہ نظامی وکیل سرکار انبالہ

مولینا خواجہ حسن نظامی زید مجدہ السامی اپنی نسبی اور خاندانی حیثیت سے میرے محترم مخدوم ہیں اور دیرینہ ذاتی تعلقات کے اعتبار سے ایک شفیق اور عزیز دوست، مصنف اور تصنیف کا تعلق فرزند و پدر کا سا ہوتا ہے یعنی جو تحریریں اس مجموعے کی شکل میں شائع ہوئی ہیں وہ میرے ایک مخدوم دوست کی معنوی فرزند ہیں اور اسی نسبت سے مجھکو عزیز ہیں۔ دیباچہ کا کام کسی کتاب کا اس کے ناظرین سے تعارف کرانا ہے۔ گویا یہ مختصر تمہید لکھکر میں اپنے ایک مخدوم دوست کے فرزندانِ معنوی کو اہل بصیرت سے روشناس کرا رہا ہوں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ کام میرے لئے خاص طور سے باعثِ مسرت ہے۔

جو تحریریں اس کتاب میں جمع کر کے شائع کی جاتی ہیں۔ یہ وقتاً فوقتاً اخبارات و رسالوں میں چھپکر قبول خاص کا تمغہ اور دلچسپی عام کا خلعت حاصل کر چکی ہیں لیکن پھر بھی ان کو ایک مجموعہ کی صورت میں شائع کرنا مصنف اور ناظرین دونوں کے لئے ضروری اور مفید ہے جس غرض اور غایت کے لئے مصنف نے اس قدر محنت اور دماغ سوزی گوارا کی وہ اوراقِ پریشاں کی نسبت مجموعہ سے بہتر حاصل ہو سکتی ہے۔

گویا ایک ایک سپاہی کا فرداً فرداً غنیم پر حملہ کرنا وہ اثر ہرگز نہیں رکھ سکتا جو ایک فوج کی فوج کا یک لخت حملہ کرنا رکھتا ہے۔ یا یوں سمجھو کہ اب تک یہ پھول کے پودے الگ الگ کیاریوں میں لگے ہوئے تھے اور اب سب کے سب ایک کیاری میں قرینے سے لگا دیئے ہیں تاکہ سیر کرنے والے کا دماغ یکایک مہک اٹھے۔ آنکھیں مجموعی نظارے سے تازہ ہوجائیں اور اس کو بہت سی کیاریوں میں گھومنے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے۔

Marfat.com

یہ ایک بدیہی اور مشہور بات ہے کہ اس زمانہ کے ممتاز اہل قلم میں خواجہ صاحب ایک امتیازِ خاص رکھتے ہیں۔ ان کا رنگ گفتگو، طرزِ بیان، انداز خیال جیسا مقبول ہے ویسا ہی نرالا اور اچھوتا بھی ہے۔ زبان سادہ اور شیریں، محاورہ ٹکسالی اور نمکین، بیان رواں اور دل نشین بناوٹ سے معرّا، تصنع سے مبرّا۔ غرض انداز مقال ہے کہ ایک سحر حلال ہے۔ علاوہ ازیں ان کی نگاہ حقیقت شناس ہر چھوٹے بڑے واقعہ میں ایک بڑا سبب اور بڑا نتیجہ دیکھتی ہے۔ معمولی بلکہ بظاہر گھٹیا چیزوں کے مشاہدے سے اعلےٰ روحانی و اخلاقی سبق حاصل کرتی ہے۔ حتّٰے کہ وہ عزلت گزین، گوشہ نشین، شب بیدار پرندہ یعنی اُلّو جو اہلِ ملامت کی سنت پر عمل کر کے عام طور سے لوگوں کی نفرت اور ظرافت کا ہدف ہی بنا رہتا ہے خواجہ صاحب کی نگاہوں میں ایک خاص وقعت رکھتا ہے اور ان کو اس کی زندگی کے تاریک اوراق میں بڑے بڑے سبق لکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ دیا سلائی کے ننھے سے تنکے سے خواجہ صاحب کا گوشِ ہوش وہ ترش باتیں سُنتا ہے جن سے حضرتِ انسان کا نشۂ خودپسندی ہرن ہو جاتا ہے۔

خواجہ صاحب کی تحریروں کی سب سے بدیہی خصوصیت قومی ہمدردی ہے لیکن یہ وہ قومی ہمدردی نہیں جو واقعات کو سطحی نگاہ سے دیکھنے والے دقائق اسلام سے بے خبر اور بے سوچے سمجھے تقریریں کرنے والے لکچرار ظاہر کیا کرتے ہیں بلکہ یہ قومی ہمدردی حقائق شناسی پر مبنی ہے۔ اس ہمدردی کی وجہ سے خواجہ صاحب قوم کی حالت کو اس کے اعمال کا نتیجہ تصور کرتے ہیں اور اس کو جا بجا عبرت کا سبق دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے خواجہ صاحب کو خاندانِ تیموریہ کے بعض حالات اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعض واقعات کی خاص واقفیت حاصل ہے۔ کچھ تو یہ واقعات اور حالات بجائے خود عبرتناک اور درد انگیز ہیں اور کچھ خواجہ صاحب کے طرزِ بیان کا جادو سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے اور انسانی ہمدردی کی رگ پر جگہ جگہ نشتر لگاتا ہے لیکن ان واقعات میں بھی سلسلۂ علت و معلول کو خاص صوفیانہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے

Marfat.com

مورخانہ طبیعت کے انسانوں کو خاندانِ تیموریہ کی تباہی کے اسباب و نتائج خالص پولیٹیکل رنگ میں نظر آئیں گے لیکن خواجہ صاحب کے نزدیک اس کے اسباب بھی روحانی ہیں اور اس کے سبق بھی روحانی۔ ان کے نزدیک سلطنت مغلیہ تاجداروں اور ان کے خاندان کی بداعمالیوں کی وجہ سے تباہ ہوئی اور یہ تمام داستان ایک دفترِ عبرت ہے جس سے دنیا کی بے ثباتی، تکبر و نخوت کی سفاہت اور مردم آزاری کی مذمت دلوں پر نقش ہونی چاہیئے

سرِ دلبراں

اہل طریقت کو سرِ دلبراں در حدیثِ دیگراں گفتن کے فن میں ہمیشہ سے کمال رہا ہے چنانچہ خواجہ صاحب بھی اس فن میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ مثلاً "خدائی گرامو فون" "کھٹکا" وغیرہ وغیرہ معمولی معمولی عنوان قائم کر کے طریقت اور تصوف کے نکات بڑی دلچسپی کے ساتھ بیان فرماتے ہیں اور ان عام پسند اور عام فہم پیرایوں میں ان مسائل کو بیان کر کے اس زمانہ کے مادہ پرستوں کی توجہ کامیابی کے ساتھ حقائق اسلام کی طرف منعطف کرتے ہیں۔ اس رنگ کے مضامین کی اس زمانہ میں بہت ضرورت ہے۔ دہریت اور مادیت کا چاروں طرف زور ہے اور معاش و معاد کے گہرے مسائل کی طرف جدید تعلیم یافتہ حضرات کو کافی اعتنا نہیں ہے کاش کہ اس قسم کی تحریروں سے ان کو ایسے مسائل پر غور کرنے کی عادت ہو۔

یہ سب کچھ ہے مگر سب سے زیادہ قابل قدر وہ خاص خاص تحریریں ہیں جن کو دیکھ کر قلب و روح میں ایک برقی رَو دوڑ جاتی ہے جن کو پڑھ کر زبان یا قلم سے پہلے آہِ سرد اور چشمِ تر داد دیتی ہے مثلاً "مست الست کی دعا" "مزار حضرت یوسفؑ پر دعا" "محراب حضرت زکریاؑ میں دعا" "استقبال رسول" "مستانہ بزم مولود" "حال دل" وغیرہ۔ ان مضامین میں اس جوہر کی خاص جھلک ہے جس کے بغیر کسی مومن کا ایمان مکمل نہیں ہوتا یعنی شاہنشاہِ اقلیم رسالت کی ذاتِ حسن الصفات کا عشقِ صادق اور جس کتاب میں یہ صفت ہو اس اور کسی صفت کی ضرورت نہیں ہے بس باقی ہوس۔

شہر انبالہ۔ ۱۱ جون ۱۹۱۳ء　　نیرنگ

خود خواجہ صاحب

از جناب ملا محمد الواحدی صاحب ایڈیٹر رسالہ "نظام المشائخ" و اخبار "خطیب" دہلی

سیدی و مولائی حضرۃ خواجہ حسن نظامی کے مضامین کا مجموعہ دوسری مرتبہ چھپکر شائع ہوتا ہے پہلے ایڈیشن میں مضامین بھی کم تھے اور ترتیب بھی کچھ نہ تھی۔ اس دفعہ بہت کچھ ترمیم ہوئی ہے۔ وقت کے نامناسب مضامین خارج کر دیئے گئے اور سال سے کئی حصہ تازہ اور اچھے اچھے مضامین شامل ہو گئے۔ درحقیقت پہلے مجموعے کو تو مجموعہ کہنا ہی ٹھیک نہ تھا۔ اب بیشک چند اعتبارات سے یہ مجموعہ مضامین کہنے کا حقدار بن گیا ہے۔

محبی جناب مولوی شیخ محمد احسان الحق صاحب قادری میرٹھی نے اس مجموعہ کی ترتیب و تالیف میں جتنی محنت کی ہے اس کی تعریف کرنی چاہیئے۔ اصل میں شیخ صاحب موصوف کا یہ فرض تھا جس کو انہوں نے ادا کیا۔ کیونکہ ہم سب پر جو حضرت خواجہ صاحب کے ادبی روحانی خوشہ چین ہیں اس قسم کی خدمتیں واجب و فرض ہیں۔

میں اس موقعہ پر خود حضرت خواجہ صاحب کی ادبی شخصیت پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میری ان کی پانچ برس مسلسل یکجائی رہی ہے اور میں نے جس قدر اخباری و لٹریری دنیا میں تعارف حاصل کیا ہے وہ اسی زمانہ کی ہم نشینی کا پرتو ہے۔ اس لئے حضرت خواجہ صاحب کی اندرونی زندگی کا حال جیسا مجھے معلوم ہے، دنیا میں شاید کسی کو نہ ہوگا۔

لوگوں میں دستور تو یہ چلا آتا ہے کہ کتاب کے شروع میں مصنف کی سوانحعمری لکھدیا کرتے ہیں۔ مگر میں نے اس روش سے الگ ایک موضوع قرار دیا ہے کیونکہ لائف کا لطف موت کے بعد ہے نہ کہ حیات میں۔ خدا خواجہ صاحب کو عمر طبعی عنایت فرمائے۔ سوانحعمری لکھکر بدشگونی کرنی ٹھیک نہیں۔ اس کے علاوہ مجھے علم ہے کہ خود حضرت خواجہ صاحب "آپ بیتی حسن نظامی" کے نام سے اپنے حالات اسی مشہور طرز تحریر میں لکھ رہے ہیں جس نے ان کو

تمام اردو انشا پردازوں سے ممتاز کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ لائف کا جو مزا اس کتاب میں ملیگا دوسرے کی تحریر میں کہاں آسکتا ہے۔ لہذا میں صرف لٹریری زندگی کی تاریخ اور اسی موضوع کی تشریحات پر اکتفا کروں گا جس سے حضرت خواجہ صاحب کی اس کتاب کو تعلق ہے۔

ابتدائی حالات

مختصر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حضرت خواجہ صاحب درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ میں پیدا ہوئے جو دہلی سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ انہوں نے مروجہ نصاب عربی کو مکمل کیا اور جناب منشی غلام نظام الدین صاحب تاجر کتب دہلی کی صحبت کے سبب ادبی اخباری میلان پیدا ہوا۔ یہ غالباً سب جانتے ہیں کہ حضرت خواجہ صاحب حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے خواہر زادوں میں ہیں اور ان کی نشوونما پیرزادگی میں ہوئی ہے۔ اگر منشی صاحب کی صحبت کا اثر نہ ہوتا تو اس قدرتی جوہر کا کھلنا، جو خواجہ صاحب کی طبیعت میں تھا یقیناً دشوار تھا۔ کیونکہ پیرزادگی اس زمانہ میں اکثر لوگوں کو مغرور وخود پرست بنا دیتی ہے اور ہاتھ پاؤں چومنے والے معتقدین پیرزادوں کے دماغ بگاڑ دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ منشی صاحب کا وہ ابتدائی جملہ مجھے ہمیشہ یاد رہیگا کیونکہ وہ میری ادبی زندگی کی بنیاد ہے کہ "دنیا میں چھوٹا اور انجان بننے سے کچھ ملتا ہے، بڑا اور دانا بننا انسان کو محروم کر دیتا ہے۔" میں نے اس قول پر عمل کیا اور آجتک کبھی اس خیال کو پاس نہ آنے دیا کہ میں کچھ ہوں جس کے پاس گیا انجان اور طالب علم بن کر گیا۔

حضرت خواجہ صاحب نے سب سے پہلے جو اخبار دیکھا وہ مرادآباد کا ایک ہندو اخبار "ہمدرد" تھا۔ فرماتے ہیں اس سے پہلے مجھے معلوم نہ تھا کہ اخبار کیا چیز ہوتی ہے۔ سب سے پہلے جس اخبار میں مضمون لکھا وہ بمبئی کا "انڈیا گزٹ" تھا جس کو لاہور کے حکیم غلام محی الدین صاحب نکالتے تھے۔ اس مضمون کا عنوان تھا "انڈیا کی نازک حالت" اور اس میں قحط کی

پریشانیوں کو بیان کیا گیا تھا۔

منشی غلام نظام الدین صاحب کتابوں کے سوداگر تھے انہوں نے خواجہ صاحب کو مولانا شرر کے ناول دیئے جن کو پڑھکر خواجہ صاحب کو انشاپردازی کا چسکا لگا۔ فرماتے ہیں کہ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا شرر کی تحریریں میری لفظی استاد ہیں اور فطرت استاد معنوی۔ ان تحریروں سے میں نے مضامین کی بندش سیکھی اور فطرت و مشاہدہ قدرت سے معنوی اثر تعلیم کیا۔ ان کا ارشاد ہے کہ یہ حال شروع زمانے کا ہے جسے آج بیس برس سے زیادہ عرصہ ہوگیا۔ بعد میں جو کچھ ترقی کی وہ مولانا سید اکبر حسین صاحب جج الہ آبادی کی صحبت کا فیض ہے جن کے ساتھ سال میں کئی مرتبہ یکجائی کا موقعہ نکالتا تھا اور اُن کے کلام پر دوسروں سے جداگانہ نظر ڈالتا تھا۔ خواجہ صاحب تو یہاں تک مبالغہ فرماتے ہیں کہ مجھ میں اگر کسی کو کچھ آدمیت نظر آئے تو سمجھ لینا کہ وہ جناب اکبر کا عکس ہے، میری ذاتی نہیں ہے ادبی حیثیت سے دیکھا جائے تو وسطی اور آخری زمانے کے مضامین سے واقعی وہی شوخی و بیباکی اور نرالا پن ٹپکتا ہے جو جناب اکبر کی نظموں میں صفت مخصوص ہے۔

مقصد مضامین نویسی

حضرت خواجہ صاحب پیرزادے ہیں اور خود صاحب سلسلہ وارشاد ہیں۔ ان کو طبیعت کی موزونی ورثہ میں ملی ہے کیونکہ تمام صوفیائے کرام اسرار تصوف کو ہمیشہ اشعار کی رنگینی اور لٹریچر کی تاثیروں میں بیان کرتے آئے ہیں۔ خواجہ صاحب شاید پہلے صوفی ہیں جنہوں نے نثر میں تصوف کے ولولے اور جذبات کو نظم کے انداز سے بڑھ کر لکھا۔ وہ شعر نہیں کہہ سکتے لیکن بعض مضامین میں قافیہ بندی کی شان گواہی دیتی ہے کہ وہ کوشش کرتے تو بہت بڑے شاعر بن سکتے تھے۔ علامہ شبلی مرحوم سچ فرمایا کرتے تھے کہ خواجہ صاحب نثر میں ایسی منظیر شاعری کرتے ہیں جس کا اثر آجکل کی نظموں میں بھی بہت کم پایا جاتا ہے۔

Marfat.com

خواجہ صاحب کی مضامین نویسی کا صرف ایک مقصد ہے جو ان کا موروثی ہے اور وہ تصوف کی اشاعت ہے۔ وہ فرمایا کرتے ہیں کہ میں نے جو کچھ خامہ فرسائی کی ہے وہ محض اسلئے ہے کہ نئی روشنی کے لوگ جو صوفیوں کی پرانی کتابوں کو نہیں پڑھتے اور ان کتابوں کے قدیمی طرز تحریر کے سبب تصوف ہی سے غیر مانوس ہوتے جاتے ہیں، میرے نئے انداز تحریر سے ادھر راغب ہوں اور کیف روحانی سے فائدہ اٹھائیں چنانچہ اس میں حضرت خواجہ صاحب کو بڑی کامیابی ہوئی اور آج جو ہزاروں انگریزی تعلیم یافتہ لوگ تصوف کے دل دادہ ہو گئے وہ محض حضرت خواجہ صاحب کی تاثیر قلم کا طفیل ہے۔

ملک میں جس قدر صوفیانہ رسالے نکلتے ہیں جن میں نظام المشائخ، صوفی، اسوۂ حسنہ، طریقت، انوار الصوفیہ اور معارف زیادہ ممتاز ہیں۔ یہ سب ظاہری یا اخلاقی اثر خواجہ صاحب کی تحریروں کا ہے کیونکہ سب سے پہلے حضرت خواجہ صاحب نے صوفیانہ رسالہ نظام المشائخ جاری کیا تھا۔ بعد میں اس کے اثر سے اور رسالے نکلنے لگے۔

خواجہ صاحب کی تحریر میں غالب مقصد تصوف ہے اس کے علاوہ غربا، شریف، محتاجوں اور بیکس لوگوں کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ بھی درحقیقت تصوف ہی کی ایک شاخ ہے۔ ان تحریروں کو بھی تصوف کے تحت میں رکھ کر پڑھنا چاہیئے۔

پالیٹکس وسیاست کی نسبت جو مضامین خواجہ صاحب کے قلم سے نکلے وہ مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ مذہب اور مظلوموں کی حمایت کرتے وقت، جو ایک جزو تصوف ہے، خواجہ صاحب نے ایسا لکھا جس کو حکومت نے پالیٹکس سمجھا اور خواجہ صاحب کو اس سے کچھ تکلیف مالی وجسمانی کا مقابلہ کرنا پڑا۔

یہ تصوف کا مشہور اصول ہے کہ سب قوموں اور فرقوں سے یکساں محبت کرنا۔ خواجہ صاحب کے مضامین میں یہ وصف بھی جگہ جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔

مسئلہ وحدت وجود کے بیان میں متقدمین نے چند مثالوں اور تشبیہات کو مخصوص کر لیا

تھا جو شخص کچھ لکھتا انہی مثالوں کو پیش کرتا تھا حضرت خواجہ صاحب کی یہ جدّت صدیوں زندہ رہیگی کہ انہوں نے ہزاروں نئی تشبیہات اس مسئلہ کی تشریح کے لئے اردو میں پیدا کردی ہیں یہ مثالیں خواجہ صاحب کے زمانہ میں تو محض ادبی لطائف تصور کی جاتی ہیں مگر ایک وقت ایسا آئیگا جبکہ صوفیائے کرام انہی مثالوں پر اپنے درس دارشاد کی بنیاد رکھیں گے۔

اگلے صوفی شعرا نے خصوصاً حضرت جامیؒ نے، نعت گوئی میں سوز و گداز کی بڑی بڑی مؤثر تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔ مگر حضرت خواجہ صاحب جس انداز سے نعت لکھتے ہیں وہ اُردو کیا کسی زبان میں اپنی مثل نہیں رکھتی۔ خواجہ صاحب شوق اور درد کو مجسم بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں اور مسلمانوں کے دل میں اپنے رسولؐ کی محبت کو ایسا بھڑکاتے ہیں کہ سنگدل لوگ بھی حبّ رسولؐ میں آنسو بہائے بغیر نہیں رہتے۔ ان دونوں باتوں کا ثبوت، جن کو میں نے اب لکھا ہے ناظرین اس کتاب میں آسانی سے دیکھ سکتے ہیں کہ آیا وحدت اور نعت میں اس سے زیادہ مؤثر کوئی تحریر ان کی نظر سے گذری ہے؟

بندے اور خدا کے راز و نیاز، شوخیاں، گستاخیاں اور دستی سے بھری ہوئی محبت خواجہ صاحب سے پہلے شاید ہی کسی کے قلم سے اتنی زیادہ نکلی ہوں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اس عجیب پیرائے سے پہلے شاید کسی نے کبھی نہیں لکھا۔ اس سے بندے کے دل میں اپنے خالق کیساتھ خوف کی مجبورانہ محبت نہیں بلکہ خالص یگانگت و یکسوئی کا تعلق پیدا ہوتا ہے اور یہی تصوف کا حاصل مطلب ہے۔

اثر اور نرالا پن

خواجہ صاحب کی تحریر میں اثر اور نرالے پن کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ایک تو اُن میں یہ ہے کہ خواجہ صاحب وہی لکھتے ہیں جو خود ان کے دل پر طاری ہوتا ہے اور ڈمیں کبھی دل چھپنے کی طاقت نہیں دیکھی، یہ آمدی ہے جو پہاڑوں کو میں لا لاتی ہے۔

دوسرے وہ نہایت عام فہم اور سیدھے سادے پیرائے میں لکھتے ہیں۔ تیسرے

Marfat.com

جن واقعات وحالات پر وہ لکھتے ہیں وہ بجائے خود طبیعتوں کو کھینچنے والے ہوتے ہیں اور جب خواجہ صاحب کے قلم سے ادا ہوں تو ان میں چار چاند لگ جانے عجیب نہیں ہیں۔ مثلاً تیموری شہزادوں کی دردناک حالتیں خود ایسی ہیں کہ معمولی طور پر بھی کوئی بیان کرے تو سننے والا اشکبار ہوجاتا ہے۔ خواجہ صاحب نے جب ان کو لکھا تو قیامت ڈھادی۔ میں نے دیکھا ہے کہ پڑھنے والے یہ مضامین پڑھکر بے قابو ہوجاتے ہیں اور سنجیدہ سنجیدہ اشخاص بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں۔ خود خواجہ صاحب کو دیکھا کہ اپنے ہی مضمون کو پڑھتے ہیں اور زار وقطار روتے ہیں۔

چوتھی وجہ نرالے پن کی یہ ہے کہ خواجہ صاحب ہر مضمون میں سب سے زیادہ غور عنوان تجویز کرنے میں کرتے ہیں بعض اوقات جب انہیں کوئی خاص مضمون آورد سے لکھنا ہوتا ہے تو گھنٹوں بلکہ دو چار دفعہ میں نے دیکھا کہ تین تین روز صرف عنوان مقرر کرنے میں انہوں نے لگا دیئے اور جب تک نرالا عنوان ہاتھ نہ آیا مضمون نہ لکھا۔

ایکدفعہ میں نے ہنسی میں اُن سے کہا، جبکہ وہ فکرِ عنوان میں بہت چُپ چُپ تھے کہ سارے جہان میں خواہ مخواہ آپ کی انشاپردازی مشہور ہوگئی ہے۔ کوئی دیکھے کہ تین دن سے ایک عنوان آپ کی سمجھ میں نہیں آیا تو جانے کہ ان کو خاک لکھنا نہیں آتا۔ خواجہ صاحب اس گستاخی کو بھی پی گئے اور اپنی فکر میں لگے رہے اور جب عنوان ذہن میں آگیا تو مضمون انہوں نے دو گھنٹے میں لکھ دیا اور فرمایا کہ میری شہرت اسی کی ہے کہ میرے عنوان نرالے ہوتے ہیں۔ میں مضمون سے زیادہ عنوان کو ضروری سمجھتا ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ عنوان سے سارا مضمون سمجھ میں آجائے اسپر طرہ یہ کہ مختصر ہو، نظر کش ہو اور تقلید سے آزاد ہو۔

خواجہ صاحب مقلد ہیں اور حنفی مشرب رکھتے ہیں لیکن انشاپردازی میں تقلید سے اُن کا تنی چڑ ہے کہ پانچ برس کی یکجائی میں میری اُن کی جب کبھی بدمزگی ہوئی تو اکثر اسی بات پر کہ وہ دوسرے لکھنے والوں کی تقلید سے خلاف قدرت گریز کرنا چاہتے تھے اور مجھ سے بتاکید ہوتی تھی کہ کسی اچھے یا بُرے طرز کی پیروی نہ کروں، خود کوئی بات نکالوں۔ لیکن یہ بات میرے امکان میں تھی، نہ میں

Marfat.com

اس کو اتنا ضروری سمجھتا تھا جتنا خواجہ صاحب سمجھتے ہیں۔

ان کا فرمانا ہے کہ وہ لوگ اردو کے دشمن ہیں جو اس میں عربی و سنسکرت کے موٹے موٹے الفاظ جن کو عوام نہیں سمجھ سکتے، داخل کرتے ہیں اور وہ لوگ احمق یا سرمایۂ زبان سے جیب خالی ہیں جو ان کی پیروی کرتے ہیں۔ مولوی ابوالکلام آزاد کی تحریروں کو خواجہ صاحب اردو کا قاتل کہا کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اپنی لیاقت جتانے کو ایسی اردو لکھنی جس میں دو حصے عربی ہو، اردو کے گلے پر کند چھری ہے۔ ایسی عبارتوں کے پڑھنے سے کم مایہ طبیعتیں اردو سے گھبرا جاتی ہیں اور اس کو مشکل زبان سمجھنے لگتی ہیں۔ حالانکہ حامیانِ اردو کا فرض ہونا چاہیئے کہ اسے عام پسند بنائیں

خواجہ صاحب نے اردو میں جو نئی راہ نکالی ہے جس کا ہر انشا پرداز کو اقرار ہے، اس کا راز یہی غیر مقلدی ہے۔ ایک بات کسی شخص نے ایک پیرایہ سے بیان کی اور خواجہ صاحب کو منظور ہوا کہ اس کی تائید کریں تو وہ کبھی اس کے بیان کردہ پیرایہ کی نقل نہیں کریں گے بلکہ ایک ایسے انداز کی تلاش میں رہیں گے جو سابق لکھنے والے سے علیحدہ ہو اور بالکل ایک نئی مستقل بات بن جائے اس کوشش میں وہ ہفتوں مصروف رہتے ہیں اور مضمون نہیں لکھتے جب تک جدت ان کے قبضہ میں نہ آجائے۔

صوفیوں کے اصول یکسوئی خیال کو وہ مضامین نویسی میں ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں یعنی جب اُن کو کوئی مضمون لکھنا ہوتا ہے تو پہلے اسکو کچھ دیر خاموش ہو کر خیال میں جاتے ہیں اور پھر بیٹھکر آن کی آن میں جھٹ پٹ لکھ ڈالتے ہیں جتنی دیر ان کو خیال کے اندر مضمون کو یکسو کرنے میں لگتی ہے اُتنی دیر لکھنے میں نہیں لگتی۔

ایک وجہ اثر اور زندہ دلی پن کی یہ بھی ہے کہ خواجہ صاحب وقت شناس بہت زیادہ ہیں جس وقت میں کوئی بات خلقت کی طبائع پر مسلط ہوتی ہے تو خواجہ صاحب اس بات کو بالکل پبلک کے احساس کے موافق مضمون میں ادا کر دیتے ہیں اور خلقت اس سے قدرتاً بیحد متاثر ہوتی ہے۔

پبلک ہر شخص میں نہیں ہوا کرتا فطرت کے مطالعہ اور قدرت کے نظاروں کی محویت اور کچھ خداداد ذہانت سے یہ چیز میسر آتی ہے۔ خواجہ صاحب کے مضامین کی تاریخ لکھی جائے تو اس میں کا بیشتر حصہ

ایسا نکلیگا جس سے معلوم ہوگا کہ ایس کا ہر مضمون اپنے وقت پر ہندستان میں بڑی ہلچل ڈال چکا ہے۔

یہ نوعیت جناب اکبر الہ آبادی سے بہت ملتی جلتی ہے وہ بھی کسی ایسے واقعہ کو نہیں چھوڑتے جس کا پبلک میں زیادہ چرچا ہو بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ سوائے ایسی موثر باتوں کے اور کسی چیز کو چھوتے ہی نہیں یہ کچھ غیبی بات ہے کہ فطرت یکایک کسی بات پر توجہ دلاتی ہے۔ دہلی میں ایک دفعہ گرمی کے شدید موسم میں نل بند ہوگئے اور خلقت ایسی پریشان ہوئی کہ قیامت کا مزا آگیا۔ رات کیوقت خواجہ صاحب کچھ لکھنے بیٹھے میں نے منع کیا کہ گرمی میں لیمپ کے آگے نہ بیٹھیے مگر وہ ایسے محو تھے کہ میرے کہنے کو سنا بھی نہیں۔ پندرہ منٹ کے بعد ایک مضمون تیار کرلائے جس میں نلوں کی بندش پر ایک بڑے لطف کا صوفیانہ نوٹ تھا میں نے راتوں رات اسکو لکھوا کر بصورت اشتہار چھپوایا اور صبح تمام شہر میں چسپاں کرادیا۔ پھر تو یہ کیفیت تھی کہ دہلی میں ایسے شوق سے آجتک کوئی اشتہار نہیں پڑھا گیا۔ جیسا کہ یہ۔ ہر اشتہار کے آگے چار پانسو آدمیوں کا ہجوم ہوجاتا تھا اور راستے بند ہوجاتے تھے۔

خواجہ صاحب نے اس مضمون میں یاد دلایا تھا کہ اگر خدا پانی کے چشمے خشک کردے تو کون تم کو پانی دے اور تمہارا کیا حال ہو جبکہ تم ایکدن میں ایسے پریشان ہوگئے۔ ان کا اشتہار اس آیت پر تھا جو قرآن پاک کے انیسویں پارے کی سورۂ ملک میں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا پانی زمین کی تہ میں سوکھ جائے تو کون اس کو اوپر لاکر بہلائے۔ اس کی تفسیر ایسے دلکش انداز سے ہوئی تھی کہ ہندو مسلمان یکساں جھومتے تھے۔

خواجہ صاحب نے اس قسم کے سینکڑوں اشتہار لکھے ہیں مگر افسوس کہ اس مجموعہ کی ترتیب کے وقت وہ ناپید ہوگئے ورنہ ناظرین دیکھتے کہ فطرت کے اس فوٹوگرافر نے اپنے وقت میں کیا کیا کام کیئے اور معمولی معمولی باتوں کو کیسے چار چاند لگائے ہیں۔ 13/280

نرالے پن کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ابتدا سے خواجہ صاحب کی نظر ذلیل اور بے حقیقت اشیاء پر جاتی تھی اور یہ وہ چیزیں تھیں جنکو اچھا لکھنے والوں نے اپنی بلند نظری کے سبب نظروں سے گرادیا تھا۔ خواجہ صاحب نے انہی کو اٹھایا اور چونکہ عوام کے طبائع کیلئے یہ بڑی کشش کی چیز تھی اسواسطے ہر دل میں ان کا گھر بن گیا

دلچسپ جزئیات

اب میں بہت معمولی باتوں کو اپنے حضرت کی پیروی میں لکھتا ہوں جو اول اول غیر معمولی معلوم ہوتی ہیں مگر آخر میں انہی سے کیرکٹر کا پتہ چلایا جاتا ہے. خواجہ صاحب بہت نحیف البدن اور دائم مریض رہنے والے ہیں کوئی شخص انکو دیکھے تو کبھی خیال نہیں کریگا کہ وہ ایک وقت اور ایک نشست میں بیٹھے بیٹھے ایک رسالہ دو جزو کا لکھ سکتے ہیں. حالانکہ دیکھا گیا اور بار بار دیکھا گیا کہ انہوں نے ایسا کیا. خواجہ صاحب کی قلم دوات کبھی صاف ستھری نہیں رہتی نہ ان کو مضمون لکھنے میں اچھے کاغذ کی تلاش ہوتی ہے جہاں وہ لکھتے پڑھتے ہیں وہاں اسقدر پراگندہ کاغذات اور چیزوں کا ڈھیر ہوتا ہے کہ آدمی دیکھکر گھبرا جائے. مگر خواجہ صاحب اس کوڑے کرکٹ میں بیٹھے لکھا کرتے ہیں. ان کو مضامین تین حالتوں میں زیادہ سوجھتے ہیں. ایک گانے میں، دوسرے تھیٹر میں تیسرے کسی عاشق یا آشفتہ حال کو دیکھنے میں تھیٹر کا تماشہ بہت دیکھتے ہیں اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے تماشہ دیکھکر کوئی مضمون نہ لکھا ہو یہ مضمون نفس تماشہ پر نہیں ہوتا تھا بلکہ تماشہ سے متاثر ہو کر کسی نئے خیال پر خامہ فرسائی کرتے تھے بارہا ایسا ہوا ہے کہ تماشہ میں میں ساتھ ہوں اور خواجہ صاحب بجائے لطف کے تماشے میں غمگین و افسردہ ہیں حالانکہ تماشہ میں کوئی بات غم کی نہیں ہے. گھر آکر میں سو گیا اور خواجہ صاحب صبح تک کچھ لکھتے رہے. غرب شہید کا گھر، تبریزی یتیم کی آہ وغیرہ مضامین اسی طرح لکھے گئے ہیں جنکو لکھکر خواجہ صاحب رات بھر پڑھتے اور روتے رہے اور صبح کردی. بعض اوقات میں نے دیکھا کہ وہ آدھی رات کو خود بخود بیدار ہو کر لکھنے لگے. پوچھا تو فرمایا کہ کل شام کو فلاں بات نے بہت متاثر کیا تھا. اب خود بخود آنکھ کھل گئی اور اس کے لکھنے پر طبیعت مجبور ہوئی.

انکی طبیعت بہت حاضر ہے لیکن ہر وقت یہ حالت نہیں رہتی بعض اوقات وہ بغیر تخلیہ اور تنہائی کے کچھ نہیں لکھ سکتے مگر عام طور پر وہ مجمع میں باتیں کرتے جاتے ہیں اور لکھتے جاتے ہیں. ایکدفعہ میں نے امتحان لیا رات کا وقت تھا بہت سے لوگ جمع تھے میں نے سوچا کہ خیال میں جمائے بغیر خواجہ صاحب کچھ نہیں لکھ سکتے ہیں اسواسطے فرمائش کی کہ اس مجمع میں کچھ لکھیئے اور میرے بتائے ہوئے عنوان پر لکھیئے. شرط یہ ہے کہ دو چار

Marfat.com

آدمی باہم باتیں بھی کرتے جائینگے۔ آپنے ہنسکر اسکو قبول کیا اور لالٹین جو اسوقت روشن تھی وہی عنوان قرار پایا۔ آپنے فرمایا میں بولتا جاتا ہوں ایک آدمی لکھتا جائے۔ تم سب آپس میں باتیں کرو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ۲۵ منٹ میں خواجہ صاحب نے ایک لمبا اور نہایت دلچسپ معنی خیز مضمون لالٹین پر لکھوا دیا جو شاید اس کتاب میں بھی ہو۔ فرمائشی مضمون نویسی سے انکو نفرت ہے مگر موقعہ آجاتا ہے تو اسکی تعمیل بھی خوب کر دیتے ہیں۔ ایکدفعہ میں نے عرض کیا کہ کاپی نویس بیکار بیٹھے ہیں بڑا حرج ہو رہا ہے جلدی ایک ۶ صفحے کا مضمون دیجئے۔ فرمایا پانوں کی ڈبیہ منگاؤ اور دروازے پر بیٹھ کر آنیوالوں کو روکو۔ میں نے ایسا کیا۔ آدھ گھنٹہ میں نقطہ کے عنوان پر چھ صفحے لکھ کر دیدیئے۔

اب وہ مضمون لکھتے میں پان بہت کھاتے ہیں پان جبتک پاس ہوں مضمون ادا کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ باجہ بج رہا ہو تو وہ خود بیٹھکر بہت اچھا مضمون لکھ لیتے ہیں۔ انہوں نے گراموفون محض مضمون لکھنے کی خاطر خریدا ہے۔ دوسرا آدمی اسکو بجاتا ہے اور وہ مضمون لکھتے جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب کا شہرہ آفاق مضمون "کہو تکبیر" جو ضبط ہو گیا اور اب اُسکے شائع ہونیکی ممانعت ہے اور جو کانپوری مسجد کے معاملہ میں لکھا گیا تھا اور جس کے ترجمے تمام عربی و ترکی اخبارات تک نے شائع کئے تھے اور جو ابتک ہندوستان میں سینکڑوں آدمیوں کو حفظ ہے، اسی طرح لکھا گیا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ خواجہ صاحب نے سحری کیوقت گراموفون بجوایا اور اسوقت یہ لکھا۔ یہ واقعہ میرٹھ کا ہے جبکہ خواجہ صاحب اخبار "توحید" کی ایڈیٹری کرتے تھے اور میرٹھ میں مقیم تھے۔ علمی مضامین بھی وہ خوب لکھ سکتے ہیں مگر انکا فرمان ہے کہ ہمارے مخاطب جاہل لوگ ہیں ہمکو اُنکی زبان میں بات کرنی ہے۔ پڑھے لکھے لوگونکو سمجھانے کیلئے ہزاروں پڑھے لکھے عالم فاضل لکھنے والے موجود ہیں مگر ان غریبوں کا کوئی نہیں۔ وہ غم کے مضامین بہترین لکھتے ہیں۔ ظرافت میں بھی انکے قلم کو بہت قدرت ہے۔ اخبار "خطیب" میں گدگدیاں اور چٹکیاں کے عنوانسے جو مضامین انہوں نے لکھے ہیں ایسی ظریفانہ عبارتیں لکھی ہیں جو اپنی شان میں سب سے نرالی ہیں اور جنکو پڑھکر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ خواجہ صاحب کا قلم کسی مضمون میں بند نہیں ہے۔ وہ ہر بحث میں صوفیانہ نکتہ نکال لیتے ہیں چنانچہ اخبار خطیب میں انہوں نے علم طب پر ایسے ایسے صوفیانہ مضامین لکھے جنکی طبقۂ اطبا میں دھوم مچگئی۔ ایک مضمون خیال میں آئے اور اسکو نہ لکھ سکیں تو خواجہ صاحب بیمار ہو جاتے ہیں۔ وہ مضمون لکھکر مسودہ کو دہرایا نقل نہیں کر سکتے اور کہتے ہیں کہ نقل کرنا مشکل، دوسرا تیار کرنا آسان۔ اردو ترقی کرتی رہی تو وہ وقت دور نہیں کہ خواجہ صاحب کے مضامین پر بڑی بڑی لیاقت والے مجھ سے زیادہ لکھیں گے۔ میں تو اتنا ہی لکھ سکا۔ فقط۔

واحدی

Marfat.com

پہلی منزل

بندہ اور خدا کے راز و نیاز

مستِ الست کی دُعا

(از رسالہ نظام المشائخ دہلی۔ جولائی ۱۹۱۰ء)

بجلی میں چمکنے والے، چاند میں جھلکنے والے، رات کے اندھیرے، سورج کی روشنی، آسمان کی بلندی، دریا کی روانی، جنگل کی سنسانی، دلگیری دل داری کے مالک! عرش کی اقامت میں خدا، دل کے گھرانے میں خدا! ہم تیرے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ اگر تو عرش پر ہے ہم کو سربلند کر، فرش میں ہے تو وسعت و ثابت قدمی عنایت فرما دل میں ٹھکانا ہو تو اس کو اپنے رہنے کے قابل بنا دے، رگ جان میں ہو تو خون میں اپنی شان اور آن بان کا جوش پیدا کر۔ اگر تو ہر جگہ ہے تو ہم کو بھی ہر جگہ پہنچا۔

تو عالم ہے: اپنے علم کا حصہ ہم کو بھی دے۔ رازق ہے، ہمارے ہاتھوں سے رزق بانٹ۔ رحمٰن ہے، رحمت نازل فرما۔ قہر و جبر کی تلوار ہمارے دشمنوں کے ہاتھ میں نہ دے۔ خیر کو وسعت دیکر شر سے بچا۔ ہماری آنکھ بن، تجھ سے دیکھیں۔ کان بن، تجھ سے سنیں زبان میں تو ہی بول۔ ہاتھ سے تو ہی کام کر۔ تو بعید ہے تو قریب آجا۔ قریب ہے تو اقرب ہو جا۔ اقرب ہے تو "نحن اقرب" کا حجاب بھی اٹھا دے۔ پھر ہم اور تو کا لفظ

Marfat.com

بھی فنا ہو جائے اور فنا کو بھی ایسی فنا ہو کہ ازل سے ابد عدم سے نمود نمود سے عدم۔ جہاں تلاش کریں اُس کا وجود بصارت و بصیرت کو نظر نہ آئے۔ اے حمد و ستائش کے قابل خدا، تو خود آ تاکہ ہم تیری تعریف کریں۔ تیری تعریف اور تیرے رنگ برنگ کے ناموں کی تعریف۔ تیرے اچھے بُرے کاموں کی تعریف۔ او گاڈ! یورپ کے منکروں کا انکار اقرار سے بدل دے۔ ان کے پیاسے دل کو روحانی تسلی کی ایکتا مگر وہ بھی نِبرُوَن عنایت فرما۔

ہے پرُبھو پُرشُوتّم پَرَم آتما! اگر تو نرگُن ہے تو ہم کو سگُن بنا دے۔ نرا کار ہے تو ہماری موہوم شکلیں بھی مٹا دے۔ سگُن بن جا۔ ساکار ہو جا اور اپنی پَرَم شکتی کو دنیا میں پرگھٹ کر۔ ہم کس سے فریاد کریں۔ تیرے سوا کس کو دیکھیں۔ اے مکہ کے سیاہ پوش مکان پر نظر خاص رکھنے والے۔ اے صلیب کی صورت کو عزت دینے والے اے ہر دوار کے دوارے رہنے والے۔ تجھکو ہم یقین دلاتے ہیں کہ تو ہی ہے اور کوئی نہیں تو نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا، اور جو کچھ ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ تو ہی تو ہے اور بس۔ تو دیکھتا ہے مگر ہم بھی دکھانا چاہتے ہیں۔ تو سنتا ہے مگر ہم بھی سنانا چاہتے ہیں۔ سن اور دیکھ۔ امیدیں ڈوب رہی ہیں، ارمان جل رہے ہیں، ماتم برپا ہے۔ نوحوں کا شروع رہا ہے۔

یہ ملک ہندوستان۔ اس کو تیری امان۔ فساد و خونریزی۔ قحط و بیماری۔ کاہلی و بیکاری۔ سب آفتوں سے، جو زمین کی ہوں یا آسمان کی، مشرق کی ہوں یا مغرب کی دین کی ہو یا دنیا کی، حفاظت دے۔

مسلمان، بے یار و مددگار مسلمان۔ غریب و لاچار مسلمان۔ کسی زمانہ کے تاجدار مسلمان، وہ جو بھوکے سوتے ہیں، بھوکے بیدار ہوتے ہیں وہ جو ٹھکرائے جاتے ہیں، جن پر رونے والے بھی ہنستے ہیں۔ خداوی تیرے پیارے محمد صلعم (ہم اس نام پر فدا ہو جائیں) کے پیارے مسلمان۔ آج زمین و آسمان میں اُن کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ نرم غالیچوں کے بدلے خاک کے بچھونے

Marfat.com

پر پڑے ہیں، مگر اب بھی گردش کو چین نہیں۔ وہ اس سے بھی گئے گذرے ذلت کے گڑھے میں ڈالنا چاہتی ہے۔ تو ان کی حمایت کر۔ صدقہ مدینے کی گلیوں کا۔ صدقہ اُس خاک کے ذروں کا جو تیرے رسولؐ کے قدموں سے پامال ہوئی۔

اے مشکلوں کے حل کرنے والے۔ اپنے دیوانے متلانے صوفیوں کو اپنے اشارۂ چشم سے آمادہ کر کہ وہ اپنے بیکس دبے بس مسلمانوں کی دستگیری کو کھڑے ہو جائیں۔ پہلے ان کے سلسلوں کو اکھٹا کر تاکہ ان کی قوت مجتمع ہو اور وہ ظاہری مرحلے بھی اسی اجتماع سے طے کریں جس طرح باطن کے مقامات اجتماع حواس و خیالات سے ہوتے ہیں۔

الٰہی! حلقہ نظام المشائخ اور رسالہ نظام المشائخ کو گروہ مشائخ کا سچا مخلص خادم بنا اور اور اس کے فرائض کو بختگی سے پورا کرنے کی توفیق عنایت فرما۔ آج جس میدان میں یہ قدم ہم نے رکھا ہے اس کو ایسا بنا دے کہ ہم اور قدم بھی وہاں اُٹھا سکیں اور منزل پر پہنچ جائیں آمین ثم آمین اور پھر آمین۔

آہ! یہ خط

مدت کے بعد خط آیا۔ تسلی بھی تسکین بھی۔ خشم و عتاب بھی۔ زخموں پر مرہم رکھ دیا اور ہاں نمک پاشی بھی کی۔

خط! اچھے اچھے حرفوں والے، پیارے پیارے مطلب والے، آ! بہت راہ دکھائی۔ تجھ کو پہلے آنکھوں سے لگاؤں، کلیجہ پر رکھوں اور دل پر بھی جو رکھوں پڑ کتا ہے اور تجھ کو مانگتا ہے تو کس کا نامہ ہے۔ تجھ میں کیا لکھا ہے۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

قاصد پر نثار۔ کیا ہی اچھا پیام لایا۔ ہاں تو یہ تاکید کر دی ہے کہ میرے مکتوب کا ادب کیا جائے، ناپاک ہاتھ نہ لگیں۔ دل و جان سے منظور۔ پیارے پیارے کا خط ہے۔ بھلا اس کی بے ادبی ہو سکتی ہے؟

Marfat.com

لکھا ہے یہ خط ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ ہاں ہاں کچھ شک نہیں۔ بلاشبہ یہ آپ کا نامہ ہے۔ آپ بھی سچے اور آپ کا مکتوب بھی اور وہ قاصد بھی جو پیام لایا۔

آپ کی یاد میں، آپ کے انتظار میں از خود رفتہ دیکھ کر اکثر لوگوں نے فرضی خطوط بنائے اور کہا کہ یہ ان کا ہے جنہیں تم یاد کرتے ہو۔ مگر تسلی نہ ہوتی تھی۔ یقین نہ آتا تھا۔ شاید آپ کو بھی اغیار کی کارستانیوں کی خبر پہنچ گئی۔ جو لکھا کہ اس خط میں شک نہ کرنا۔ نہیں! جناب۔ یہ تاثیر، یہ تجلی، یہ کشش اوروں میں کہاں تھی۔ دلی یقین کے ساتھ پڑھوں گا۔ آنکھیں ترس گئی ہیں، پتلیاں سیر نہیں ہوتیں اور کہتی ہیں۔ خط! ہم تیری یاد میں رو تے تھے پلکیں آنسوؤں سے بھگوتے تھے۔ تو اب آیا۔ بتا دے کیا تو آیا؟ تو ہمارے پیارے کا پیارا خط ہے۔ قاصد نے تیرا نام **قرآن** بتایا ہے دل یہ کہتا ہے کہ تو قرۃ العین ہے۔ اب تیرے بھیجنے والے سے مخاطب ہوتا ہوں۔ بندہ نواز! آپ نے جو یہ تحریر فرمایا کہ ہم نے اپنی امانت آسمان۔ زمین اور پہاڑوں کے پاس رکھنی چاہی تھی مگر سب نے انکار کیا اور اس بھاری بوجھ کی ذمہ داری سے ڈر گئے اور تو نے اس بار کو اٹھا لیا۔ میں اس لکھنے سے بہت شکرگزار ہوا۔ اس تحریر سے آپ نے میری قدر بڑھائی اور ہمچشموں میں ممتاز کیا لیکن یہ محض ذرہ نوازی ہے ورنہ میں اس قابل نہ تھا کہ اس نازک امتحان میں پورا اترتا۔

یہ چھیڑ خانی کا فقرہ خوب فرمایا کہ تو بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے۔ ہاں جناب جو مرضی ہیں آئے ارشاد کیجئے۔ آپ کے دلدادہ ہیں۔ سب کچھ سننا ہی پڑیگا۔

نوکدار نشتروں کی امانت بھی دل و جگر میں رکھیں اور پھر آپ کی نرم گرم باتیں بھی سنیں ہم جاہل سہی، ظالم سہی، ناعاقبت اندیش سہی۔ پر یہ تو دیکھئے کہ جان پر کھیل گئے اور آپ کی فرمائش کو نہ ٹالا۔ اتنے بڑے ڈیل ڈول کے آسمان، ایسی چوڑی چکلی زمین اور بھاری بھرکم پہاڑوں نے جس بات سے منہ چھپایا اور حیلہ حوالہ کرنے لگے، اس کا برداشت کرنا ایک مشتِ خاک سے کیونکر ممکن تھا۔ مگر محض آپ کی رضا مندی کی خاطر اس ہولناک

Marfat.com

منزل میں قدم رکھدیا آپ کو خبر بھی ہے؟ آپ کی امانت کے سبب ہم پر کیا گذرتی ہے۔ آپ کی چاہت کا دم بھرنے والے میاں شیطان رات دن چوری کی فکر میں ہیں۔ ہر وقت وہ اور ان کے یار غار خانۂ دل کے گرد منڈلایا کرتے ہیں کہ موقعہ بنے تو وار کر جائیں اور ہمکو آپ کے سامنے خائن ثابت کر کے شرمندہ کرادیں۔

اس بیرونی طوفان کی حفاظت کے علاوہ ذرا اندرونی مشکلات کا حال بھی سنیئے۔ آپ کی امانت ہے تو بالکل سربستہ اور سربمہر، کوئی نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے اور اس میں کیا ہے لیکن عجب طلسماتی پڑیہ ہے۔ جہاں رکھی جائے وہیں ایک طرح کا سوز بے کلی اور اضطراب پیدا کردیتی ہے۔ اُلجھن ہوتی ہے۔ شہر میں جی گھبراتا ہے۔ جنگل ویرانے میں نکل جانیکو طبیعت چاہتی ہے۔ دنیا کی شان وشوکت۔ زیب وزینت۔ عیش وراحت سب ہیچ نظر آتے ہیں۔ آنکھیں سونا کم کردیتی ہیں۔ زبان اپنا مزہ بھول جاتی ہے۔ بات چیت میں بھی زیادہ چلنا پسند نہیں کرتی۔ پیٹ تن بھاتی غذائیں نہیں مانگتا۔ جو سے وہ لے لیتا ہے اور وہ بھی بار بار نہیں کئی کئی وقت کے بعد اپنے یگانے غیر اور بیگانے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود اپنا تن من بے حقیقت دبیکار نظر آنے لگتا ہے۔ تو جناب امانت کیا ہے۔ ایک بلائے بے درماں ہے۔ تاہم ع۔ ہرچہ از دوست می رسد نیکوست

سبحان اللہ! آپ کی تحریک کی آن بان کے قربان، نوازش کا اظہار ہوتا ہے۔ قہر و غضب کی شان کا ذکر بھی کردیا جاتا ہے۔ وعدۂ وصل سے ڈھارس بندھائی جاتی ہے تو فرقت وجدائی کی دھمکی بھی ساتھ ہی ملتی ہے۔ جناب! کون کہتا ہے کہ آپ رحیم نہیں، کریم نہیں، دلنوازی نہیں کرتے۔ چارہ سازی نہیں فرماتے۔ آپ کی ذات سے اس سے بڑھ بڑھکر امیدیں ہیں لیکن ان دھمکیوں سے کیا حاصل۔ ہم پہلے ہی ڈرتے ہیں اور حضرت کی بے نیازی اور کبریائی سے خوف کھاتے ہیں۔

اس خط میں سرکار نے سب کچھ تو لکھا ہے مگر یہ نہ بتلایا کہ اب آپ کا دیدار کس دن

Marfat.com

میسر آئے گا۔ اس وعدے سے اطمینان نہیں ہوتا کہ عنقریب ہم تم سے ملیں گے۔ وقت بتائیے۔ منٹ اور ساعت مقرر کیجئے اور ملاقات کے پروگرام سے آگاہی بخشئے۔ ایسی گول مول بات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رہا سہا اطمینان بھی جاتا رہے گا اور ہر وقت انتظار کا سامنا ہوگا جو موت سے زیادہ سخت چیز ہے۔

برافگن پردہ از رخ بے محابا یکے کن وعدۂ امروز فردا

آ

(از رسالہ نظام المشائخ ۱۹۱۲ء)

خوشی بن کر آ، غم میں سما کر آ، مگر آ، عید کے چاند میں آ، محرم کے ہلال میں آ، چمک میں جھلک میں تاریکی میں لہریں لے۔ کڑک سے دل ہلا لیکن اے آنے کے قابل آ۔
رمضان کے سناٹے میں آیا تراویح کے قرآن کی خوش لحنی میں جلوہ دکھایا۔ افطاری کے وقت تیری مزیدار آہٹ سنائی دی۔ اب بھی آ جس طرح چاہے آ لیکن آ۔

کہتے ہیں تو ہر چیز میں آسکتا ہے۔ ہر حال میں تیری آمد کا امکان ہے۔ تیرے آنے میں دیر نہیں لگتی۔ تجھ کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ آ۔ تجھے بغیر جو آجائے۔ بلا حرکت متحرک ہو۔ وہ تو ہے۔ تو بس اسی طلسماتی غیر مفہوم چال سے آجا۔ دیکھ آجا۔ سن آجا۔ سمجھ آجا۔
ہم کو وہ دیدار دے جو دیدۂ دیدار طلب کے شایان ہو۔ موسیٰ کو بے ہوش کرنے والا طور کو خاک سیاہ بنانے والا نہیں۔

ہلال عید

آسمان کے کونے میں منہ نکالے ہمکو دیکھ رہا ہے ہم اسکو دیکھ رہے ہیں۔ یہ وہی پارۂ نور ہے جو ہر ماہ کے ختم پر چھپکر نکلتا ہے۔ مگر کبھی آج کی سی خوشی، اُمنگ، کیفیت، پیدا نہیں

Marfat.com

ہوئی۔ یہ کیوں؟ کیا تو اس کے پردہ میں اپنی ابرو دکھا رہا ہے۔ ہاں تو ہی ہوگا نہیں تو ہی ہے۔

ایسے عالم بیشمار ہیں۔ ایسے فلک لاتعداد ہیں۔ چاند بھی بہت سے ہوں گے اور دیکھنے والے بھی، پھر تو کہاں کہاں چشم نوازیاں کرنے جائیگا۔ آ۔ تجھے اپنی آنکھ میں چُرا کر چھپا کر رکھ لیں۔ اپنے لئے اور اپنے دل بیقرار کے لئے۔ بڑی سیر ہوگی تو ذرا ہم میں چھپ کر تو دیکھ۔ لوگ تجھے ڈھونڈھتے پھریں گے۔ عرش و کرسی پریشان ہونگے فرشتوں کو تلاش ہوگی۔ دوسری دنیا کے باشندے عید کی بہار چھوڑ کر تیری جستجو کی سرگردانی میں پھنس جائینگے۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ہماری آنکھ کا خانہ چھوٹا ہے۔ اس میں تیری گنجائش نہ نکلے گی، نہیں دریا حباب میں آسکتا ہے۔ انجن کی وہ بھاپ جو ریل کی لمبی قطار کو کھینچ کرلے جاتی ہے اور خود انجن کی حرکت اس کے دم سے ہے، کہاں رہتی ہے؟ انجن کے ایک چھوٹے سے ظرف میں۔

اچھا یوں نہیں تو پھول کی خوشبو کی طرح دل کے گل میں سما جا۔ یہ مدلل مطالبہ قبول کر۔

چاندرات

چاند تو چھپ گیا مگر چاندرات موجود ہے۔ ہر طرف اندھیرا اور وہی رات جو روز آیا کرتی ہے۔ پھر یہ چہل پہل گھما گھمی کیسی؟ ہو نہ یہاں بھی تیرے گیسوؤں کی شرکت ہے۔ بے شک یہی بات ہے۔ قسم لے لے۔ وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ

صبح عید

آنکھ کھلنے سے پہلے، سورج نکلنے کے اول انکار کو شکست ہوئی۔ اسرار نے شرد کے کپڑے پہن لئے اور فتحیابی کا جشن تیار ہوگیا۔ عیدگاہ میں چھوٹے بڑے اچھے

بڑے سب تیرے لئے جمع ہوئے ہیں۔ کھڑے ہو کر انتظار کرتے ہیں، جھک کر دیکھتے ہیں اور عاجز ہو کر سر خاک پر رکھ دیتے ہیں۔ اب تو آجا اور گلے مل جا۔

سُنا تھا کہ تو دلوں میں رہتا ہے اس لئے ہر شخص سینے سے سینہ ملا کر معانقہ کرتا ہے کہ شاید کسی کے دل میں تو مل جائے۔ مگر تو کیوں حجاب کرتا ہے اور ملنے سے گریز کرتا ہے آج کے دن بھی نہ ملا تو کب ملیگا؟

دیکھ آ۔ اب صبر نہیں ہو سکتا۔ دامن قرار ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ تو نے کہا تھا اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ مجھ سے مانگو قبول کروں گا۔ سو تجھ ہی سے مانگتے ہیں اور تجھ ہی کو مانگتے ہیں۔

وعدہ پورا کر اور آ۔ یہ عید ہے۔ وعید کا خیال چھوڑ دے۔ اگر تو مَن جائے تو ہماری عید بھی مَن جائے گی۔

دُعائے بیقراری اور دلِ آشفتہ کی بکا وزاری

رمضان المبارک ۱۳۳۱ ہجری کی اکیسویں تاریخ کو منزل گاہ حلقۂ المشائخ میں امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ کا سالانہ عرس تھا۔ یہ دعا چند گرم فقروں کے اضافہ کے ساتھ اسی موقعہ پر خواجہ صاحب مدظلہ نے پڑھی تھی۔

الٰہی تجھ سے کیونکر مانگیں۔ دل کو قرار نہیں طبیعت کو یکسوئی نہیں۔ زبان میں گویائی نہیں۔ پہلے قرار دے۔ اطمینان عطا فرما۔ بولنے اور مانگنے کی طاقت مرحمت کر تاکہ کہیں سانس کی خمیر

اس کی خیر اور اس کی خیر جس کی دم شماری کا وقت آگیا۔ دل کی حرکت بند ہو جائے تو انسانی مشین رک جائے مگر ایسی حرکت سے بچا جو درجۂ اختلاج کو پہنچ گئی ہے۔ جب دل ذرا صحت پر آئے گا تو پکاریں گے اَللّٰھُمَّ یَا رَبَّنَا اے پروردگار! اُدھر جب کہ حاضر! آج کی رات کا صدقہ۔ ہماری دعا کو سن۔ یہ وہ شب ہے جس میں تیرے شیر، تیری تیغ، اور تیرے کلمہ۔ علی مرتضیٰؑ کی یادگاری کا سالانہ جلسہ منانے کیلئے ہم لوگ جمع ہوئے ہیں برادر رسولؐ۔ زوج بتولؓ۔ پدر فرزندانِ طول۔ رموز و اسرار کے خرقہ پوش عجیب کا روں کے پردہ دار، حیدر کرار، شہسوار کارزار۔ اَن داتا۔ من داتا۔ تجھ پر سلام اور اس برکت والی روح پر سلام جس کے وسیلہ سے دنیا کی اس شب تار میں خدائے برتر سے دل و جان کا اُجالا مانگا جاتا ہے۔

اللہ میاں! تم دیکھتے ہو بجلیوں کی روشنیوں سے آنکھوں پر انجن کی چیخوں اور توپ کی گرجوں سے کانوں پر۔ الحادی فلسفہ کی دلیلوں سے عقل وحواس پر حملے ہو رہے ہیں۔

نور علوی کو ظاہر کرو کہ برقی رو ماند ہو حیدری نعرے کو بلندی دو، جس سے عارضی آوازیں پست ہوں۔ علوم (ربانی) کے باب کھول دو جو عقل وحواس اپنی ہستی کو بچائیں آمین اے رب العٰلمین آمین۔ اے قبول کر سکنے والے! یہ کون ہے جو پوچھتا ہے کہ علی مرتضیٰؑ کی روح یہاں کہاں؟ جس پر سلام بھیجتے ہو۔ بے تار کے برقی اشارات کی طاقت کو نہیں دیکھا، اس آلہ سے بڑھ کر ہم کو ہنر یاد ہے۔ ہم جو چاہیں کہیں اور اُن کو سنائیں۔

اے بیکسوں اور لاچاروں کی پناہ! ہماری مرادوں کو پورا کرنے والے۔ ہم کو اپنے در کے سوا اور کسی کے آگے نہ جھکا۔ معاش کی طلب میں در در کی ٹھوکریں نہ کھانے دے اپنے غیب کے خزانے سے رزق عنایت کر۔ بے اولادوں کو ایسے فرزند مرحمت فرما جو دین اسلام کے سپوت ہوں۔

خداوندا! اہل دہلی، حاضرین مجلس اور حلقہ نظام المشائخ کے تمام ممبروں کی دلی مرادیں

پوری کر۔ خاصکران کے مقاصد برلا جنہوں نے حلقہ کے دعاخانہ میں اپنی مختلف ضروریات کے لیے دعا کی خواستگاریاں بھیجی ہیں۔ الٰہی ان سب کے ارمان برآئیں جو اس حلقہ اور دُعا خانہ اور اس قسم کی مجالس کے معین و مددگار ہوں۔

اور مجھ بے وجود کو بھی توفیق دے کہ زمانہ کے فیشن اور نمائشی نفاق آمیز اعمال سے محفوظ رہوں۔ جو کچھ کہوں وہی کروں اور تیری رضا کی حد سے آگے نہ بڑھوں۔

بھگت کے بس میں آ بھگوان

(از اخبار "توحید" میرٹھ۔ مورخہ ۱۶۔ اپریل ۱۹۱۳ء)

یارحمٰن یا سبحٰن

تیری سمرن جیوں، آگے سیس دھروں، کیسے بھگتی کروں

اے بھگوان، اے سبحٰن، اے رحمٰن

موسیٰ کے زمانہ کا چرواہا ہوتا تو تجھ کو اپنے گھر بلاتا، پاؤں دباتا، سر دُھلاتا، ٹھنڈا ٹھنڈا دودھ پلاتا۔ تو سوتا تو پنکھا جھلتا۔ تو سنتا تو گانا گاتا، روتا، رُلاتا، جاتا تو روکتا پیروں پڑتا، ہاتھ جوڑتا۔

داتا تو کہاں ہے؟ میرے من کی ہیپتا کے دیکھن ہار۔ مولیٰ مولیٰ۔ سُن۔ اُلجھنوں میں ہوں، گردشوں میں ہوں، بیقراری دیکھ، آہ وزاری دیکھ، اشکباری بھی۔

آنسو دے ان میں نہاؤں، سوزش دے تڑپوں۔ لوٹوں۔ تجھ کو پاؤں۔ بلالی کا دل دے۔ در آستان پر سر ٹکراؤں۔ عزت تجھ سے ہے۔ ذلت تجھ سے ہے میرے بھو بھگوان۔ اپنے بھگت کے بس میں آجا۔ دے جا۔ دلا جا۔

Marfat.com

یہ رات کیونکر کٹے۔ تو یاد آتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اپنے داس کو درشن دے۔ روپ دکھا جلوہ افروز ہو۔ آنکھ بے ہوش اور من سنتوش ہو۔ کس کا بلقان، کیسا ایران، تیری رحمت کا چشمہ اور اس میں اشنان۔ اسی میں ہیں دونوں جہان۔ رین اندھیری۔ بدلی کالی۔ رستہ بھاری، دشمن سر پر، غفلت دل میں، ہاتھ پکڑ کر بھگوان۔ میں قربان، تجھ کو دیکھوں اور نہ دیکھوں کوئی۔ سب ہوں گم، تو ہے گرم۔

شوکت والے، طاقت والے، توپوں اور سنگینوں والے، زخموں اور مرہم والے دکھ کے کرتا سکھ سروپ، تیرے بھوکے، تیرے پیاسے۔ یہ ہے اچھا، تو ہو پاس۔ پھول بھی تو، خار بھی تیرا۔ نور بھی تو نار بھی تیری۔ آنکھیں میری، سب کچھ تیرا اور نین کے اندر ڈیرا تیرا۔ بس میں آ بھگوان۔

سر ہے حاضر، کھنچے کٹاری عشق کی اگنی، چتا ہماری۔ ست پکاریں، بت بن جائیں۔ جزو کو تیاگیں، کل ہو جائیں۔ یثرب پہنچیں مکہ دیکھیں۔ بیچ سمندر جھنڈا گاڑیں۔ مہدی باپو گونجیں گرجیں۔ ان کے آگے چل کر کڑکیں۔ تیر چلیں سب سینوں پر دشمن چھدے سنگینوں پر۔

تو ہو بس میں، سب ہوں بس میں حسن نظامی کس کا بندہ؟ وقت کٹھن ہے۔ اکا پھندا بھگتی اپنی من کو دے۔ بھارت سیوا سب کو دے۔ بس میں آ بھگوان۔ تیرے نام کو پرنام یَا ذِی الْعِزَّةِ وَالْجَبَرُوْتِ وَالْاِکْرَامِ ط

تو اگر عہد وفا باندھ کے میرا ہو جائے ٭ گورے طلکوں کے اجالوں میں اندھیرا ہو جائے

حروف کی دعا

الف تو آگے بڑھ اور کن کہنے والے دانا کے سامنے ہمارا وکیل بن۔ کیونکہ تو بھی

ایک و یکتا ہے۔ شرکت سے پاک ہے اور ہمارا خدا بھی وحدہٗ لاشریک اور غیریت سے پاکیزہ ہے۔

مولٰے! ہم حروف ہیں تیرے معانی کی امانت سینوں میں رکھتے ہیں۔ تو نے ہم کو ازل کے مخفی قلم سے پیدا کیا ہے اور ہمارے اجسام کو وہ روح دی ہے کہ ظاہر میں بے حس و حرکت و بے جان نظر آتے ہیں مگر درحقیقت زندہ ہیں اور جو ہم کو نظرِ غور سے دیکھے تو اس کو بھی زندہ کر دیتے ہیں۔

تو نے ہم کو وہ زبان دی ہے جو خاص تیری بول چال میں کام آتی ہے۔ یعنی یہ کہ بغیر بولے اور بغیر لب ہلائے بات ادا ہو جاتی ہے اور دوسرے اس کا مطلب سمجھ لیتے ہیں۔

انسان روزمرہ کتابوں، اخباروں اور خطوط میں ہماری باتیں سنتا ہے مطلب سمجھتا ہے مگر یہ نہیں سوچتا کہ یہ کیا بھید ہے کہ حروف منہ سے کچھ نہیں کہتے لیکن جہاں آنکھ کے سامنے آئے اور خود بخود ان کا مطلب ذہن میں آنے لگا۔ کانوں کو ان کی آواز سنائی نہیں دی مگر دل و دماغ میں اِن حروف کا مطلب چلا گیا۔

خدایا ایسے آدمی پیدا کر، جو ہمارے پُراسرار وجود کا اصلی مطالعہ کریں اور ہمارے ذریعہ تو اُن کو ملجائے اور جب تیرا ان کا وصال ہو تو اس خوشی میں ہماری مراد بھی پوری فرما اور وہ یہ ہے کہ ہم کو نااہل لوگوں کے قلم سے بچا۔ اپنے نافرمانوں کے قبضے میں نہ دے جو ہم کو تیرے وجودِ واحد کے انکار میں استعمال کریں۔

پروردگار! ہم عربی حروف ہوں یا سنسکرت، انگریزی ہوں یا فارسی، چینی ہوں یا جاپانی اس لئے ہیں کہ ہم سے تیری وحدت کے مضامین لکھے جائیں۔ نہ کہ تیری دشمنی اور مخالفت کی تحریریں ہمارے پُرزوں سے تیار ہوں۔

آؤ حرفو! اخبار "توحید" کے قرطاسِ ابدی پر صف آرا ہوں عین کی توپ سے غین پر گولہ باری کریں تاکہ غیر فنا ہو جائے اور وحدت کو مقامِ بقا حاصل ہو۔ آمین ربنا ثم آمین۔

Marfat.com

موسمی دعائیں

(۱) از اخبار "توحید" مورخہ ۴۔ اپریل ۱۹۱۳ء

تیرے نام سے شروع اے رحمت شفقت والے۔ اے آدمیوں اور سب کے پالنے والے، اے سب کے بادشاہ، اے سب کے معبود، پراگندہ دل کے وسوسوں اور شر پر خناس کے پھندوں سے محفوظ رکھ۔ جو گمراہ کرنے کے لئے بہکاتے رہتے ہیں۔

جی بیکل ہے، اس کو کل دے۔ آنکھیں خشک ہیں، ان کو اپنی محبت کے آنسو مرحمت فرما۔ خوش قول بنا۔ خوش عمل بنا۔ خوش وقت بنا۔ دشمن زیر ہوں، حاسد خوار ہوں، بدخواہوں کو رسوائی ہو۔ آزار دہندے زار و نزار ہوں۔ آمین ربنا آمین۔

پاک روزی عنایت کر۔ وہ مشکلیں دور ہوں جو کسب حلال میں حارج ہیں۔ غیب کے خزانے کھول۔ جن کے ہاتھ سے دلوانا چاہتا ہے ان کو ہمارا بنا دے۔ آمین ربنا آمین۔

عزت و آبرو مرحمت کر۔ اپنے سوا کسی کے آگے جھکنے نہ دے۔ مذہب۔ ملک۔ قوم۔ خاندان سب کی لاج رکھ۔ ذلت و رسوائی سے بچا۔ آمین ربنا آمین۔

بے گھروں کو گھر دے۔ بے زروں کو زر دے۔ شادیاں ہوں خانہ آبادیاں ہوں۔ میاں بیویوں میں میل جول ہو۔ امن ہو، سکھ ہو، چین ہو۔ سب گھر بہشت بن جائیں۔ بے اولادوں کو اولاد دے۔ نہ بجھنے والا چراغ دے۔ ماؤں کی گودیں بھریں۔ سنسان ویرانوں میں نیک بچوں کی رونقیں ہوں۔ آمین ربنا آمین۔

بیماروں کو صحت دے۔ بلائیں دور ہوں۔ وبائیں دور ہوں۔ آفت کے حملے واہ ہو۔ غم کے بستر تہہ ہو جائیں۔ درد و الم کافور ہوں۔ آمین ربنا آمین۔

مقدمہ میں کامیابیاں ہوں۔ حق فتح پائے۔ بیگناہوں کو قید سے رہائی ہو۔ ٹل جائے

Marfat.com

اگر ناگہانی آئی ہو۔ آمین ربنا آمین۔

(۴)

از اخبار توحید میرٹھ مورخہ ۱۶ مئی ۱۹۱۳ء

رَبَّنَا رَبَّنَا رَبَّنَا

نافرمان بندوں کے معبود، بیکسوں کے سہارے، لاچاروں کے چارہ کار، پروردگار یہ ہاتھ تیرے آگے پھیلے ہیں۔ یہ کچھ امید سے دراز ہوئے ہیں۔ ان کو تجھ پر ناز ہے کیونکہ تو بندہ نواز ہے۔ ان ہاتھوں کی خطا تھی جو تیرے غیروں کے دروازوں پر دستک دیتے رہے قصور نفس کا تھا جو بہکا کر دربدر کی ٹھوکریں کھلاتا پھرا۔ اب تیرا دروازہ مل گیا ہے۔ آستانہ کی چوکھٹ پر جھکے ہوئے شرمندہ سر کی لاج رکھ لے۔ یہ پیشانی تیرے سرکش بندہ کی ہے جو عاجزی سے خاک پر پڑی ہوئی ہے۔

رحم کرنے والے خطاپوش داتا، ہم تیرے ہیں تو ہمارا ہے۔ تجھ سے نہ کہیں تو کس سے کہیں۔

طاعون نے، قحط نے، مفلسی نے، خود غرضی نے اور ریاکاری نے جھوٹی عزتوں کی حرص وہوس نے تیرے بندوں کو کہیں کا نہ رکھا۔ اپنی رحمت کی کمند میں اسیر کرلے اپنے کرم کے حصار میں بچالے۔

صدقہ اُس گیسوؤں والے حجازی کا جس کی یاد واللیل کے پیارے لفظ میں کی جاتی ہے۔ صدقہ اُس نورانی مکھڑے کا جس کو والضحیٰ کا خطاب عطا ہوا۔ اُس کا طفیل جو بے قرار سمندر کے کنارے سنغرق پہاڑوں کے بیچ میں یثرب کی خوش نصیب زمین پر کملی اوڑھے تیرے نام کی منادی کرنے آیا تھا۔ اُس پتھر کا صدقہ جو تیری محبت میں سات دن کے بھوکے پیاسے پیٹ پر باندھا گیا تھا واسطہ اُن چھالوں کا جو بنتِ رسولؐ کے ہاتھوں میں چکی پیسنے سے پڑے تھے۔ وسیلہ اُس پیاسے حلقوم کا جو کربلا کی تپتی زمین پر ستم کی چھری سے

Marfat.com

کٹ گیا اور اُن تلواروں کا جو تیرا نام بلند کرنے کو اٹھائی گئیں۔ اُن گھوڑوں کا جو تیرے دشمنوں کی صفوں میں ہنہناتے ہوئے، ٹاپیں مارتے ہوئے، کف برساتے ہوئے گھس گئے۔ حرم حجاز کا صدقہ، مدینے کے درودیوار کا صدقہ، سسکیاں بھرنے والے ستون کا صدقہ اور اس پیار کا صدقہ جس سے فراق زدہ لکڑی کو تسلی دی گئی۔ اس ممبر کا صدقہ جہاں تیرا مرتّل تھا، تیرا مُدثّر تھا۔ اُس ہریالے گنبد کا صدقہ جو تیری شمع سراج منیر کا فانوس ہے۔ اُن جالیوں کا صدقہ جن کے اندر کچھ ہے، آہ کچھ ہے۔

فریاد ہے مرے، دُہائی ہے مولے۔ دیدے مولے اپنا بنالے۔ ایک کردے اور نیک کردے۔ آمین۔ اللھم آمین۔ ثم آمین۔ بیماروں کو شفا، بے اولادوں کو اولاد بے روزگاروں کو روزگار، بے قراروں کو قرار۔ امتحان دینے والوں کو کامیابی۔ مقدمہ والوں کو فتحیابی۔ مقروضوں کی سبکدوشی۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْم

(۳)

ازاخبار توحید مورخہ ۵ مئی ۱۹۱۳ء

غریبوں کے دردمند خدا! ہم کو خس کی ٹٹی اور تہ خانہ کی ٹھنڈک درکار نہیں ہے اپنی رحمت کی خنکی مرحمت کر اور گرمی کے موسم کی بلاؤں سے بچا۔ گرم زمین کی حرارت سے ہمارے دماغ کو محفوظ رکھ جس پر ہم تیری دی ہوئی روزی کمانے کے لئے اور بال بچوں کو پالنے کے واسطے دھوپ میں چلتے پھرتے ہیں۔ لُو سے، سرسام سے اور گرمی کے کل آلام سے حفاظت دے۔

علیگڑھ کالج کی پیچیدگیاں دُور ہوں۔ حاجی نواب سیکریٹری دلیری و حقانیت سے کارگذاریاں دکھائے۔

ندوۃ العلماء کا انجام بخیر ہو۔ موجودہ خلفشار آسانی سے رفع ہو جائے۔ علم دین کا بول بالا رہے۔

ہندو مسلمانوں کی تازہ کوشش اتحاد میں برکت ہو۔ دونوں کے دلوں کو خلوص عطا فرما۔ ذات کی رنجشیں اور خود غرضیاں بیچ میں نہ آنے دے۔ لارڈ ہارڈنگ کی خیر ہو۔ ان کو توفیق دے کہ ہندوستان میں عدل و انصاف برقرار رکھیں۔ گوروں کالوں کو برابر سمجھیں۔ اخباری دنیا میں اتفاق دے۔ ہر ایک کو حوادثِ ناگہانی سے بچائے رکھ اور اپنے فضل کا سایہ ڈال تاکہ وہ حقیقی صداقت سے تیرے بندوں کی خدمت کریں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

آنسو بھری آنکھ کی اِلتجا

از اخبار توحید میرٹھ۔ مورخہ ۸۔ جون ۱۹۱۳ء

میرے مالک پچھلی رات ہے۔ سب سوتے ہیں۔ تو جاگتا ہے۔ میں جاگتی ہوں۔ تو سامنے کے آسمان میں ہے۔ یا خود میرے اندر کے مکان میں ہے۔ جہاں ہے میری التجا کو سُن۔ صبح کا نور چمکنے سے پہلے۔ تاروں کی روشنی چھپنے سے پیشتر۔ پرندوں کی نغمہ خوانی سے قبل میری مراد مجھ کو دے۔

یہ سامنے تیرے اجمیری پیارے کا سفید گنبد ہے۔ اس کے کلس پر اپنا دیدار دکھا اس کو طور بنا۔ مجھ کو موسوی بصیرت دے اور تو جلوہ افروز ہو۔ آنسو کا پردہ تیار ہے اور کوئی نہ دیکھنے پائے گا۔ چپکے سے اس کے اندر آجا تاکہ تجھ کو اپنی بپتا سناؤں۔ کلیجہ کے زخم کھول کر دکھاؤں۔

دن بھر ان بیقراروں کی دید میں گزر گیا جو اجمیری وسیلہ گاہ میں تجھکو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ ایک کہتا تھا آہی قرض کے بوجھ نے پیس ڈالا۔ اپنے خواجہ کے صدقے میرے بازو ہلکے کر۔ دوسرے کی فریاد تھی مولےٰ ناگہانی بلا نے گھیر لیا۔ خواجہ کے ہاتھ سے اس

آفت کو دور فرما. تیسرے کی فریاد تھی. گود خالی ہے گھر بے چراغ ہے اولاد کیلئے جی ترستا ہے. ارمان کا باغ اجاڑ ہوا جاتا ہے. خواجہ کے وسیلہ میرا دامن بھر دے. چوتھا مرض جسمانی میں مبتلا تھا. روضۂ خواجہ سے سر ٹکراتا تھا. اس کی بھی تجھ سے آس تھی اور خواجہ کے در کی ڈھارس پاس تھی. پانچواں رزق کا بھوکا تھا. ہاتھ خالی. پیٹ خالی. خواجہ کے دروازہ پر تجھ کو پکارتا تھا اور روٹی کا ٹکڑا مانگتا تھا. چھٹا آتش عشق میں جلتا، آہ شرربار کھینچتا. غلاف خواجہ پر مایوسانہ ہاتھ مارتا تھا. کیونکہ اس کو بھی یقین تھا کہ غلاف کے اندر تیرے پاس جانیکا راستہ ہے اور تیرے پاس جا کر شربت وصل کا جام میسر آ سکتا ہے.

ساتواں کچھ اور کہتا تھا. دیوانہ تھا. مستانہ تھا. کائنات اور ہستی موجودات کے معمہ کو اور اس کے گورکھ دھندے کو نادانی کی انگلیوں سے سلجھا کر الجھا رہا تھا اور خبر نہیں کیا بڑبڑا رہا تھا.

اتنے نظاروں سے تھکی ماندی. اپنی عاجز بندی چشم اشکبار کی التجا پر رحم کر دے اور ان سب کی مرادوں کے ساتھ، جن کا اوپر ذکر آیا ہے، میری درخواست بھی پوری فرما دے.

جھولی والے فقیر کی بھیک

از نظام المشائخ. اگست ۱۹۱۳ء

تو ہی جانتا ہے رمضان میں کونسی رات ہزار راتوں کے برابر ہے. کس کو تو نے خطاب قدر عطا فرمایا ہے مجھکو ہزار. لاکھ یا سو پچاس سے غرض نہیں. میں اس کی بھی پرواہ نہیں کرتا کہ وہ رات خطاب یافتہ ہے یا نہیں. اس کا شوق بھی نہیں کہ نزول ملائکہ اور روحوں کی ملاقات والی شب میسر آئے.

میں تو اے بڑی اونچی چوکھٹ والے بادشاہ تجھکو مانگتا ہوں. تیری آرزو میں سر شام

Marfat.com

سے نہیں سویا۔ چاہے تو رمضان ہیں بل یا شوال میں۔ رمضان کے عشرۂ آخر میں جلوہ افروز ہو یا ذیج کی اور کسی رات میں۔ مجھے اس سے کچھ بحث نہیں۔ میں ہر حال میں راضی برضا ہوں۔

قربان اس دروازے کے جس پر چشم لاہوت کو ہاہوتی نوشتہ نظر آتا ہے۔ دل کہتا ہے میں جبروتی ہوں، روح کہتی ہے میں ملکوتی ہوں۔ ہاتھوں کا اصرار ہے کہ ہم ناسوتی ہیں۔ تو کیوں نہ اس دروازے کے راز کو عالم ناسوت میں فاش کر دیں۔ کب تک اقلیم ہاہوت پردۂ خفا میں رہے گی۔

مگر نہیں میرے باپ۔ میرے امام میرے مرشد اول۔ سیدنا علیؑ سلامک علیہ نے وعدہ کر لیا تھا کہ راز کو مخفی رکھوں گا تو، مجھ کو بھی یہ رمز ظاہر نہ کرنی چاہیئے۔ اچھا تو اے وہ جس کے پاس جانے کے لئے ہاہوت جیسے گم اور گم کرنیوالے دروازے سے گذرنا پڑتا ہے، دور سے میری آواز سن۔ میں ناسوت کے عالم خواہشات میں ہوں۔ وہیں سے پکارتا ہوں۔ پانچ پردوں کی دوری ہے مگر جانتا ہوں کہ تو وہاں بھی سُن لیتا ہے۔ ناسوت میں ہوں۔ اس کے بعد ملکوت ہے۔ پھر جبروت ہے، پھر لاہوت ہے، پھر ہاہوت کا دروازہ ہے۔ مگر تو سب میں ہے۔ اول بھی آخر بھی۔ لاہوت میں بھی۔ ناسوت میں بھی۔ پس تو میری سُن۔ میں اپنے سر کو تیری چوکھٹ پر جھکاتا ہوں۔ میں تیرا بندہ ہوں۔ یہ میرے دونوں ہاتھ کُنڈی کھٹکھٹاتے ہیں۔ تو بخشش وکشایش کے دروازے کو کھول۔ جب تو دیتا ہے، اور دے سکتا ہے تو مجھکو دے۔ جب تیرے ہاں کسی بات کی کمی نہیں تو میرے لئے دیر کیوں ہے دست رحمت بلند کر اور بندے فقیر کی جھولی میں کچھ ڈال دے۔ یہ جھولی والا فقیر گھر گھر نہیں جاتا۔ اسی دروازہ پر آتا ہے، اسی پر آیا ہے، اسی پر آتا رہیگا۔ کسی نے کہا وہ نوالہ دینے کے بہانہ سے اپنے مشتاقوں کو دیدار دکھا دیتا ہے، اور یہ شعر پڑھا ہے

آمد بروں زخانہ چو آواز ما شنید بخشیدنِ نوالہ گدا را، بہانہ ساخت

Marfat.com

تو یہ بھکاری بندہ بھی صدا لگاتا ہے بھیک کا ٹکڑا مانگتا ہے۔ دروازے کے فقیر کو مایوس کر اپنے بھکاری کی بھیک کا خیال رکھ اور میری جھولی میں خیرات ڈال دینے کے لیے دروازہ پر آجا تاکہ میں رمضان کے روزے، تراویح، نوافل شب بیداریاں۔ غرض تمام نیکیاں جو میں نے اور تیرے سب بندوں نے کی ہیں، تجھ پر قربان کر کے پھینک دوں اور پھر تیرے قدموں کو پکڑ لوں۔ اگر وہ نہ ہوں، اور یقیناً نہیں ہیں کیونکہ تو اعضائے جسمانی سے پاک ہے۔ تو اپنے خیال و تصور سے تیرے مثالی پاؤں بناؤں۔ اُن کو چوموں، ان پر سر لگاؤں، آنکھیں ملوں اور جب تک تو میری جھولی نہ بھر دے، اُن قدموں کو نہ چھوڑوں۔

رمضان کے روزہ دار فقیر کی آواز سن جو کہتا ہے۔

میری جھولی بھر دے میرا چنبل بھر دے

تیری جنت کی خیر اس کی فرحت کی خیر شاخِ طوبیٰ کی خیر حورِ حمرا کی خیر
ٹھنڈی نہروں کی خیر اُجلی لہروں کی خیر تیرے جلوے کی خیر دید میلے کی خیر

میری جھولی بھر دے میرا چنبل بھر دے

تیری دوزخ آباد اُس کا برزخ آباد طوق بھاری آباد شعلے ناری آباد
قہر و خفگی آباد طیش و ترشی آباد گُرز و ہنٹر آباد دُکھ کے سنٹر آباد

میری جھولی بھر دے میرا چنبل بھر دے

تیری کرسی رہے اُس کی بستی رہے عرش اعظم رہے حکم محکم رہے
لوحِ مخفی رہے نقش ہستی رہے نورِ نیر رہے شانِ اختر رہے

میری جھولی بھر دے میرا چنبل بھر دے

تیرے دریا بہیں سوچیں ہر جا اٹھیں کوہ و جنگل رہیں جب کے دنگل رہیں
مرنے والے مریں جینے والے جئیں عقل والے رہیں بھولے بھالے رہیں

میری جھولی بھر دے میرا چنبل بھر دے

Marfat.com

سُنا! تیرا فقیر بندہ تیری ہر چیز کی سلامتی چاہتا ہے۔ خیر وشر، نور و ظلمت، قہر و رحم کا یکساں خیر طلب ہے تو تو بھی اس پر مہربان ہو اور اس کی خالی جھولی میں ایک غیبی ٹکڑا ڈال دے۔

فلک پر

از رسالہ صوفی اگست ۱۹۱۳ء

فلک پر جس کو حدِ نظر کہتے ہیں، میں نے ایک مست کی متوالی آنکھ دیکھی۔ ستارے اُس کو نثار ہے تھے مگر وہ بے پروائی، مدہوشی، خود فراموشی کے عالم میں آسمان کے دروازہ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نہیں کہہ سکتا اس آنکھ کو کس ئی تلاش تھی، مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ اس میں خمار وستی تھی یا کچھ اور تھا۔

فلک کی کھڑکی کھلی۔ ایک فرشتہ نے گردن نکالی اور آنکھ سے کہا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی کا حکم نہیں سنا؟ نشہ باز کا یہاں کام نہیں۔ زمین کے میخانہ میں جا اور جام کی لال روح کو دیکھ چشم دیدار طلب نے ملکوتی ہستی کے فرمان کی پرواہ نہ کی اور لڑکھڑاتی ہوئی آسمان کے اندر گھس گئی۔

فرشتے اس بے ادب، گستاخ اور دیوانی آنکھ کے داخلہ سے گھبرا گئے۔ انہوں نے غل مچا دیا اور کہا تو اس مقدس اور پاکیزہ مقام پر بھی فتنہ و فساد برپا کرنے آگئی۔ خدا سے ہم نے کہا تھا آدم کو خلیفہ نہ بنا جو تیری با امن زمین پر خونریزی کریگا مگر اس نے آدم کی علمیت سے ہم کو قائل کر دیا۔ وہ جو کچھ تھا زمین کے لئے تھا۔ اس کی خلافت تجھکو مبارک مگر آسمان ہمارا ہے ہم کو عبادت کرنے دے اپنی آوارگی کو یہاں مت پھیلا۔

Marfat.com

میں فرشتوں کی یورش ہیں ایک غیبی صدا پیدا ہوئی جس نے کہا آنے دو مت روکو یہ میری ہے۔ میں اس کا ہوں۔ اس کے بعد ایک تجلی نمودار ہوئی۔ فرشتے کانپ کر سجدہ میں گر پڑے مگر انہوں نے گرتے گرتے دیکھا وہ تجلی آنکھ کے پردے میں سما گئی۔ آنکھ نے اپنے دونوں غلافوں کو کھینچا اور پردے بند کر لئے۔ پھر دیکھا تو نہ فلک تھا نہ زمین۔ نہ فرشتے۔ نہ کچھ اور۔ آنکھ اور اس کے اندر چھپی ہوئی تجلی کے سوا سب نابود ہو گئے۔ میں نے کہا کیا فنا و بقا اسی کا نام ہے

قدرت میرے ہاتھ میں

از رسالہ نظام المشائخ ستمبر ۱۹۱۳ء

گنہگار، خطاؤں کی پوٹ، ابن آدم، خاک کا پتلا میں ایک بشر ہوں۔ تم بھی جانتے ہو میں بھی جانتا ہوں کہ کس قدر قصور میری ہستی سے نمودار ہوئے۔ تم نے مجھکو آزمایا۔ میں نے تم کو دیکھا ایک بار نہیں ہزار دفعہ۔ محبت کے رشتہ کو کتنی مرتبہ خفقان کی چھری سے کاٹا۔ گو وہ نہ کٹ سکا مگر زخمی ضرور ہوا۔

میرے خیالات، میرے حالات۔ میرا ظاہر، میرا باطن تم سے پوشیدہ نہیں۔ جو عیاں تھا وہ بھی تمکو معلوم، جو مخفی تھا اُس سے بھی تم خبردار۔ برسوں یکجائی رہی آنکھ کی، کان کی۔ ہاتھ کی پاؤں کی۔ زبان اور ہونٹ کی اور خبر نہیں کس کس کی۔

مگر تم نے دیکھ بھال کر قول دیا، جان بوجھکر پیمان وفا باندھا اور کہا میں تیرا ہو کر رہونگا اور اپنا بنا کر رکھوں گا۔ یہہ کہہ کر طاقت اور قدرت کی کنجیاں میرے حوالے کر دیں اپنا سب کچھ سونپ دیا۔

میں نے یہ دیکھ کر گردوپیش کے تعلقات توڑ ڈالے تمہاری زنجیر سے ہاتھ پاؤں اور دل کے گلے کو باندھ لیا تمہاری یاد کو بقائے زندگانی کا ذریعہ ٹھہرایا۔ تمہاری اطاعت و فرماں

Marfat.com

پذیری کے آگے جھک گیا۔ جو کہا وہ کیا جدھر لے گئے اسی سمت چلتا رہا۔

کچھ یاد ہے وہ اندھیری راتیں جن میں میں جاگتا تھا اور تم کو جگاتا تھا اور وہ گرمی کے دن جبکہ میں تمہاری خاطر اپنے جسم کو پسینہ میں ڈبوتا تھا۔ وہ سردی کے سناٹے جن میں تمہاری مدارات کی جاتی تھی۔

تم کہتے تھے آہا یہ کیسے اچھے دن ہیں۔ میں کہتا ہاں میاں۔ یہ زمانہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ تم مجھ پر فدا تھے میں تم پر نثار تھا۔ آسمانی آبادی رشک کرتی تھی۔ بازدوں کے فرشتے نیکی و بدی کے علاوہ ایک تیسری چیز درج رجسٹر کرتے تھے۔

• اسی زمانہ میں جبکہ میں نے سمندر کی یورش سے نجات پائی۔ تم نے کہا آدمی! میں تیری یاد میں بے چین تھا۔ تو کہاں تھا۔ تو آگیا؟

اب کیا ہوا جو تم مجھ سے بیزار ہو۔ اگر خطا داری اور غلط کاری باعث حجاب ہے تو یہ پہلے بھی تھی، کہہ چکا ہوں کہ تم نے آزما لیا تھا اور خصلت و عادت کو پہچان گئے تھے۔

اب تم مجھ سے بچتے ہو۔ بہانہ کر کے ٹالتے ہو۔ ظاہر داری کی رسموں سے بہلاتے ہو اُس کو، جو تمہاری دی ہوئی قوت و عرفان سے غیب کا مشاہدہ کرتا ہے جو باوجود سیہ کاری و عصیاں تابی کے زبردست طاقت ہوش و دانش کی رکھتا ہے۔

آج اگر تم ناقص اور تمہاری شان کو نہ سمجھنے والی ہستی کو اپنا بناتے ہو اور تاج حکمرانی اُس کے سر پر رکھتے ہو، آج اگر تم کو یہ خیال ہے کہ قدیمی رشتہ توڑنے سے منظر کائنات کی نمائش بڑھ جائیگی، تو میں ادب سے کہوں گا کہ انصاف کا خون ہو جائے گا اور لطف رعنائی و کبریائی ہاتھ سے جاتا رہیگا۔

یاد تمہاری ہے اس کو سامنے لا کر سوچو۔ قدرت تو تم مجھ کو دیکھ چکے ہو میں ہجوم اندوہ میں اپنے ہاتھ کی قدرت کو گردش دونگا اور ناقص العقل ہستی کو خاک و خون میں ملا دوں گا۔ پھر نہ کہنا کہ وفاداری و دلداری کے خلاف کیا۔ میرا دل پک گیا ہے میرا جگر دکھ گیا ہے۔

(۲)

مسلمان ہوں جسپر نعمتوں کو پورا کرنے کا وعدہ کر چکے ہو۔ حجازی ہوں جس کی دلجوئی کا قول ہار چکے ہو مست الست ہوں جس کے "بلٰی" کو قرآن میں شائع کر چکے ہو۔ وہ وجود ہوں جس کی پشت پر مُہرِ اسرار کے نشان ہیں۔ منکر اور ناشناس دوزخیوں کو مجھپر مسلط نہ کرو۔ اپنی فرقت کی آگ میں مت جلاؤ، رقابت کی آتش میں نہ ڈالو۔ کوئی قصور ہوا ہو تو چشم کرم کو پھیرلو اس میں کام تمام ہو جائے گا۔ دوسروں کے سامنے ذلیل و رسوا نہ کرو۔ مانتا ہوں کہ یہ سب کچھ نگاہِ قہر کی کارسازیاں ہیں۔ مگر قہر اپنی ذات تک محدود رکھو۔ تمہاری رحیم سرکار ہے۔ پھر ایک نہ ایک دن ملائمت کی توقع ہو سکتی ہے۔ ان خودغرض، بندۂ حرص و ہوس اجسام، ان نمود پسند اور فراموش کار افراد کے پالے نہ ڈالو جنہوں نے تمہارے دلدادہ کو جوتیوں میں ڈال رکھا ہے، اور اجازت دو کہ میں بھی انتقام کے لئے باہر آؤں اور اس خس و خاشاک کو نابود و فنا کر کے دکھاؤں کہ تھی تمہاری دی ہوئی قدرت میرے ہاتھ میں!

کعبے والے خدا کو کیونکر پاؤں؟

از رسالہ خدام کعبہ۔ جون ۱۹۱۴ء

میں اُس کو چاہتا ہوں۔ میرا جی اُسپر آگیا ہے اس کی یاد مجھکو ستاتی ہے۔ دید مانگتا ہوں۔ ایک نظر ڈالنے کی ہوس ہے۔

وہ کہاں ہے کس طرح دستیاب ہوتا ہے۔ ہر چیز کوشش سے مل جاتی ہے۔ ہر حرن نے پڑھتے پڑھتے بی۔اے۔ پاس کر لیا۔ لال خاں کو سرفبازی کا ہنر آگیا۔ انجن دہلی سے دوڑا تھا کلکتہ پہنچ گیا۔ گنگا ہر دوارے سے بہی تھی بہتے بہتے سمندر میں جا گری۔ سورج طلوع

ہوا تو اُس نے ہر سوتے کو جگا دیا۔ چاند غروب ہوا تو تارے چمک گئے

میری بیٹی حسبانو نے پاؤ پارہ قرآن شریف کا صبح سے شام تک یاد کرلیا۔ پکانیوالی نے آٹا گوندھا تھا اب روٹی پکا رہی ہے۔ مگر میں اس کو کعبہ کی کالی چادر میں، مدینہ کے سبز غلاف میں، اجمیر کے صندل میں، دہلی کے نظام الدین میں، نماز کے سجدے میں، بیوہ کی آہ سرد میں، یتیم کی چشم تر میں، مظلوم کی مایوسی میں، ظالم کی خود فراموشی میں ڈھونڈھ چکا۔ ہر در دانہ کی کنڈی بجا چکا۔ آنسو بھی بہائے ہاتھ بھی پھیلائے لیکن اُس کا دامن نصیب نہوا میں نیا گرفتار نہیں ہوں میری اسیری پُرانی ہے۔ مگر اب بھی مجھکو فریاد کرنی نہیں آتی اُسکی نازبرداریاں نہیں جانتا۔ کوئی ہے جو مجھے بتائے کہ میں اسے کیونکر پاؤں۔

اِدہر جھک۔ سُن۔ بتانے والا بتاتا ہے۔ زخم کھول مرہم کا پھایہ خود سامنے آتا ہے۔ تیری تلاش ادھوری تھی، تیری جستجو کا رُخ بے رُخ تھا۔ وہ کعبہ کی چادر میں مُنہ چھپائے موجود تھا۔ وہ مدینہ کے سبز غلاف پر صاف جھلک رہا تھا۔ اس نے تجھکو اجمیری صندل میں خوشبو بن کر اور دہلی کے نظام الدین میں سلطان المشائخ ہو کر پکارا مگر تیرے کان میں سائنس وفلسفہ اور نئے زمانہ کے ہوا و ہوس نے پردے ڈال رکھے تھے۔ تو اُس کی آواز بے صوت کو کیونکر سنتا؟

اور سُن۔ علی مرتضیٰؑ نے کیا آواز دی کہ ارادہ کی شکست میں اُس کی شکل نظر آتی ہے۔ ہربرٹ اسپنسر نے کتاب لکھی اور ہر چیز کا فلسفہ بتا دیا۔ مگر چھپنے کا وقت آیا تو ناگہانی اتفاد سے مسودہ غائب ہوگیا۔ اس وقت اس نے کہا کہ یہ کون تھا جس نے میرے ارادہ اور یقینی کوشش کو جلدی پورا ہونے سے روکدیا۔ کیا یہ امر اتفاقی تھا؟ اگر اتفاقی بات تھی تو مسودہ پریس میں دستیاب ہونے کے بعد پھر کیوں گم ہوگیا۔ کیا اتفاقات کو میرے ساتھ ضد ہے۔ شاید اس میں کوئی بھید ہے۔ ممکن ہے اس کا اختیار کسی مخفی طاقت کے ہاتھ میں ہو۔ وہ کون ہے؟ کیا خلقت اُسی کو خدا کہتی ہے۔

اگر یہ سچ ہے تو میں اُسے کیونکر پاؤں؟ الیلی طوائف کو دیکھ عمر بھی چھوٹی۔ صورت بھی انوکھی

لباس بھی طرحدار، آواز بھی قیامت، گانے کا ڈھنگ بھی بے نظیر مگر اس کو کوئی بھی نہیں پوچھتا مجرے کے لئے کوئی نہیں بلاتا۔ نوبی جان طوائف۔ کالی بھونڈی۔ چالیس برس کی عمر، پھٹی ہوئی آواز، ناچنا آئے نہ گانا لیکن ہر شخص کی زبان پر اس کا چرچا ہے۔ یہ اثر اور بے اثری کس نے پیدا کی؟ کیا اس نے جس کو خدا کہتے ہیں۔ اگر بات یہی ہے تو سمجھ کہ خدا انہی موقعوں پر پہچانا جاتا ہے۔

استاد شبو کا قصہ بھول گیا۔ خون کے مقدمہ میں گرفتار تھے۔ ثبوت پورا تھا۔ قانون پھانسی پر لٹکانے کے لئے آستیں چڑھا چکا تھا۔ ہزاروں روپیہ روز لینے والا وکیل قلم ہاتھ سے رکھ کر چپ چاپ کھڑا تھا۔ استاد کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں کہ جج صاحب نے حکم دیا کہ شبو خاں تم بری کئے جاتے ہو۔

ختم خواجگان چشت پڑھوایا تھا۔ ان کا زیادہ بھروسہ اسی پر تھا۔ گو وکیلوں کے محنتانہ میں دس ہزار خرچ ہوا لیکن ان کا دل یہ کہتا تھا کہ وکیلوں سے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ مشکل تو خدا کو پکارنے سے حل ہوگی۔ کہ وہی اصلی وکیل اور کارساز ہے۔

اگر یہ بات درست ہے تو خدا اسی توکل اور بھروسہ کے اندر تھا اور سب ظاہری اسباب کو شکست دے کر ختم خواجگان میں نمودار ہونے والا وہی تھا۔ تو چاہتا ہے تو اس طرح اس کو تلاش کر۔

چودھری امر سنگھ کا دس لاکھ روپیہ کیوں تباہ ہو رہا تھا قانون کے ہاتھوں دستاویز کی تحریر کی بدولت وہ کس طرح مایوس ہو گئے تھے۔ رشوت خوار حاکم کو ۵۔ ۷۔ ہزار روپیہ دینے کو تیار تھے مگر پنڈت جی نے گیتا کا پاٹھ ایسا کیا۔ کہ اس کے اثر نے ان کی جائداد کو بچا لیا۔ ان کو حیرت تھی کہ غیبی ہاتھ کہاں سے نمودار ہو گیا۔ اس کا تو انہیں گمان بھی نہ تھا لیکن غیب کی آواز پکار پکار کر اور نقارہ بجا بجا کر کہہ رہی تھی۔ کہ جو خدا پر بھروسہ کر لیتا ہے تو وہ اس کا حامی بن جاتا ہے اور ایسی صورتوں سے مشکلیں آسان کرتا ہے

Marfat.com

جس کا اس کو وہم وگمان بھی نہ ہو۔ بس تو بھی انہی کرشموں میں اس کو ڈھونڈا کر۔

ارمان والی اصغری، دولت والی اصغری اولاد کیلئے بھڑک گئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر اور حکیموں کے علاج میں پورا اکیس ہزار روپیہ پانی کی طرح بہا چکی تھی۔ مگر کیا ہاتھ آیا حسرت و مایوسی۔ اور سورۂ مزمل کے وظیفہ میں کیا خرچ ہوا صرف اکیس روپے، اور نتیجہ کیا ہوا چاند سی صورت کا بیٹا۔

ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میرا اس پر ایمان ہے۔ اس گوشۂ تنہائی میں، جہاں زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں، یہی شغل رہتا ہے۔ مگر یہ سب میرے درد کی دوا نہیں ہیں۔ خون کے مقدمہ سے رہائی، دولت کی کمائی اور بچے کی ہوائی نہیں چاہتا۔

میرے دل میں ایک اور درد ہے، میری آنکھ کچھ اور دیکھنا چاہتی ہے۔ میں اس کو پانے کا خواستگار ہوں اور علانیہ دید کا طلبگار ہوں جس کو خدا کہتے ہیں، جو رب کعبہ کہلاتا ہے۔ ابابیلوں سے، ہوائی جہازوں اور کنکروں سے توپ کے گولوں کا کام لیتا ہے۔ جو اپنے نام کے گھر بنواتا ہے۔ ان کی عزت وحرمت کراتا ہے مگر سکونت مکانی سے انکار کرتا ہے۔

وہ جس نے کشمیر کے گلزار پہاڑوں، شملہ کے خنک آبشاروں، سوئزرلینڈ کے سہانے نظاروں کو چھوڑ کر حجاز کے سوکھے جلتے بلتے کوہستان کو اپنی پسندیدگی کا نشیمن بنایا اور پروانہ بھجوایا۔ قرآنی گزٹ میں چھپوایا کہ ساری خدائی میں ایک دفعہ میرے ہر ہمت وطاقت والے شیفتہ پر اس مقام کی دید فرض ہے۔ میں اس کو مانگتا ہوں جو عرب کی کھجوروں کانٹے دار بیریوں، اونٹوں کے کجاوؤں کو آم کی ٹہنیوں، گلاب کی شاخوں اور موٹروں پر ترجیح دیتا ہے۔

جس نے اپنے نام کی قسموں کو رب کعبہ کے لفظ سے نامزد کیا ہے جس کا اشارہ ہے کہ سب فدا کار کعبہ کے رُخ مجھ کو دیکھیں اور سر جھکائیں۔

بس میں اسی کو، بالکل ٹھیک اسی کو پوچھتا ہوں کہ وہ کیونکر ملے؟

Marfat.com

طائر سبز فام کا پیام

از رسالہ اسوہ حسنہ میرٹھ بابت اگست ۱۹۱۲ء

ذکر اسی شب برأت کا ہے جبکہ پہلے آسمان پر وہ جلوہ افروز تھا جس کو خدا کہتے ہیں۔ آسمان پر پہرے لگے ہوئے تھے۔ فرشتے اپنی نوکریوں پر سربسجود اور بابقیام حاضر تھے۔ چاند کی شمع جل رہی تھی۔ تاروں کے فانوس جگمگا رہے تھے۔ زہرہ گنگناتی تھی اور نغمہ بجاتی تھی۔ مشتری وجد کرتا تھا۔ عطارد سال بھر کی تقدیروں کے نوشتے پیش کر رہا تھا۔ مریخ تلوار کھینچے کھڑا تھا۔

تخت رب العالمین ظہور ذات سبحانی کی مستی میں جھوم رہا تھا۔

میں نے دیکھا ایک سبز پرندہ دست قدرت پر بیٹھا ہے اور مخلوق پناہ رب سے کچھ کہہ رہا ہے۔ قدرت کا دوسرا ہاتھ اس کے سر پر شفقت سے پھر رہا ہے اور بار بار اس پرندکی منقار سرخ کو بوسے دیئے جاتے ہیں۔

اتنے میں ایک زمردین قفس لایا گیا جس کے اندر موتیوں کا جھولا پڑا ہوا تھا۔ جانور پھدک کر اس پنجرے کے اندر چلا گیا اور قفس کی تیلیوں میں سے چونچ نکال کر ستانی صدا میں کچھ اور گانے لگا۔ غیب کے ہونٹ پھر بڑھے اور فریادی پرندے کی چونچ کو چوم کر اس کا پنجرہ ایک موجود وجود کے حوالے کر دیا گیا۔

یہ موجود وجود پنجرا ہاتھ میں لئے ہوئے ہوا میں تیرتا، فراٹے بھرتا۔ دم کے دم میں زمین پر آگیا۔

یہیں میں قائد ہمدردی کا گھر تھا جہاں حسن نظامی کا خاکستانی پیکر جلوؤں کی دید کے لئے آنکھیں مانگ رہا تھا۔ آج شب برأت ہے۔ میں بصیرت مانگتا ہوں۔ لال پرڈی

کا پنجرا نہیں مانگتا آپ کی بھی عجیب دین ہے۔ بھوکے کو کپڑا دیتے ہو اور ننگے کو روٹی، اندھے کو کان دیتے ہو اور بہرے کو آنکھیں۔

صاحب نیلی آنکھ کا طلبگار ہوں اور البیلے یار کا خواستگار ہوں۔ یہ جانور کسی بچے کو بخشئے۔ یہ کھلونا کسی نادان کے حوالے فرمائیے۔

چینی کی رکابی میں بنے ہوئے پھولوں کو کیا کروں۔ رنگ روپ بھی ہے۔ دوام قرار بھی ہے۔ مگر نیچرل ادائیں نہیں۔ نہ وہ گل اندامی کی مہک ہے۔ طلائی نقرئی گلدانوں کے گلدستے مجھکو منظور نہیں۔ یا یہ گل پودا درکار ہے جو اپنے بھروسہ اور اپنے پاؤں کا سردار ہے۔

کھجور کے درخت میں آم نہ لگا۔ انگور کی شاخ میں کریلے نہ پھیلا۔

وجود موجود! قرنِ ہست کے فرد!! تو کیا جانے عبد و معبود کے کلمہ کلام کو۔ نابود ہوجا اور اس جوہر ستانی پنجرے کے سامنے سے ہٹ جا۔

وجود موجود نے ایک ہلکی سی جنبش کی اور ایک نامفہوم صدا میں کہا۔

معدوم ہستی نما آدم! آج کی رات لین دین اور جزا و سزا کی رات ہے۔ اجسام و ارواح، الفاظ و معانی۔ بندہ و خدا کی یکجائی کی رات ہے۔ ہر طلب کی حقیقت مجاز کا لباس پہنتی ہے۔ آج دربار سے جس کو جو کچھ ملتا ہے اس کی خواہشوں کا مجسمہ ہے۔ تو جو اکڑتا ہے، الٹی سیدھی باتیں بنا کر اپنا کوئی ممتاز مطالبہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ غور کر کہ یہ جانور اور پنجرا تیری ہی خواہشوں کا برزخ ہے۔ تیرے ہی مطالبات کا ہیولیٰ ہے۔

بصیرت کیوں مانگتا ہے؟ کس کی دید کا طلبگار ہے۔ دیکھ اس قفس میں سب کچھ نمودار ہے۔ یہ طائر سبز فام طریق حیات کا خضر ہے اور عطائے ربانی کا مجازی برزخ ہے جس طرح تیری دعا اس زبان سے تھی جو اصلی حسن نظامی کی نہیں۔ تیری طلب اس دل سے تھی جو حقیقی حسن نظامی سے خارج ہے۔ تیرے ارادے اس دماغ سے تھے جو اس حسن نظامی سے تعلق نہیں رکھتا۔ لہذا اس کا جواب، اس کا عوض، اس کا تبادلہ

Marfat.com

بھی اس صورت میں ہوا جو تیری آنکھوں کو اجنبی اور غیر نظر آتا ہے۔

وجود موجود کی گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ طائر سبز فام نے اپنی شیریں نوا بولی کو اردو زبان میں آمیز کر کے یوں دُرفشانی شروع کی۔

پہلے ثابت کر کہ تو ہی حسنِ نظامی ہے پھر دیکھ کہ میں ٹھیک تیرا ہی مطالبہ ہوں یا کچھ اور؟

ارے نادان یہ سارا جہان وہ نہیں ہے جو تو دیکھتا ہے، وہ نہیں ہے جس کا تصور تیرے ظلماتی ذہن میں آتا ہے۔ یہ شکلیں حیوان و انسان کی، یہ صورتیں شجر و حجر کی دیکھنے میں کچھ اور ہیں اور حقیقت میں کچھ اور ہیں۔ ایسے ہی ان اجسام کی ارواح کے جذبات و خیالات اپنے اندر باہر کی جو شکلیں بناتے ہیں وہ سب بے معنی اور مہمل ہوتی ہیں۔

اول تو مسلمانوں کی قوم کو دیکھ پھر دوسری قوموں پر نظر ڈال۔ بلندی و پستی۔ عروج و زوال۔ شہ زوری و بیچارگی۔ سرکشی و بے بسی کے دو کارخانے دکھائی دیں گے جو ایک دوسرے کے بالکل خلاف کام کر رہے ہیں۔ جب ایک فریق بلند ہوتا ہے تو جان لے کہ اس نے خود اپنی بلندی کو بلند نہیں پایا دوسرے اس کو بلند سمجھتے ہیں۔ اس کو رات دن اپنی پستی کا تصور ہوتا ہے۔ جو عروج میں ہیں ان کو اپنی حالت زوال پر نظر آتی ہے۔ شہ زور کو ہمیشہ اپنی کمزوری کا احساس ہوتا ہے۔ سرکش دوسروں کو مرعوب کر لیتا ہے تو خود اپنے نفس سے بھی مرعوب رہتا ہے اور اپنی کم طاقتی کا صدمہ سہتا ہے۔

لیکن میں جس کے پاس آتا ہوں اس کو چند رموز میں منتہائے مقصود کی اصلیت بتا دیتا ہوں، سمجھا دیتا ہوں بلکہ آنکھوں سے دکھا کر ذہن و دماغ پر نقش کر دیتا ہوں۔

دیکھ میں مدینہ کے گنبد خضرا و برج سبز کا مرغ ناسوتی ہوں۔ یہ ہی مقام سرخ کے آگے گردن جھکا جس کو پروردگار کے لب بے لب نے چوما پس تو میرے ہر بول کی صدا اور میری ہر حرکت پر قدم اٹھائے چلا جا کہ یہی میرا اسوۂ حسنہ ہے اور اسی کے اندر تو اپنے سب مطالبات مشاہدہ کریگا اور پائیگا۔

Marfat.com

تو ہی ہے اے خدا

از اسوۂ حسنہ۔ اگست ۱۹۱۴ء

لوہے کے قلم کو لال نیلے آنسو دینے والے۔ لوہے کی توپ کو آگ کی آہ بخشنے والے تو ہی ہے جس کے نام سے ہر چیز شروع ہوتی ہے جس کے پرتوہ سے بڑھتی پھیلتی ہے اور جس کے اشارہ سے نابود و فنا ہو جاتی ہے۔

ہر صورت دوسری شکل سے نرالی ہے۔ یہ تیرے شجر قدرت کی ایک معمولی سی ڈالی ہے آدمی آدمی سے جدا، جانور جانور سے جدا۔ درخت سے درخت علیحدہ۔ پہاڑ ہے تو ہر ایک اپنی صورت میں سب پہاڑوں سے الگ۔ دریا ہے تو وہ بھی اپنے رنگ اور وضع قطع میں دوسرے دریاؤں سے انوکھا ذرہ ذرہ میں فرق و امتیاز ہے۔ واہ مولیٰ تیرا کیا راز و نیاز ہے۔

بولیاں رنگ برنگ کی بنائی ہیں اور ہر بولی میں اپنی شانیں چھپائی ہیں۔ حرفوں کو عجیب عجیب وضع کے کپڑے پہنائے ہیں کسی سے کہا اوپر سے نیچے آؤ، کسی کو حکم ملا کہ دائیں سے بائیں کو چلو۔ کوئی بائیں سے دائیں کو ہانکا جاتا ہے۔ کسی کا نام عربی رکھا ہے کسی کو چینی کہا ہے کوئی ہندی ہے، کوئی انگریزی ہے غرض عجب ہنگامۂ رنگارنگی اختلاف ہے اور پھر ہر جگہ مطلب ایک صاف صاف ہے۔

آسٹریا کا بوڑھا بادشاہ معلم الملکوت بن کر لاکھوں کروڑوں انسانوں کی خونریزی کے لئے تلوار میان سے کھینچتا ہے تو پہلے تیرا نام لیتا ہے۔ دلی کا ناتوان گدا الفت آمیزی کے واسطے قلم ہاتھ میں لیتا ہے تو پہلے تیرا نام لے کر زبان کھولتا ہے۔

میں کب تک کہوں تو ہی تو ہے۔ تو کب تک سنے تو ہی تو ہے۔ کہنے اور سننے سنانے کا وقت ہو چکا اب فعل اور عمل میں جلوہ افروز ہو۔ اس پرانی لفظی حمد و ثنا کے عوض نئی معنوی

Marfat.com

تعریفیں حاصل کر۔

ذرا تو ہی دیکھ کیسی چوڑی چکلی، صاف ستھری سڑکیں آدمیوں نے بنائی ہیں۔ جگہ جگہ سنگی پہرہ دار کھڑے کر دیئے ہیں جو راستہ چلنے والے کو بتاتے ہیں کہ کتنا راستہ طے کیا اور کتنا باقی ہے۔ کچی سڑکیں ہیں۔ لوہے تک کی سڑکیں بن گئی ہیں۔ مگر بتا کہ تجھ تک کونسی سڑک جاتی ہے۔ تیرا پتہ کس پتھر پر لکھا ہے؟

سمندر کہتے ہیں ان کی موجیں اور کف آلود جوش و خروش میں تیرا نشان ہے۔ کنارے آواز دیتے ہیں ہماری بیچارگی و افتادگی میں تیری شان نہاں ہے۔ آہ سینہ سے نکلتی ہے تو کہتی ہوئی چلی جاتی ہے کہ اس خلجان کے اندر تو ہی ہے۔ واہ زبان پر آتی ہے تو تیرا نعرہ مارتی سی جاتی ہے۔

روئی دُھنیئے کے ہاں پاش پاش ہو جاتی ہے اور تیرا گیت گاتی جاتی ہے۔ لوہا آگ میں تپتا ہتوڑوں سے کٹتا پٹتا ہے مگر تیری سرمدی صوت اور تیری ابدی صوت کو فراموش نہیں کرتا۔

اکیلے خدا یہ تو نے رحمۃ للعلمین کا لقب کس بشر کو دیا ہے؟ وہ سورج ہے یا چاند ہے تارا ہے یا مٹی کا دیا ہے؟ سراج منیر کس کی شان میں فرمایا ہے؟ اس روشن چراغ تک ذرا ہم کو بھی پہنچا دے۔ ہم بھی اپنے بجھتے ہوئے چراغوں کو اس سے روشن کر لیں۔ وہ چاند۔ سورج تارا نہیں مٹی کا چراغ ہے مگر دوسروں میں اپنی روشنی ڈال سکتا ہے۔ اس لئے ان سب سے اعلیٰ و برتر ہے۔ ہم اس کو چاہتے ہیں جس کی زلفیں اندھیری رات کی طرح کالی تھیں، جس کا چہرہ صبح کی نورانی روشنی کے مثل منور تھا، وہ جو خلق عظیم کا درجہ لیکر اس دنیا میں آیا تھا جس نے عیش و راحت تیرے نام پر لٹایا تھا۔ وہ جو میدانوں میں تلوار کھینچکر نعرۂ حق بلند کرتا تھا۔ برچھیوں کو ہما دوں کے سینے پر ما تا تھا۔ تیروں کو جھٹکے بکا تے دل و جگر میں اُتار دیتا تھا۔ وہ جو خود بوریئے پر بیٹھتا تھا اور دوسروں کو شاہانہ تخت دیتا تھا۔ وہ جو کمبل کا کرتہ پہنتا تھا اور اپنے غلاموں کو

سدطانی قبائیں بخشتا تھا، جو کا آٹا کھاتا تھا اور ہمارے لئے پلاؤ قورمے پکوا کر رکھتا جاتا تھا۔ وہ جو راتوں کو جاگا اور ہمارے لئے پاؤں پھیلا کر سونے کا سامان کر گیا۔ وہ جو تیرے آگے آنسو بہاتا تھا کہ میری امت کو ہنستا رکھ۔ وہ جو بیماروں کی مزاج پرسی کو خود ان کے گھر تک جاتا تھا۔ گھر والوں کے ساتھ ہو کر ان کا ہاتھ بٹاتا اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتا یہاں تک کہ اپنی جوتی خود ہی گانٹھ لیتا تھا اپنے کپڑوں میں آپ ہی پیوند لگا لیتا تھا۔ اس کو تو نے ہمارا آقا۔ مولیٰ بنایا ہے۔ اس واسطے ہمارا جی اس پر آیا ہے۔ ہم کو اجازت دے کہ اس کا ذکر ادب سے کریں اور پھر کہیں کہ وہ جو لڑکوں تک کو پہلے خود سلام کرتے تھے۔ غریبوں۔ مسکینوں کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے تھے۔ مفلس بیمار کو حقیر نہ جانتے تھے۔ لاچار بیوہ عورتوں کے سودے بازار سے خرید کر اور اپنے کندھے پر رکھ کر لاتے تھے جنہوں نے کام کے وقت کبھی اس کی پرواہ نہ کی کہ دور جانے کے لئے سواری موجود ہے یا نہیں اکثر پیدل، پا برہنہ، سر برہنہ چلے جاتے تھے۔ دینی لڑائی کے سوا کسی پر وار کرنے کی پہل نہ کرتے تھے اپنے اصحاب میں اس طرح مل جل کر بیٹھتے تھے کہ اجنبی کو یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا تھا کہ حضور کونسے ہیں۔ وہ جو لیٹنے کے لئے بچھونے کا انتظار نہ کرتے تھے، اگر بچھونا نہ ہوتا تو بے تکلف زمین پر لیٹ رہتے تھے۔

تو ہی اے خدا اس حبیب کا راستہ بتا۔ اس کا اسوۂ حسنہ دکھا تاکہ ہم سب تیری کھینچی ہوئی لکیر کے فقیر بنیں اور ہماری رفتار تیرے اور تیرے بھیجے ہوئے رسول کی رفتار گفتار و کردار پر ہو۔

دنیا جہان کے حالات معلوم کریں تو اسی رسول کی پاک زندگی کے اسوۂ حسنہ کو دیکھ کر معلوم کریں۔ کیونکہ ان کی سیرت میں دین و دنیا کی معلومات کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ بس وہی سیرت ہماری بحالت کا ذریعہ بنے۔ سیاست ہو تو وہ جو تیرے رسول نے بتائی معاشرت ہو تو وہ جو تیرے فرستادہ نے بتائی۔ لکھنا پڑھنا، بولنا چالنا۔ کھانا۔ پینا۔ رہنا۔ سہنا۔ لڑنا جھگڑنا۔ غرض ہر حصۂ زندگانی میں حصہ لیں مگر تیری اور تیرے رسول کی پیروی سے ایک قدم باہر نہ دھریں۔

Marfat.com

بندوں کی دُعا

ازاخبار خطیب دہلی ۳۰ جنوری ۱۹۱۵ء

کاغذ کے ناتوان ہاتھوں کو توانائی دے۔ بیجان حرفوں میں اثر زندگانی بخش۔ ان مٹ تقدیروں کو نہ بدل مگر صبر کی تدبیریں یا تسلیم و رضا کی لکیریں۔ دل کی تسلی کے لئے بھیج۔ تو نے مجان کے جھلسے ہوئے بے رونق پہاڑوں میں وہ پھول نرگس کے پیدا کئے اور ان پھولوں نے کائنات آخر کی بیمار آنکھوں کو صحت بخشی۔ ہم اپنی شرمیلی جھکی ہوئی نظروں کو تیرے سامنے شرنج بناتے ہیں۔ ہمارے دین و دنیا کے پہاڑوں میں عیش و راحت کے باغ لگا دے

اے خیالوں میں رہنے بسنے والے مگر دانش و عرفان کی تمناؤں کو بیتاب رکھنے والے اے ہر ذرہ میں موجود مگر آفتاب تحقیق کی نظروں سے مخفی اے ٹوٹے ہوتے دل کو نشیمن بنانے والے ہمارے پاش پاش دلوں کو بھی نوازنے آجا۔ اس فطرت کی سیتوں سے جی ڈرتا ہے۔ اپنی بستی میں پناہ دیدے۔

تجھ کو داتا کہیں۔ تجھ کو مولیٰ کہیں۔ تجھ کو داور کہیں۔ تجھ کو کیا کچھ کہیں۔ تو ہر جے اور ہر سے آزاد۔ تو ہندو کا برہم اور رام اور مسلمان کا اللہ عیسائی کا گاڈ سکھ کا اکال پرکھ۔ تو امیر اور غریب کو ایک نگاہ سے دیکھنے والا ہے۔ ہماری دعا اور پرالتماس اور قبول کر۔

طائر سیاہ فام

از رسالہ القمر دہلی۔ جون ۱۹۱۵ء

کل رجب ۱۳۳۳ھ کی ۲۸ تھی معراج کی رات سونے گزر گئی اس لئے کل روا حصہ میں آیا رین بسیرے کے وسیع صحن میں بہت سے انسان پچھلی رات کی خنک ہوا کا لطف

Marfat.com

-اٹھا رہے تھے اور بے خبر سوتے تھے۔ میری آنکھیں ان کی بے فکری اور بے خبری پر رشک کرتی تھیں اور دل کی بھٹی آنسو گرم کر کے بھیج رہی تھی۔

میں نے تکیہ کے نیچے سے بجلی کا لیمپ نکالا۔ اس کا کھٹکا دبایا۔ روشنی تڑپ کر باہر نکل آئی۔ غسل خانہ میں لیجا کر اس کو رکھ دیا۔ وضو شروع کیا۔ جب زبان نے کہا۔ میرے رب میرے چہرہ کو اپنے نور سے اُجلا کر دے۔ تو میرا خیال لرز گیا۔ میں نے یہ کیا مانگا۔ کیا میرا چہرہ منور ہونے کے قابل ہے۔ برقی لیمپ نے اشارہ کیا کہ کیوں خلجان میں پڑتا ہے نور بھی کوئی چیز ہے۔ بارہ آنے کو نور کی بیٹری آتی ہے خواہ مخواہ خدا کا احسان اٹھاتا ہے۔

باہر آیا۔ تاروں نے اذان دی۔ افق نے حیران ہو کر کہا نماز کا وقت نہیں ہوا یہ کیسی اذان؟ تخت کا مصلےٰ آہستہ سے بولا۔ وقت تہجد ہے مگر کل کی رات کیسی غفلت میں کٹ گئی۔ خیر آج بھی کچھ نہیں گیا۔ چاہتا تھا کہ نیت باندھوں اور دل کی گرہ کھولوں کہ پھر کلیجہ میں ایک تیر لگا۔ کوئی چیز سینہ کے اندر جوش مارتی منہ کی جانب اُبلتی ہوئی آئی۔ میں نے آہ آہ کہہ کر اس بخار کو باہر پھینک دیا۔ اور کہا ٹٹولے اُو پیارے ٹٹولے یہ میرے گھٹ کے اندر کیا چیز ہے۔ کمبخت یہ کیا بلا ہے میری ساری رات برباد کر دی

جب میرے آہ و فغاں نے کچھ اثر نہ کیا۔ سارے جسم پر اس نامعلوم زہر نے قبضہ کر لیا میں بیقرار ہو گیا۔ میں نے نماز کے قانونی طریقے کو ترک کر دیا اور بغیر قیام و رکوع سجدہ کے آگے سر جھکا دیا۔

پیشانی کے نیچے خاک نہ تھی تخت کی لکڑی تھی۔ اس پر سر دجانماز تھی۔ میرا ماتھا اُس پر رکھا تھا اور اُس کی بڑدسن آنکھیں بے اختیار رو رہی تھیں۔

میں نے سبحان ربی الاعلیٰ نہیں کہا۔ میں نے ہندی میں اُسکی تعریف کی۔ اُس کی خوشامد کی۔ اس کی بڑائی کی۔ جوں جوں میں اس کو جگ داتا جگ داتا پکارتا تھا دل ودل دل کی آگ بھڑکتی تھی۔ کیا میرا خدا ہندی زبان میری زبان سے سُن رہا ہوگا؟

Marfat.com

اس نے تو وعدہ کیا ہے بندہ میری طرف ایک بالشت آتا ہے تو میں اُسکی جانب ایک ہاتھ بڑھتا ہوں۔ آج وہ کہاں چلا گیا مجھے کیوں رُلاتا ہے سامنے کیوں نہیں آتا ہے۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا شعلۂ غم کو زیادہ بھڑکا گیا میں نے سجدے کو چھوڑ دیا۔ گردن کو اوپر اٹھا لیا چشم تر کو آسمان سے لڑایا جب بھی جی کو قرار نہ آیا۔ رین بسیرے کا دروازہ کھولا سب سونے والوں پر حسرت کی نگاہ ڈالی۔ قبرستان میں آیا۔ حور بانو کی والدہ خاکی چھپر کٹ میں غریب گیاہِ سبز کا چادرہ اوڑھے اپنے لاڈلے بچے حسن بصری کو آغوش میں لئے سوتی تھیں۔

حدیث یاد آئی۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ تم قبروں کے مُردوں پر رشک کروگے۔ کاش قبروں میں ہوتے اور زندگی کی اُلجھن ہم کو نہ ستاتی۔ سچ فرمایا میرے رسولؐ نے۔ دیکھو میری بیوی، جو دس برس شریک بزم حیات رہ کر جنت کو سدھاریں، کیسی خوش نصیب ہیں اور آرام سے پڑی تی ہیں اور آگے بڑھا۔ اب جنگل سامنے تھا۔ بڑے بڑے گنبد چپ چاپ کھڑے تھے۔ درختوں پر اندھیرے نے سایہ ڈال رکھا تھا۔ دن کو جو سایہ مجھے نیچے نظر آتا تھا اس وقت ان کے اوپر سوار تھا۔

سگنل کی لال آنکھ

جی۔ آئی۔ پی۔ ریلوے کی لائن آئی۔ سگنل نے اپنی لال آنکھ دکھائی۔ اس کا پھیلا ہوا ہاتھ دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ جو اپنا ہاتھ دوسروں کے آگے پھیلاتا ہے۔ اس کی زندگی کا راستہ رُک جاتا ہے جیسے اس سگنل کے پھیلے ہوئے ہاتھ کے سبب ریل اس سڑک پر نہیں آسکتی۔

میں اس سے کیوں مانگوں۔ کیا وہ حاضر و غائب کا عارف نہیں ہے۔ اتنے میں سگنل نے ہاتھ جھکایا۔ لال آنکھ بند کی۔ سبز کھولی۔ کیا کوئی ریل آئی۔ آگے بڑھا سلطان سکندر لودھی کا مقبرہ استقبال کو کھڑا تھا۔ ہاتھ ملایا۔ ملاقات ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک گیدڑ برابر سے نکل کر بھاگا۔ اس کے فرار نے جسم میں گدگدی کی۔ بے اختیار ہنسی آئی۔ برقی لیمپ کی شعاع کو گیدڑ پر دوڑایا۔

Marfat.com

غریب وحشی زیادہ گھبرایا اور کہیں بھاگ کر غائب ہو گیا۔

اب خدا خدا کر کے جی ٹھہرا اور اس ٹھنڈ میں ذرا چین آیا۔ چار رکعت نماز ادا کی۔ اسم بلد ذکر جہر ادا کیا اور ہر ہو میں ایک مزا پایا۔

صبح صادق قریب تھی چاہتا تھا کہ گھر چلوں کہ پیل کے بے برگ درخت پر ایک شاما نے نغمہ حمد شروع کیا۔ بولی :۔

سانچے پیر

کہیں دور ایک دیوار پر اس کا جوڑا بیٹھا تھا اس نے جواب دیا۔ سب پیر سانچے سانچے۔ بہت دیر تک ان کے سوال و جواب ہوتے رہے۔ کیوں ری کالی کلوٹی چڑیا۔ تو ہمارے پیروں کا مزاج بگاڑتی ہے۔ سانچا نام اللہ کا ہے۔ باقی سارا جہان جھوٹا ہے۔ شاما بولی :۔

کیسے پیر۔ کیجے پیر کیسے

جوڑے نے جواب دیا :۔

سانچے رب۔ سانچے سانچے

ہاں اب ٹھیک کہا۔ آخر تو کالے رنگ کی چڑیا ہے سراپا ظلمت ہے مگر بات نورانی کہتی ہے۔ جتنے کالے بدشکل ہوتے ہیں ایسی ہی سفید بات کہا کرتے ہیں۔

طائر سیاہ فام کے ظاہری الفاظ میں تو یہ تھا جو سنایا۔ مگر اس طائری اسپرٹ کا سمجھنا آسان نہیں جس نے اس کو سمجھ لیا وہ رات کا سونا بھول جاتا ہے۔ اس کو سننے میں مزا آتا ہے اور رونا ہی اس کی دارین کی تسلی بن جاتا ہے۔ جس کی ہر آدم زاد کو ضرورت ہے۔

پہلی منزل ختم ہوئی اب دیکھنا دوسری منزل کی کیا شان ہے؟

Marfat.com

۲ دوسری منزل

ذوق و شوق، عشق و محبت، سوز و گداز، ارادت و عقیدت

حسن کا فرمان

از رسالہ مخزن ۱۹۰۸ء

دھڑ دلے، دودلے نفسانی عاشقوں کے نام:

جاں نثار قدیم زلف کے مشرقی صوبے دار **ذوق** دہلوی کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ظل الٰہی کا حسب ذیل فرمان اُن عاشقوں کو پہنچا دے جن کی محبت ماجناب کی شان عالم آرائی میں بٹہ لگاتی ہے۔

ان کو بتایا جائے کہ ماجناب عرصۂ دراز سے ایک ایسے ملک میں رہتے تھے جہاں ہمکو سوائے ہمارے کوئی نہ جانتا تھا۔ اس ملک میں ماجناب کی جیسی شان وحیرت تھی اس کا اظہار ہماری قدرت میں داخل ہے مگر تم کو اتنی طاقت نہیں دی گئی کہ کشف راز کی تاب لاسکو۔ ایک ذرۂ اگلی شان کا ظاہر ہوجائے تو نمائشی ہستی کا نشان باقی نہ رہے۔

ایک دن ماجناب نے اپنی آن بان کا تماشا دیکھنا چاہا خیال آنا تھا کہ خودبخود تماشاگاہ کی صورت پیدا ہوگئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ پہاڑ ہیں، دریا ہیں، جنگل ہیں، گلستاں ہیں اور ایک انسانی صورت ان کے بیچ میں بےحس وحرکت کھڑی ہے۔ یہ عالم ماجناب کو پسند آیا۔ شان زیبائی

کے تھوڑے تھوڑے جلوے چاروں طرف بکھیر دیئے۔ تصویر کی خاموشی ایسی بھائی کہ اس کو اپنے لئے اختیار کر لیا اور اس کی آنکھوں میں تخت سلطانی بچھا دیا گیا۔

یہیں سے ہماری حکومت کا زمانہ شروع ہوا اور ماجناب کی کبریائی کونسل میں ابرو، رخسار، لب، دندان، ذقن، گردن داخل کیے گئے۔ گیسو کی سرحد قائم ہوئی۔ آواز اور زبان کے وزیر احکام چلانے لگے۔ ماجناب کی رعایا ویسی ہی وفادار ہوئی جیسا ظل الٰہی کا پہلے منشا تھا۔ کونسل کے بعض ممبر، یا یوں خیال کرنا چاہیئے کہ بعض صنوبید ار نادانی و شرارت سے کسی پر ظلم کرتے، جفاکاری سے پیش آتے تو اطاعت شعار رعیت بڑی خوشی سے انکی ستم آرائی برداشت کرتی۔ بارہا باڈی گارڈ کے سپاہی پلکیں نوکدار برچھیوں سے حضوری کے لوگوں کو ستاتے مگر کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کسی نے اُف کی ہو۔ ماجناب کے کان انکی فریاد سے ہمیشہ نا آشنا رہے۔ اگرچہ ہم نے کبھی نہیں چاہا کہ بے زبان رعیت پر ظلم توڑے جائیں مگر کیا کریں بعض دفعہ شوخی کے نشہ میں ایسا ہو جاتا تھا اور بارگاہ احدیت مآب کو اس سے افسوس ہوتا تھا۔ بعض دفعہ رعیت کے بعض افراد نافرمان ہو جاتے تھے تو ماجناب ایک حسین ایلچی ان کی ہدایت کے لئے مقرر فرماتے تھے۔ چنانچہ یوسف، موسیٰ، رام، کرشن، محمدؐ جیسے خوبصورت لوگ وقتاً فوقتاً ہدایت کے لئے مقرر کیے گئے۔

اب آجکل بھی ہم دیکھتے ہیں کہ رعایا میں ابتری پھیل گئی ہے۔ دو دِلے، تھڑدِلے اور نفس پرست لوگ ہماری حضوری کی طلبگاری کرنے لگے ہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ ایک فرمان کے ذریعہ انکو ہدایت کی جائیگی اگر انہوں نے اس فرمان کو قبول کیا تو نزول رحمت کے مستحق ہوں گے ورنہ قہر کی بجلیاں گرینگی اور ان کی ہستی کو نیست و نابود کر دیں گی۔

ماجناب احدیت کے خیال مقدس میں تھڑدلا شخص جو ذرا سی بدنامی و ملامت کے ڈر سے گھبرا جائے۔ یا ایسا دُودِلا کہ کا ہے جنیں اور گا ہے چناں کی حالت میں گرفتار رہو یا نفس پرستی اور جذبہ شہوانی کی تکمیل کی غرض سے ہماری رعیت بننا چاہتا ہو، ہرگز اس قابل

Marfat.com

نہیں کہ ماجناب کی نورانی حکومت کو اپنی سیاہ کاریوں سے بدنام کرنے کے لئے باقی رکھا جائے۔

اگر تم لوگ ماجناب کی دل آرا حکومت میں باقی رہنا چاہتے ہو تو بدنامی کے فکر و تردّد کو پس پشت ڈال دو یکسوئی اور خلوص قلب سے اپنی پیشانیاں ہمارے سامنے جھکا دو۔ نیت اور ارادے کو نفسانی خواہشوں سے پاک رکھو۔ ہم تم میں وہ صفت دیکھنا چاہتے ہیں جو ہماری قدسی صفات سلطنت کی رعایا کے واسطے زیبا ہو

نفسانی خواہش کی تکمیل ایک فوری لذت ہے جو دوسرے ملکوں میں بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ ہماری اقلیم کی حیات ہے وہ دیرپا اور ابدی۔ اگر نفسانیت درمیان میں نہ لائی جائے تو عارضی سرور کے بدلے ابدی لطف کی کیفیت عطا کی جائے گی۔ پس تمام طلبگاروں کو آگاہی دی جائے کہ وہ اس فرمان کی تعمیل کے لئے تیار ہو جائیں۔

منظرِ فراق

یعنی

وفات الرسولؐ

کا سین

از نظام المشائخ۔ مارچ ۱۹۱۲ء

آسمان چپ، زمین دل تھامے ہوئے۔ ہوا چلتے چلتے رکتی ہے اور خانۂ رسولؐ میں غم کی گھڑی کو جھانکتی ہے۔ پرندوں نے چہچہانا چھوڑ دیا۔ کبوتر معصوم عائشہؓ کی بے کسی کو بھولپن سے دیکھ رہا ہے۔

آفتاب رسالت پر موت کا ابر چھا رہا ہے۔ نورانی کرنیں پردے میں چھپ رہی ہیں۔ امت کا سرتاج دنیا سے سدھارتا ہے۔ باپ کی لاڈلی فاطمہؓ کا سہارا بیٹی کے سر سے

Marfat.com

ہاتھ اٹھاتا ہے۔ عائشہؓ کا دل دھڑکتا ہے کہ سہاگ کی منزل آخر ہوئی۔ حجرۂ رسولؐ کی رونق رخصت ہو رہی ہے۔ یاس و ہراس در و دیوار سے لگے کھڑے ہیں۔

یارسول اللہ! ابھی نہ جایئے حسنؓ حسینؓ سے جدا نہ ہو جیے۔ ذرا دیکھیے یہ گیسو دراز سہمے جاتے ہیں۔ اب ان کو کون دوش پر بٹھائے گا۔ کس سے ان کے نازک دلوں کی لداری ہوگی۔ انہیں کس پر چھوڑا۔ تلواریں ان کو گھور رہی ہیں اور ڈرا رہی ہیں۔ تیر ان کے بے کینہ سینوں سے اور خنجر ان کی صراحی دار گردنوں سے کچھ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر رہے ہیں۔

علیؓ کی کمر ٹوٹی جاتی ہے۔ عقدہ کشا کی زندگی میں حسرت و رنج و محن کی گرہ لگا رہی ہے۔ سلجھے ہوئے امام الجھ رہے ہیں۔ صدیقؓ کو بڑھاپے میں یارِ غار کا داغ رلائے دیتا ہے

بچی کی سچی بی بی عائشہ رضہ

کی افسردگی دیکھی نہیں جاتی۔ ست پتا کی دلائی۔ ست بچی کی من موہنی۔ برن کائنات کے سب سے بڑے شام سندر کی منظورِ نظر، صدیق رضہ کی گود میں پلنے والی، آغوشِ نبوت کے تخت کی ملکہ کیسی اُداس، مایوس۔ نڈھال سر رسولؐ کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ آج اس کی راجدھانی ہاتھوں سے چھن رہی ہے۔ آج اس کا دھنی دُنیا سے منہ موڑ رہا ہے۔

بچی کی سچی عائشہ! ہم تیرے ست کے قائل ہیں۔ تو بچی صدیقہ ہے۔ ایک دفعہ آگ میں جل کر مر جانا آسان ہے مگر سارے عمر تپ کے کام میں لگا رہنا اور اس کو انجام پر پہنچانا تیرا ہی حصہ تھا۔ رسولؐ کے خانگی حالات جن پر امت کے ہزاروں کاموں کا انحصار تھا۔ تو نے ہی بتائے اور پرشوتم کے پیارے شوہر کے نام پر اپنی زندگی کا عیش و آرام نثار کر کے جلا ڈالا۔

عقل والے تدبیروں کے بادشاہ عمر رضہ کو دیکھنا۔ سائیں کے فراق نے دیوانہ کر دیا ہے۔ ہوش و حواس قابو سے نکلے جاتے ہیں۔ عثمانؓ فدا کار سکوت میں ہیں۔ غم نے گم کر دیا ہے۔

سب سے زیادہ جس دل پر قیامت آئی وہ فاطمہ زہرا رضہ کے سینے میں پھڑک رہا ہے۔

Marfat.com

یہ ان کے باپ ہیں جو داغ جدائی دیکر جاتے ہیں. زہرا بی بی. رسولؐ بابا کو نظر بے بسی سے دیکھتی ہیں اور دل ہی دل میں کہتی ہیں. الٰہی! اب کیا ہوگا. کیا بابا جان مرجائیں گے. کیا میری تشفی دینے والے پردیس کو چلے. اچھی بابا. فاطمہ رضؓ کو بھی لے چلو. لڑائیوں میں اپنی لونڈی کو نہ بھو. لے اکثر ساتھ رکھا میدان موت میں بھی یہ کنیز ساتھ رہے گی. ہائے میرے فقر و فاقہ کے وقت اب کون دلاسا دینے آئے گا. بابا میں تمہاری بیٹی ہوں. بابا میں تمہاری فاطمہ ہوں، میں ضد کرتی ہوں کہ آپ نہ جائیے. میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ مجھ کو یتیم نہ بنایئے اے خدا! تو ہی سن. صدقہ اس کششِ الفت کا جو اپنے حبیبؐ کو دنیا سے کھینچ رہی ہے صدقہ اس قاب قوسین سے آگے والے مقام کا طفیل اس آنکھ کا جو اس بندہ کو خصوصیت سے پیار کرتی ہے، واسطہ اس مشیت لامتناہی کا جو سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کر سکتی ہے، میرا باپ مجھ سے جدا نہ ہو، میرا سید آنکھ بند نہ کرے. پروردگار! میں تیرے رسولؐ کی لختِ جگر ہوں. خداوندا! میں اس آنکھ کی ٹھنڈک ہوں جس کو تو نے دنیا کی ٹھنڈک کے لیئے مقرر کیا تھا الٰہی! میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے

سرکار استغراق میں تھے. رختِ سفر کا مشاہدہ فرما رہے تھے. عالم خاک سے آنکھ بند تھی. عالم پاک کی جانب کھلی ہوئی تھی یکایک اہل بیت کی بیت بیاں. امت کی یتیمی کو ساتھ لیکر قدموں کو چمٹ گئیں. آنکھوں کو تلووں سے ملا اور حضور کو متوجہ کر لیا. چشم گرامی وا ہوئی. بیقراروں کی غمناک صورتوں پر نگاہ ڈالی اور رفیق اعلیٰ کے ان سب کو سپرد کیا گیا. رفیق اعلیٰ کو پکارا رفیق اعلیٰ نے لبیک کہی اور جھک کر اپنے کارگزار مقبول بندے کو اٹھا لیا قریب کے سب مقام ادب سے بُعد ہو گئے. عزرائیل کا اسم صفت. اسم ذات. نے الگ کر دیا. رفیق اعلیٰ نے رفیق اعلیٰ کو خود منزل رفق میں لیجا کر پہنچا دیا.

جو کبھی نہیں ہنسا. جو کبھی نہیں ہنسے گا، جو ہنسی سے پاک ہے. اس نے مسکرا کر رسولؐ کے ذِلت زدہ اصحاب کو اہل بیت کو غم والم کی تصویروں کو دیکھنا اور زبان بے زبانی سے

ارشاد فرمایا. کیا یہ میرا ہمیشہ تمہارے پاس رہتا. کیا تمہارا دل مجھ سے زیادہ اس کا مشتاق تھا؟ تم کو اس کی خاطر نوازوں گا اور نواز رہا ہوں. تم کو اس کی خاطر اُمتوں کا سرتاج بنایا اور بناؤں گا. عائشہ رض ہراساں نہ ہو میں تیرا محافظ ہوں. فاطمہؓ دلگیر نہ ہو. میں تجھکو دلاسا دونگا اور جلدی اس سے ملاؤں گا. میرے بندے کے فدائیو! بے چین نہ ہو، قیامت تک میں تم سے ماتم پرسی کروں گا اور دل زخم خوردہ پر مرہم پاشی ہوتی رہے گی۔

لو صاحبو! آقا رخصت ہوئے. فاطمہ رض کی آنکھیں اُبل پڑیں. عائشہ رض کے حجرے میں آفتاب چھپ گیا. جبرئیل جاتے ہیں. اب نہ آئیں گے. دیکھو یہ تمہارے کملی والے شاہ لیٹے ہیں. امتی امتی پکارنے والے اور آخر وقت تک اُمت کے خیال میں سرشار متوالے کو جی بھر کے دیکھ لو. اب یہ شکل بھی مٹی میں منہ چھپانے والی ہے۔

منظر خیالی تیرہ سو تیس برس کے بعد دل کو نہ ستا. کون مرا، کون گیا؟ کس کی وفات؟ وہ زندہ ہیں. زندہ خدا کا زندہ رسول. نہ مرنے نہ مرنے دے. آؤ. اس کے دین کی آس میں سانس کو قربانی چڑھائیں اور اس تک پہنچیں جس کی آرزو ان مناظر تخیلات میں لیکر آئی ہے. مرجاؤ اور اس کو پاؤ

اچھی بابل کیا لاڈلی بیٹی کو بھول گئے؟

اُمّت کی سسرال سے مدنی میکہ کو ایک خط

از توحید ۔ ۱۶، مئی ۱۹۱۳ء

بابل بدھوا، چودہویں سال میں بیوہ ہو جانے والی دکھیا، امتا کے چاہنے والے پتا باوا جان. امت تم پر قربان. آپ کی بدنصیب رانڈ امتا پردیس میں بیکس بے بس پڑی ہے کوئی پرسان حال نہیں. کیا آپ اپنی لاڈلی کو بھول گئے۔

Marfat.com

ہائے بابل وہ دن یاد آتا ہے جب میں آپ کی دل کی انگنائی میں کھیلتی پھرتی تھی اور آپ مجھ کو میٹھی میٹھی محبت بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ میں بگاڑتی تھی آپ سنوارتے تھے میں روتی تھی آپ رومال سے آنسو پونچھتے تھے۔ میں ضد کرتی تھی آپ نازبرداری کرتے تھے میری فکر میں آپ نے رات کو سونا چھوڑ دیا تھا۔ سات سات دن کے فاقے جس کے لئے ہوتے تھے وہ یہی پھوٹی قسمت کی کنیز ہے۔

وہ زمانہ بھی یاد ہے جب آپ کی لاڈلی بیٹی کے بیاہ کی تیاریاں تھیں قیصر و کسریٰ کی بادشاہتوں کا سامان میرے جہیز کے لئے نکالا جا رہا تھا اور ہاتھوں کو ایسی مہندی لگائی گئی تھی جس کے چاؤ نے پردیس میں جا کر بالم سیاں کو بے اختیار کر دیا اور وہ ان ہاتھوں پر قربان ہو ہو گئے۔

اور اس گھڑی کو کیونکر بھولوں جبکہ میکہ سے ڈولا چلا ہے اور میں نے بچپن کے گھر بار کو چھوڑ کر پردیس کی راہ لی ہے۔ اپنے بیگانے روتے تھے۔ بابا جان آپ بھی غمگین افسردہ تھے۔ مجھکو کالے کالے پہاڑ۔ اونچی اونچی کھجوریں جنگل کی بیریاں اور ان پر کبوتروں کا غٹرغوں غٹرغوں کرنا اور مدینہ کی سہیلیوں کی جدائی۔ سب پر طرہ آپ جیسے پریمی پتا کی چشم محبت کا فراق غضب ڈھا رہا تھا سسرال میں اچھی گزری۔ لال جوڑے والی دلہانی کہلائی شوہر دلداریاں کرتا تھا آنکھ کے اشارہ کو دیکھتا رہتا تھا چاندنی راتیں تھیں سمندر کا کنارا تھا اور کان میں موتی ہزارہ تھا۔ فوجیں تھیں پہرے تھے۔ در و دیوار سنہرے تھے۔ تاج تھا تخت تھا سہاگ تھا بخت تھا

مگر ہائے بابل قسمت لوٹ گئی۔ عمر کا چودھواں سال۔ امنگوں اور ارمانوں کا شباب پیدا نہ ہونے پایا تھا کہ شیام سندر پیا رن میں کام آئے دشمن نے دھوکے کی کٹاری خبر نہیں کہاں ماری۔ کام تمام کر دیا۔ میرا سہاگ لٹ گیا۔ میری راجدھانی مٹ گئی۔ میں بے وارث رہ گئی۔ میری ہری ہری چوڑیاں اتر گئیں۔ میں بیوہ اور دکھیا رانڈ کہلانے لگی۔

Marfat.com

اچھی بابل ذرا اپنی امتا کو دیکھنے آؤ۔ اچھی میرے چاہنے والے باپو مجھکو ساس نندوں کے طعنوں سے بچاؤ۔ وہ مجھ کو چھیڑتی ہیں۔ انہوں نے مجھکو نکو بنا رکھا ہے۔ اب اس گھر میں میری مٹی خراب ہے۔

بیٹی اپنے منہ سے کیونکر کہے۔ بڑے شرم کی بات ہے لیکن پتا تجھسے کیا پردہ ہے اب مجھ سے رنڈاپے کے دن نہیں کاٹے جاتے۔ راتیں مجھکو ستاتی ہیں۔ گھٹائیں جب آتی ہیں، بجلی جب چمکتی ہے، بادل جب کڑکتا ہے۔ مور جب بولتا ہے، پپیہا پی کہاں کی صدا لگاتا ہے، سہاگنوں کے جھولے جب دیکھتی ہوں۔ پھول پہننے والیاں جب سامنے آتی ہیں میری تمناؤں، میرے ولولوں میں حشر برپا ہو جاتا ہے۔ کلیجہ پر سانپ لوٹتا ہے ننگی کلائیوں پر نگاہ جاتی ہے تو بے اختیار ٹھنڈا سانس نکل جاتا ہے۔ سنتی ہوں آپ بدھوا کی شادی کے حامی ہیں میرے لئے بھی کچھ فکر کیجئے۔ میری جوانی دیوانی کی خوشبو کو بربادی سے بچایئے۔ پھر وہی پہلی سی مہندی منگایئے۔ سفید ہاتھوں کو لال لال بنایئے۔ پھر دلہن بنوں پھر جہیز کا انتظام ہو جیسی آپ کی لاڈلی بیٹی ہوں ویسا ہی بیاہ رچایئے۔ ارمان کہتے ہیں ابھی تیری عمر چودہ برس کی بھی نہیں۔ باپ کی چہیتی ہے۔ جو ضد کرے تھوڑی ہے جو دان مانگے کم ہے۔

اچھی بابل میرا بیاہ رچا دو۔

اچھی بابل مجھے مہندی منگا دو

اچھی بابل میرا منڈھا چھوا دو

سب پربتوں کے بانس کٹواؤ، سب باغوں کے پھول پتے منگواؤ۔ مجھے سہاگ کی چوڑیاں پہناؤ، اپنی لاڈلی کو بھول نہ جاؤ۔ وہ تم ہی پر آسرا رکھتی ہے۔

کاگا! میرا یہ سندیسا مدینہ نگری پہنچا دے۔ بھونرے! کلیوں کے رس کو چھوڑ اور ذرا میرے من کی بپتا باواجان تک لیجا۔ نسیم سحری میرے نامراد گھر میں کیوں چلی آتی ہے؟

Marfat.com

یہاں سب پھول مرجھائے ہوئے ہیں۔ اسلئے قدم جا اور طائف کے چمن والوں کو یہاں کی خزاں کاریاں سنا دے۔

بجلی کے تارو! اگر تم میرے "ہوم" جاسکو تو مائی ڈیر فادر" کو میری خبر دیدینا۔

ہم ہیں بالک ایک پتا کے

از توحید ۲۴ مئی ۱۹۱۳ء

ہمارا باپ فقط آسمانی نہیں زمین پر بھی وہی ہے۔ اول بھی وہی ہے۔ آخر بھی وہی ہے دکھ میں بھی ہمارا باپ ہے اور سکھ میں بھی ہمارا پدر بزرگوار یہ وہ سوا تئیس برس سے وہ ساری دنیا کا باپ اور دنیا والے اس کے بچے ہیں۔ اسی واسطے رحمۃ للعلمین کا لقب دیا گیا ہے۔

گورے۔ کالے۔ نیلے پیلے۔ لمبے تڑنگے چھوٹے بونے۔ بھوکے پیٹ بھرے۔ خاک پر سونے والے اور مخملی بچھونے پر پاؤں پھیلانے والے سب حجازی باپ کے فرزند ہیں انجیل کا آسمانی باپ اس کے قول کے موافق اپنے اکلوتے بچے مسیح کو سولی پر چڑھتا دیکھتا ہے۔ اس کی فریاد سنتا ہے جبکہ اس نے ایلی ایلی کہہ کر باپ کو پکارا اور کہا۔ کیا تو مجھکو بھول گیا مگر اس کو اپنے لاڈلے بیٹے پر ترس نہیں آتا۔ یہاں تک کہ اس کا نور چشم سولی پر تڑپ تڑپ کر جان دیدیتا ہے۔

ہمارا باپ آسمانی و زمینی خدا کا بھیجا ہوا رسول اور بندہ ہے۔ ہمارے باپ میں اس کے خدا کی صفت رحمت سر سے پاؤں تک چمکتی نظر آتی ہے۔ ہمارا باپ اپنی امت کے پاؤں میں پھانس کی کھٹک کو بھی گوارا نہیں کرسکتا اور بے چین ہو جاتا ہے۔

ہمارے باپ کو مدینہ کی گلیوں میں بچے روک لیتے تو وہ کھڑا ہو جاتا اور جبتک بچے ہاتھ نہ چھوڑتے ٹھہرا رہتا۔ ہمارا باپ دو جہان کا شہنشاہ تھا۔ مگر غریب لاوارث عورتوں کا سودا

Marfat.com

بازار سے لاتا ان کے بوجھ کندھے پر اٹھاتا۔ بیماروں کی خدمت میں رات رات بھر جاگتا اور اپنے بچوں کی خبر گیری کے لئے آبادی میں رہتا تھا جنگلوں، پہاڑوں میں خلقت سے منہ چھپائے نہ پھرتا تھا۔ ہمارے باپ پر اُس کے بچے عاشق تھے جب کافر تیر چلاتے اور تاک تاک کر ہمارے باپ پر نشانے پھینکتے تو اس کے بچے ستر ستر تیر ڈھال بن کر اپنے جسم پر کھاتے تھے۔ مسیح کے بچوں کی طرح نہ تھے جنہوں نے تیس روپے لیکر اپنے باپ کو قاتل دشمن کے حوالے کردیا۔ ہمارا باپ آدمی تھا۔ ہمارا باپ بچوں سے ان کی سمجھ کے موافق باتیں کرتا تھا۔ مسیح کی طرح نہیں جو مچھلی والوں کے سامنے فلسفہ اور الٰہیات کی مشکل مثالیں دیتا تھا۔

ہمارا باپ بڑا۔ ہمارا باپ سب سے اچھا۔ ہمارا باپ سب کا باپ اور ہم سب اُسکے بالک تو آؤ اپنے باپ کو پہچانیں۔ در در کی ٹھوکریں نہ کھائیں۔ اپنے باپ کے گھر چلیں۔ وہ ہم کو یاد کرتا ہے ہم بھی اس کو یاد کریں۔ اس کی محبت گود پھیلائے۔ ہندو مسلمان۔ عیسائی، موسائی سب بچوں کو بلاتی ہے چلو بابا جان کے سینہ سے چمٹ جائیں۔ پاؤں چومیں آنکھوں سے لگائیں۔ باپو پتا۔ بابا۔ فادر۔ ابت کہکر جنت کے میوے اور پھول مانگیں۔ باپ کے گھر کا راستہ کدھر ہے؟ دیکھو کسی یتیم بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرو۔ اس کی خبر گیری کرو۔ باپ کا گھر مل جائیگا۔ جھوٹ بولنا چھوڑ دو۔ باپ کے پاس جا پہنچو گے۔ لڑائی جھگڑے سے باز آؤ مدنی بابا کا دروازہ ہاتھ آجائے گا۔ کسی سے نہ ڈرو۔ خدا کا خوف اپنے دل میں ہر وقت رکھو۔ اس کو ایک مانو کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور اس کو اور اپنے باپ کو ہر چیز سے اچھا اور بڑا سمجھ کر محبت کرو۔ باپ تم کو اپنے گھر میں بلا لے گا۔

ہم ہیں بالک ایک پتا کے جس کا پیارا پیارا نام محمدؐ ہے اور جو خدا کی طرف سے ہم دنیا والوں کے لئے رحمت کا پیام لے کر اور رسول بن کر آیا ہے۔

سلام ہمارے باپ پر، سلام ہمارے رسولؐ پر، سلام ہمارے پتا پر۔ سلام ہمارے فادر پر اور اس کے اصحاب اور آل صفا پر، سلام اس پر جس کی نسبت قرآن میں مَاکَانَ

Marfat.com

مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۔ ارشاد ہوا اور ہدایت کی گئی تھی کہ اپنے محمد کو زید. بکر اور دنیا کے نسلی باپ کی طرح نہ سمجھو بلکہ رسول اللہ اور پیغمبری ختم کرنے والا مانو. لہذا ہمارا اس کو باپ کہنا اور اپنے تئیں بالک سمجھنا محبت کا لفظ ہے ورنہ وہ رسول ہم اُمتی. ہمارے ماں باپ اُس پر قربان ہوں۔

مدنی شیام سُندر کی مُرلی

از توحید یکم جون ۱۹۱۳ء

شیام نے مرلی بجائی کس طرح ؛ مچ گئی گھر گھر دہائی کس طرح
ہر کی مرلی ہر کے اندر باجتی ؛ ہر کی ہے ہر سے رسائی کس طرح

زلفوں والے یتیم پیارے. بشرب باشی موہن کنہیا کی بانسری کے بلہاری. حجازی پربت میں کھڑے ہو کر ایسی بجائی کہ جنم جنم کے دُکھ کلیش دُور ہو گئے. روح. آتما جیو جسم شریر سب کو سرشار و پُر کیف بنا دیا۔

مگر اب زمانہ گذر گیا. راتیں بیت گئیں. شیام سندر کی مرلی کی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ جنگل کے ہرن. باغوں کے مور، آم کی ٹہنی کی کویل، سب اس پیاری اور سریلی صدا کی راہ دیکھ رہے ہیں جس کی کوک کلیجہ میں ہوک پیدا کرتی ہے. برسات کا موسم قریب آیا. کالی گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آئیں گی اور کرشن کنہیا کی بانسری کو ڈھونڈھیں گی کوئی چاتر سمجھدار سکھی سہیلی ایسی نہیں جو شیام سندر کو سندیسا پہنچائے. اس مہانے بن میں بلا کر لائے. پریم روپ مورتی کانوں میں مندرے ڈالے. بانسری لے کر پھونکے اور نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ کا جلوہ ظاہر ہو. شیام کی مرلی سننے کو جی ترستا ہے. رن کے بجل نرم ہمارے حجازی موہن کی بانسری کے آگے ہیچ ہیں. کاش وہ پھر بجے. پھر گھر گھر دہائی مچے۔

آہاہا۔ وہ دیکھو شیام سندر مرلی لئے بن سے نکلے۔ وہ ہمارے سیتاپتی تیر کمان سنبھالے نمودار ہوئے۔ اب کوئی دم میں مرلیا باجے گی اور زمین کی بدلی برسے گی۔ ندی نالے سوکھے تھے۔ گنگا جمنا پیاسی تھیں۔ گھٹ کے تیرتھ سونے تھے بھگتی کا تھا کال پڑا۔ ست کے گلے جنجال اٹھا اب مرگ کی ترشنا دور ہوئی اور چنتامن کا فور ہوئی۔ اب ہر ہر کی آمد آمد ہے۔ اب ہر کی آمد آمد ہے۔ سنسار کا داتا آتا ہے اور ہر کا جھنڈا لاتا ہے بانس کی مرلی صور ہے یہ اور پستک کا مسطور ہے یہ۔

حلقہ بگوش کا قلمی نذرانہ

خواجہ کے دربار میں

از توحید۔ ۸۔ جون ۱۹۱۳ء

شاہوں کے شاہ عرش پائے گاہ۔ سلطان الہند اجمیری خواجہ کے دربار میں حلقہ بگوشوں کی نذریں گذر رہی ہیں۔ فقیر بے نوا خالی ہاتھ۔ خانماں برباد۔ اس قابل کہاں ہے کہ جہاں پناہ کے حضور میں کچھ پیش کر سکے۔

ہند اولی داتا جانتے ہیں۔ بندہ حسن گدڑی پوشوں میں پیدا ہوا مسکینوں میں پلا گور غریباں میں جا کر سوجائے گا۔ زر و جواہر طلا و نقرہ کی نہ کبھی اس نے اپنے وجود کے لئے خواہش کی نہ دوسروں کو ان کی حرص دلائی۔

خواجہ بابا اس شکل موہوم معدوم ہستی نما کو پہچانتے ہیں۔ بندہ برس گزر گئے اخباری میدان میں خواجہ کا نام بلند کرنے کے لئے جس خیال سے نکلا تھا اسکی تعمیل میں کوئی دن کوئی رات۔ کوئی گھنٹہ۔ کوئی ساعت۔ کوئی منٹ خالی نہیں جانے دیا۔ آج ازدہ میدان میں یہ رجز پڑھے کہ خواجہ اپنے غلام کو دیکھیے جس نے قلم کی آگ سے لاکھوں آہنی دل موم کر دیئے

Marfat.com

بے شمار انکار کرنے والی ہستیوں کو درِ آستان پر جھکا دیا تو ذرہ نواز خواجہ اظہار قدردانی فرمائیں گے۔

اخبار توحید کا خواجہ نمبر بھی اسی دیرینہ جانفشانی و خدمت گذاری کا نمونہ ہے دنیا والے جس قسم کا شوق رکھتے ہیں اور جن طریقوں سے بات کو سننا چاہتے ہیں اسی کی موافق اور ان ہی طریقوں سے اور اسی پیرایہ سے گفتگو کی جاتی ہے

نمبر کا لفظ خواجہ کے بزرگ اور پاکیزہ نام نامی کے ساتھ بھدا اور بے جوڑ معلوم ہوتا ہے مگر کیا کیا جائے یہ بھی نئے زمانہ کی رسم ہوگئی ہے بعہدِ انگلش میں ہے ہر چیز کے اندر نمبر۔ کیا عجب نکلا جو توحید کا خواجہ نمبر۔

لہذا لفظوں سے چشم پوشی کر کے ان معانی کی طرف توجہ کی جاتی ہے جن کی اشاعت اس دورِ جدید میں لازمی اور ضروری ہوگئی ہے۔ خواجہ نمبر اخبار توحید کی، اور اس غلامِ بے زر خرید کی قلمی نذر ہے۔ ؎

بندہ حسن بصد زباں گفت کہ بندۂ تو ام تو بزبانِ خود بگو بندہ نواز کیستی؟

خواجہ اور اُن کے درباریوں ہیں یہ نئی روشنی کا نذرانہ لے جاتے ہوئے حجاب آتا ہے۔ مگر حقائق شناس بارگاہ، ضمائر آگاہ سرکار اپنے حلقہ بگوشوں کی نیت سے خبردار ہے۔ لہذا کمال ادب و عقیدت کے ساتھ یہ قلمی گلدستہ پیش کیا جاتا ہے۔ پھول پراگندہ ہیں افسردہ اور بے رنگ ہیں لیکن خواجہ کے دربار میں اچھے بُرے سب کھپ جاتے ہیں سب پر نظرِ الطاف رہتی ہے۔

عالم پناہ سلطان اس ناچیز نذر کو قبول فرمائیے اور اس میں ایسی برکت و تاثیر عنایت کیجئے کہ جو دیکھے سمندرِ معانی کی تہہ میں پہنچ جائے تاکہ خاکبوسِ آستانہ کی محنت ٹھکانے لگے اور کسی وحدت کی ڈگر یا مل جائے، اور

قلزم مضموں ہیں اخبار میں ٭ ناؤ کاغذ کی چلے منجدھار میں

اجمیری پہاڑ کا بولنا

از توحید ۰ ۸ جون ۱۹۱۳ء

اجمیر کے اونچے پہاڑ نے جو رات دن خواجہ کے روضہ کو دیکھتا رہتا ہے، ہندوستان والوں کو خطاب کر کے زبانِ حال سے کہا۔

میں سنگدل پتھروں کا پہاڑ ہوں مگر اے آدمی میرا دل چشمے بہاتا ہے۔ میں سختی میں ضرب المثل ہوں لیکن اے نرم مزاج کے مدعی انسان! تجھ سے زیادہ دوسروں کے کام آتا ہوں میں اجمیری ہوں میری بات سن مجھکو نظرِ بصیرت سے دیکھ۔

طور میرا بھائی تھا جس پر خدا نے حضرت موسیٰ کو بلا کر پیغمبری دی جودی بھی میرا ہم جنس تھا۔ جہاں حضرتِ نوحؑ کی کشتی نے قرار پکڑا۔ وہ میرے ہی ہمقوم پہاڑ کا غار تھا جہاں حضرت ابراہیمؑ نے چاند ستاروں اور سورج کو دیکھکر خدا کا عرفان حاصل کیا۔ بیت المقدس کا نورانی پہاڑ بھی مجھ جیسا پتھریلا تھا جہاں حضرت عیسےٰ نے کلمہ الٰہی کا وعظ کہا۔ اور جو آج تک انجیل میں کوہ زیتوں کے نام سے مشہور ہے۔

اس کے آگے کچھ اور کہوں تو سن سکے گا تجھ میں تاب اور برداشت ہے حضرت موسیٰ کی طرح بیہوش تو نہیں ہو جائیگا۔ اچھا تو آ تجھسے وہ بھی کہوں۔ حجاز کا نام سامنے لا۔ وہاں بھی میرا ہمشکل کالا کلوٹا سوکھا پہاڑ ہے جس کی آغوش میں ایک تر و تازہ پھول کھلا جس کی وادی میں ایک گیسو دراز نے لکڑی کندھے پر رکھ کر بکریاں چرائیں جس کے اوپر چڑھ کر اس نے اپنی قوم کو پکارا اور خدا کے غضب سے ڈرایا یہ وہی پہاڑ ہے جس کے نیچے اس نے گھر چھوڑ کر راستہ چلا اور ہجرت کر کے مدینہ پہنچا۔ اسی پہاڑ کے دامن میں اس نے حق کا پیام ختم کر کے آرام فرمایا۔

Marfat.com

ذرا آنکھ بند کر تا کہ دل کی آنکھ کھلے، اور دیکھ یہ سبز گنبد کس کا ہے؟ یہ اس کے چاروں طرف اونچی اونچی کالی دیواریں کس کی ہیں یہ سب پہاڑ ہیں مجھ جیسے پتھر ہیں جن کی چوٹیوں پر خدا کی تجلیاں نازل ہو رہی ہیں۔ اس پہاڑ کی یاد میں مسلمان فاتحوں نے زمین کے سب بلند مرتبہ والے پہاڑ فتح کر لئے اور ہندوستان کا کوہ ہمالیہ بھی انکے آگے جھک گیا۔

بس وہی میں اجمیری پہاڑ ہوں۔ مدینہ میں حجازی پہاڑ سبز گنبد دیکھتا ہے۔ اجمیر میں مجھکو سفید گنبد اسی وضع قطع کا نظر آتا ہے۔ مدینہ میں حجازی پہاڑ کے گرد دیکھوں مشتاق پروانہ وار

فانوس سبز

سمجھ کر چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ اجمیر میں میری آنکھ بے شمار فدائیوں کو حجاب سفید کے آس پاس بیقرار مشاہدہ کرتی ہے جو مدینہ میں ہے وہی یہاں ہے۔ غفلت چھوڑ آنکھیں مل منہ دھو اور ہوش ٹھکانے کر کے دیکھ۔ کیا جلوے ہیں۔ کیا شانیں ہیں؟ در خواجہ یا رو در مصطفےٰ ہے۔ سراسر مدینہ کا نقشہ کھنچا ہے۔

دیکھنے سے فارغ ہو تو مدنی جبل کی یاد میں تو بھی ہاتھ پاؤں ہلا اور اپنے اجمیری پہاڑ کی عزت کو بلند کر۔ میرے تاراگڈھ کو امید کا ستارہ بنا۔ میرے چلّے کو کمان توڑ کر تیر اندازی کی کمان میں ڈال اور نفس وخودی کے لشکروں پر تیر برسا۔ ادہر آ۔ اُدھر جا۔ اس کو دکھا۔ اس پر تیر چلا۔ کمان جس طرف چاہے کھینچ مگر تیر کا نشانہ ایک ہی رکھ تا کہ خود فراموش دشمن نفسانی چلا اٹھے اور کہے۔ ؎

کماں جانب دیگرے می کشد
ولے تیر بر جان ما می زند

Marfat.com

آیار اپ چلکے دیکھیں برسات کا تماشہ

(از توحید۔ یکم جولائی ۱۹۱۳ء)

والضحیٰ، واللیل، والرعد، والبرق۔ چمک۔ کڑک اور گھنگھور گھٹاؤں کی قسم برسات کا موسم آگیا۔ جون کی گرمیاں گئیں۔ جولائی کی سیرابیاں نمودار ہوئیں۔ سمندری مانسون ہوائی جہاز پر اڑا چلا آتا ہے۔

کیوں رے ابر تو آیا میرے پیارے کو نہ لایا۔ تیری بوند بوند میں ایک روح ہے تیرے قطرہ قطرہ میں ایک جان ہے۔ اب مردہ مٹی زندہ ہوجائے گی۔ کروڑوں جانور حرکت کرنے لگیں گے۔ چراغوں اور برقی لیمپوں پہ ان کی یورش ہوگی۔ چراغ کہے گا پروانہ! مجھ پر کیوں گرا پڑتا ہے؟ پروانہ جواب دے گا۔ کل جہاں تھا وہ نورانی مقام تھا۔ آج دنیا میں آیا تو اس کو تاریک پایا تجھ کو دیکھا تو سمجھا کہ تو میرے وطن روشن کا نشان ہے۔ اس لئے تجھ سے گلے ملتا ہوں۔ ملنے دے ناراض نہ ہو۔ بادلو! ذرا ٹھہرنا۔ دیکھو۔ ایشیا میں اور مسلم کے دلِ تشنہ کام میں بھی جا سکتے ہو یا نہیں۔ اگر نہیں تو جاؤ میں تم کو نہیں مانگتا۔

برسات وہ اچھی جس میں برساتہ ہو ورنہ ہیچ۔ قسم ہے گھونگر والے بالوں کے بادلوں کے پیچ وخم کی وہ مسلمانوں کے پیچیدہ احوال سے زیادہ نہیں ہیں۔ قسم ہے کوندنے والی بجلی کی، جو مسلمانوں کی بیقراری بہت بڑھ گئی ہے۔

کوئی یار نہیں کس کو برسات کا تماشہ دکھائیں کون سمجھے کہ جولائی کی برسات میں کیا بہار ہے مور بولتے ہیں۔ کوئل کی آواز آرہی ہے۔ مینڈک تالابوں میں پکار رہے ہیں۔ میرا یار ہوتا تو وہ بھی ان کا مزا لیتا نہیں بلکہ وہی اس کا لطف اٹھا سکتا تھا۔

Marfat.com

یہ سب تماشائی بندۂ حرص و ہوس ہیں۔ اسیر مجاز ہیں۔ میں جس یار کو تماشہ دکھانا چاہتا ہوں وہ مجذوب ہے، دیوانہ ہے، سالک ہے، ہوشیار ہے۔ وہ دیکھتا ہے اور دکھاتا ہے، سُنتا ہے اور سُناتا ہے۔ آج وہ آجائے تو بادلوں سے پانی نہ برسے کچھ اور برسے۔ کچھ اور بہار ہو۔ کسی دوسری چیز کی کیچڑ نظر آئے۔

پیاسی زمین کی قسم۔ گرمی اور گھمس کی قسم۔ دھوپ اور لُو کی قسم۔

افق حجاز

پر ایک بادل نظر آتا ہے جو شاید گرج رہا ہے اور ادھر کو بڑھ رہا ہے۔ میں اس میں حیات اور ممات کے کرشمے دیکھتا ہوں۔ مجھ کو اس کی آمد کا یقین ہے۔ وہ طوفانی رفتار سے، سیلابی انداز سے، غیبی پردوں سے اُٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔

اگر یار سوتا ہے تو اس کو جگا دو۔ اس کا تماشہ دیکھے یہ برسات بار بار نہیں آتی۔ اور کہو۔ آیار چلکے دیکھیں برسات کا تماشہ۔ دن رات کا تماشا، اسرار کا تماشا، اغیار کا تماشا ایک ایک کا تماشا اور سب مل کے ترک کردیں۔ گھر بار کا تماشہ

ٹھنڈا سانس

کھجور کی ٹہنی کے نیچے

از توحید ۸۔ جولائی ۱۹۱۳ء

میرٹھ میں شام تھی، ابر تھا، ہوا کا سکوت تھا۔ آسمان و زمین پر اُداسی تھی۔ جھینگروں کا شور تھا، مینڈک جگہ جگہ بول رہے تھے۔ میں نے کھجور کے نیچے کھڑے ہو کر قدرت کے اس نظارے کو دیکھا اور میرے سینے نے ایک ٹھنڈا سانس باہر پھینکا۔

Marfat.com

زمین کہتی تھی میں ٹھنڈی ہوں۔ بارش کے پانی نے مجھ کو سیراب کر دیا۔ دیکھو میرے جسم پر پانی بہنے کے نشان پڑے ہوئے ہیں جو بل کھاتا ہوا مجھ پر سے گذرا ہے۔

چھوٹی چھوٹی گھاس کے سبز تنکے خاک سے منہ نکالے مجھ کو دیکھ رہے تھے۔ ہرے درختوں کی شاخیں مستانہ شباب کے عالم میں مخموری کی شان سے سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھیں کمپنی باغ کے تختۂ چمن میں لال۔ نیلے۔ سفید۔ رنگ برنگ کے پھول شام کے ڈراؤنے وقت سے سہمے جاتے تھے اور پتوں میں منہ چھپا کر تاریکی کی چادر بدن پر کھینچے لیتے تھے۔ ان سب کو دیکھ کر میری آنکھ نے پھر کھجور کی ٹہنی کو دیکھا جو

بانکی تلوار

کی مثل اونچے درخت کے گلے میں لٹکی ہوئی تھی۔ سینے میں پھر ایک شورش ہوئی اور اس نے ایک ٹھنڈا سانس نکال کر مجھکو دیا۔

ہاں آج کے دن اس موسم میں سب مخلوق شگفتہ اور خوش حال ہے مگر ابن آدم اپنے دل کی گرمی میں بھنا جاتا ہے۔ اس کو باطنی سوز جلائے ڈالتا ہے۔

جھینگر اور مینڈک نغمہ سنجی میں مصروف ہیں۔ اپنی زندگی کے مزے لے رہے ہیں۔ آدم زاد کیا کرے جس کو یہ زندگی وبال معلوم ہوتی ہے۔ وہ کیونکر واہ کہے اس کو آہ کے مقام سے فرصت نہیں ملتی۔ میں نے کھجور کی ٹہنیوں کو نظر بھر کے دیکھا اور کہا۔ تم اس اجنبی ملک میں کیوں؟ بہت دن نہیں گذرے مدینہ حجاز میں باب رحمت کے سامنے والے گھر میں تم کو بعالم رویا دیکھا۔ تمہارے سایہ میں میرا سلطان جس کا سکہ دونوں جہان میں چلتا ہے، کھڑا تھا۔ اس کے بدن پر افغانی لباس تھا۔ اس کے سامنے شکستہ دلوں کے ڈھیر تھے۔ وہ تمہارے پتے توڑ توڑ کر ان دلوں کو باندھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

میری امت کے دل ٹوٹ گئے ہیں، ان کو باندھتا ہوں، آ تو بھی باندھ

یادہ تھا، وہاں تھا۔ یا یہ اور یہاں ؟ گرم سانس والے اب یہاں نہیں رہے۔ کھجور کی ٹہنی میرے ٹھنڈے سانس پر سایہ نہ ڈال میں مسلم ہوں جس کا سینہ گرمایا ہوا ہے۔ مگر ٹھنڈا سانس نکلتا ہے۔ میرا دل بھی ٹوٹا ہوا ہے مگر اس کے زخم کی بندش حجازی کھجور کے پتے سے ہو سکتی ہے تو میرٹھ میں ہے کیونکر تیرا پتا اس جراحتِ درونی کے کام آ سکتا ہے؟

موسم برسات ہے مخلوق خدا کے دل امنگوں کے سانس لے رہے ہیں دیکھ مینڈک کیسی بے فکری سے گن گناتا ہے۔ جھینگر کس اطمینان میں گاتا ہے۔ مجھ کو قرار ہو تو میں بھی ایک نغمہ مستانہ کی لے بلند کروں۔ مگر ٹھنڈے سانس کا کیا علاج وہ بار بار آتا ہے اور کہتا ہے کہ تیرا دل بے چین ہے۔ تو برسات کی بہار نہ دیکھ۔ پہلے اس کو ہاتھ میں لے اور حجازی شفاخانے میں لے کر جا۔ جہاں افغانی لباس والا

ربانی سرجن

اس کی مرہم پٹی کریگا۔ اس کے بعد تو بھی شام کی دلگیری میں برساتی ترانے کا مزا دیکھیو۔ اب تو فقط تو ہے اور ٹھنڈا سانس۔ امید ہے اور اس میں خوف دبیم کی پھانس۔

عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو

از توحید ۳۔ ستمبر ۱۹۱۳ء

عید کے چاند نے کہا مجھکو دیکھیو مدنی محبوب کے ابرو کا خم اسی شکل کا تھا آسمانی کنارے کی شفق بولی اور خسار کی رنگت دیکھنی ہو تو مجھپر نظر ڈال لو اس میں کچھ اسی قسم کا روپ تھا۔ سامنے سے تاریکی دوڑ کر آئی اور شرما کر کہنے لگی گیسو مجھ سے ملتے جلتے تھے۔ شام کے ستارے نے کہہ چکے تو صبح کا نور بھی چمکا اور زبان شعاعی سے گویا ہوا

اپنی تجلی کی قسم ہے نے محمد کا میں آئینہ ہوں۔ اس کی زبان درازی بجلی کی طرح گری۔ وجود عشق بے تاب ہوگیا اور کلیجہ تھام کر عیدگاہ کی جانب چلنے لگا۔ وہاں کچھ سائل تھے، کچھ مسئول تھے کچھ اُجلے تھے، کچھ میلے تھے۔ آنکھ نے کہا غریبوں کی یہ عیدگاہ نہیں ہے۔ دل نے کہا ناز کا مقام تو یہی ہے۔ تو اگر نیاز کی عیدگاہ تلاش کرتی ہے تو حجاز میں جا، یثرب کو دیکھ۔ چند پیچیدہ گلیاں نظر آئیں گی۔ ان کی دیواروں پر راز و نیاز کے سائن بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم ہو جائے گا کہ مقصود کہاں دستیاب ہوتا ہے۔

غریبوں کی عیدگاہ مہربان ہوئی اور اس کے امام نے جھک کر گلے لگانا چاہا۔ مگر مشتاق سینہ نے کہا نیازمندی کا ناز قدموں سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ مجال نہیں کہ سرکار کے سینہ تک بڑھنے کی جرأت کر سکے۔ یہ ادب پسند کیا گیا اور ارشاد ہوا۔ دیوانو یہ قدم ہمیشہ تمہارے رہیں گے۔ تمکو عید مبارک۔ بیقراروں نے جواب دیا۔

عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو ــــــ انبساطِ عید دیدن روئے تو

پیا اجمیری

ہست کے مست

از نظام المشائخ جون ۱۹۱۴ء

فطرت جس کو آجکل نیچر کہتے ہیں، قدرت جس کا نام اس زمانہ میں مادت طبعی ہوگیا ہے، اجمیری پہاڑوں میں ہست تھی مگر مست نہ تھی۔

نیچر کی مستی پہاڑوں کی مستی میں سکوت ہے۔ سمندر اور دریاؤں میں شور و روانی ہے۔ جمادات میں پابندی ہے۔ نباتات میں شگفتگی اور سرسبزی ہے جیوانوں

میں حرکت خود اختیاری ہے اور انسانوں میں ہوشیاری و دلفگاری، دلداری وجفاشعاری ہے۔

اجمیر کے جمادات، نباتات، حیوان، انسان سات سو برس پہلے ہست تھے شکلیں رکھتے تھے لیکن یوم الست کے مست خواجہ پیا کے قدم آنے سے مستی میں آ گئے مستی کے دم سے بستی ہے چشتی خواجہ کا اس سنسان خاکستان میں پاؤں رکھنا تھا کہ کوہستان کے ہر تنکے سے پھول میں دنیا جہان کی آبادیاں نظر آنے لگیں۔ ہر کلی کھلکھلا کر ہنسی اور اپنے اندر کی بستیاں نازک پتیوں پر دکھانے لگی۔

چنبیلی کے پھول پر شبنم

خواجہ پیا، موہن سیّاں، کالی کملیا کاندھے پر ڈالے، وحدت کی بانسری ہاتھ میں لئے جب اس بیابان میں جلوہ افروز ہوئے تو ایک چنبیلی کے پھول نے اپنی ہری بھری ٹہنی میں جھوم کر خواجہ پیا کے چرنوں پر سر جھکایا اور اپنے سینہ و گردن کے موتیوں کے شبنمی ہار کو ادب سے نذر چڑھایا اور کہا پالاگن مہاراج۔ ایک رات کی عمر والی ہستی آپ پر قربان میری بپتا سنتے جائیے۔

میں ذرات خاک کا مجموعہ ہوں۔ فطرت و نیچر نے ہست ہونا چاہا تو مٹی سے سر نکالا۔ شاخیں بڑھائیں۔ پتے پھیلائے۔ کانٹے چنے۔ اور پھر ایک دن شام کو سبز فام کچی کلی کی صورت نمودار کی۔ وہ رات ارمانوں کی رات تھی۔ اندھیرا بڑھتا جاتا تھا تو کلی سبزی سے سفیدی کی جانب بڑھتی تھی۔ بند پتیوں میں سرگوشیاں ہوتی تھیں ہر پتی دوسری پتی کے سینے سے لگتی اور کہتی تھی۔

غنیمت جان اس مل بیٹھنے کو ۔۔۔ جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

اُس شب ہر دم بگل میں خار تھا اور آپ جانتے ہیں کہ ہر پتی میں کس کثرت سے ذرے

سے تھے اور ان سب کی مخموری سے میرے تنومند کا کیا عالم ہوگا۔

میں نے سمجھا کہ زندگی بڑے مزہ کی چیز ہے۔ کھلنے کا وقت آرہا ہے اور شباب اپنا گھر بنا رہا ہے۔ ابھی وجود گل کی پیکر پوری تیار بھی نہیں ہوئی ہے اور جذبات کی رنگا رنگیاں لذتوں کا مینہ برسانے لگیں جب سب کچھ تیار ہو جائے گا تو خدا جانے کیا مزا آئے گا۔

اسی اثنا میں مرغ نے صدا بلند کی۔ مندر کا گھنٹہ بجا۔ نسیم سحر آنکھیں ملتی اور مستی میں لڑکھڑاتی نمودار ہوئی اور ہمارے درخت کے بدن میں گدگدیاں کر کے آگے بڑھنے لگی۔ مجھکو بے اختیار ہنسی آئی مگر ہنسنے کی دیر تھی۔ ایک ہی جنبش میں پتیاں کلی کی ہم آغوشی سے جدا ہو کر تھرتھرانے لگیں اور صبح صادق کے افق کو سامنے دیکھکر شرمانے لگیں۔

اب کیا تھا آسمانی نور نے زندگی کا دوسرا دور دکھانا شروع کیا۔ آس پاس کی جھاڑیوں سے چھیڑ چھاڑ ہونے لگی۔ ہوا نے ہمارے شباب کی مستی کو اپنے دامنوں میں بھر کر چپ چاپ جنگل میں بکھیرنا شروع کیا۔

یہ زمانہ ختم نہ ہوا تھا کہ آسمان کی آنکھ کا آنسو قطرۂ شبنم کی شکل میں مجھ تک آیا اور کہا۔ پھول! مجھ کو جگہ دے کہ فلک نے نظروں سے گرا دیا۔ میں نے ہاتھوں ہاتھ اس کو لیا۔ مگر میرے ذرات نے اس کو جذب کرنے سے انکار کیا بے چارہ کو اذیت کے کنارہ ٹھہرائے رکھا۔

اتنے میں سورج نکل آیا۔ کرنوں نے شبنم کو چھیڑنا شروع کیا اور بیچاری بوند کا گھڑی بھر ٹکنا دو بھر کر دیا۔ آخر وہ گھبرا کر موت موت پکارنے لگی اور میرا دل موت کا نام سن کر سہم گیا۔ میں نے خیال کیا تو کیا مجھکو بھی موت آئے گی اور ان ولولہ خیز خوشیوں کو خاک میں ملائے گی؟

Marfat.com

یکایک آپ کے جمالِ باکمال پر نظر پڑی شبنم کا قطرہ جلدی سے آپ پر تصدق ہو گیا۔ مجھے بتا ئیے کہ میں کیونکر قربان ہوں کہ اس موت کے کھٹکے سے نجات پاؤں خواجہ پیا نے گلابی مستانی آنکھ سے اس فریادی پھول کو دیکھا اور خبر نہیں نظروں ہی نظروں میں کیا کہہ دیا کہ پھول مستی میں آگیا اور بولا پالیا۔ مل گیا۔ یہ زندگی کیا چیز ہے۔ اس نگاہ پر سب کچھ نثار۔ میرے پیا۔ میرے سیاں تو ملا تو سب کچھ ملا۔

پیکر امکان کیوں دلگیر ہے

از نظام المشائخ دسمبر ۱۹۱۴ء

لامکاں نہیں مکان، مکان نہیں مکین، مکین نہیں کن کا حرف جس کو کون و مکون کہتے ہیں جس نے اپنا گلا توت ایجاد کی چھری سے کٹوایا اور پھر مخلوق کے آگے بڑھ کر انسان کہلایا۔ یہی پیکر امکاں کا کائناتِ شاداں و فرحاں میں اسیر پنجۂ دلگیری ہے۔ اسی کو وحدت نے فرقت کی شکل بن کر ستایا ہے۔ یہی کہتا ہے الٰہی ہجر میں کلیجہ منہ کو آیا ہے چیونٹی رفیق زندگی کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔ مکھی اپنے جوڑے کے ہمراہ اڑتی پھرتی ہے بگلا دریا کے کنارے دو دو کی بہار سے سفید ہے۔ کوا گھر کی چار دیواری پر اپنے مونس کو لئے بیٹھا ہے اور کالی رنگت پر فخریہ چہچہاتا ہے۔ ریل کے پہئے آہنی ہم جنس سے گلے مل کر چلتے ہیں۔ پھول ایک دوسرے کو دیکھ کر کھلتے ہیں۔ پانی کے قطرے کیسے ملے ہوئے ہیں۔ ہوا کے ذرے کس طرح آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ پہاڑوں کی بلندی سنگی ذرات کی باہمی ہم نشینی سے ہے۔ دریاؤں کی روانی پانی کے میل جول سے ہے۔ چاند تاروں کو لیکر چمکنے آتا ہے۔ سورج شعاعوں کے حلقہ میں موج اڑاتا ہے۔ خود اس کو دیکھو جو ڈھا ہے، ہر رہے۔ ہر میں ہے اور پھر کہنے کو سب سے جدا ہے جس کی وحدت و یکتائی کی گھر گھر

دھوم ہے۔ جو نہ مانے اس کے لئے خطاب احمق و شوم ہے۔ وہ بھی اکیلے پن سے اکتاتا تھا۔ دیکھنے دکھانے کی ہوس میں خاک کے پتلے بناتا تھا۔ اور کہتا تھا میں چھپا ہوا خزانہ تھا۔ مجھے اچھا معلوم ہوا کہ پہچانا جاؤں پس میں نے خلقت پیدا کی۔ آدم کو خلیفہ کہا۔ دیکھا دکھایا۔ نوحؑ کو، ابراہیم کو، موسیٰ کو، عیسیٰ کو ان کے زمانے میں محرم راز بنایا۔ ابراہیم سے کہا میرا خلیل ہے۔ موسیٰ کو آگ کے بہانے پاس بلایا اور کہا تو کلیم ہے۔ کچھ اور ترنگ آئی۔ دل لگی کی ٹھہرائی۔ بولا جوتیاں اتار دے اور سانپ سے کھیل۔ جی بہلا اور فرعون سے لڑ۔ بٹی کی مورت اپنے بنانے والے کی مہربانیاں دیکھ کر اترائی اور صورت دیکھنے کی صدا لگائی۔ کہا کہ تو دیکھ نہیں سکتا اور پھر جلدی سے ناسوتی آنکھ کے سامنے لاہوتی جلوہ نمودار کر دیا۔ تاب کہاں سے آتی وہ خاک کا پتلہ سینہ تھام کر رہ گیا۔

عیسیٰ کو اپنی روح کہہ کر پکارا، عالم تعین میں پھنسا کر مردے جلائے۔ پھر کہا کہ تیرے بعد اس کی باری ہے۔ جو محبوب جناب کردگاری ہے محمدؐ نام۔ محمدؐ کام۔ محمدؐ سر انجام رفیق اعلیٰ، رفیق ظاہر، رفیق باطن۔ معراج میں بلایا۔ دو کمانوں یا اس سے بھی قریب فاصلہ پر ٹھہرایا۔ کچھ کہا، کچھ دیکھا۔ کچھ دکھایا۔ اب تیرہ سو برس سے خبر نہیں کیا کرتا ہے کہاں رہتا ہے۔ کس شغل میں مشغول ہے۔ مسرور ہے یا ملول ہے۔

مگر مجھے اس سے کیا۔ وہ خوش ہو یا ناخوش۔ وہ تو عین ذات میں سرشار ہے۔ مشکل میں میرا آزار ہے کہ عالم امکان اور تعین کی تصویر ہوں۔ وحدت کے ہاتھوں ہجر و فراق میں اسیر ہوں جب اس نے اپنی واحد خوشی کو اکیلا نہ رہنے دیا اور صفاتی شکلیں جی بہلانے کو بنائیں جب اس نے ہر موجود کو اس کا ہم جنس وجود دیا، جبکہ اس کی نیچہ صفات کی رفاقت میں دی گئی جبکہ اس کی قدرت حیلہ اور وسیلہ کی دست نگر رہی تو میں کیوں اکیلا رہوں، میری دلگیری ختم کیوں نہیں ہوتی۔ مجھکو میرا دلدار کیوں نہیں ملتا۔ جانے کتنی دور ہے۔ مجھوروں کے ہارغ کتنے فاصلہ پر ہیں۔ وہ مقام کہاں ہے جہاں

Marfat.com

سرورِ عالم شکستہ دلوں کو کھجوروں کے پتوں سے باندھتے تھے۔ میرے پاش پاش دل کا مرہم انہی کے پاس ہے۔ یہ زخم انہی کے نشتر سے چیرا گیا ہے وہی پٹی باندھیں گے کوئی چارہ ساز ہو یا نہ ہو، کوئی دلنواز ہو یا نہ ہو، مدنی شیام سندر کی یاد کافی ہے جبکہ اس کی آس ہے تو پھر کیا ہراس ہے۔ میری آنکھوں کے خالی کٹورے آنسوؤں کی لبریزی مانگتے ہیں۔ میرے سینہ کے خالی کچوسنے محمدی آرام جان چاہتے ہیں۔

میں نہیں، ایک اسیرِ دست بیداد فریاد کرنے کھڑا ہوا ہے۔ سب سہاروں کو قطع کر کے ایک سبز گنبد کے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹاتا ہے۔ دیکھیے دل کی گرہ کون کھولنے آتا ہے۔ درد بھی اُس حکیم کے گھر جانے کے وقت ملا تھا۔ علاج بھی یہیں ہوگا فرقت بھی اس کوچہ کی گردش میں پائی پوسی تھی، وصال بھی اُس کی گلی کی ٹھوکریں کھانے سے میسر آئے گا۔ اسیر ہوں۔ دلگیر ہوں۔ افتادہ پامالی ہگیر ہوں، حیات کا مجاز ہوں، ممات کی حقیقت ہوں، حرکات کا عکس ہوں، بے اختیاری کا سایہ ہوں۔ محمد محمد تیرے دروازہ پر آیا ہوں یا اُس کو ملا، یا تو مل جا۔

پردیسی پیتم دیکھی تمہاری پریت

از نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۵ء

اُس کے لئے میں، میرے واسطے وہ۔ دونوں اجنبی اور پردیسی تھے۔ فاصلہ کچھ بڑا نہ تھا بس اتنا کہ تین بار پلک جھپکے ہیں اُس کا۔ وہ میرا پیتم کہلایا۔ اس نے مجھے میں نے اُس کو اپنا بنایا۔ ان دنوں سورج مشرق ہی سے نکلتا تھا اور دریاؤں میں خاک کی جگہ پانی ہی بہتا تھا۔ جب تک سمندر میں آتشی طوفان کا ذکر سننے میں نہ آیا تھا۔ ہر چیز اپنی تھی کوئی بھی پرایا نہ تھا۔

Marfat.com

ایک رات کھجور کی ٹہنیوں میں ہوا جھولا ڈالنے آئی اور بیری کی شاخوں میں مکھی بھنبھنائی۔ دل سرشار تھا۔ تخیل مستغرق، بحر ناپیدا کنار تھا۔ ہوا کو مدد نہ دی اور مکھی کے سامنے مستی نہ رکھی۔ اس بات سے خدا ناراض ہو گیا اور اس نے اپنے جہان کا رخ میری طرف سے بے رخ کر دیا۔

میں نے کہا دنیا بے رخ ہو جائے۔ میرا پردیسی پیتم رُخ نہ پھیرے۔ پیارے پیتم نے میرے قول کو چوم لیا اور قول کے جسم کو سینہ سے لگا لیا۔ خدا کو ہم دونوں کی محبت پسند آئی اور اس نے توبہ کے دروازے کھول دیئے۔ سورج نے کہا میں مغرب سے نکل آؤں گا۔ اس وقت یہ در بند کرنا پڑیگا۔ پردیسی پیتم نے اپنے رخسار کو سورج کی جانب موڑا کہ دیکھو کیسے۔ سورج بن سُنے شرما کے پیچھے کو ہٹ گیا میں نے کہا پیارے تمہارا منہ ہے یا شمس الضحٰے۔ اس نے جواب دیا بزرخ کبریا۔ میں نے کہا تو لاؤ تم کو سجدہ کروں بولا خبردار یہ عالم مجاز ہے۔ میں نے کہا مجاز بھی حقیقت کا راز ہے اور وہ ہنسکر خاموش ہو گیا، شرما کر نظریں جھکا لیں۔

کیا لطف کی راتیں تھیں، کیا مستی و سرور کی گھاتیں تھیں، کیا باہیں تھیں، کیا گردنیں تھیں جو ہم آغوش ہوتی تھیں، کیا لمبے بال تھے جو اُلجھتے تھے۔

مگر دیکھو تو وہ پردیسی روٹھ گیا۔ میں تو لڑا نہ تھا۔ وہ کیوں خفا ہو گیا۔ اونٹوں کے قافلے میں کہیں چھپا ہے۔ چاند مسکراتا ہے۔ کیا اسی کے اندر گیا ہے۔ تارے کھلکھلا کر ہنس رہے ہیں اور ان میں ہو بہو اس کی ضیا ہے۔ ہاں یہیں ہوگا۔ ان کو توڑ لو آسمان سے جدا کر دو۔ زمین پر رکھ کر ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھو۔

نہیں سنو۔ یورپ کے میدانوں میں گرج کی آواز آتی ہے۔ اس کو جنگ کی زمین بہت بھاتی ہے۔ شاید وہاں جا نکلا ہو۔

ادب سے پکارنا۔ وہ فیلڈ مارشلوں کو نقشے بتاتا ہوگا، خندقیں کھدواتا ہوگا،

Marfat.com

زخموں کی مرہم پٹی کرتا ہوگا۔ لاشوں کو دفنانے کی فکر میں مصروفیت ہوگی۔

کیوں پردیسی تم یہاں ہو اور ہو تو کس کیمپ میں۔ اتحادیوں میں یا بیدادیوں میں۔ جرمن میں یا انگریزی خرمن میں۔ بولو۔ من جاؤ۔ بس ناراضگی ہوچکی۔ میں سنے مانا کہ امت کی لاشوں کو یورپ میں دیکھنے گئے ہو۔ مگر ایسے اس کو بھی ساتھ لیا ہوتا جو ایک دم کو جدا نہ کیا جاتا تھا۔ نہ بولو گے تو ہم بھی بولنا چھوڑ دیں گے۔ نہ آؤ گے تو ہمارا بھی آنا جانا بند ہو جائے گا۔

پیتم پیتم۔ پیارے۔ راج دُلارے میاں کہاں ہو۔ خدا تو ترس کھاؤ اور جواب دو۔ آسمان چہارم کے مسیحؑ تک تمہاری خاموشی سے بیقرار ہیں۔ فرشتے ان کی آہ و زاری سے بیزار ہیں۔ مگر مجھے ان سے زیادہ اپنی فکر ہے۔ وہ تو امت کی سفارش کے لئے تم کو ڈھونڈتے ہیں اور میں فقط تمہاری دید چاہتا ہوں۔

نہیں بولتے، دروازہ نہیں کھولتے۔ کیسے دلدار ہو۔ کیونکر کہوں کہ جفا شعار ہو۔ تم نے تو کبھی جفا نہ کی تھی۔ آج کیا ہو گیا۔

افوہ! میری بے صبری، میری بے چینی۔ کیا یہی اقرار تھا۔ کیا اسی سلوک کے قابل یہ گنہگار تھا۔ اگر سر لائق دار تھا تو یہاں کسے انکار تھا۔ مگر جدائی کی سزا خلاف تہذیب قانون بین الاقوام عشق ہے۔ یہ بڑی وحشیانہ پاداش ہے۔ ہائے اب بھی رحم نہ آیا۔ نہ خود بولے۔ نہ کسی قاصد نامہ بر کو بھیجا۔ واہ بس پردیسی پیتم دیکھی تمہاری پریت۔

رس کے بھرے تورے نین

از نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۵ء

مونخوار آنکھیں، اشکبار آنکھیں، دلدار آنکھیں، دلفگار آنکھیں میں کیا کہوں کہ

Marfat.com

وہ ہیں زہردار آنکھیں۔ شر ربار آنکھیں۔

آنکھ تھی یا نرگس کا پھول، پھول تھا یا دل میں چبھنے والا کانٹا، نہیں کانٹا نہیں۔ یہ پھول ہے۔ وہ حدت کی شراب کا لبریز گلاس تھا۔ شاید اب بھی نشہ میں غلط کہا۔ وہ نشتر دل کا پیکٹ نہ ہو، چھری کی دھار نہ ہو۔ تیر کی نوک نہ ہو۔ مگر دل تو کہتا ہے وہ آنکھ رسیلی، کٹیلی، نشیلی تھی۔ اُس میں سے نور برستا تھا۔ سرور اُبلتا تھا۔ اس نے اپنا رس دو پیالوں میں مجھکو بھی دیا تھا۔ دل کی گواہی معتبر نہیں۔ اس کو جنون ہے۔ وہ وارفتہ مزاج ہے۔ دماغ سے پوچھو کہ چشم زیر بحث کی نسبت بیان دے۔ حق کو جان کر سچی زبان دے۔

جناب عالی! وہ حجاز کی بنی ہوئی دو نالی بندوق تھی۔ ایک سکنڈ میں دس کرد، فیر کرتی تھی۔ یا وہ بے تار کا تار دار اشارہ تھا یا کھاری سمندر کا کنارہ تھا۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ وہ رلا رہی تھی اور ہنسا رہی تھی اور آزاد ہستیوں کو جال میں پھنسا رہی تھی۔

دماغ میں بھی خلل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے اندر بھی کسی سودہ کا دخل ہے۔ ارے کوئی تو کہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک کیا تھا۔ آنکھ تھی یا طلسم ہوشربا تھا۔

جی ہاں، چھ معتبر اشخاص اس گھر میں ہیں۔ چار مرد، دو عورتیں۔ ان سے دریافت ہو تاکہ تحقیقات خلجان بےخودی سے واگزاشت ہو۔

آپ کون؟ اسم شریف؟ ابوبکر بن ابی قحافہ۔ کچھ ان آنکھوں کے بارے میں واقفیت ہے؟ کیوں نہیں، میرے یار، میرے خلیل محبوب خدائے جلیل کی آنکھیں ہیں۔ انہی کو دیکھکر میں بوڑھا جوان ہو گیا۔ انہی آنکھوں نے مجھکو چشم بصیرت عنایت فرمائی۔

دوسرے صاحب تشریف لائیں۔ ان کا اسم گرامی؟ عمر ابن الخطابؓ۔ ان آنکھوں کی نسبت کیا رائے ہے؟ میری رائے ان آنکھوں ہی نے چھین لی اور خود میری رائے بن گئیں۔ میں کیا بتاؤں کہ وہ کیا ہیں۔ اتنا کہہ سکتا ہوں۔ فاتح ہیں، ملک گیر ہیں، قاتل ہیں اور سب مقتول۔ انہی کے اسیر ہیں۔

Marfat.com

تیسرے بزرگ کہاں ہیں۔ ان کا اسم مبارک؟ عثمانؓ بن عفان ان آنکھوں کے متعلق آپ
کا کیا خیال ہے؟ کن آنکھوں کے متعلق؟ یہ جو سامنے ہیں۔ میری زبان شرماتی ہے
مجھے کچھ یاد آتا ہے اور عقل چکراتی ہے۔ چوتھے صاحب کو بلائیے اور مجھ سے کچھ نہ کہوائیے۔

ان حضرت کو تکلیف دی جائے۔ صورت سے ذکی اور ذہین نظر آتے ہیں دیکھئے
یہ کیا فرماتے ہیں؛ آپ کا اسم عالی؛ مجھ کو علیؓ ابن ابی طالبؑ کہتے ہیں۔ مگر میں ابھی کچھ نہ
کہوں گا۔ پہلے ان دو عورتوں کا بیان سن لیجئے۔

اچھا اول ان بی بی صاحبہ کو تکلیف دو اور پردہ میں یہ آنکھیں دکھاؤ۔ آپ اپنا
نام نامی ارشاد فرما سکتی ہیں؛ مجھکو عائشہ صدیقہ رضؓ کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ
یہ آنکھیں کیا ہیں؟

بعد مدت کے ہوئی دید تری آنکھوں کی۔ یہ میری گود میں بند ہوئی تھیں، یہ مجھکو محبت
سے دیکھتی تھیں، ان کو میں نے آسمانوں سے ٹکٹکی لگائے دیکھا، ان کو آنسوؤں میں
غرقاب پاتی تھی، انہی کو دیکھ کر میرے تن بدن میں جان آتی تھی۔

دوسری سیدہ کو بھی دکھاؤ اور ان کے فرمان کو قلمبند کر لاؤ حضرت کا نام مبارک؟
مظلوم فاطمہؓ۔ بنت صاحب العیون۔ یہ میرے بابا جان کی آنکھیں ہیں جو مجھ سے خفا ہو کر
کہیں چلی گئی تھیں۔ یہ میرے حسنؑ حسینؑ کو پیار کرنے والی انکھیاں ہیں، یہ میرے ہاتھوں کے
چھالوں کو دیکھنے والی ہیں۔ مجھے دو کر مدت کے بعد میں نے پائی ہیں میں تم کو آنکھوں پر رکھوں
دل میں چھپا لوں میں کچھ نہیں کہتی انہی سے پوچھو کہ یہ کیا ہیں۔

علیؑ نامدار۔ اب تو فرمائیے انجمن کا خلفشار مٹائیے۔ اچھا سنو! کہتا ہوں۔

یہ دیوانوں کو ہوشیار کرنے والی ہیں۔ ایک طرف خونخوار ہیں ظالموں کا قصہ پاک کرتی ہیں ایک
جانب اشکبار ہیں۔ خوف ذوالجلال سے تر رہتی ہیں سب دلوں کی دلدار ہیں۔ دلوں کو قرار دیتی
ہیں سنگدلوں کا نشتر ہیں۔ نگاران کا کار ہے۔ یہ رس کے بھرے دو نین ہیں۔ انہی کی

Marfat.com

مٹھاس سے کونین کے لب بند ہیں رخار بخش ہیں جمار شکن ہیں۔ یہ چشم محبت میرے بھائی متحمل کی ہے۔ یہ چشم فسوں ساز میرے مولا میرے سرورکائنات کی ہے جس پر سحرکاری کا الزام لگایا گیا۔ یہ وہ ہیں، یہ وہ ہیں۔ یہ وہ ہیں یہ وہ۔ یہ .... آنکھ کھل گئی۔ منزل مل گئی

اجمیری چنبیلی کا پھول

از خطیب ۲۲ مئی ۱۹۱۵ء

مست پھول۔ یہ اجمیری چنبیلی کا پھول ہے۔ اس کی دید میں ہر ارمان حصول ہے۔ ایک ہار خریدو۔ گلے میں لٹکا کر سینہ سے لگاؤ۔

کیوں جناب داتا چنبیلی۔ آپ نے آنکھ کھولی۔ کلی سے پھول بنے۔ فدا ہماری کلی کے لئے بھی تھوڑی سی صبا منگوا دو۔ اس کی بند پتیوں کو کھلنے کی اور کھلنے کی اجازت دلوا دو بھائی تم مقبول صبیب اللہ ہو۔ تم چاہو تو خواجہ بھی مہربان ہو جائیں۔ خواجہ کی نظر مہر ہو تو اللہ میاں کی عنایت میں کیا دیر ہے۔ اسی خود غرضی کے لئے اتنا چکر اتنا پھیر ہے۔ بندہ مشرک نہیں۔ تم کو اور تمہارے خواجہ کو خدا، یا شریک خدا نہیں مانتا۔ مگر تمہارے وسیلہ کے سوا کسی کو نہیں جانتا پہچانتا۔ دل کے لگاؤ کے واسطے ایک رشتہ درکار ہے۔ رشتہ کہاں سے لاؤں قطع و برید کا زمانہ ہے۔ رگ گل میں تمنا کو پروتا ہوں۔ تم سے کہتا ہوں تمہارے خواجہ کے آگے روتا ہوں۔

کہنا چمن حیات سے یقین کی بہار خفا ہو کر چلی گئی ہے۔ وہم۔ شک۔ گمان نے ہر غنچہ کو گھیرا ہے نیل نہیں، زاغ پنچیں مارتا ہے اور کہتا ہے یہ میرا ہے، یہ میرا ہے باغ اُجڑ جائے گا اس وقت آپ کو توجہ ہوگی تو کیا ہاتھ آئے گا۔ اے اجمیری پھول، اتنا کہدے گا تو بیڑا پار ہو جائے گا۔

Marfat.com

زُلف کا ماجرا

از خطیب ۲۲ رمئی ۱۹۱۵ء

اندھیری رات میں سوائے اس کے میں اور کیا بیان کرسکتا ہوں کہ وہ سیاہ بال تھے۔ ان میں پیچ و خم تھے۔ کنگھی سے اُلجھتے تھے مشکل سے سلجھتے تھے۔

شاعروں نے ان کو گیسوئے عنبریں کہا۔ زلف پیچاں نام دھرا۔ میں نے یہ ماجرا سنکر خلقت کی آہوں کو فراہم کرنے کا حکم دیا کیونکہ سنتا تھا۔ آہ بھی کالی ہوتی ہے۔ اس میں بھی پیچیدگی کا جنجال ہوتا ہے۔ لوگوں نے کہا دوسروں کی آہ مانگتے ہو۔ تم بھی تو سینہ سوزاں رکھتے ہو ایک شرارۂ آہ اپنا بھی دو۔

میں گُل چمپا کی بوئے مست میں مشغول تھا پلک مطالبہ سے چونکا۔ چاہا کہ ایک آہِ تاریک کھینچوں مگر دل نہ مانا۔ پھول کی بوئے پیچیدہ کو آگے بڑھا دیا۔ خوشبو بل کی لائی۔ غمزہ سے اتائی اور بولی اکیلی نہ جاؤں گی شمع کے دھوئیں کو ساتھ بھیجو۔ خوشبو کی یہ ادائے محبوبانہ دل کو بھائی۔ آہ کو بلایا۔ شمع کے دھوئیں کو بُھایا اور تین پیچیدگیوں کو اللہ بیلی، اللہ نگہبان کہا۔

اب زلف کا ماجرا شروع ہوا۔ سارے جہان کی آہیں، دنیا بھر کے پھولوں کی خوشبو کل بزم کائنات کی شمعوں کا دھواں مِل جُل کر گھر سے چلا تو دیکھا۔ عرب کے ایک شہر مدینہ میں ایک کالی کملی والا کھڑے ہیں اور سورہ والیل پڑھ رہے ہیں۔

اس مردِ عرب کے گیسو دیکھ کر پیچیدگی شرما گئی اور بولی۔ آشفتہ می دارد مرا زلف سمن روئے شما۔

زلفوں والے نے منہ سے نہ بولے۔ ایک دوسرے کمبل والے کے سر پر ہاتھ رکھا پھر

Marfat.com

گیسو دراز تھے، اور فرمایا

جاؤ میرے حسن۔ ہندوستان سدھارو اور تم کو سلطان الہند لقب دیا جاتا ہے وہ ملک تاریکی شرک سے کالا ہے۔ وحدت کا نور لیجاؤ، اُجالا بنکر میرے بنو۔ میرا بناؤ

خبر نہیں اس ہاتھ میں کیا تاثیر تھی۔ زلف حسن لہرانے لگی اور بل کھا کر چلائی۔ مجھ کو معین الدین حسن کا درجہ دیا۔ دین حسن کی اعانت میرا فرض ہے اور ہندی دلوں کی الجھن سلجھانا دل کا ارمان پورا کرنا میرا کام ہے۔ زلف کا اتنا ہی اجرا سنا تھا کہ رجب کا چاند نظر آیا۔ ہندو مسلمان کے گھر میں عید آئی۔ اجمیر اجمیر کی دھوم مچی۔ ہر حسنی اپنی بستی چھوڑ کر گھر سے چلی دیکھا پہاڑوں کی آغوش میں گنبد سفید کی وہی شان ہے جو مدینہ میں گنبد سبز کی تھی، زبان سے نکلا ؎

درِ خواجہ یا رودرِ مصطفےٰ ہے ٭ سراسر مدینے کا نقشہ کھچا ہے

ادب نے کہا خاموش، سلسلۂ زلف میں اسیر ہو۔ زبان بند کر۔ تقریر نہیں۔ تاثیر ہو تاکہ دل کے اُلجھاؤ سلجھیں۔ من موہنی مراد ہاتھ آئے۔

چارۂ تشنہ لبی

از خطیب۔ ۲۲ مئی ۱۹۱۵ء

اجمیر کا عرس، مئی کا مہینہ، خلائق کا انبوہ جس میں ہندو بھی، مسلمان بھی، دانا بھی نادان بھی۔ مگر ہر جان پانی کی خواہاں اور پانی مثل خطہ حجاز ہر جگہ نایاب۔

اخباروں نے چھاپا۔ اس کا تدارک ضرور ہو۔ اہتمام کرنیوالوں نے کمر باندھ لیں حضور نظام کے وعدے چشمہ کشائی بھی یاد آ گئے مگر دل نے انگڑائی لیکر کہا میری پیاس کا کیا انتظام ہوگا اس کے لئے کونسا ہمدرد ہے جو کنڈی کھٹکھٹائے گا، تشنہ کامی سے

جان لبوں پر آئی ہے۔ روح کی زبان خشک ہے چہرہ پر مردنی چھائی ہے۔ کوثری خواجہ سے کہو اس تشنہ لبی کے چارہ کار نہیں۔ تو اخبار العشق میں ریمارک چھپائے جائیں گے نکتہ چینی ہوگی۔ پھر نہ کہنا کہ بیخت نویسی حد سدیشن تک پہنچی ہے۔ پریس ایکٹ کے اشارے کنائے یا اور کسی انداز میں گرفتار کرو۔ اس پر پہلے ہی صاف کہے دیتے ہیں۔ اس پیاس کا انتظام کرنا ہوگا۔ خالی جام بھرنا ہوگا۔

ایک میں ہوں ایک میرا خماری ہے۔ مجھ میں اس میں اسی جام کی خاطر مدت سے یاری ہے۔ دودھ کی نہر نہیں مانگی، شہد کا چشمہ طلب نہیں کیا۔ سادہ پانی کا ایک کٹورہ درکار ہے۔ بڑھا دو، منہ سے لگا دو، دل کی لگی کو بجھا دو۔ للہ بجھا دو۔ میں قربان کوچہ شرابی سے بچا کر عشق کے اصلی دار الخلافے تک پہنچا دو۔

اے دل مجھ پر آ

از خطیب ۲۲ جون ۱۹۱۵ء

تو اچھی صورتوں پر آتا ہے میں بھی خدا کی صورت پر بنا ہوں۔ اچھی سیرتوں پر آتا ہے تمام کائنات کی مخلوق سے افضل و اشرف سیرت رکھتا ہوں۔ تو لباس پر، رفتار پر، گفتار پر، ادا سے طرحدار پر جان دیتا ہے دیکھ مجھ میں بھی کسی چیز کی کمی نہیں۔

پس میں درخواست کرتا ہوں کہ تو مجھ پر آ یعنی مجھ سے محبت کر۔ میری الفت میں اسیر ہو۔ اگر تو میرا دل ہے تو غیر پر نہ آ خود مجھ پر آ۔

تو مجھ کو کتنا پیارا ہے سینہ کے اندر پہلو میں چھپا کر سوائے تیرے کس کو رکھا ہے۔ اس جون کی گرمی میں تیری خاطر نیلوفر کا شربت پیتا ہوں۔ دریا کے ٹھنڈے ریت پر لوٹتا ہوں تاکہ تو خنکی سے راحت پائے، اور ہاں اپنے

Marfat.com

سانس کا پنکھا

تجھ پر لگا رکھا ہے جو دن رات چلتا رہتا ہے اور تجھ کو ہوا دیتا ہے۔

میرے دل میں تیری مخفی خواہش کو ذرا سے اشارہ سے تاڑ جاتا ہوں اور جس طرح تو کہتا ہے کھاتا ہوں، پیتا ہوں، چلتا ہوں، پھرتا ہوں۔ تیری ہی آنکھوں سے دنیا کو دیکھتا ہوں یعنی جس چیز کو تو چشم مسرت سے دیکھنا چاہتا ہے، اُسی پر نظر ڈالتا ہوں۔ اور کسی پر نہیں۔ تیرے ہی کانوں سے سُنتا ہوں یعنی تیری مرضی کے خلاف کسی آواز پر کان نہیں دھرتا۔ تو پھر کیا شرط انصاف ہے کہ تو مجھ کو چھوڑ کر دوسروں پر آئے۔ مجھ سے بے وفا بن کر غیروں کی وفا کا عہد باندھے۔

خبر بھی ہے۔ میں اس خدا کا بندہ ہوں جس کو شرک سے نفرت ہے، ہر گناہ کی اس کے دربار میں معافی ممکن ہے مگر شرک کی نہیں۔ پس میں کیونکر گوارا کروں کہ تو اغیار کی الفت میں مبتلا ہو اور میرا حق دوسروں کو دے۔

اے دل تیرا نام ایک مجاز ہے حقیقت میں شکوہ راز و نیاز ہے۔ میری اس تحریر کو چشم حقیقت سے پڑھ اور خدارا مجھ سے محبت کر۔

اگر تو مجھ سے محبت کرنے لگے تو خدا تک تیری رسائی ہو جائے گی۔ کیونکہ میری شناخت خدا کی شناخت ہے۔ چونکہ تو خود میرا دل ہے جب میرے وجود کا عرفان حاصل کریگا عرفان رب حاصل ہو جائے گا من عرف نفسہ فقد عرف ربہ دلیل موجود ہے۔

مگر ہائے تو مجھکو بھول گیا۔ تو غیر کی چاہت میں میری وفا شعاریوں کو پس پشت ڈال بیٹھا۔ مجھے تجھ پر غصہ آتا ہے چاہتا ہوں اپنے سینہ کو چیر ڈالوں اور تجھ کو نکالکر پھینکدوں۔ لیکن یہ بھی محال ہے بسکہ نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی۔ الٰہی یہ کیسی مشکل آئی۔

اچھا تو میں دنیا والوں کو تیری کج ادائی سناتا ہوں اور ان سے کہتا ہوں کہ جس کو سینہ سے لگا کر رکھا ہوا ہے بھروسہ کبھی نہ کرنا وہ تمہارا نہیں غیر کا طلبگار ہے۔ بلکہ خود تجھ سے

کہتا ہوں کہ خدا نے قدرت کا کارخانہ یونہی بنایا ہے کہ میں تجھ پر مروں اور تو دوسروں پر۔ لہذا تو جن پر مرتا ہے وہ بھی تجھ سے بے وفائی کریں گے اور تجھ کو اسی طرح آتشِ فراق میں جلنا ہو گا جس طرح میں جلا کرتا ہوں۔

تو مجھ کو چھوڑ کر ما سوا پر فریفتہ ہوا۔ دیکھیو ایک دن ماسوا تجھکو چھوڑ کر ایک دوسرے ماسوا کا اسیر ہو گا پھر تو ہو گا اور دردبھری آہیں۔ وہ آہیں جن کا کچھ نتیجہ نہ نکلے گا کیونکہ دوزخ کا عذاب ابدی اور غیر فانی ہے۔

سوہنے دی یاد وچ

ہچکی

تو کیوں آتی ہے، میرا سجنا تو یاد نہیں کرتا؟ میرے من موہن سُندر کے دل میں میرا خیال تو نہیں آیا؟

پھر آئی ہچکی نہ ستا۔ میرا سینہ ناتوان ہے۔ اس میں جگہ جگہ پھانسیں چبھی ہوئی ہیں تو آتی ہے تو سینے میں کھٹک ہوتی ہے۔ اس کے زخم دکھنے لگتے ہیں۔ سانس رکا جاتا ہے۔ جب تو آتی ہے گردن کو جھٹکا دیتی ہے اور ناف سے سر تک پٹھوں اور رگوں کو ہلا ڈالتی ہے۔ میرا جی سانس سے گھبراتا ہے اور پیا پیارے کی یاد میں بے قابو ہوا جاتا ہے۔

ہائے میں نے کیسے کیسے درد بھرے خط بھجوائے۔ لکھنا نہ آتا تھا، دوسروں سے لکھوائے مگر اس نے کاغذ کا ایک پرزہ نہ بھیجا۔ دو حرفوں میں بھی تجلی کی۔ کس سے کہوں میری نہ کوئی سکھی ہے نہ سہیلی ہے۔ اپنا ہے نہ پرایا ہے۔ کاش مجھ پر کوئی لعن طعن

ہی کرنے والا ہوتا۔ اسی بہانہ سے دل بہلتا اور اس کا ذکر سننے میں آتا۔

میں نے اس کی خاطر رسوائیاں برداشت کیں۔ دنیا نے کیا کچھ نہ کہا لیکن اس نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ میں بھی کوئی ہوں۔ اب یہ ہچکی آئی ہے۔ کیا (موہنے ڈا سینہا) پیام یار لائی ہے۔ اگر یہ اس کا خط ہے تو کس سے پڑھواؤں۔ خیال کی ڈاک میں سانس کا ڈاکیہ لایا ہے۔ وہی پڑھے گا۔ مگر آہ اس خط میں کیا لکھا ہے۔ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو بھرے آتے ہیں۔ تلھ (پیارے) مجھے بتا تو کیوں رونداا (روتا) ہے۔

میرا ساجن تو اچھا ہے؟

یہ ہچکی موت کی خبر لاتی ہے۔ اس کے نہ دیکھنے کا ارمان دل میں رہا جاتا ہے۔ دنیا کا آسمان اب تک اونچا نظر آتا ہے۔ زمین اسی طرح بچھی ہوئی ہے۔ چولھے کی آگ ویسی ہی زبانیں نکال کر جل رہی ہے۔ میرا دل اب تک تڑپ رہا ہے گواہ رہو۔ میرا خاتمہ دل و جان کے نام پر ہوتا ہے جس کا ہمیشہ کلمہ پڑھا۔ مجھے قبر کا کچھ ڈر نہیں۔ اس کی تاریکی کا اندیشہ کیا کروں۔ فرقت کی رات سے زیادہ اندھیری نہ ہوگی اور میں نے ساری عمر انہی راتوں میں بسر کی۔ میں منکر نکیر کا کیا خوف کروں۔ پیارے کا نام یاد ہے۔ اس کی گلی کا پتہ یاد ہے وہی میرا دین ہے۔ وہی میرا ایمان ہے۔

زندگی کا چراغ بجھتا ہے۔ روح کا پروانہ دوسری شمع کے گھر جاتا ہے۔ اب گھر کے بستروں کو لپیٹو۔ آئینے توڑ دو۔ کسی کو بلاؤ۔ جو میرے غم میں گریباں چاک کرے۔

آخری ہچکی آنے سے پہلے مجھے بیان کر لینے دو کہ میرا صیاد ہر جا ہر جائی ہے۔ کائنات کے ذرہ ذرہ میں اس کی سمائی ہے۔ نہیں آتا تو ایک میرے پاس۔ اس واسطے اے دنیا کے لوگو! تم اگر اس کوچہ میں آؤ اور اس سے جی لگاؤ جس کو خدا کہتے ہیں تو ذرا سوچ سمجھ کر ایسا کرنا۔

Marfat.com

آغوشِ محرم میں شبِ عید

از نظام المشائخ ۔ نومبر ۱۹۱۴ء

آنکھوں نے مدعا چھوڑ دیا، دلوں سے آہوں کی صدائیں نہیں آتیں۔ اب کہیں سے سُبکیوں اور ہچکیوں کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں اب کوئی عشق بازی کے کوچہ میں قدم نہیں رکھتا، یار کی گلیاں سنسان پڑی ہیں گویا ان گلیوں کے یار سب جنگ یورپ میں چلے گئے۔

آج وہ وقت ہے کہ زلف و کمر کا خیال ایک بڑا گناہ مانا جاتا ہے۔ جناب حالی اس کے مفتی اعظم ہیں خدا ان کو سلامت رکھے۔ انہوں نے لاانتہا شاگرد وہم و خیال پیدا کر دیئے ہیں۔ ایک جانب مولٰنا اشرف علی اصلاح خیال کے درپے ہیں ایک طرف خواجہ غلام الثقلین اصلاح تمدن کا ترانہ گاتے ہیں۔ انہی کے پڑوس میں ابنِ عمنہ کی صدا بلند ہوئی ہے۔ نظام المشائخ بھی لمبی لمبی آیات و احادیث و اقوال اولیاء لکھنے لگا جس نظامی تک اس گلی میں نہیں آتا۔ جو اس گلی کے سو سو پھیرے کرتا تھا۔

اب عشق بازِ زندگی کا کیا انجام ہو گا جس کی روح خدا ہے جس کو شیکسپیئر نے مجسم خدا کہا اور جس کی حقیقت سمجھنے سے وہ عاجز ہو گیا جس پر مولانا روم کو حال آتا تھا، جس کو دیکھ کر حافظ شیراز، کا دم دنیا سے گھبراتا تھا جس پر شیخ سعدی جان دیتے تھے۔

اب پروانوں کی پرسش نہیں ہے۔ اب شمع کی یادگاریاں مٹ رہی ہیں۔ اب بلبل کی بدمستیاں خواب و خیال ہوئی جاتی ہیں۔ اب شاخ گل کا جھومنا کوئی نہیں دیکھتا۔ اب گل کی چشم سرمگیں سے کسی کی آنکھیں نہیں لڑتیں۔ آج تو آنکھوں میں سرمہ لگانا بھی عیب سمجھا جاتا ہے اور عشق بازی کون کرے جب کہ ہر وجود روٹی اور عزت کے دام میں گرفتار ہے ہر ہستی کو بال بچوں کی پرورش کا آزار ہے۔ جناب حافظ کے مطرب و مے کو کون پوچھے؟

کردانہ ہر کا معتہ نوالے کھانے والوں نے حکمی حکمت سے حل کر لیا ہے۔
کباب کھانے والے گذر گئے۔ شراب پینے والے فنا ہو گئے۔ سرد تک راہی عدم ہوتے۔ جو سوکھی روٹی پانی میں بھگو کر الفت بسری کر لیا کرتے تھے۔ جرمنی کی سالہا سال کی تیاریاں بھی جنگ میں آئیں اور گذر رہی ہیں۔ یورپ کی نبرد آزمائیوں کے ولولے نکلے چلے جا رہے ہیں۔ توپوں کے گولے، بندوقوں کی گولیاں، سنگینوں کی نوکیں سب اپنی زندگی کے دن آگے بڑھ بڑھ کر پورے کر رہی ہیں۔
آج محبت کو دنیا میں رہنے کی ممانعت کی جاتی ہے۔ الفت کو اس دور حیات میں آنے سے روکا جاتا ہے۔ مولانا رومؒ نے خاد گندم کا الزام لگا کر مجاز کو خوفناک بنا دیا کیا حقیقت والے گندم نہیں کھاتے۔ کیا انکے بندوں میں گندم کے دانے آگ نہیں لگاتے
مجاز اور حقیقت دو لفظ ہیں جو ذہن انسانی کے پھندۂ خیالی ہیں۔ ورنہ نہ حقیقت کی کچھ ہستی ہے نہ مجاز کی۔ سوز کا کچھ نتیجہ ہے نہ ساز کا۔
آؤ! محبت کی ایک نئی دنیا آباد کریں آؤ! عشق کا ایک نیا آسمان و زمین بنائیں۔
آؤ! اب وقت آگیا ہے کہ ان پیٹ پیٹ پکارنے والوں، اور دولت و عزت کے متوالوں کو بائیکاٹ کریں۔ یہ ہم کو جینے نہ دیں گے۔ ان کو کالج و اسکول بنانے دو، ان کو انجمن و کانفرنس میں غل مچانے دو۔ یہ اور ان کے سب حالی موالی یہاں رہیں۔ ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہم کو ایک سانس بھی ان کے ساتھ لینا دوبھر ہے۔
انہوں نے بہت لکھنے والے بنائے ہیں جو چھاپے کی مشینوں کی طرح انجان اور بےخبر رہ کر لکھتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے بولنے والے تیار کئے ہیں جو گراموفون کے ریکارڈوں کی مثل گاتے بجاتے ہیں اور عالم بےعلمی میں دوسرے کے ہاتھ سے البم میں بند کر کے رکھ دیئے جاتے ہیں ہم کو زکام ہو۔ تو ان کو بنفشہ گاؤ زبان یاد آتی ہے سرسام کا خطرہ ہو تو سر کے بالوں کو نظر لگاتے ہیں۔ سردی آئے تو لحاف توشک سے جی بہلاتے ہیں۔

گرمی آئے تو برف اور پنکھے کے سامنے سر جھکانے ہیں۔

یہ تقدموں میں وکیلوں کے محتاج ہیں۔ یہ چلنے میں جانوروں اور کوئلہ پانی کے محتاج ہیں۔ ان کو لباس کے لئے بھیڑ کی اُترن اُون درکار ہوتی ہے۔ ان کا سہارا جھوٹ مکر ہے۔ ان کی پشت و پناہ دغا و جفاکاری ہے

یہ خدا کو کیا جانیں، یہ اس کی امانت محبت کی کیا قدر کریں۔ منہ سے شرک خفی و جلی پکارتے ہیں مگر آنکھوں، ہاتھوں اور خیال وارادہ سے خود ہی اس کا ارتکاب کرتے ہیں اب ہم ان میں ایک دم بھی نہیں گزار سکتے۔ اب ایک لمحہ بھی ان میں رہنا دشوار ہے۔ چلو چلو کر اُن سے علیحدگی میں بیڑا پار ہے۔

اس دنیائے جدید کی کیا بات ہے۔ عید قرباں کی ستائی رات ہے۔ ہوٹل کا اکیلا کمرہ ہے۔ سامنے کمپنی باغ ہے۔ میز پر آئینہ کے سامنے لیمپ جل رہا ہے۔ پرانی دنیا کا کوئی پروانہ نہیں ہے۔ نورجہاں اسی منظر کے لئے کہہ گئی تھی۔ ع

نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

ہوا آتی ہے مگر عاشق مزاج مچھروں سے گستاخی نہیں کر سکتی۔ مچھر آتے ہیں، گاتے ہیں، حال میں لاتے ہیں۔ آغوش کھلا ہوا ہے۔ نہ تو غیری نہ من غیرم کی صدا ہے ادھر مچھر، اُدھر مچھر، نیچے مچھر، اوپر مچھر، دائیں مچھر، بائیں مچھر، ہر طرف مچھر، ہر سمت مچھر خیال میں بھی وہی، عالم مثال میں بھی وہی ظاہر میں بھی مچھر باطن میں بھی مچھر۔

آ میرے پیارے مچھر۔ بھری آنکھوں پر، میرے رخسار پر، میرے ہونٹوں پر، میری ٹھوڑی پر۔ تو اس نئی دنیا میں عشق کا پروانہ ہے۔ تو شاخ شجر محبت کا بلبل مستانہ ہے۔ آفاقہا گردیدہ ام، بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری۔

میں شکل صورت کا پابند نہیں ہوں بیں سیرت کی حسن و قبح کو بھی آزادخیالی کے خلاف سمجھتا ہوں، جو دل کو بھا جاتے۔ جو تنہائی میں انیس و ہمدم بن جائے۔ جو سب کو

Marfat.com

چھوڑ کر میرا ہو جائے۔ جو ہوائے دہر کے مخالفانہ جھونکوں کے باوجود میرے پہلو سے جدا نہ ہو۔ وہی میرا ہے۔ اسی کا میں ہوں۔ باقی سب ہیچ ہیں۔

اس نئی دنیا کے قوانین کچھ بھی ہوں لیکن محبت اور اس کے جذبات غیر فانی سے یہ آباد ہے۔ سن لو محبت کے پیام رساں نے کیا فرمایا۔

جو تیری دوستی کو دوسروں کی دوستی پر تیری بات کو دوسروں کی باتوں پر تیری محبت کو دوسروں کی محبت پر ترجیح دے وہی تیرا دوست ہے۔ گویا ان کے خلاف دوستی نہیں ہے۔ میرے دلدار پھر کو دیکھ لو یہ سب اوصاف مجھ میں ہیں۔ میری بات سننے آیا ہے۔ میری دوستی میں وطن سے ہجرت کی ہے۔ میری محبت کو تمام کائنات کی ہم نشینی سے مقدم جانا ہے۔ بس یہی میرا جاناں ہے۔ بس یہی میرا جاناں ہے۔

میں محبت کے پیامبر کے قربان۔ کیا بات سنائی ہے۔ کیا دل کی بیکلی مٹائی ہے ساری رات آنکھوں میں گزری۔ آنکھیں لال ہوگئیں۔ خمار کے ناسوت سے لاہوت تک پہنچیں۔ چاند میری رات نہ تھی۔ چاندنی نے اپنی چمک کی بجلیاں گرائیں۔ گملوں کے سبز پودے شر پر فتنے بنے۔ تشنہ انتظار کو کسی کی آمد کی آہٹ کا سراب دکھایا۔ ہر لحظہ کلیجہ منہ کو آیا۔ مگر دل کہتا تھا۔ کہ جب میری بستی پریم سے آباد ہے۔ تو پھر اجڑا گھر آباد ہے۔

یہ پریم میری ہر الجھن کا سلجھانے والا اور میری ہر دشواری کو آسان کرنے والا ہے۔ یہ پریم ہی ہے جس کے ستون پر آسمان کھڑا ہے اور سورج چاند قائم ہیں۔ پریم نہ ہوتا تو سب ٹوٹ پھوٹ کر گر پڑتے۔ سمندر سوکھ جاتے۔ پہاڑ زمین کے اندر دھنس جاتے۔ دریا رک جاتے کنارہ بہنے لگتا۔ پانی آگ لگاتا اور آگ پیاس بجھاتی۔ کیونکہ پریم و محبت کی تاثیریں دنیا جہان سے نرالی ہیں۔ عشق کی گنگا ہمیشہ الٹی بہا کرتی ہے۔ یہاں کا پانی آگ ہے اور آگ پانی ہے یہ ہر ایک کے سمجھنے کی بات نہیں ہے

پریم آتما سے کچھ باتیں

میں جس کی گود میں ہوں اور جو میری گود میں ہے۔ میں پریم اور محبت سے کچھ باتیں کرنی چاہتا ہوں۔ وہ محبت جس کو میں پریم آتما کہتا ہوں۔ اور جس ؓ نے مجھے یہ ارمان بھری جان عطا کی ہے۔ یہ میرا رب ہے۔ یہ میرا مولے ہے یہ میرا مالک ہے۔

حکم ہو تو آنسوؤں کے سمندر اس کے قدموں پر نثار کروں۔ ارشاد ہو تو ایک نعرہ مجنونانہ بلند کر کے دنیا سے جدید کو ان کے الطاف کی خبریں کچھ تو بولو۔ ہم بھی تو موسیٰ سے ہمکلام ہونے والے کی آواز سنیں۔ ہم کو بھی تو معلوم ہو کہ امتِ مرحومہ کے یہ درجے اور مراتب ہیں۔ آپ کے لحاظ و سکوت سے دم لبوں پر آ گیا۔ ہم اور تو کچھ نہیں چاہتے۔ فقط آپ کی تعریف کا طریقہ دریافت کرتے ہیں۔ آپ کی آواز سننے کی تمنا رکھتے ہیں۔

ہائے یہ۔ آہ یہ۔ ربنا انت۔ مولانا انت۔ ہکذا۔ مثل ہذا۔ ارے تو۔ اوہ آپ ہیں تم حضرت شاہ۔ نئی دنیا کے دیوانو آؤ۔ دیکھو نقاب اٹھ گئی۔ پہلے میرے جدید محرم راز جن دلوں کو ہلا دو جو ماتوں کو ان کی یاد میں ملبلایا کرتے تھے اور درد کے افسانے سریلی صداؤں میں سنایا کرتے تھے۔

دیکھیں۔ وہ یہ ہیں۔ قربانی کے جانوروں کو پکارا جن کی خاطر آج کے دن انہوں نے سر کٹائے ہیں۔ دیکھو یہ کھلم کھلا میرے گھر میں آئے ہیں۔ تم نے جان کھوئی اور یہ جان لینے سے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ کیسے چاہے انجان بنتے ہیں۔ دوسروں کی گردن پر چھریاں پھر گئیں یہ بے خبر بنے کھڑے ہیں۔ یہ تمہارے ہی کھلونے تھے۔ تم ہی پر صدقے ہو گئے آؤ ذرا آنکھوں میں تو آؤ۔ ذرا کلیجہ تو ٹھنڈا کرو۔ اور ذرا اس سوال کا جواب تو دو کہ یہ کیا چیز ہے اور محبت کی کتاب میں اس کا کیا حال لکھا ہے۔ اور جدید میں یہ تغزلات کیوں کی جاتی ہیں۔

Marfat.com

تیسری منزل

عشق و محبت کے اشارے

آنسو کی سرگذشت

(از رسالہ زمانہ کانپور ۱۹۰۲ء)

جس دل میں درد نہیں اس کو انسان کے سینہ میں نہ رہنا چاہیئے۔ آنسو نشانِ درد ہے اور مجھکو اس کی سرگذشت بہت بھاتی ہے۔ زمانہ کی خاطر اس کو قلم بند کر دیا گیا۔ تا کہ سب درد آشنا دل دیدہ کا لطف اٹھائیں۔

بچارا آنسو اس گھر میں پیدا ہوا جہاں خوشی کی چہل پہل اور شادی کی خوب گہما گہمی تھی چاروں طرف سے مبارک سلامت کی آوازیں آرہی تہیں مگر جس تہہ سے دل میں اس کا ڈیرہ تھا۔ اس کو شکم مادری کی یاد نے گھیر رکھا تھا۔ آنکھیں بار بار اس وطن تاریک کو ڈھونڈھتی تھیں اور مایوس ہو کر رہ جاتی تھیں۔ آخر دل نازک کو تاب نہ رہی۔ اس میں درد کا ایک دھواں اٹھا اور آنسوؤں کو زبردستی آنکھوں تک کھینچ لایا۔

یہ کشمکش مدتوں آنسو کو درپیش رہی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ بھرے پرے گھر میں بربادی شروع ہوئی۔ پہلے باپ مرا اور پھر ماں بھی رخصت ہو گئی۔ ایک جوان لڑکی اور چھوٹا سا لڑکا زندہ بچا۔ باقی سب کا خاتمہ ہو گیا۔ لڑکی ہوشیار تھی بار بار بیکسی و لاچاری کا خیال آتا اور غم زدہ دل پر ایک ٹھیس سی لگتی۔ آنسو امنڈ امنڈ کر آتے جس سے غمگین آنکھوں میں تیرنے لگتے۔ مگر یہ دکھیاری ان کو زبردستی پی جاتی تا کہ معصوم بھائی نہ دیکھ لے اور اس کے شکستہ دل کو صدمہ پہنچے

کچھ دن تو یونہی گذرے۔ اس کے بعد لڑکی کی شادی ہو گئی۔ لڑکی پڑھی لکھی تھی، تعلیمیافتہ خاوند کو بہت عزیز ہوئی اور دونوں میں اخلاص و محبت کا مضبوط رشتہ قائم ہو گیا یہ صورت دیکھ کر آنسو خلوت میں سدھارے اور ان کی سرگذشت کا سلسلہ ملتوی ہو گیا۔

یکایک زمانہ نے اپنی نیرنگی کا ورق اُلٹا اور پیاری کا پیارا ساجن طاعونی شکار ہو گیا۔ شوہر کیا مرا یہ خود مر گئی۔ ہندو دھرم اور راجپوتی شرم کے پیام آنے لگے کہ زندگی ختم ہوئی۔ اب اس آباد دنیا میں تیرا کچھ بھی حصہ نہیں۔ تا اپنا چت چتا کی سلگتی آگ میں لگا۔ وہی تیرے دکھ کا خاتمہ کریگی۔ چندرمان کی سہانی چاندنی کو مت دیکھ اور برکھارت کی مستانہ ہواسے اپنے دامن بچا اور یقین کر کہ خوشی کے دن تیرے ساجن کے ساتھ چل گئے۔ بپتا کی ماری لڑکی دم بخود چپکی سن رہی تھی کہ دل میں ایک سناٹا آیا۔ دھڑکی ہلکی ہلکی چبک ہونے لگی اور برسوں کے رُکے ہوئے آنسو اُبل پڑے۔ یہ آنسو نرالی شان کے تھے۔ اندرونی سوزش نے ان کی رنگت نکھار دی تھی۔ سیاہ پلکوں نے ڈھلک کر زرد رخساروں پر بہنا اور چمکنا ستم ڈھا رہا تھا۔ اب آنسوؤں کا دور دورہ تھا اور انہیں کا عمل دخل۔ اندھیری رات میں بے چاری جوان بیوہ کا کوئی ساتھ نہ دیتا۔ غریب اکیلی پڑی سسکیاں لیا کرتی تھی۔ مگر اس کے اصلی رفیق آنسو اس سے ایک لحظ کو بھی جدا نہ ہوتے تھے۔

ایک دفعہ ہولی کے موسم میں ارمان بھری بیوہ اپنے رنگیلے پریتم کو یاد کر کے آنسو بہا رہی تھی اور اس کی سہاگن ہمجولیاں رنگ اچھالتی کلیلیں کرتی پھرتی تھیں اور اس کی حالت زار پر کسی کو بھی رحم نہ آتا تھا۔ یہ بے ترسی دیکھ کر اسے خیال آیا کہ مہاتما بدھ نے سچ فرمایا تھا۔ کہ کل سنسار خود غرض اور دکھ کی پوٹ ہے۔ اس کی فانی خوبی پر نہ ریجھنا۔ اپنی ہستی کے مطالعہ میں دل لگانا جو اصلی سکھ اور آنند ہے۔ یہ خیال آتے ہی بدنصیب لڑکی نے جی میں ٹھان لی کہ اب اس جوتی سروپ سے دل لگانا چاہیئے جس نے ان نیرنگیوں کو ظاہر کیا ہے یہ سوچ کر ایک رات گھر سے نکل گئی اور گنجان جنگل میں آسن جا کر جا بیٹھی اور کسی کا دھیان جمایا

Marfat.com

جب وہ آنکھ بند کئے سانس روکے کسی کی یاد میں تھی۔ اُس نے دیکھا کہ خوشی کی مورت آسمان سے اتری آ جو رو رہی تھی۔ آنسو بہا رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ یہ دنیا خوش رہنے کے لئے بنی ہے مگر کوئی خوشی آنسو کی کرن اور جھالر کے بغیر خوبصورت اور خوشنما نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے آنسو زندگی کے لئے زیبائش بنائے گئے ہیں؀

لیمپ

از رسالہ نہان ۱۹۰۸ء

اب ہر ملک میں چراغ اور شمع کے بدلے لیمپ کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ انسان تاریکی دور کرنے کا کوئی ذریعہ نہ جانتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں سب کام آسانی سے پورے کر لئے جاتے تھے۔ ہندوستان کی نسبت سنا ہے کہ جب کسی شخص کو رات کے وقت کوئی تحریر پڑھنی ہوتی تو جنگل کی گھاس وغیرہ جلا کر پڑھتا تھا۔ یہی حال عرب کا تھا۔ وہاں بھی چراغ کا دستور نہ تھا۔ وہ لوگ بھی خاص ضرورت کے وقت لکڑیاں روشن کر کے کام نکال لیتے تھے۔ اس کے بعد انسان تمدن میں آگے بڑھا اور مٹی کا چراغ بنایا۔ سینکڑوں برس خاکی چراغ نے خاکی انسان کے گھر کو روشن رکھا اور اس کی روشنی میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی گئیں۔ جب نفاست بڑھی تو موم اور کافوری شمع بنائی گئی اور اس کے لئے مختلف وضع کے فانوس تیار ہوئے تاکہ ہوا اور پروانوں کی آفت سے محفوظ رہے۔

فانوس عموماً شمعوں کے لئے بنائے جاتے تھے۔ چراغ کے واسطے بہت کم چیزیں تھیں جو بے چارے کو ہوا کے جھونکوں سے بچا سکتیں۔ ترقی کے زمانہ میں مٹی کے بدلے تانبہ اور پیتل کے چراغ بنائے گئے۔ مندروں، مسجدوں اور خانقاہوں میں ان بکی چراغوں کا بہت رواج ہو گیا۔ چنانچہ باوجود علمی ترقی کے آج تک مذہبی مقامات میں یہی پیتل اور تانبہ کے چراغ پائے جاتے ہیں۔ یورپ نے جس کو نئی روشنی کا استاد بیان کیا جاتا ہے چراغ بھی

کے فن میں بڑا کمال پیدا کیا ہے۔ اس سے اوّل ٹین کی ڈبیاں روشن کیں۔ اسکے بعد کانچ کی چمنیاں ڈھالیں اور لمپ تیار کیے۔ کانچ کی چمنیاں ایک طرح کے فانوس ہیں جو روشنی کو بیرونی آفتوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔

انسان ذرا آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔ اس کو پرانے زمانے کے دو چراغ چاند و سورج نظر آئیں گے جو اپنی قدیمی حالت پر جوں کے توں قائم ہیں۔ زمین پر مٹی کے چراغ سے لیکر بتی چراغ، شمع کافوری، شمع مومی، مٹی کے تیل کا لمپ یہاں تک کہ بجلی کا لمپ بن گیا۔ مگر آسمان پر وہی پرانا قاعدہ جاری ہے۔ کیا مجال جو ذرا تغیر و تبدل ہو۔

مگر زمین کی ترقی نے جو روشنی کے معاملہ میں ہوئی، بجائے اس کے کہ انسان کو فائدہ پہنچاتی، الٹا نقصان پہنچایا۔ آجکل آدمی اس نئی روشنی کی بدولت طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا ہے اوّل تو خرچ کی زیادتی، پہلے تھوڑے خرچ میں بہت سا کام نکل جاتا تھا۔ اب کروڑوں روپیہ نمائشی اور فضول روشنی میں برباد ہوتا ہے۔ غریب ہندوستان بھی امیر یورپ کی دیکھا دیکھی ان فضولیات میں مبتلا ہو گیا اور اپنی محنت کی کمائی یورپ کے لیمپوں کی نذر میں مفت گنوا رہا ہے۔

مسلمانوں کے مشہور پیشوا اور حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے خلیفہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت مشہور ہے کہ جب وہ رات کو وقت ملک کا کام کرتے کرتے کسی کام کو باہر جاتے تو چراغ گل کر دیا کرتے تھے اور فرماتے کہ میں نہیں چاہتا قوم اور ملک کا تھوڑا سا تیل بھی بیکار جائے اسواسطے چراغ گل کر دیتا ہوں کہ فضول روشن نہ رہے۔

بخلاف اس کے آجکل پبلک کے روپیہ کی جیسی قدر کی جاتی ہے ظاہر ہے۔ میونسپل کمیٹیوں کی طرف سے شہروں میں روشنی کا انتظام کیا جاتا ہے مگر اس میں ذرا سی ہمدردی روا نہیں رکھی جاتی۔

لمپ ایک ڈبیہ کا نام ہے خواہ وہ لوہے کی ہو یا کانچ کی۔ اس میں تیل بھر دیتے ہیں اور بتی

Marfat.com

بیچ میں اٹکا دیتے ہیں۔ پھر اسپر کانچ کی چمنی لگادی جاتی ہے۔ یہ روشنی کا حجاب ہے۔ اس کے اندر بی بتی نئی روشنی کا تاج سر پر رکھ کر ملک ظلمات فتح کر کے حکومت کرتی ہیں۔

پروانے بیچارے اس روشن تاج کے دیوانے ہیں۔ ڈھونڈھ کر جاتے ہیں اور کانچ کے سفید پردے سے ٹکرا کر گر پڑتے ہیں۔ پچھلے زمانہ میں شمع کے رخ پر جو حجاب لٹکایا جاتا تھا وہ دور سے اور نزدیک سے پردہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ مگر آج کل چونکہ دنیا ہی دھوکہ کی ہے، یہ پردہ بھی دھوکہ کی ٹٹی ثابت ہوتا ہے۔ ننھے سے پرندہ کو روشنی بے حجاب نظر آتی ہے لیکن جب قریب جاتا ہے تو غریب مایوس ہو کر گر پڑتا ہے اور منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔

گورنمنٹ کی مہربانی ہے کہ اس نے رعیت سے ہتھیار لے لئے تاکہ لوگ خودکشی سے محفوظ رہیں۔ اسی طرح ان دیوانے عاشق مزاج پرندوں کی حفاظت جان بھی سرکار کو منظور تھی۔ اس لئے سفید کانچ کے پہرہ دار کھڑے کر دیئے ہیں۔ اب ان طالبان مرگ کی آرزو کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی۔ مگر کیا تعجب ہے کہ پروانے بھی انسانوں کی طرح حجاب توڑنے کی کوئی نئی صورت نکالیں اور بقا و فنا کی منزلیں آسان ہو جائیں۔

مٹی کا تیل

از رسالہ زبان ۱۹۰۵ء

خاکساران جہان را بحقارت منگر　　تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اللہ میاں نے اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں پیدا کی جو بیکار ہو یا حقیر و ذلیل سمجھی جا سکے۔ چار عنصر آگ، ہوا، پانی، خاک میں سب سے زیادہ بے حقیقت خاک ہے جو تمام مخلوقات کے پاؤں میں روندی جاتی ہے۔ پانی کے زور کے ساتھ بہہ جاتی ہے۔ ہوا کے جھونکے سے اڑ جاتی ہے اور آگ کی تمازت سے جلا کرتی ہے مگر اُف نہیں کرتی۔ دیکھنے میں اس کی بیچارگی اور ذلت پر ترس آتا ہے لیکن خود اس سے سوال کیا جائے تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر کرے گی۔

Marfat.com

کہ میری شان سب سے بڑی اور نرالی بنائی۔ ہر چیز کا خمیر میرے وجود سے تیار کیا۔ خاص کر انسان، جو اشرف المخلوقات ہے۔ مجھ سے پیدا ہوتا ہے اور مجھ ہی میں فنا ہو جاتا ہے۔

اس ناچیز خاک کی تہہ میں وہ نایاب خزانے قدرت کے دبے ہوئے ہیں جنکو کام میں لاکر انسان آدمی کہلاتا ہے ورنہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا۔ خیر اور چیزیں تو اپنی جگہ میں، مٹی کے بعض ٹکڑوں کی تہہ میں ایک قسم کا چکنا بدبودار پانی ہوتا ہے جس کو لوگ مٹی کا تیل کہتے ہیں۔ مقابلہ کر کے دیکھو تو چنبیلی کا تیل۔ موتیا کا تیل اپنی خوشبو کے سبب اس بدبودار تیل سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ بڑے بڑے خوبصورت اور نازک دماغ لوگ چنبیلی وغیرہ کے تیل کو سر چڑھائے رکھتے ہیں اور جہاں مٹی کا تیل آیا اور ناک ڈھکی۔ مگر ضرورت کے لحاظ سے یہ گندا سڑا پانی تمام تیلوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ آجکل تمام دنیا میں اسی کے دم سے اُجالا ہے اگرچہ گیس اور بجلی کی روشنی نے اب مٹی کے تیل کو بھی مات کرنا شروع کر دیا ہے تاہم اس کا عالمگیر اثر ابھی تک باقی ہے متوسط درجہ اور ادنیٰ درجہ کے آدمی، جو دنیا میں زیادہ تعداد رکھتے ہیں، مٹی کے تیل کے سوا اور کچھ نہیں جلا سکتے۔ یہی تیل روشنی میں لڑکوں کو سبق یاد کراتا ہے، جوانوں کو حسن افروزی کے جلوے دکھاتا ہے اور بوڑھوں کو ٹھوکروں سے بچاتا ہے۔ اسی کی روشنی میں نمازی نمازیں پڑھتے، پجاری پوجا کرتے، وعظ اور کتھا کے جلسے ہوتے ہیں۔ یہی وہ تیل ہے کہ چور کو چوری میں مدد دیتا ہے اور پولیس کو چور پکڑنے میں لالٹین دکھاتا ہے غم کی رات میں، جدائی کی رات میں جب مونس و غمگسار پاس نہ ہو تو مٹی کا تیل جل جلکر اپنا وجود فنا کر دیتا ہے اور انسان کا شریک غم بن کر باعث تسلی ہوتا ہے۔

امریکہ کا راک فیلر اسی خاک کے نیچے رہنے والے تیل کی بدولت لاتعداد دولت کا مالک ہے یہی تیل دوسرے ملک کے ہاتھ میں رہنے کے باعث ہندوستان کی دولت غیروں کو بانٹ رہا ہے یہی تیل دنیا کی تمام کلوں میں کام آتا ہے یہی وہ چیز ہے جس کے بل پر دنیا کی مشہور سواری موٹر کار زمین پر دوڑتی پھرتی ہے۔

اے خاک نشین تیل! ہم کو تیری یہ ادا بھاتی ہے کہ جہاں آگ قریب آئی اور تو مشتعل ہوا۔ خدا کی قدرت ہے کہ تجھ میں یہ صلاحیت ہے کہ تو آن کی آن میں شعلہ زار بنکر مقبول ہو جاتا ہے اور انسان کی یہ قسمت کہ برسوں ٹکریں مارتا ہے، پہاڑوں، دریاؤں میں سرگردان پھرتا ہے مگر وہ تجلی نصیب نہیں ہوتی جو وجود خاکی کو جلا کر فنا کر دے۔

تو اتنا بے غرض و بے تعلق کیوں ہے؟ تیری روشنی میں شراب خواری ہو، زناکاری ہو یا عبادت الٰہی، تجھے روشنی دینے سے کام۔ کیا تو محتسبی نہیں کرسکتا جو لوگوں کو گناہ سے بچائے یا کم سے کم ان کو گناہ کرنے میں مدد نہ دے۔ کیا تجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ خدا کے نافرمان انسان کو اپنے آتشی طمانچے سے خبردار کر دے۔ بیشک تجھ میں سب طاقتیں خدا نے رکھی ہیں۔ مگر تو اچھی طاقتوں کو کام میں لاتا ہے جس سے کسی کو تکلیف یا کسی کی دل آزاری نہ ہو البتہ انسان اپنی نیک قوتوں کو بھول جاتا اور بُری طاقتوں کو کام میں لاکر خود تکلیف اٹھاتا اور دوسروں کو تکلیف دیتا ہے۔ اگر وہ تیری صلح کل پالیسی پر عمل کرے تو دنیا میں ایسا ہی امن قائم ہو جائے جس طرح لمپ کی روشنی میں سب لوگ خوشی وخرمی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

عشقیہ آتشبازی
پھلجھڑی، انار، مہتابی

یہ شب برات آتشبازی کے دن آگ جلائے گی۔ ہستیاں مٹائیگی۔ فنا کے پھول بہار دکھائیں گے۔ بچے پھلجھڑیوں کے لئے ضد کرتے ہیں ان کو دلوائی جاتی ہیں۔ آؤ ہم بھی نادان بن کر نار کے نورانی کھلونے مانگیں اور جی بہلائیں۔

پھلجھڑی کیونکر بنتی ہے، کاہے سے بنتی ہے؟ یہ سب کو معلوم ہے۔ گندک ہوتی ہے تاکہ آگ قبول کرے۔ شورہ ڈالا جاتا ہے تاکہ تیزی اور شورش پیدا ہو۔

Marfat.com

کوئلے جن کی ایک ہستی آگ پہلے بگاڑ چکی ہے، پھلجھڑی کا جزوِ اعظم ہیں۔ اور یہ پھول لوہے کے بُرادے سے بنتے ہیں اور اس لئے اس کی آمیزش بھی ضروری سمجھی جاتی ہے۔

بس یہ پھلجھڑی کی کائنات ہے جس پر کاغذ کا خول چڑھا کر بازاروں میں پھلجھڑی کے نام سے بیچا کرتے ہیں۔ ہم ایسی پھلجھڑی چاہتے ہیں جس میں گندھک نہ ہو تو اس جیسا آگ قبول کرنے والا مادہ ضرور ہو۔ نمکین شورہ نہ ملے تو کوئی دوسری جلی بھنی چیز شامل کرلیں اور وہاں لوہ چون ذراتِ آہن، جن پر پھولوں کی ہستی کا مدار ہے، ڈھونڈھنا ضروری ہے۔ تو کیا پھول ایسی سخت دھات کے ذرّوں سے بنتے ہیں۔ نہیں نہیں خاک کے ذرے بھی چمک دمک دکھانے میں کم نہیں۔ وہی ڈال دینا۔

آہا ہا۔ عشق کی دیاسلائی انسانی پھلجھڑی میں لگادی۔ آنکھوں کی راہ پھلجھڑی کے اندر کا مسالہ جل جل کر نکل رہا ہے۔ آنسوؤں کے پھول جھڑ رہے ہیں۔ کوئی دم کا یہ تماشہ ہے پھلجھڑی جل چکے گی اس کا خول راکھ ہو کر گر پڑیگا۔ اہا ہا کا غل و شور خود بخود بند ہو جائے گا اور جلی ہوئی راکھ اندھیرے میں زمین پر گر کر پامال ہونے لگے گی۔

نہیں جناب ہم ایسی پھلجھڑی نہیں چاہتے جس کے جلنے کے بعد اندھیرا ہو جائے جس کا تماشہ تھوڑی دیر کا ہو، جس کی بہار عارضی نظر آئے۔ ہماری ضد پوری کرنی ہے۔ ہمارا دل رکھنا ہے تو ایسی پھلجھڑی منگا کر دو جو ایک دفعہ سلگنے کے بعد پھر کبھی نہ بجھے جس کے پھولوں کا مینہ برستا رہے جس کی بہار کبھی ختم نہ ہو۔ دیکھو ہم کو منگا دو۔

پھلجھڑی نہیں تو کوئی اور آگ کا کھلونا دلا دو۔ کہتے ہیں یہ دن آگ بازی کے ہیں۔ آج کی رات اللہ میاں پہلے آسمان پر آئیں گے۔ اچھا تو ہم ان سے کہیں گے کہ ہم آپ کے بندے ہیں۔ سب کو آگ کے کھلونے مل گئے ہم کو بھی دلوایئے۔ دل کے انار میں بارود بھری ہوئی ہے۔ مگر ایسی آگ نہیں ملتی جس سے یہ انار چھوٹ جائے۔ آپ ہی کوئی چنگاری دیجیے تاکہ انارِ قلب کی چند لمحہ بہار دیکھ لیں۔ جتابی بھی خوب ہوتی ہے۔ روشن اور منور

Marfat.com

ظلمت کو کافور کرنے والی، آسمانی ماہتاب کی ماجائی. مگر اس میں بھی وہی عیب ہے جل کر خاموش ہوجاتی ہے. مہتابی وہ اچھی جو ہمیشہ چمکتی رہے، ہر وقت نورافشانی کرے. ظلمت کو فتح کرکے کبھی مفتوح نہ ہو. بھلا وہ گورا کس کام کا جو کالے کو فتح کرکے پھر اس کا مفتوح ہو جائے ہمارا نسخہ بن گیا تو دکھا دیں گے کہ جس وقت مہتابی روشن ہوئی تو پھر کبھی نہ بجھے گی. یہاں بھی نور، وہاں بھی نور، ادھر بھی نور، ادھر بھی نور، جہاں سنو یہی آواز آئے گی۔

خیر اگر ابکی شب برات میں یہ عاشقانہ آتشبازی میسر نہ آئی تو آئندہ کی امید رکھنی چاہیئے۔ کہتے نہیں دُنیا بامید قائم۔

دیاسلائی

از رسالہ زبان ۱۹۰۹ء

آپ کون؟ ناچیز تنکہ۔ اسم شریف؟ دیا سلائی کہتے ہیں. دولت خانہ؟ جناب دولت خانہ اصلی گھر جنگل ویرانہ تھا مگر چند روز سے احمد آباد میں بستی بسائی ہے اور سچ پوچھیئے تو یہ ننھا سا کاغذی ہوٹل جس کو آپ بکس کہتے ہیں اور جو آپ کی انگلیوں میں دبا ہوا ہے، میرا موجودہ ٹھکانہ ہے.

یہ احمد آباد ناروے یا سویڈن کے پاس کوئی نیا مقام ہے؟ کیونکہ آپ کی بستیاں تو انہی علاقوں میں سنی جاتی ہیں.

نہیں جناب احمد آباد ہندوستان میں ہے. آپ دیکھتے نہیں میری رنگت کالی ہے. یہ اسی ملک کی نشانی ہے. ورنہ ناروے سویڈن کی دیا سلائی گوری چٹی ہوتی ہے مجھ غریب کو اس سے کیا نسبت؟

آہا. تو آپ ہمارے ملک کی دیا سلائی ہیں تب تو گو آپ کا رنگ سانولا ہے مگر ہماری نگاہ میں سب دیا سلائیوں کی رانی ہو۔ ذرا مہربانی کرکے مجھ کو "رانی" نہ فرمائیے بیگم کہیئے

Marfat.com

میں نے مسلمانوں کے گھر میں جنم لیا ہے۔ منشی فتح خاں نے مجھے بنایا ہے۔

بہت اچھا میاں تنکہ ناراض نہ ہو۔ اللہ اکبر تم کو بھی یہ دن لگے کہ "رانی" اور "بیگم" میں تمیز کرتے ہو۔ "کے آدمی کے پیر شہدی"۔ وہ وقت بھول گئے کہ زنجیروں میں باندھ کر شین کے آرہ کے نیچے رکھے جاتے تھے اور آرا آن کی آن میں تمہارے ٹکڑے کر ڈالتا تھا۔ اس کے بعد جیسی گت بنتی تھی تم خود خیال کر کے گریبان میں منہ ڈال سکتے ہو۔ تمہارے تراشیدہ کندوں کا ظلماتی گرم چشمہ میں ڈالا جانا اور اس کھولتے ہوئے پانی میں تمہارا تلملانا، کبھی سطح آب پر آنا، کبھی پھر تہہ میں چلا جانا یہاں تک کہ اسی دار و گیر اور پیچ و تاب میں تمہاری کھال تک اُتر جاتی تھی۔ اس وقت کچھ دیر کے لئے باہر نکال کر تم کو دم دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد پھر شین میں کس دیا جاتا تھا اور شین چھیل چھیل کے تمہارے لمبے لمبے بدت بنا دیتی تھی۔ اور پھر وہ پرت دوسری کل میں ڈال کر کترے جاتے تھے۔ اس طرح اس حرکت میں تم جیسی ہزاروں ہستیاں عالم وجود میں آ جاتی تھیں۔ زرد گندھک اور سرخ مصالحہ کا لباس بھی کچھ عزت سے نہیں پہنایا جاتا تھا بلکہ سرنگوں کر کے گرم گرم گندھک اور مصالحہ میں تمہاری ناک ڈبو دی جاتی تھی۔ اس پر یہ مزاج کہ بیگم کہلانے کی آرزو ہے۔ کھینچی کی ڈبیا میں رہتے رہتے یہ دماغ ہو گیا۔ ابھی کوئی شخص بکس کی کالی مٹی سے منہ یار گڑ کر پھینکدیگا۔ پھر جو آئے گا پاؤں میں مسلتا آئے گا۔

حضرت! آپ کو تو غصہ آ گیا۔ خفگی کی کیا بات ہے۔ جو چیز جہاں ہو اسی سے منسوب ہوتی ہے۔ میں مسلمانوں کی خانہ زاد ہوں۔ اگر "رانی" کے مقابلہ میں "بیگم" کے لفظ کو پسند کروں تو کیا گناہ ہے۔ یہ سب نام کی بحث ہے، کام دیکھنا چاہیئے۔ سو جیسا مسلمانوں کا کام کرتی ہوں۔ بے کم و کاست ہندوؤں کا بھی بجا لاتی ہوں۔ یہاں تک کہ میرے مشرب میں دیسی بدیسی، گورے کالے کا فرق بھی جائز نہیں۔ مندر میں میرے دم سے روشنی ہے اور مسجد میں بھی۔ راجہ اور نواب کے محل کی تاریکی بھی دُور کرتی ہوں، اور ایک غریب کے

Marfat.com

جھونپڑے میں بھی میرے سبب اجالا ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ بےحقیقت ہوں اور بےبسی کے عالم میں انسانی کلوں سے عرصہ تک بیکل رہی ہوں تو یہ کچھ مجھی پر منحصر نہیں ہے۔ آپ پر بھی یہ بیتا پڑ چکی ہے بلکہ آپ کی مجھ سے زیادہ درگت ہوئی ہے۔ کیا یاد نہیں کہ پریم کی آری نے شجر راز سے کاٹا اور نو مہینے شکم مادر کے چشمہ میں آپ بھی جوش کھاتے رہے اور پھر برسوں پرت در پرت کے چکر میں گردش رہی۔ میرے زنانی اور "بیگم" کے لفظ سے اتنے چونکے ذرا اپنی ہٹ دھرمی کو دیکھیے کہ فقط نام اور لفظ کے فرق سے آپ کے کاموں میں بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ جو کالا کتا ہے وہ گورا کرنا نہیں چاہتا۔ جو مسلمان کو پسند ہے اس سے ہندو کو نفرت ہے۔ اور غریب دکمزور ہونا تو گویا دائرہ آدمیت سے خارج ہو جانا ہے اس کو دنیا میں رہنے اور انسان کہلانے کا کوئی حق ہی باقی نہیں رہتا۔

بس بس۔ خاموش رہو بی فتنی۔ ہو تو اتنی ذرا سی مگر زبان بارہ ہاتھ کی ہے لگیں حد سے گزرنے۔ تم کیا جانو کہ آدم زاد کی کیا عالی شان ہے۔

مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئی ہو تو قرآن میں سنا ہو گا کہ خدا نے آدمی کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے اور تمام اسرار کا علم اس کو بخشا ہے۔ بس یہ جو کچھ کرتا ہے عین منشائے الٰہی کے مطابق کرتا ہے۔ کیونکہ سب کاموں کی حقیقت اس کو معلوم ہے

اوہو! آپ کو یہ غرہ بھی ہے۔ بیشک آپ خلیفۂ خدا ہیں مگر سب چیزوں کی حقیقت آپ کو معلوم نہیں۔ قرآن میں تو یہ آیا ہے کہ آدمی کو سب چیزوں کے نام بتائے گئے تھے یہ کہاں ہے کہ اصلیت بھی بتا دی گئی تھی۔ اگر اصلیت اور حقیقت معلوم ہے تو بتاؤ کہ بجلی کیا چیز ہے؟ وہ تو غلاموں کی طرح آپ کی خدمت کرتی ہے اور اس کی تابعداری پر آپ کو گھمنڈ بھی بہت بڑا ہے۔ مگر آج تک آپ کو یہ خبر نہیں کہ یہ کیا چیز ہے اور چند حرکتوں سے کیونکر ظاہر ہو جاتی ہے۔

خیر بجلی تو بڑی چیز ہے، تنکے کے اسرار سے بھی آپ ناواقف ہیں کہ ذرا سی رگڑ میں

Marfat.com

یہ نورانی شعلہ کہاں سے آجاتا ہے. محض غلط ارشاد ہے کہ آپ کے سب کام علمِ غنی الٰہی کے مطابق ہوتے ہیں۔ خدا کی ہوا عام ہے۔ پانی اور روشنی عام ہے۔ جنگل اور دریا عام ہیں۔ مگر آپ کی ذاتِ شریف ان سب چیزوں کو اپنے لئے مخصوص کرلینا چاہتی ہے۔ آپ کی خواہش ہوتی ہے کہ روٹی. پانی. ہوا سب میرے قبضہ میں ہوں جس کو چاہوں دوں جس کو چاہوں محروم کردوں۔ ایک آدمی کروروں روپے خزانوں میں بند رکھتا ہے اور لاکھوں آدمی بھوک سے مرجاتے ہیں مگر وہ خود غرض کچھ پروا نہیں کرتا۔ اپنی ہوس اور طمع کے جوش میں، نام اور نشان کے شوق میں لاکھوں ہمجنسوں کو فنا کرڈالتا ہے تو کیا خدائی خلافت کا انہی اعمال سے دعوے کیا جاتا ہے اور کیا یہ باتیں منشائے پروردگار کے موافق ہیں؟ حضرت آپ ہزاروں لاکھوں سجدے کرتے ہیں، مگر آپ کا سرکش وجود ویسا کا ویسا ہی باقی موجود رہتا ہے. مجھ کو دیکھئے کہ ایک ہی سجدہ میں مقبول ہوجاتی ہوں اور تجلی اس چھوٹی سی شکل کو جلاکر خاک کردیتی ہے۔

خدا تمہاری طرارزبان کو چلتا رکھے۔ میں ہارا تم جیتیں۔ اچھا تو لاؤ اندھیرا زیادہ ہوگیا میرے کلبۂ تاریک کو تجلی راز سے روشن کردو۔

کھٹکہ

از رسالہ صوفی ۱۹۰۹ء

لوگ کہتے ہیں کہ زندگی وہ اچھی جس میں کسی بات کا کھٹکہ نہ ہو بلکہ ایسی زندگی کو بہشت سے تشبیہ دیجاتی ہے. کیونکہ بہشت میں فکر وتردد کا کھٹکہ نہ ہوگا۔ مثل ہے

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد ۔۔۔ کسے را با کسے کارے نباشد

ہر شخص کا اپنے کام میں مست وسرشار رہنا اور کسی سے کچھ علاقہ نہ رکھنا بہشتی زندگی ہے. مگر اس جہان کو اختلاف سے زیبائش ہے لیسے آدمی بھی اس دنیا کے پردہ

پر رہتے ہیں جو بے کھٹکہ رہائش سمجھتے ہیں اور ایسا گروہ بھی یہاں موجود ہے جو

کھٹکہ دار گزران

کا شیدائی ہے اس کو جینا مرنا، چلنا پھرنا، ہنسنا بولنا، کھانا پینا۔ الغرض کوئی بات ہو کھٹکہ کے بغیر بے مزہ اور پھیکی معلوم ہوتی ہے اور انصاف یہ ہے کہ کھٹکہ پسند جماعت حق بجانب ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دین و دنیا کا کارخانہ کھٹکہ پر چل رہا ہے۔ موجودات خصوصاً فنا اور آگے بڑھکر حیوانات وغیرہ کی تمام نوعیں کھٹکہ سے ظاہر ہوتیں، کھٹکہ سے قائم رہتیں اور کھٹکہ ہی سے فنا ہو جاتی ہیں۔ حیوانات میں انسان کو دیکھئے کھٹکہ اس پر بھی محیط ہے ہر سانس میں کھٹکہ کا سلسلہ موجود ہے۔

کھٹکہ کی خارجی مثالیں

کسی بڑے تار گھر میں چلے جایئے۔ ہزاروں کھٹکے سنائی دینگے۔ انسانی انگلیاں حرکت کر رہی ہوں گی اور کھٹکہ کی گونج ان سے نکل رہی ہوگی۔ آواز سب کی ایک، انگلیوں کی حرکت بھی یکساں لیکن کاغذی نقوش کو ملاحظہ کیجئے۔ یہاں آکر یہ کھٹکہ رنگ برنگ کی صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ کہیں لکھا ہے زید کو لاکھ روپے کا فائدہ ہوا، کسی میں درج ہے عمرو ہلاک ہو گیا۔ الغرض ایک کھٹکہ کے مختلف ظہور اور نتیجے کاغذ پر ہویدا ہوتے ہیں جن لوگوں کو اس

برقی کھٹکہ کا عرفان

ہے وہ تو صرف آواز سن کر ٹک دبد کا فرق محسوس کر لیتے ہیں مگر ناواقف حیران ہوتے ہیں اور بعض اوقات شک و شبہ کرتے ہیں کہ ایک ہی کھٹکہ سے مختلف خبریں کیونکر

Marfat.com

بن گئیں جو کھٹ کھٹ خوشی کے تار میں سُنائی دی تھی وہی غم کی اطلاع میں سُنی گئی۔ اتنا بیّن فرق کس طرح ہو گیا حقیقت آشنا تار بابو ان نادان لوگوں کے شک و شبہ کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔

اسی تار کے کھٹکہ میں وحدت و کثرت کا سبق موجود ہے جس میں آج کل کے بعض کم فہم انسان اُلجھ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ واحد کثرت میں ظاہر ہو کر واحد کیونکر رہ سکتا ہے۔ حالانکہ وہ اگر ذرا سا غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ دہلی سے کلکتہ تک دو سو تار گھر ہیں۔ ایک بابو دہلی میں بیٹھکر کلکتہ کو تار دیتا ہے۔ بس جس وقت اس کی انگلی حرکت کرتی اور ایک کھٹکہ پیدا کرتی ہے تو کلکتہ تک ہر تار گھر میں وہ کھٹکہ پیدا ہو جاتا ہے وہی کھٹکہ دہلی میں، وہی کلکتہ اور وہی درمیانی تار گھروں میں۔ کسی کھٹکہ میں ذرّہ بھر کمی بیشی نہیں ہوتی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کھٹکہ سے دو سو کھٹکے پیدا ہو گئے مگر حقیقت میں وجود ایک ہی ہے۔ احمق سے احمق آدمی بھی جس کو تار کے معاملہ سے تھوڑی سی آگاہی ہے نہیں کہہ سکتا کہ کھٹکہ تقسیم ہو گیا اور اس کی وحدت میں کچھ فرق آگیا۔ پھر ذاتِ واحد کے کثرتی ظہور سے اس کی وحدت میں کیا نقصان ہو سکتا ہے۔

گھڑی کا کھٹکہ

یہ سامنے والی دیوار کے سہارے دم لینے والی گھڑی بھی دیکھی۔ سانس کا کھٹکہ چل رہا ہے اور سوئی کی گردش وقت کاٹ رہی ہے۔ ہر کھٹکا فنر کی پیچیدہ طاقت کا ایک حصہ کم کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن یہی ننھا منّا کھٹکہ گھڑی کی سب طاقت ختم کر کے اس کو خاموش کر دے گا۔

رات کے اندھیرے میں جب کوئی مونس و غمخوار پاس نہ ہو۔ کھٹکہ دار گھڑی

کو پاس رکھ لیجئے۔ دیکھیئے یہ کھٹکہ کیا لطف دیتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ گھڑی کی زندگی بھی کھٹکہ سے معلوم ہوتی ہے اور موت کا باعث بھی یہی کھٹکہ ہوتا ہے۔ انسان کو گھڑی سے تشبیہ دی جائے تو مشابہت بہت ہی ٹھیک اور موزوں ہوگی۔ گھڑی کی بناوٹ اور کل پرزے سب انسانی اعضاء کی ساخت سے نکلے ہیں۔ پھر بھلا نقل تو کھٹکہ سے جئے، کھٹکہ سے مرے اور اس کے کھٹکہ سے لوگوں کو فائدہ پہنچے اور اصل یعنی انسان کھٹکہ سے محروم سمجھا جائے اور بے کھٹکہ زندگی کو بہشتی کہا جائے، یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔

گراموفون کا کھٹکہ

غیبی آواز سے خود بخود بولنے والا باجہ گراموفون، جو نئے زمانہ کی لاثانی اور عجیب ایجاد تصور کیا جاتا ہے، نوک دار کھٹکہ سے بولتا ہے۔ ایک سوئی کی نوک ریکارڈ کی چکرانے والی تختی پر کھٹکہ دار ضربیں لگاتی ہے اور موم پیکر کی مخفی آواز کو عیاں کردیتی ہے۔ پھر دیکھیئے کہ کیا کیا عجیب و غریب صدائیں نکلتی ہیں۔ آجکل کے خوش باش انسان گراموفون کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ مگر ان میں کسی کو اس کھٹکہ پر توجہ نہیں ہوتی جس کے طفیل باجے کا کاروبار چلتا ہے۔ حالانکہ ہر بار سوئی انسان خود ہی بدلتا ہے۔ اگر وہ ادھر توجہ کرے تو اپنے وجود کے کھٹکہ کا حال بھی ایک دن معلوم کرلے۔

انسانی کھٹکہ

ان خارجی مثالوں کے بعد خود انسان کے اندرونی کھٹکہ کو دیکھنا چاہیئے کہ یہ ناداں بے کھٹکہ زندگی پر مرا جاتا ہے حالانکہ زندگی بغیر کھٹکہ کے بالکل نکمی

Marfat.com

اور بیکار ہے۔ آدمی کے تمام دینی و دنیاوی افعال کسی سبب سے ہوتے ہیں نوکری کرتا ہے تاکہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالے۔ اسی طرح دنیا کے سب دھندے کسی سبب کے ماتحت ہیں، تو یہ سبب اس شخص کے لئے ایک کھٹکا ہے۔ بظاہر تو یہ کھٹکا اس کو ناگوار معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں یہ کھٹکا نہ ہو تو جاہل آدم زاد ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور کچھ کام نہ کرے۔

دینی امور کا بھی یہی حال ہے۔ دوزخ کے خوف، بہشت کے لالچ، خدا کی رضامندی کی طمع، غرض اس کے اعمال کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے یہی اس کے لئے کھٹکا ہے جس کے بغیر یہ سب اعمال، جن سے انسان کی روحانی زندگی وابستہ ہے، چل نہیں سکتی۔

کھٹکے کے باطنی اسرار

جو اسرار کھٹکے کے وجود میں پائے جاتے ہیں، ان تک رسائی ممکن ہے مگر ان کا بیان کرنا بہت دشوار ہے کیونکہ ان کا تعلق زیادہ تر کیفیت اور حال سے ہے جو قال اور الفاظ میں نہیں سما سکتی۔ اس لئے ہم باطنی کھٹکے کا صرف ایک حصہ بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

زندگی کا مسلسل لطف

آدمی جگہ جگہ تلاش کرتا پھرتا ہے اور اپنے اندر کی طلسماتی زنجیر کو حاصل نہیں کرتا۔ جس میں اس کو ساری دنیا کی مزیدار کیفیتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ ہر سانس جو جسم کے اندر جاتا اور باہر آتا ہے، اگر اس کی قدر کی جائے تو لازوال نعمت ہے بشرطیکہ اس میں لوچ دار کھٹکا بھی پیدا ہو جائے۔

Marfat.com

جوگی حبس دم وغیرہ طریقوں سے اس سانس کو اپنے قابو کا بنا لیتے ہیں اور پھر ساری خلقت سے بے پروا ہو کر جنگل میں منگل کرتے ہیں اور انند کے تار بجاتے ہیں۔ مسلمان درویش باوجود فقر و فاقہ کے مست و سرشار رہتے ہیں محض اس سانس کی بدولت جس میں ذکر الٰہی لہرایا کرتا ہے اور ان کو ہر وقت سرور رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے سانس میں ذکر الٰہی کا کھٹکا سنتے رہتے ہیں۔

پوچھا جائے گا کہ کس طریق سے سانس میں لوچ پیدا ہوتا ہے اور کیونکر یہ مزیدار کھٹکا حاصل ہو سکتا ہے؟ مگر یہ سوال بھی ایسا ہی ہے جیسے باطنی کھٹکے سے بے خبری۔ اخباروں کے مضمون میں یہ باتیں لکھنی دشوار ہیں مختصر یہ ہے کہ ذکر جہر اور ذکر خفی جس کو پاس انفاس بھی کہتے ہیں، سانس میں پر لطف کھٹکا پیدا کر دیتا ہے اور پھر انسان مسلسل لطف کی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے۔

جس وقت یہ کھٹکا انسان کے دم سے وابستہ ہو جاتا ہے پھر زندگی بے کھٹکے گزرنے لگتی ہے جس کی اکثر لوگوں کو خواہش ہے۔

خدائی گراموفون

از رسالہ صوفی ۱۹۰۹ء

مسٹر ایڈیسن کو دعوےٰ ہے کہ اس نے گراموفون ایجاد کر کے ثابت کر دیا کہ انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ بیجان کا بولنا ایک زمانہ میں معجزہ اور دوسرے عہد میں کرامت شمار ہوتا تھا۔ آج ایڈیسن معجزہ و کرامت کا انکار کر کے یہ عجیب چیز پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ محض عقل انسانی کا ظہور ہے۔ کسی غیبی طاقت کو اس میں دخل نہیں ہے کیونکہ عقل و سائنس غیبی چیزیں نہیں ہیں

ہم ایڈیسن سے دریافت کرتے ہیں کہ عقل انسان کہاں سے آئی جس نے

Marfat.com

یہ کرشمہ ظاہر کیا۔ اس کا دارومدار بھی ایک پراسرار طاقت پر ہے۔ پس کہہ سکتے ہیں کہ جس کرشمہ کا نام ایک وقت میں معجزہ، دوسرے وقت میں کرامت تھا۔ آج کل کے زمانہ میں اس کا نام ظہور عقل یا سائنس کا تماشا ہے۔ تینوں ناموں کے باطنی معانی میں کچھ فرق نہیں۔

اصل میں خود انسان حضرت ایزد کا گراموفون باجہ ہے۔ جب اس سراپا عقل و سائنس خدا کو منظور ہوا کہ آواز ہوا پنے کان سے سُنے۔ اس نے خاکی ریکارڈ بنائے اور ان میں اپنے دیکھنے دکھانے اور سننے سُنانے کی صدا بھر دی اور پھر اس کو ایڈیسن کے موی ریکارڈ کی طرح ایک گردش میں مبتلا کر دیا۔

بعض ریکارڈ ہیں جن میں سنسکرت زبان سے روحِ الٰہی ظاہر ہوتی ہے اور وید کے نام سے مشہور ہوتی ہے۔ بعض ہیں جو عبرانی و عربی کے ذریعہ سے انجیل و توریت قرآن کہلاتے ہیں۔ غرض خیر و شر، خشک و تر، مہذب و غیر مہذب، سب کچھ ان ریکارڈوں میں موجود ہے خود میاں ایڈیسن بھی خدائی باجہ کے ایک ریکارڈ ہیں۔ فما غور کریں تو ان کو بھید مل جائے گا۔

مچھر

از رسالہ صوفی ۱۹۱۰ء

پھنبھناتا ہوا ننھا سا پرندہ آپ کو بہت ستاتا ہے۔ رات کی نیند حرام کر دی ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی سب بالاتفاق اس سے ناراض ہیں۔ ہر روز اس کے مقابلہ کے لئے مہیں تیار ہوتی ہیں، جنگ کے نقشے بنائے جاتے ہیں۔ مگر مچھروں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ شکست پر شکست ہوتی چلی جاتی ہے، اور مچھروں کا لشکر بڑھا چلا آتا ہے۔

Marfat.com

اتنے بڑے ڈیل ڈول کا انسان ذرا سے بھنگے پر قابو نہیں پا سکتا۔ طرح طرح کے مصلحے بھی بناتا ہے کہ ان کی بو سے مچھر بھاگ جائیں لیکن مچھر اپنی یورش سے باز نہیں آتے۔ آتے ہیں اور نعرے لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ بیچارا آدمزاد حیران رہ جاتا ہے۔ اور کسی طرح ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

امیر۔ غریب۔ ادنیٰ۔ اعلیٰ۔ بچے۔ بڈھے، عورت۔ مرد۔ کوئی اس کے وار سے محفوظ نہیں۔ یہاں تک کہ آدمی کے پاس رہنے والے جانوروں کو بھی ان کے ہاتھ سے ایذا ہے۔ مچھر جانتا ہے کہ دشمن کے دوست بھی دشمن ہوتے ہیں۔ ان جانوروں نے میرے دشمن کی اطاعت کی ہے تو میں ان کو بھی مزا چکھاؤں گا۔

آدمیوں نے مچھروں کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ہر شخص اپنی سمجھ اور عقل کے موافق مچھروں پر الزام رکھ کر لوگوں میں ان کے خلاف جوش پیدا کرنا چاہتا ہے مگر مچھر اس غم کی کچھ پروا نہیں کرتا۔

طاعون نے گڑبڑ مچائی تو انسان نے کہا کہ طاعون مچھر اور پسّو کے ذریعہ سے پھیلتا ہے، ان کو فنا کر دیا جائے تو یہ ہولناک وبا دور ہو جائے گی۔ ملیریا پھیلا تو اس کا الزام بھی مچھر پر عائد ہوا۔ اس سرے سے اُس سرے تک کالے گورے آدمی غل مچانے لگے کہ مچھروں کو ہٹا دو، مچھروں کو کچل ڈالو، مچھروں کو تہس نہس کر دو۔ اور ایسی تدبیریں نکالیں جن سے مچھروں کی نسل ہی منقطع ہو جائے۔

مچھر بھی یہ سب باتیں دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا اور رات کو ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھے ہوئے "پانیر" کو آکر دیکھتا اور اپنی برائی کے حروف پر بیٹھ کر اُس خون کی ننھی ننھی بوندیں ڈال جاتا جو انسان کے جسم سے یا خود ڈاکٹر صاحب کے جسم سے چوس کر لایا تھا۔ گویا اپنے قاعدہ کی تحریر سے انسان کی ان تحریروں پر شوخیانہ ریمارک لکھ جاتا کہ میاں تم میرا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

Marfat.com

انسان کہتا ہے کہ مچھر بڑا کم ذات ہے۔ کوڑے۔ کرکٹ۔ میل کچیل سے پیدا ہوتا اور گندی موریوں میں زندگی بسر کرتا ہے، اور بزدلی تو دیکھو اس وقت حملہ کرتا ہے جب کہ ہم سو جاتے ہیں۔ سوتے پر وار کرنا، بے خبر کے چرکے لگانا مردانگی نہیں انتہا درجے کی کمینگی ہے۔ صورت تو دیکھو کالا بھتنا۔ لمبے لمبے پاؤں بے ڈول چہرہ۔ اس شان وشوکت کا وجود اور آدمی جیسے گورے چٹے۔ خوش وضع۔ پیاری ادا کی دشمنی، بے عقلی اور جہالت اسی کو کہتے ہیں۔

مچھر کی سنو تو وہ آدمی کو کھری کھری سناتا ہے اور کہتا ہے کہ جناب ہمت ہے تو مقابلہ کیجئے۔ ذات صفات نہ دیکھیے۔ میں کالا ہی، بد رونق سہی، نیچ ذات اور کمینہ سہی۔ مگر یہ تو کہیئے کہ کس دلیری سے آپ کا مقابلہ کرتا ہوں اور کیونکر آپ کا ناک میں دم کرتا ہوں۔

یہ الزام سراسر غلط ہے کہ بے خبری میں آتا ہوں اور سوتے میں ستاتا ہوں۔ یہ تو تم اپنی عادت کے موافق سراسر ناانصافی کرتے ہو۔ حضرت میں تو کان میں آکر "الٰہی معلیم" دیدیتا ہوں کہ ہوشیار ہو جاؤ اب حملہ ہوتا ہے۔ تم ہی غافل رہو تو میرا کیا قصور۔ زمانہ خود فیصلہ کردے گا کہ میدان جنگ میں کالا بھتنا۔ لمبے لمبے پاؤں والا بے ڈول فتحیاب ہوتا ہے یا گورا چٹا آن بان والا۔

میرے کارناموں کی شاید تم کو خبر نہیں کہ میں نے اس پردہ دنیا پر کیا کیا جوہر دکھلائے ہیں۔ اپنے بھائی نمرود کا قصہ بھول گئے جو خدائی کا دعوے کرتا تھا اور اپنے سامنے کسی کی حقیقت نہ سمجھتا تھا۔ کس نے اس کا غرور توڑا۔ کون اس پر غالب آیا، کس کے سبب اس کی خدائی خاک میں ملی، اگر آپ نہ جانتے ہوں تو اپنے ہی کسی بھائی سے دریافت کیجئے یا مجھ سے سُنیئے کہ میرے ہی ایک بھائی مچھر نے اس سرکش کا خاتمہ کیا تھا۔

Marfat.com

اور تم تو ناحق بگڑتے ہو اور خواہ مخواہ اپنا دشمن تصور کئے لیتے ہو۔ میں تمہارا مخالف نہیں ہوں۔ اگر تم کو یقین نہ آئے تو اپنے کسی شب بیدار صوفی بھائی سے دریافت کر لو۔ دیکھو وہ میری شان میں کیا کہے گا۔ کل ایک شاہ صاحب عالمِ ذوق میں اپنے ایک مرید سے فرما رہے تھے کہ میں مچھر کی زندگی کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ دن بھر بے چارہ خلوت خانہ میں رہتا ہے۔ رات کو جو خدا کی یاد کا وقت ہے، باہر نکلتا ہے اور پھر تمام شب تسبیح و تقدیس کے ترانے گایا کرتا ہے۔ آدمی غفلت میں پڑے سوتے ہیں تو اس کو ان پر غصہ آتا ہے۔ چاہتا ہے کہ یہ بھی بیدار ہو کر اپنے مالک کے دیئے ہوئے اس سہانے خاموش وقت کی قدر کرے اور حمد و شکر کے گیت گائے۔ اس لئے پہلے ان کے کان میں جا کر کہتا ہے اٹھو میاں اٹھو جاگو جاگنے کا وقت ہے۔ سونے کا اور ہمیشہ سونے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ جب آئیگا تو بے فکر ہو کر سونا۔ اب تو ہوشیار رہنے اور کچھ کام کرنے کا موقع ہے مگر انسان اس اصلی نصیحت کی پروا نہیں کرتا اور سوتا رہتا ہے تو مجبور ہو کر غصہ میں آجاتا ہے اور اسکے چہرہ اور ہاتھ پاؤں پر ڈنک مارتا ہے۔ پھر واہ رے انسان آنکھیں بند کئے ہوئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور بے ہوشی میں بدن کو کھجا کر پھر سو جاتا ہے اور جب دن کو بیدار ہوتا ہے تو بے چارہ مچھر کو صلواتیں سناتا ہے کہ رات بھر سونے نہیں دیا۔ کوئی اس دروغ گو سے پوچھے کہ جناب عالی! کے سکنڈ جاگے تھے جو ساری رات جاگتے رہنے کا شکوہ کر رہا ہے۔

شاہ صاحب کی زبان سے یہ عارفانہ کلمات سن کر میرے دل کو بھی تسلی ہوئی کہ غنیمت ہے ان آدمیوں میں بھی انصاف والے موجود ہیں بلکہ میں مل ہی میں فرمایا کہ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ یہ شاہ صاحب مصلے پر بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے ہیں اور میں ان کے پیروں کا خون پیا کرتا ہوں۔ یہ تو میری نسبت ایسی اچھی اور نیک رائے

Marfat.com

دیں اور میں ان کو تکلیف دوں۔ اگرچہ دل نے یہ سمجھایا کہ تو کاٹنا تھوڑی سی ہے، قدم چومتا ہے اور ان بزرگوں کے قدم چومنے ہی کے قابل ہوتے ہیں۔ لیکن اصل یہ ہے کہ اس سے میری ندامت دُور نہیں ہوتی اور اب تک میرے دل میں اس کا افسوس باقی ہے۔

سو اگر سب انسان ایسا طریقہ اختیار کریں جیسا کہ صوفی صاحب نے کیا تو یقین ہے کہ ہماری قوم انسان کو ستانے سے خود بخود باز آجائے گی۔ ورنہ یاد رہے کہ میرا نام مچھر ہے۔ لطف سے جینے نہ دوں گا اور بتا دوں گا کہ کمین اور پنچ ذات اعلیٰ ذات والوں کو یوں پریشان اور بے چین کر سکتی ہے۔

لا

(از رسالہ نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۱ء)

انگریزی زبان میں اس سربلند لفظ کے معنی قانون اور ضابطہ کے ہیں۔ عرب والے انکار اور نفی کے وقت اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اہل اردو تحکمانہ طلب کے موقعہ پر لا بولتے ہیں۔ مگر لام الف دو حرفی لفظ کی اصلی شان پر بہت کم لوگوں کو توجہ ہوتی ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ آج دو چار ساعت اس کی حقیقت پر غور کریں۔

اول تو ذرا اس لفظ کی ظاہری صورت پر نظر ڈالیے۔ کیسا مغرور اور متکبر وجود ہے۔ شاعرانہ مدح سرائی کرنی ہو تو سرو بالا قد کہہ کر جی خوش کر لیجیے۔ مگر حضرت لا جیسے رد کی سی لچک کہاں۔ سرو گو خود سر درخت ہے تاہم ہوا کے جھونکوں سے اس کے تھبے تھبے جنبش میں آیا کرتے ہیں۔ برخلاف لا کے کہ کسی ہوا کے جھونکے سے نہیں ہلتا اور مضبوطی سے بے حس و حرکت قدم جمائے کھڑا رہتا ہے۔ لا نہیں جانتا کہ اس کے پیروں میں کون پڑا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنا سر نخوت سے اونچا رکھتا ہے۔

Marfat.com

انگریزی زبان میں جس کام کے لیے یہ مستعمل ہے اس کی ضد اور ہٹ کو کون نہیں جانتا سارا زمانہ ایک منہ ہو کر چیخے چلائے مگر میاں لا کے حکم کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ جو لوگ جناب لا کے حقائق و معارف سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں وہ اول تو برسوں اسکول و کالج کی خانقاہ میں راتوں کو جاگ جاگ کر لا کے ذکر اذکار میں مشغول رہتے ہیں اسکے بعد لندن کی سب سے بڑی خانقاہ میں جا کر وہاں کے حلقہ ذکر میں تین سال گذارتے ہیں جب کہیں جا کر ان کو خرقہ لا کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ یہ خرقہ اور سند خلافت لیکر اپنے ملک میں آتے ہیں اور آبادی سے الگ ایک خلوت خانہ لیکر رہتے ہیں۔

اس کے بعد کیا ہوتا ہے، یہ نہ پوچھیے ورنہ مسٹر لا، کا نیا تازیانہ سامنے آجائیگا اگر آپ اس کوڑے سے نہیں ڈرتے اور آزادانہ تحقیقات چاہتے ہیں تو سن لیجیے کہ خرقہ پوشان لا۔ اپنے خلوت خانوں میں ہزاروں مکر و فریب کی کمندیں پھیلاتے ہیں اور انجان بھولی بھالی چڑیوں کو جال میں پھانستے ہیں۔ لا کی قینچی سے جیبیں کترتے ہیں۔ لا کے استرے سے سر مونڈتے ہیں اور ممکن ہوتا ہے تو لا کے پستول کی گولی سے بے زبان جانور کو شہید کر ڈالتے ہیں لا کے سیاہ خرقہ والے بزرگ کے کمالات اور کرامتیں اس قدر زبردست اور مستند ہیں کہ کوئی دہریہ اور ملحد ان کے انکار کی مجال نہیں رکھتا سب مانتے ہیں کہ لا کے تصرفات باطنی بالکل سچے اور یقینی ہیں۔ لا دن کو رات اور رات کو دن بنا سکتا ہے۔ لا ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم ثابت کر سکتا ہے۔ لا کے ایک ادنیٰ اشارۂ چشم میں بیگناہ پھانسی پر چڑھ جاتے ہیں اور لا ہی اگر چاہے تو اصلی مجرم کو دار سے اتروا لے۔

عرب کا "لا" صور اسرافیل ہے۔ انگریزی لا کی اس کے سامنے کچھ قیمت نہیں ایک ہی ضرب میں حکومت کے لا کو نیست و نابود کر سکتا ہے حکومت کے لا کی بساط ہی کیا ہے جو عربی لا کے سامنے آسکے عربی لا تو وہ بلا ہے جو خداؤں پر چوٹ کرتا ہے اور ہمیشہ کامیاب رہتا ہے کس کی طاقت ہے جو عرب کے لا کے مقابلہ میں ٹھہر سکے۔ خدا اور ذات خداوندی

خداوند عزیٰ تینوں ایکدفعہ ملک حجاز کے میدان میں اس بہادر لا کے سامنے آ گئے تھے اور چاہتے تھے کہ اپنی خدائی کو اس کانٹے سے صاف کردیں۔ مگر جونہی لا نے اپنی گرج دار آواز نکالی تینوں خدا سر کے بل اوندھے زمین پر گر پڑے۔

کہتے ہیں عرب کے اس لا میں یہ طاقت غیبی خزانہ سے آگئی ہے اور یہ وہ خزانہ ہے جو گنج وحدت میں مخفی ہے۔ اس خزانہ میں لازوال اور بیشمار دولت ہے جو الف کی تھیلیوں میں رہتی ہے جب اس کنز مخفی کو لام مفرد میں زور پیدا کرنا منظور ہوا تو اس نے اپنے خزانہ کا ایک الف اس کے آخر میں لگا دیا۔ یہ اسی کی قوت ہے جس کے بل پر عرب کا لا دنیا کا بے مثل شہ زور مانا جاتا ہے عرب کے لا کو کنز مخفی کا حکم ہے کہ ہر وجود کو نابود کردے۔ چنانچہ جب یہ حکم بجا لاتا ہے تو صلۂ خوشنودی میں اس لا کو دوسرا الف عطا ہوتا ہے جو لا کے اول میں چسپاں کردیا جاتا ہے اور یہ لا سے اِلّا بن جاتا ہے۔ اور جونہی اِلّا بنا اس کے سامنے سے تمام حجابات اٹھ جاتے ہیں اور کنز مخفی اس کے ذاتی ظہور کے لفظ اللہ میں وصلت کا شرف عطا فرماتا ہے اور لوگ اِلّا اللہ کے نعروں سے اس کی تشہیر کرتے ہیں۔

آپ نے سنا ہے عرب کے لا کا فسانہ، عرب کے کلمہ گو اور دنیا کے وہ سب آدمی جو ان کی ہمنوائی پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لا کا ورد یوں کرتے ہیں لا الٰہ الا اللہ گویا ہر شخص لا کی ضرب سے سب خداؤں کی نفی کرکے ایک خدا کا وجود قائم کرتا ہے اور فنا کے بعد بقا کا تماشہ دیکھتا ہے

اردو کا "لا" سوائے تحکمانہ طلب کی شان کے اور کوئی شان نہیں رکھتا۔ اس کا ذکر کرنا فضول ہے۔ بس ان میاں کی تو اتنی ہستی ہے کہ فلاکرک کے بولے کہ ہم کو بھی لا کی بحث میں لا۔ لے آئے۔ مگر لانے کا نتیجہ کچھ نہ نکلا بس ظاہر ہوا کہ درمیانی لا خوب تھا۔ ہم کو بہت پسند آیا۔ اب خدا کرے جس دن ہم سب کے جسم سے جان نکلے تو لا الہ الا اللہ سانس

کے جھولے میں جھول رہا ہو کبھی جھونٹا لیکر زبان پر آئے اور کبھی دل میں جائے اور چاروں طرف وحدت کے ترانوں کا شور ہو۔ آمین۔

مکھی

از رسالہ صوفی اگست ۱۹۱۱ء

دیکھنے میں بھنبھناتا ہوا ذرا سا پرندہ ہے بلکہ پرندہ کا لفظ بھی اس ننھی سی ہستی پر زیبا نہیں۔ یوں سمجھئے کہ ایک ناچیز و غلیظ و مکروہ بھنگا ہے مگر نظر تعمق سے دیکھو تو عرفان قدرت کا پر اسرار نوشتہ ہے۔

مکھیوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم شہد کی مکھیوں کی ہے دوسری قسم وہ مکھیاں ہیں جو انسان کے ساتھ بودوباش رکھتی ہیں۔ تیسری قسم کی مکھیاں قبروں۔ قتل گاہوں ذبح خانوں وغیرہ مقامات میں رہتی ہیں۔

قسم اول شہد کی مکھی آدمی کو طریق تمدن سکھانے والی اور بڑی عقلمند ہے۔ قرآن شریف میں ایک سورت اس کے نام سے منسوب ہے۔ اس مکھی کے ضابطے اور قانون انسانوں کو حیرت میں ڈالتے ہیں۔

آدمی جوں جوں ترقی کرتا ہے، قدامت کے اصول سے منحرف ہوتا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ تمام دنیا میں شخصی حکومت کا دور دورہ تھا یا اب یہ وقت ہے کہ خود مختاری اور مساوات کی روح ہر شخص میں سرایت کر گئی ہے جس کو دیکھئے ہمچو من دیگرے نیست کا راگ گاتا ہے۔ یورپ میں ان خیالات کا بڑا زور ہے، وہاں کے باشندے آزادی کی ترنگ میں کسی کی برتری گوارا نہیں کرتے۔ اکثر مقامات میں جہاں بادشاہ کوئی چیز نہیں ہر فرد بشر اپنا آپ حاکم ہے، اور اگر کہیں بادشاہ موجود ہے تو اس کا کچھ اختیار نہیں۔ شطرنج کے مہرے کی مثل نام کو بادشاہ ہے۔

اگرچہ اہل یورپ نے عملاً اس کو ثابت کر کے دکھا دیا کہ فردِ واحد کی حکومت سے زیادہ مفید پنچائتی حکومت ہے لیکن یہ عملاً درآمد ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اصول اسی وقت تک کارگر ہے جب تک خلقت میں علم کا شوق عام ہے، اور لوگوں میں اپنے فرض کا احساس باقی ہے۔ جس دن علمی چرچا کم ہوا اور تعیش و آرام طلبی نے جہالت کا بازار گرم کیا اسی روز دیکھ لینا کہ جمہوریت کا سارا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا اور پھر وہ لوگ،، جن کے دماغ اور قوی قدرتاً شاہی و افسری کے قابل ہیں، خود مختار بادشاہ بن جائیں گے

شہد کی مکھی ابتدا سے خود مختار بادشاہ کے ماتحت ہے۔ آدمی کی طرح رنگ نہیں بدلتی۔ ان مکھیوں کے ہر چھتہ میں ایک حکمراں ملکہ ہوتی ہے جس کے حکم پر ہزاروں مکھیاں گردش کرتی ہیں۔ مکھی ملکہ کا فرمان اشاروں ہی اشاروں میں پورا ہو جاتا ہے۔ اسکو نہ گزٹ میں اعلان کرنے کی ضرورت ہے نہ وائسرائے اور ڈپٹی کمشنر کی معرفت کی تلاش۔ جب ذرا پروں کو حرکت دی اور آنکھوں کو سامنے کر کے بھنبھنائی، فوراً سب رعایا تعمیل کیلئے کھڑی ہو گئی۔ مکھی ملکہ کی خوش نصیبی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ اس کے ملک میں نہ کوئی باغی ہے نہ انارکسٹ شورش کنندہ۔ مکھیوں کی شہزادی بڑی کم خوراک ہے۔ رعایا جس قدر شہد جمع کرتی ہے، یہ اس میں سے صرف اپنے اور اپنے بچوں کی خوراک لے لیتی ہے۔ باقی رعایا کا حصہ رہتا ہے۔ اگرچہ اس کی رعایا ایسی اطاعت گذار ہے کہ ملکہ خواہش کرے تو سارا شہد اس کے حوالے کر دے یا کم سے کم جو زائد ٹیکس ان پر لگایا جائے اس کو خوشی خوشی برداشت کرے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ ملکہ رعیت کے حصے پر بری نگاہ نہیں ڈالتی اور قناعت سے اپنے حصہ پر زندگی بسر کر لیتی ہے۔

ذرا سننا پھولوں کی ڈالیوں سے کیسی گونج کی آواز آ رہی ہے۔ یہاں تو سوا مکھیوں کے اور کچھ نظر نہیں آتی۔ تاہم سمجھ میں آگیا۔ گونج انہی مکھیوں کے پروں کی ہے مگر نہیں بہت سی مکھیاں پھولوں پر بیٹھی رس چوس رہی ہیں۔ پروں میں کسی قسم کی حرکت نہیں ہے۔ اسپر

Marfat.com

بھی ان میں سے ایک آواز آتی ہے۔ یہ کس چیز کی صدا ہے؟ آپ کو خبر نہیں۔ یہ مکھی کا ترانہ حمد و شکر ہے۔ رزق کھائی جاتی ہے اور رازق کا شکرانہ ادا کرتی جاتی ہے۔ اسی پر بس نہیں بان کے چھتے میں جا کر دیکھ لینا صبح و شام ایک خاص آواز سنائی دیگی وہ بھی انکی حمد و ثنا ہوتی ہے۔

گھریلو مکھی

اب قسم دوم گھریلو مکھی کو لیجئے جس کو آپ کی اصطلاح میں مگس بے حیا کہتے ہیں۔ کیسی ملنسار اور محبت کرنیوالی چیز ہے۔ آپ دھکے دیتے ہیں، دھتکارتے ہیں اور وہ دامن نہیں چھوڑتی۔ چہرہ سے اڑایا تو وہ ہاتھ پر آ بیٹھی۔ وہاں سے جھٹکا تو قدموں میں آن گری۔ بہت ہوا تو طواف کرنے لگی اور دو چار چکر لگا کر پھر پہلو میں آ گئی۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اس کے ایک پر میں زہر ہے اور دوسرے میں تریاق کھانے میں گرتی ہے تو پہلے زہر دار پر ڈالتی ہے اس لئے حکم ہے کہ اسکو غوطہ دیکر پھینکا کرو تاکہ تریاق کا اثر زہر کو معتدل کر دے۔ کون مسلمان ہے جو اس حدیث کے سننے کے بعد بے چاری مکھی پر آنکھیں نہ نکالے گا۔ مگر اس میں اس غریب کا قصور نہیں۔ یہ تو قدرتی بات ہے کہ ایک پر میں زہر رکھا گیا ہے اور دوسرے میں تریاق۔ جب وہ گرتی ہے تو اپنے اختیار سے نہیں گرتی۔ بے قابو ہو کر غوطہ کھاتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ محض قدرتی حکمت کا تقاضا ہے کہ زہر دار پر کے رخ پر گرائی جائے۔

ہندو مذہب سے مکھی کی عداوت

ایک ہندو فقیر نے، جو چھوت چھات کی قید سے آزاد تھا، بڑی دلچسپ بات کہی کہ میاں ہندو مذہب والے نخواہ مخواہ چھوت چھات کا غل مچاتے ہیں اور اپنے ہمسایہ

Marfat.com

مسلمان بھائیوں سے الگ تھلگ رہ کر ان کے دلوں کو مکدر کرتے ہیں۔ پہلے کمبخت مکھی کا تو کچھ تدارک کریں جس نے چھوت چھات کے تمام اصول میں گڑبڑ ڈال رکھی ہے مسلمانوں سے تو ان کی گوشت خوری کے سبب احتیاط کی جاتی ہے مگر مکھی کا کیا علاج جو گوشت پر بیٹھتی ہے اور اسی وقت اڑ کر برہمن کی رسوئی اور دال بھات کی تھالی میں آجاتی ہے اسی پر بس نہیں سارے جہان کے غلیظ اور میلے کچیلے مقامات میں مکھی کا گذر ہے اور اسی حالت میں پاک صاف نہائے دھوئے ہندوؤں کے بدن۔ کپڑے۔ کھانے پر پہنچتی ہے پھر چھوت کہاں رہی۔ اس نا ہنجار نابکار نے تو گندے ستھرے کو ایک کر دیا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ کچھ علاج سمجھ میں نہیں آتا مسلمانوں سے تو علیحدہ رہنا ممکن مگر اس موذی سے کسی طرح چھٹکارا اور بچاؤ ممکن نہیں

فقیر نے کہا سنتے ہیں کہ آدمؑ کے بیٹے نے اپنے بھائی کی لاش کوّے سے سیکھ کر دفن کی تھی۔ لہذا ہندو مکھی سے نصیحت حاصل کریں اور چھوت کے خیال کو چھوڑ کر مسلمانوں سے شیر و شکر ہو جائیں۔

مُردار خوار مکھی

مکھی کی تیسری قسم مردار خوار ہے۔ یہ عموماً قبروں اور سڑی ہوئی لاشوں اور قتل گاہوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کے زہر سے خدا بچائے بڑی خوفناک چیز ہے میں تو جب کبھی اس سبز رنگ کی مکھی کو دیکھتا ہوں تو موت کے بعد کا زمانہ یاد آجاتا ہے اور خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ مجھکو اور سب بھائیوں کو مکھی کے عذاب سے بچائے۔

مکھی کے صوفیانہ اوصاف

(۱) جس طرح صوفی لوگ انسان کی روحانی حفاظت کیلئے پیدا کئے گئے ہیں مکھی بھی جسمانی محافظ ہے۔ گھروں کی زہریلی چیزوں کو چوس چوس کر صاف کر دیتی ہے۔

Marfat.com

(۲) دل میں جذبۂ الفت رکھتی ہے۔ گو پروانہ کی مانند جل مرنا اس کو نہیں آتا تاہم جس گھر میں پیدا ہوتی ہے اس سے دلی محبت رکھتی ہے۔ ہر وقت پاس رہنا چاہتی ہے ہزار تدبیریں اس کو جدا کرنے کی کیجئے مگر یہ دامن نہیں چھوڑتی۔

(۳) متوکل ہے جو مل جائے کھا لیتی ہے دربدر ماری ماری نہیں پھرتی

(۴) بہت سویرے بیدار ہوتی ہے اور اپنے محبوب انسان کو غافل دیکھنا گوارا نہیں کرسکتی۔ اس لئے سوتے میں بار بار چہرہ پر آتی اور بار بار پر مار کر بھنبھناتی ہے اور زبان حال سے کہتی ہے۔ اُٹھ پیارے آدمی یہ وقت خدا کی حمد کا ہے۔ دیکھ کیسا سہانا سماں ہے، بیدار ہو اور دوگانہ شکر بجا لا۔ تو اب تک پڑا سوتا ہے۔ مجھکو دیکھ بڑی دیر سے جاگ رہی ہوں اور خدا کی دی ہوئی ہوا میں اُڑتی پھرتی ہوں۔

(۵) شہادت پسند ہے۔ یعنی دانستہ مکڑی کے منہ میں چلی جاتی ہے تاکہ اس کا بھوکا پیٹ بھرے اور یہ مرتبہ شہادت کمائے۔ آپ کہیں گے اس میں مکھی کا کیا کمال ہے مکڑی تو بے خبری میں چھاپہ مارتی ہے۔ مکھی کی تو خوبی جب تھی کہ جان بوجھ کر موت کے منہ میں چلی جاتی۔

یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ آجکل کے سائنسداں ڈاکٹروں نے خوردبین آلات سے مشاہدہ کیا ہے کہ مکھی کے جسم میں ہزاروں آنکھیں ہیں، تو بس جس کے دو نہیں ہزار آنکھیں ہوں وہ مکڑی کے داؤں سے بے خبر کیونکر رہ سکتی ہے۔

نہیں جناب یہ صرف مکھی کا ذوق قربانی ہے کہ اپنی ہستی کو مٹا کر دوسرے کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ کاش ہم لوگ بھی مکھی ہی سے جاں نثاری کا سبق سیکھیں اور عشق حقیقی کے جالے میں گرفتار ہو کر فنائیت حاصل کریں۔

نوٹ: مکھی کے اس مضمون میں ہندو مسلم الفاظ بھی تھے جو موجودہ زمانہ میں مناسب سمجھے گئے۔ لہذا ان کو لفظ انسان واچھوت سے بدل دیا گیا۔ حسن نظامی نومبر ۱۹۳۶ء

اُلّو

ازرسالہ صوفی ۱۹۱۰ء

اُلّو ایک ایسے جانور کا نام ہے جس کی نحوست کو سب مانتے ہیں. ضرب المثل کے جملے بے چارہ اس پرندے کے وجود پر بن گئے ہیں جب کسی گھر یا شہر کی ویرانی بیان کرنی منظور ہو تو کہتے ہیں کہ وہاں تو اُلّو بول رہا ہے یعنی وہ مقام بالکل اُجاڑ ہے. آبادی کی چہل پہل بالکل نام کو نہیں اور فقط نحوست اور ویرانہ پن میں ہی اُلّو بدنام نہیں ہے، حماقت و بے عقلی کے موقعہ پر بھی اُلّو ہی کا نام لیا جاتا ہے. اُلّو کی آواز سے بہت بدشگونیاں منسوب ہیں.

پس ایسے منحوس جانور کے ذکر اذکار میں کون جی لگائیگا. کس کو رغبت ہوگی کہ بلبل ہزار داستان اور طوطی شکر مقال کے چرچوں کو چھوڑ کر اس بدنام پرندہ کے بیان میں مصروف ہو. مگر دنیا کے پردہ پر سب آدمی ایک مزاج و طبیعت کے نہیں بستے۔ ہزار اُلّو کو بُرا کہنے والے ہیں تو دو چار اس کی مدح سرائی کرنے والے بھی نکل آئیں گے خاصکر وہ گروہ جو موجودات کے ہر نیک و بد کو صفاتِ یزدانی کا مظہر تصور کرتا ہے۔

جو لوگ بلند آسمان، چمکدار ستاروں، روشن آفتاب و ماہتاب، لہلہاتے باغوں میں شانِ غیبی کا ظہور مشاہدہ کرتے ہیں جن کو چشم مستانہ میں جلوۂ راز نظر آتا ہے جو گل کی صورت میں حسنِ ازلی دیکھتے ہیں جن کی زبان سے ان نظاروں کو دیکھکر یہ نکلتا ہے۔ کہ اے خدا تو نے چنیں نفوس انبیائے عالی ہمہ پست زمین، اندھیری رات، سنسان بیابان، نگاہِ معموم اور نوکدار کانٹوں میں بھی حقیقت کی نمود پاتے ہیں (وہ ہر چیز میں خدا کی شان نظر آتی ہے)

ہنداکوئی وجہ نہیں کہ اس جماعت کے رسالہ میں جس کا مشرب ہمہ اوست ہے، اور جو خیمہ و شمر و دون ہو محمل لیلیٰ کے جرس کی صدا سنتے ہیں، اُلّو کی سرگذشت نہ لکھی جائے صوفی کی

Marfat.com

روش یہ ہونی چاہیئے کہ ہر اچھی بُری چیز میں منزل مقصود کو تلاش کرے۔ یہ رسالہ صوفیوں کا ہے اس لئے اس میں بھی جہاں عام پسند عنوانوں پر مضامین لکھے جاتے ہیں وہاں ان عنوانوں کو بھی زیر بحث لایا جائے جن پر توجہ کرنا قاعدہ اور دستور کی نظر میں قابل نفرت ہے۔

اُلّو کے اوصاف

اُلّو کی زندگی، بود و باش ایک باخدا، تارک الدنیا درویش کی سی ہے۔ وہ آبادی سے گھبراتا ہے۔ اس کو خلوت، تنہائی بھاتی ہے۔ عام پرندوں کی طرح رونق دار شہروں اور عمل شور کے مقام پر آشیانہ نہیں بناتا۔ سرسبز درختوں کی شاخوں پر بیٹھ کر نغمہ سنجی نہیں کرتا جس سے فرحت پسند انسان جی بہلائے۔ اُلّو سارا دن حریص پرندوں کی مثل پیٹ کی خاطر در بدر مارا مارا نہیں پھرتا بلکہ وہ اجاڑ اور غیر آباد کھنڈروں میں نشیمن بناتا ہے جہاں کوئی غیر مانوس آواز اس کی مشغولی میں خلل انداز نہ ہو۔ دن بھر صائم رہتا ہے اور شام کو سورج چھپنے کے بعد رزق کی تلاش میں نکلتا ہے اور جونہی نکلا خدا تعالیٰ شکار کے چند لقمے دلوا دیتا ہے جن سے روزہ افطار کر کے کسی ٹوٹے ہوئے گنبد یا جھکی ہوئی دیوار پر آ بیٹھتا ہے اور ہُو ہُو کے نعرے لگانے لگتا ہے۔ اسی ذکر و شغل اور یاد الٰہی میں صبح ہو جاتی ہے اور یہ پکا اور سچا صوفی ریاکاری کے ڈر سے خاموش ہو کر اپنے حجرہ میں گھس جاتا ہے اور حبس دم کر کے مراقبہ میں بیٹھ جاتا ہے پھر شام تک باہر نہیں آتا۔

یہ خود پسند آدمی بادشاہی کا تاج پہن کر نوبت نقارے بجواتا ہے۔ نوبت خانوں کیلئے اونچے اونچے مکان تیار کراتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ نوبت ہمیشہ بجے گی لیکن زمانہ کا چکر چند ہی روز میں اس سرکش کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ پھر دنیا والے اس کو اور اس کے نوبت نقاروں کو بالکل بھول جاتے ہیں مگر اُلّو نہیں بھولتا مٹنے والے تاجدار کے خاکی ڈھیر پر جاتا ہے اور نقیب و چوبداروں کی آواز کو صدائے عبرت میں مرنے والے کے

وجودِ خدا کی کو سناتا ہے اور اس کے نوبت خانہ پر ٹھیک رات کے بارہ بجے یہ نوبت بجاتا ہے کہ یہاں کی ہر چیز کو فنا ہے باقی رہنے والی بس خدا کی ایک ذات ہے۔

ایک دفعہ گرمی کے موسم میں راقم الحروف درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحب میں حاضر تھا۔ پچھلی رات جبکہ چاند غروب ہو رہا تھا، جی چاہا کہ قطب مینار کا نظارہ کروں۔ اسوقت عجیب پُر اثر وقت تھا۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔ درگاہ شریف سے نکل کر مقبرہ ادہم خاں کے قریب آیا تو دسویں رات کے چاند کی صورت سامنے آگئی۔ بیچارہ ماندگی کے عالم میں اُفق تنزل پر جھک رہا تھا اور اپنی افسردہ شعاعیں ویران در دیوار پر ڈال رہا تھا۔ اِل بجی روشنی میں شاہی کھنڈرات کی صورت ایسی ہیبت ناک اور ڈراؤنی معلوم ہوئی کہ کلیجہ کانپنے لگا۔ تاہم ہمت کر کے ذرا اور آگے بڑھا۔ جوگ مایا کا مندر دُور سے نظر آرہا تھا۔ دوسری طرف جو پھر کر دیکھا تو غیاث الدین بلبن اور محمد خاں شہید کے شکستہ مقبرے اور بیسیوں اونچی نیچی ٹوٹی پھوٹی عمارتیں نظر آئیں جن پر پھیکی پھیکی چاندنی اور رات کی خاموشی نے خبر نہیں کس بلا کا اثر پھیلا رکھا تھا کہ بے اختیاری کی سی حالت پیدا ہوگئی لیکن ارادہ قطب مینار دیکھنے کا تھا۔ ان نظاروں میں تھوڑی دیر مصروف رہکر آگے بڑھ گیا اور علاؤ الدین خلجی کے مقبرہ کے پاس پہنچا تو بے چارہ سلطان خلجی اکیلا تنہا خوفناک کھنڈر کی گود میں پڑا سوتا ہے۔ کوئی پہرہ دار نہیں، پاسبان نہیں جو اس سکندر ثانی کی خوابگاہ کے قریب جانے سے مجھ اجنبی کو روکے زندگی کی تو خبر نہیں مرنے کے بعد جب ابن بطوطہ نے اس مقبرہ کو دیکھا تھا۔ تو عجب شان تھی۔ زریں مخملی غلاف بچھے ہوئے تھے۔ اگر اور لوبان کی خوشبو سے مقبرہ مہک رہا تھا۔ عالی شان گنبد کے قریب بہت بڑا مدرسہ تھا جہاں سینکڑوں طلباء علوم و فنون حاصل کرتے تھے۔

آج کی رات نہ گنبد باقی تھا نہ غلاف۔ نہ خوشبو۔ نہ مدرسہ۔ نہ طلبا یہاں تک کہ

Marfat.com

قبر کا نشان بھی ناپید تھا چونے اور پتھروں کے انبار میں خبر نہیں کس جگہ سکندر ثانی سلطان علاؤالدین خلجی کی ہڈیاں پڑی تھیں. اس منظر نے میرے پاؤں پکڑ لئے بدن ساکن کر دیا. آنکھوں کو دریائے عبرت میں غرق کر دیا. محو حیرت بنا کھڑا تھا کہ سامنے کی شکستہ دیوار پر سے اُلو کی صدا کان میں آئی جو سلطان کی گذشتہ شان و شوکت کا نوحہ رُک رُک کر پڑھ رہا تھا.

ان سب پُر اثر نظاروں سے زیادہ میرے دل پر صدائے بوم کی چوٹ لگی نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت کیا حالت ہوئی اور اب جب اس کا خیال کرتا ہوں کیا کیفیت دل کی ہو جاتی ہے تو کیا ایسے ناصح اور بیکسوں کے دمساز جانور کو آپ بُرا کہہ سکتے ہیں؟ اگر اس کی محل شناسی پر غور کیا جائے تو بیساختہ داد دینی پڑتی ہے جن کو سب بھول گئے سب نے چھوڑ دیا ان کو اُلو نے نہیں بھلایا اور ساتھ نہیں چھوڑا. اُلو کی آواز کو منحوس ناحق کہتے ہیں. ذرا دھیان سے سنو اللہ ھو صاف سمجھ میں آئیگا بعض دفعہ ہو ہو بھی کہتا ہے اور بعض وقت پورا اللہ ھو پکارتا ہے. بنگالی مینا، ہیرامن طوطا اور ننھی ننھی خوبصورت چڑیاں میٹھی میٹھی بولیوں سے آپ کا جی خوش کرتی ہیں مگر اُلو اپنے نعرہ حق سے آپ کے دل کو لرزا دیتا ہے. اس لئے آپ اس کو منحوس کہتے ہیں. نہیں نہیں ایسا خیال نہ کرو. یہ خوشنوا پرندے دل کو یادِ حق سے ہٹا کر تکلفاتِ دنیا میں مصروف کرتے ہیں اور اُلو کی جگر خراش فریاد انجام حیات کو یاد دلاتی ہے اور کہتی ہے. ؎

جگہ دل لگانے کی دنیا نہیں ہے ۔۔۔ یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

آج سے آپ کو چاہیئے کہ اُلو کی نحوست کا خیال چھوڑ کے اس کی خوبیوں پر غور کیا کیجئے اور اُلو پر کیا منحصر ہے، عالم موجودات میں جو شے نظر سے گذرے، اچھی ہو یا بُری، اس کے اچھے معنی نکالنے چاہئیں۔

نوٹ:۔ اس مضمون میں جس قدر قرآنی فقرے تھے ان کی جگہ اردو فقرے کر دئے گئے ہیں تاکہ سب ناظرین سمجھ سکیں۔ حسن نظامی نومبر ۱۹۰۹ء

رسول کی من بھاتی غذا

جو

ازاخبار زمیندار ۱۹۱۲ء

میرا اچھا بیٹا زرد پوش جو کیسا پیارا پیارا ہے۔ پیدا ہوتے ہی عشقبازی کا بسنتی لباس پہن لیتا ہے اور مرتے دم تک اس کو تن سے جدا نہیں ہونے دیتا۔ یہانتک کہ موت کی چکی میں پس کر نابود ہو جاتا ہے۔ اس نکیلے دانہ سے نفرت نہ کرنا۔ بھائی یہ تمہارے رسول صلعم کا منہ چڑھا دانہ ہے یہی وہ ہستی ہے جس کے آگے کسی کھانے کو سرکارِ رسولؐ تک رسائی نہ ہو سکی تھی۔ اس کی تعریف کون کرے۔ خلقت تو دیوانی ہو گئی ہے جس کو دیکھو

گندم گنہ گار

پر جان دیتا ہے۔ روٹی تو روٹی محبوب بھی گندمی رنگ کا تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ وہی میاں دانۂ گندم ہیں جن کو نوش کر کے آدم جنت سے نکلے اور عتابِ الٰہی کے سزاوار ہوئے۔

یہ وہی چیز ہے جس کو مولانا روم اپنی مثنوی میں ہوس پرستوں کی عشق بازی کا سبب قرار دینے کو کہا ہے۔ کہ۔ ع این خمار از خوردنِ گندم بود

نہیں جناب۔ ہم کو تو اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی من بھاتی غذا جو مرغوب ہے اس کا تن بھی اچھا اور من بھی مزہ دار

پالیسی کی تلاش

لوگ کہتے ہیں ہندستانیوں کو ایک نئی پالیسی بنانے کی ضرورت ہے۔ اگر واقعی یہ ٹھیک ہے

تو بھی میرے نزدیک پالیسی یہ ہونی چاہیئے کہ

جَو کھاؤ اور جَو کی رنگت بن جاؤ

لیگ وکانگریس، اسکول وکالج، ہوش وخرد سب کو آگ لگادو۔ گردش سے یہ وقت آگیا کہ پیٹ بھرنے کو جَو کے چار دانے بھی نہیں ملتے، تو بس یہی پالیسی بہتر ہے کہ دیوانہ وار جَو کا چھلکا اتارنے کی کوشش کرو۔

خبر نہیں میں نے کیا کہا اور آپ کیا سمجھے؟ یہ کوئی معمہ نہیں ہے جَو کو چاہتا ہوں، جَو پر مرتا ہوں۔ اسی کا نام بار بار زبان پر آتا ہے۔ مدینہ شریف سے واپس آکر دونوں وقت جَو کی روٹی کھاتا ہوں۔ اس میں صحت ہے، تندرستی ہے، طاقت ہے، لذت ہے اور وہ یاد ہے جس کے بھولنے نے قوم کو تباہ وبرباد کردیا۔ یاد رکھ، بھول مت۔ رسول جَو کھاتے تھے، صحابہؓ جَو کھاتے تھے۔ تلوار چلانے والے، ہاتھ اور ملک چلانے والے، دماغ کو وہ معذ خوراک دیتا تھا جس میں جَو کی روٹی کے سوا توس مکھن کا نام نہ تھا۔ ذرا کھا کر تو دیکھو کیسی مزہ کی چیز ہے۔ ذرا سا خمیر ملا لیا کرو روٹی نرم ہوجائے گی اور ہضم میں دیر نہ ہوگی۔ سنا ہوگا دلّی میں دربار تھا۔ انہی دنوں کا ذکر ہے مرنے والے بہادر شاہ بادشاہ کے خاندان کی چند شہزادیاں اپنے ٹوٹے ہوئے بوریئے پر بیٹھی جَو کی روٹی کھا رہی تھیں چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ سردی چمک رہی تھی۔ سب سے چھوٹی سات برس کی عمر والی لڑکی اپنی ماں سے مخاطب ہوکر بولی۔ کیوں بی اماں یہ انگریزوں کے بادشاہ بھی جَو کھاتے ہوں گے۔ کیونکہ تم نے پرسوں کہا تھا کہ سب بادشاہ اور ان کے بچے جَو کھایا کرتے ہیں۔ ماں اس معصومانہ سوال کو ٹالنا چاہتی تھی مگر بچی نہ مانی اور بولی اچھی بی بتاؤ۔ جواب ملا نہیں۔ جو دربار کرتے ہیں وہ جَو نہیں کھاتے۔ میں نے پرسوں تم سے یہ کہا تھا کہ بادشاہ اور ان کے بچے جَو کھایا کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جن

Marfat.com

بادشاہوں کا نام فقط بادشاہ رہ جاتا ہے اور کام چھن جاتا ہے۔ ان کو جو کے سوا اور کچھ کھانے کو نہیں ملتا بلکہ یہ جو کا ٹکڑا میسر آجاتا ہے اس کو بھی غنیمت سمجھو۔ تقدیر تو اس قابل بھی نہیں۔ آج لاکھوں روپیہ آتشبازی اور خبر نہیں کن کن بازیوں میں سرکار انگریزی کا خرچ ہو جائے گا مگر اس سے کون کہے کہ ہم تیمور کے گھر والے جو کی روکھی روٹی سے بھی محتاج ہو گئے ہیں ایک بازی ہمارے نام کی بھی لگا دو۔ دلّی میں تخت بچھا ہے۔ ایک نظر ان پر بھی ڈالو جو کل کے دن اس تخت کے مالک تھے اور آج فرش خاک پر ذلیل پڑے ہوئے ہیں۔ مگر ہوا کس کا کہنا کس کا سنتا میں تم سے کہتی ہوں کہ شاہوں کے شاہ سلطانِ کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی جو کی روٹی کھاتے تھے۔ ہم اور کسی بادشاہ کو کیوں دیکھیں اپنے آقا و مولا کی مثال کیوں نہ دیں۔ کہتے ہیں دانہ دانہ پر مہر ہوتی ہے دسولیناؔ میں جو کے دانہ پر قبولیت کی مہر لگنی چاہیئے۔ دیکھوں کتنے عاشقانِ رسولؐ گندم ترک اور جو اختیار کرتے ہیں یقین مانو کہ مسلمانوں کو غذا کا فیشن فوراً بدلنا چاہیئے۔ سفید چپاتی پر مرنا چھوڑ دو۔ تم کالے ہو گوری چیز سے رشتہ جوڑو گے تو قانون گھور کر دیکھے گا۔ اگر دس بیس خدا کے بندے جو کھانے کا عہد باندھ لیں تو میں سمجھوں گا روحانی حکومت کی زندگی میں جان پڑ گئی کیونکہ بزرگوں سے سنا ہے کہ روح کا رنگ زرد ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ روحانی حکومت کو دنیاوی حکمرانوں سے کچھ سروکار نہیں۔ ذوق وشوق کی اقلیم پر قبضہ کرنا اور اس میں اپنا سکہ وخطبہ رائج کرنا مقصود ہے تو اس خواہش کو زرد خطرہ نہ بنا لیا جائے جیسے کہ چین وجاپان کی زرد قوموں سے ولایتی مضمون نگار زرد خطرے کا عنوان قائم کر کے ڈرایا کرتے ہیں۔ میرا جو اندیشہ کی چیز نہیں صاف ہے چکنا ہے، ایسے ہی ہم اس کے چاہنے والے بھی پالیٹکس سے علیحدہ اور کسی دوسری دھن کے شیدائی ہیں۔ یا یوں کہو کہ گورے آدمیوں کی طرح کہتے ہیں کہ ہم سیاسی آدمی نہیں ہیں مگر آزادی کے عشق میں جو کی طرح زرد ہو گئے ہیں۔

Marfat.com

پھولوں کے شکوے

قسمت و تقدیر کی شکایتیں

از توحید ۔ ۱۶ ۔ اپریل ۱۹۱۳ء

میرٹھ کی نوچندی میں راقم فقیر نے پھولوں کی نمائش دیکھی یہی سارے مجمع کی جان تھی ادھر پھول، اُدھر پھول، نیچے پھول، اوپر پھول. چاروں طرف گل خانے ہی گل خانے نظر آتے تھے. آراستہ خیمے میں سفید فرش پر میزیں سجی ہوئی تھیں جن پر جداگانہ سلیقہ و ترتیب سے چینی اور شیشے کے گملوں میں رنگ برنگ کے پھول لگائے گئے تھے. نمائش اس کی تھی کہ کس نے نیچرل اور موزوں طریقے سے پھولوں کو چُنا ہے چننے والیاں بھی جن کو انگریز مس بابا لوگ کہتے ہیں، جگہ جگہ موجود تھیں اور فرش کے متحرک پھول ثابت ہو رہی تھیں. فقیر اس عالم "گلُ و گِل" کی سیر کرتا پھر رہا تھا کہ یکایک ایک جھاؤ کی ٹوکری پر نگاہ پڑی جس میں چند نہایت خوشرنگ و خوبصورت پھول رکھے ہوئے تھے اور یہ ٹوکری زمین پر دھری تھی ان کو دیکھ کر آگے بڑھا ہی تھا کہ تصور کے کان میں ایک شیریں آواز نے کچھ کہا۔ یہ صدائے گل تھی جو اپنی قسمت و تقدیر کا شکوہ کرتی تھی۔ اُس نے کہا جب میری اور میز کے سامنے والے گلدستہ کی ایک ذات ہے، ایک رنگت ہے، ایک بُو ہے تو پھر اس کی کیا وجہ کہ اس کو شیشے کے گملہ میں شاندار میز پر لگایا ہے اور مجھکو جھاؤ کی ٹوکری میں زمین پر ڈالدیا ہے ۔

پھول کے اس شکوے سے دل پر چوٹ لگی اور ڈاکٹر اقبال کا شکوہ یاد آگیا جو اُنہوں نے خدا سے کیا تھا کہ اتنے میں دوسرے کان میں صدائے مخفی نے اس کا

Marfat.com

جواب دیا اور کہا کہد ے۔ اے سننے والے! ٹوکری کے پھول گوشہ اور خلوت کے امن میں ہیں۔ دیدار بازوں کی یورش میز پر ہے۔ مگر یہ سب ہوس پرست ہیں۔ پھول کی ظاہری خوشنائی کو دیکھتے ہیں لیکن پھول کو دیکھنے کے لئے نظرِ عرفان بھی چاہتی ہے یہ ایسی بڑی عزت ہے جو میز کے پھول کو نصیب نہیں۔ پس اے ٹوکری کے غریب گلدستے! تجھ کو بشارت ہو کہ تیری شان کو دوام ہے اور میز کے پھول کو زوال۔

دوسری طرف پھلوں کی میزیں تھیں۔ ہر قسم کے میوے اور پھل چنے ہوئے تھے ان میں بعض پھلوں کو تراش کر دکھایا گیا تھا۔ ایک ترشے ہوئے پھل نے کہا۔ مجھکو زخمی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ جواب آیا۔ تیرا باطن اہلِ ظاہر کو نظر آجائے اور وہ بھی اپنے اندرون کو چیر کر دیکھیں کہ اس میں اور ظاہر میں کچھ فرق تو نہیں ہے؟

ہولناک لیکچر

از توحید ۱۶ مئی ۱۹۱۳ء

کل رات کو ہم دیکھ رہے تھے ۲۹۔ جمادی الاولیٰ کا چاند شب اول کے ہلال کی مثل ستاروں میں جھلملا رہا تھا۔ یہ آخری تاریخ تھی۔ اب دو تین روز تک یہ چاند مخفی رہے گا اور ۲۹ یا ۳۰ تاریخ کو نمودار ہوگا مگر جمادی الاولیٰ کے نام سے نہیں جمادی الآخریٰ نام لیکر۔

راقم فقیر آسمانوں والے، زمینوں والے، پہاڑوں اور سمندروں والے، نور و ظلمت کے رکھوالے خدا سے کچھ مانگ رہا تھا کہ احساس و ادراک کے کان میں ایک نطق، ایک خطبہ، ایک لیکچر، ایک تقریر کی آواز آئی۔ ہوش نے اپنے گوش ادھر لگائے اور سُنا۔

افسردہ اور اداس چاند ستاروں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ستارے دل لگائے

Marfat.com

سن رہے تھے۔ بیان ہولناک تھا۔ لہجہ اندیشہ خیز تھا۔ دل نے کہا زمین کے قانون بنانے والے سنتے نہ ہوں۔ صوت سرمدنے جواب دیا۔ نہیں وہ سب سوتے ہیں خفیہ پولیس کارِخاص کے اہل کار نسیم سحر کی آغوش میں مدہوش پڑے ہیں۔ پہرہ پر کوئی نہیں۔ چاند نے کہا۔

ستارو! سنتے ہو۔ اب ہم تم چند ساعت کے مہمان ہیں۔ آفتاب افق مشرق سے طلوع ہونے والا ہے۔ نور کو انوار زیر و زبر کرنے آتے ہیں۔ آج کی رات ہمنے تاریکی کا مقابلہ کیا۔ اس سے لڑے۔ اس کو شکست دی مگر اہل جہاں سوتے رہے۔ ہماری معرکہ آرائی کی سیر نہ دیکھی۔ اب سورج کی جنگ دیکھنے کے لیے سب کی آنکھیں کھل جائنگی

میرے درخشندہ بھائیو! آسمان کی خاموشی دور ہونے والی ہے۔ زمین کا سکوت ختم ہونے کے قریب آگیا ہے اس لئے میں اپنی مہینہ بھر کی روشن گویائی کو تمام کرتا ہوں اور حجرۂ خلوت میں جاتا ہوں۔ کل کی رات اور پرسوں کی رات اور شاید اس کے بعد ایک اور رات مجھکو میدان فلک میں نہ پاؤ گے۔ تمہارا کمانڈر غروب ہوتا ہے، تمہارا سردار تلوار میان میں کرتا ہے۔ تنہائی میں ہمت نہ ہارنا ظلمت شب کا مردانہ وار مقابلہ کرنا۔ وہ دیو ہیکل ہے۔ تم نازک اندام ہو۔ ڈر نہ جانا۔ سپاہ باطل کو رنیدہ کا فتح کرلینا دشوار نہیں، جب تاریکی کے لشکر سمندروں، پہاڑوں اور زمینوں کے غاروں سے نکل کر آسمان کے کناروں پر حملہ آور ہوں تو مریخ اپنا منور دستہ لیکر میمنہ کو سنبھالے، مشتری میسرہ کو روکے۔ زحل قلب میں جم جائے زہرہ اور عطارد کمسریٹ کی نگہانی کریں۔ باقی افسر کمینگا ہوں میں رہیں۔

شہاب ثاقب کی سرچ لائٹ سے دیکھ بھال رکھنا۔ بےخبری بُری بلا ہے اور اس کے بعد فائر ہو۔

نورانی گولے اندھیرے پر برسائے جائیں شعاع کی سنگینیں چلیں۔ کرنوں کی

Marfat.com

گولیاں سَن سَن کرتی نکلیں۔

جب دشمن کا پاؤں ڈگمگائے، شکست کے آثار نمودار ہوں سب سپاہی چمکیں دمکیں اور ایک آخری حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیں۔

جب آسمان کا ملک صاف ہو جائے گا، تاریکی کا کوئی حصہ باقی نہ رہے گا تو فرشتے فتح کا جشن رچائیں گے پروردگار کی نصرت غیب کا ترانہ گائیں گے۔ تم بھی اپنی زبان کھولنا۔ حمد سبحان ذی شان میں فرشتوں کی شرکت کرنا۔

ستاروں نے کہا۔

اے عثمانی ہلال کی صورت کے قمر! ہم کیا ہماری بساط کیا۔ غریب غروب ہونے والے تارے ہیں۔ تو بھی چھپ جانے والا کرۂ نور ہے۔ دن کا صف شکن آفتاب ہم سب میں بڑا ہم سب سے زیادہ شہ زور ہے۔ مگر رات کو نا پید ہو جاتا ہے۔ اس پر کیا گھمنڈ اور غرور کریں۔ تاریکی بھی خدا کی پیدا کردہ ہستی ہے اس سے کیوں لڑیں۔ خوں ریزی وسفاکی اپنا کام نہیں۔ خاموشی میں پیدا ہوئے، خاموشی میں مر جائیں گے۔ پھر اس غل شور فتنہ وفساد سے کیا سروکار۔ کچھ اور سنا کوئی اور بات کہہ۔ زہرہ کا ایک گیت سُن نغمہ سرائی میں جی لگا۔ گود میں پاؤں لٹکائے میٹھا ہے۔ ایسی نصیحت کر جو یادگار زمانہ ہو۔ اور آسمانی نصیحت اور آکاش بانی کہی جائے۔

چاند مسکرایا۔ اپنی جگہ سے سرکا اور جھک کر ستاروں کے کان میں کچھ کہا جس سے وہ سب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ تلواریں میانوں سے کھینچ لیں اور ایک ایک کر کے نابودی کی رزم گاہ میں گھس گئے اور ان کے پیچھے چاند بھی کن انکھیوں سے دنیا کے سونے والوں کو دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ چلا اور آخر کہیں غائب ہو گیا۔

یہ کیا کہا؟ اس کو کون سمجھا۔ ناسمجھ کہیں گے چند الفاظ جوڑ کر رکھ دئیے ہیں جن کا مطلب کچھ بھی نہیں ہے۔ اُن سے کہو بے مقصد اس دُنیا میں نہ کوئی آواز ہے نہ کوئی حرکت ہے پھر یہ بے مطلب کیونکر ہے؟

خاکی جام

فنا کے بعد بقا

عشق کی خیالی داستان

از توحید۔ یکم جولائی ۱۹۱۳ء

جب فراق کی بے چینی آدم زاد سے برداشت نہ ہو سکی، جب ہجر کی بے قراری انسان کے وجود خاکی کی تاب و توانائی سے بڑھ گئی تو مایوس ہستی نے زہر کا ایک پیالہ ہاتھ میں لیا۔ آسمان کو دیکھا اور کہا۔ پیدا کرنے والے خدا۔ یہ مشت خاک اتنی بڑی امانت کے قابل نہیں ہے اپنی امانت واپس لے۔ میرے بازوؤں کو اس بوجھ سے ہلکا کر اور اگر تو ایسا نہیں کرے گا، یا نہیں کرنا چاہتا تو میں خود اس بار سے سبکدوش ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر زہر کا پیالہ پی لیا اور تھوڑی دیر میں تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ اس کے بعد رسموں کے پابند لوگ آئے بے جان لاش کو نہلایا اور سفید کفن کا جوڑہ پہنا کر جنگل بیابان میں ایک گہری قبر کے اندر لیجا کر دفنا دیا۔ کسی نے یہ خیال نہ کیا کہ ہمارے ابنائے جنس پر کیا گزر گئی اور ہم کیوں اس معدوم ہستی نا پیکر کو خاک میں ملاتے ہیں۔

(۲)

بڑے زور کی آندھی آئی۔ بادل کڑکے بجلی چمکی۔ طوفانی بارش ہوئی۔ جنگل میں پانی زور شور سے بہنے لگا۔ پہاڑی ندی میں سیلابی کیفیت پیدا ہوئی جس کی زد میں پرانا قبرستان بھی آگیا شہید محبت کی قبر ذرا اونچے مقام پر تھی سیلاب سے بچ گئی

Marfat.com

تاہم سامنے کے غار میں کچھ دن کے بعد معہ پتاؤ کے یہ بھی گرپڑی اور گڑھے کے اندر مٹی کا انبار بنی رہی۔ اس کو بھی ایک سال گذر گیا۔ اتنے میں ایک اور طوفان آیا۔ سردی کا موسم تھا۔ اس زور سے اولے پڑے کہ تمام صحرا سفید ہو گیا۔ قاعدہ ہے کہ اولے جب برستے ہیں تو پانی ان کو سمیٹ سمیٹ کر نشیبی مقامات میں جمع کر دیتا ہے۔ چنانچہ جس گڑھے میں ہمارے مردۂ عشق کی خاک پڑی ہوئی تھی وہاں بھی اولوں کا انبار لگ گیا۔ یہ قصہ رات کا ہے صبح کو جبکہ اولے گھل کر اور پگھل کر گڑھوں میں جذب ہو چکے تھے۔ ایک کمہار اپنے گدھوں کو لئے ہوئے اولوں کی مٹی کی تلاش میں آیا یعنی جن گڑھوں میں اولے جمع ہوئے تھے وہاں کی مٹی کھود کھود کر بوروں میں بھر لی۔ ہمارے مرحوم عاشق کی مٹی بھی ایک بورے کے حصہ میں آئی اور کشاں کشاں کمہار کے گھر میں پہنچی۔ مشہور ہے کہ جس مٹی میں اولے ملے ہوئے ہوں۔ اس کے برتن میں پانی بہت ٹھنڈا ہوتا ہے اور گرمی کے موسم میں دنیا والے اس کی بہت قدر کرتے ہیں۔ چنانچہ کمہار نے اس مٹی کے بہت سے برتن مٹکے ٹھلیاں۔ گلاس صراحیاں وغیرہ بنائیں۔

(۳)

برسات کا موسم تھا۔ سخت گھس اور گرمی کے بعد ابر گھر کر آیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا درختوں میں لہرا رہی تھی۔ سبز ٹہنیاں آبادیوں میں ہوا پاشی کر رہی تھیں۔ یکایک دیکھا کہ ایک آراستہ کمرہ ہے جس میں ایک پری جمال حور لقا مستی نشۂ شباب میں مخمور انگڑائیاں لیتی ہوئی اٹھی اور نوکر کو حکم دیا کہ کمہار کے ہاں سے ایک صراحی اور جام لے آئے مگر یہ صراحی اور جام اولوں کی مٹی کے ہوں۔ تعمیل کی گئی۔ گنہ گار ہاتھوں نے شراب کی بوتل کھولی۔ صراحی میں پانی بھرا اور اس میں وہ شراب ڈالدی گئی۔ اسکے بعد پانی ملی ہوئی شراب گلاس میں نکالی گئی اور ایک انداز مستانہ سے وہ گلاس ہونٹوں تک پہنچا جس وقت لب جاں بخش اس خاکی جام سے ہم آغوش ہوئے، ایک صدائے غیب

نے یہ شعر پڑھا ۔

پس مردن بنائے جائینگے ساغر مری گل کے
لب جاں بخش کے بوسے ملینگے خاک میں مل کے

او مغرور بے خبر، جفاکار، مستانے شرابی۔ میں اسی آدمی کی خاک ہوں جو تیری یاد میں پھڑک پھڑک کر مرگیا۔ میرا جسم، میری ہڈیاں۔ میری آنکھیں جو تجھ کو دیکھنا چاہتی تھیں، میرا وہ دل جس میں تیرے ملنے کی آرزو تھی۔ میرا وہ دماغ جو تیرے وصال کے تخیلات میں سرشار رہتا تھا، سب خاک ہوگئے لیکن پوری بربادی۔ کامل تباہی اور آخری فنا کے بعد آج یہ مقام بقا حاصل ہوا اور میرے ہونٹوں کی خاک گلاس کے کنارے میں پیوست ہوکر تیرے سراپا حیات ہونٹ تک پہنچی اور وصال کی گھڑی نصیب ہوئی۔ اگر یہ وصل جسم کی زندگی میں میسر آتا تو ہرگز ہرگز وہ دوامی تعلق حاصل نہ ہوتا جو آج کے دن محسوس ہورہا ہے اور جو یقیناً ہمیشہ قائم و برقرار رہیگا۔

(۴)

عشق کی اس داستان کو سن کر راقم درویش نے کہا۔ او مسلمان! تو ہراساں اور پریشان نہ ہو دور حاضر کی مصیبتیں تیری ابدی بقا اور پائدار زندگی کی نشانیاں ہیں۔ مسرور کر اور خوش باش ہو۔ اور ان کانٹوں کو روندتا ہوا آگے بڑھا چل ۔

دوربین اور مکاشفاتِ غیب

از توحید یکم جولائی ۱۹۱۵ء

تمہاری آنکھ دور کی چیز نہیں دیکھ سکتی تو ایک دوربین منگالو۔ بُعد کی مسافتیں قریب ہوجائیں گی۔ اور جس کو دور سمجھتے ہو وہ پاس آجائے گا۔

Marfat.com

دوربین کیا چیز ہے؟ سب جانتے ہیں۔ آدمی نے ہنر اور علم کے زور سے ایک شیشہ ایجاد کیا ہے۔ جہاں اس شیشہ کو آنکھ کے سامنے لگایا بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوگز پرے کے در و دیوار چہرہ کے پاس آ گئے۔

بعض دوربینیں لاکھوں کوس کی چیز دکھا دیتی ہیں۔ آجکل یورپ والوں نے ایسی دوربین ایجاد کی ہے جس سے چاند سورج اور آسمان کے سب تاروں کی حقیقت نظر آجاتی ہے۔ لوگوں نے اس دوربین کے ذریعہ حساب لگا کے بتایا ہے کہ سورج کتنا بڑا اور ہم سے کس قدر دور ہے۔ چاند اور مریخ زمین سے کتنے فاصلہ پر ہیں اور ان کی اندرونی حالت کیسی ہے۔ انہی دوربینوں سے قدرت کے نامعلوم بھید بھی کھل گئے مثلاً پہلے زمانہ میں فقط ایک چاند سورج کا علم تھا اور نادان خلقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد پر ہنستی تھی کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی متعدد عالم ہیں جہاں یہاں کی طرح چاند سورج اور مخلوق آباد ہے۔

مگر اب دُوربین نے یہ دعویٰ سچا کر دکھایا اور یورپ والے مان گئے کہ اس سورج کے علاوہ، جو ہم کو نظر آتا ہے اور جس کے طلوع و غروب سے دنیا کے رات دن کا حساب مقرر ہے، اور بھی بہت سے سورج ہیں اور ان کے ساتھ بھی اسی طرح ایک عظیم الشان نظام اور کائنات گردش کر رہی ہے جس طرح ہمارے سورج کے ساتھ ہے گویا دوربین نے غیب کی باتوں کو عیاں کر کے دکھا دیا اور مسلمانوں کے ایمان بالغیب کی تصدیق ہو گئی۔

ان ہیئتی دوربینوں کے علاوہ میدان جنگ میں ایک اور دوربین استعمال کی جاتی ہے یعنی جنگی جہازوں اور خشکی کے لشکروں کے پاس ایک دوربین ہوتی ہے جس سے سینکڑوں کوس کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں کہ دشمن اس وقت کس حال میں ہے اور اس کے پاس کیا کیا ساز و سامان ہے۔

Marfat.com

بہرحال دوربین ایک عجیب طلسم کشا لوح ہے جب آنکھ کے سامنے آتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا دور کی چیز بالکل سامنے کھڑی ہے لیکن درحقیقت وہ وہاں نہیں ہوتی۔ دیکھنے والے کو صرف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز قریب آگئی تو کیا دُوربین

دھوکہ کی ٹٹی ہے؟

نہیں یہ بات نہیں ہے۔ دُوربین صداقت کا آئینہ ہے۔ وہ جو کچھ دکھاتی ہے بے کم و کاست سچ اور واقعی ہوتا ہے لیکن دوسرے آدمی جن کی آنکھ پر دُوربین نہیں ہوتی، اس میں شک کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ اتنی دور کی چیز آنکھ کے پاس آگئی۔

چنانچہ صوفیائے کرام کے مکاشفاتِ غیب پر ایسے ہی لوگ، جو ظاہری دوربین کے کمال سے بے خبر ہیں، لعن طعن کیا کرتے ہیں کیونکہ اُن کو یہ بات بالکل عقل کے خلاف اور عجیب معلوم ہوتی ہے۔ ایسی ہی معراج رسول اللہ علیہ وسلم کی نسبت وہ لوگ، جن کی آنکھیں بصیرت کی دوربین سے محروم ہیں، اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آن کی آن میں ساتوں آسمانوں کو طے کر کے عرش اعظم پر پہنچ گئے۔ پروردگار عالم سے ملاقی ہوئے۔ دوزخ جنت کی سیر دیکھی اور واپس آئے تو بستر گرم تھا۔ دروازہ کی کُنڈی ہل رہی تھی۔ یعنی اتنے عظیم الشان سفر میں چند سکنڈ سے زیادہ عرصہ نہ لگا۔

مگر اس کو نہیں دیکھتے کہ دوربین کے اندر سے نگاہ آن کی آن میں لاکھوں کوس تک پہنچ جاتی ہے اور بڑے بڑے مقامات کی سیر کر کے چند سکنڈ میں واپس بھی آجاتی ہے، تو آیا یہ مشاہدہ عقل کے مواق ہوتا ہے یا خلاف؟

اصل یہ ہے کہ نئے زمانہ کی تمام ایجادیں اور سائنس کے آلات بظاہر تو لوگوں کو

Marfat.com

خدا سے بے خبر کر رہے ہیں لیکن اگر کوئی شخص ان کے باطنی حقائق پر غور کرے تو یہی چیزیں مذہبی عقائد کی مستحکم دلیلیں اور خدا پرستی کے

سگنل

بن جائیں اور پھر حیات انسان کی سب ریل گاڑیاں دنیا کے اسٹیشن سے بے خطر پاس ہو کر منزل آخرت تک پہنچنے لگیں۔

گلاب تمہارا اکیکر ہمارا

از توحید ۲۴ جولائی ۱۹۱۳ء

ان سب شاعروں کو سامنے سے ہٹاؤ جو گلاب کے پھول پر مرتے ہیں سینکڑوں برس سے ایک ہی چہرے کے طلب گار ہیں۔ یہ سب لکیر کے فقیر ہیں۔ مقلد ہیں سنی سنائی تقلیدی باتوں پر جان دیتے ہیں۔

میں کچھ اور دیکھتا ہوں۔ مجھکو ایک اور آنکھ ملی ہے جو ان سب سے اونچی ہے میرے دل کی ہم نشینی دہسری کے ان میں ایک بھی قابل نہیں ہے میں بندہ ہوں سب بندوں کی مثل ہوں۔ میں بشر ہوں۔ تمام بنی آدم کے برابر درجہ لے کر آیا ہوں۔ میں نبی نہیں ہوں۔ ولی نہیں ہوں۔ مہدی اور عیسیٰ نہیں ہوں۔ دعویٰ خود نمائی و خودستائی سے بھی انکار ہے۔ مگر میں عالم تعین دہستی شالی کی ایک تصویر ہوں جس میں رنگ فطرت کی قلکاریاں ہیں۔ اس واسطے میں خود اپنے وجود کا طلبگار ہوں اور اسی لئے یہ تعلی اور یہ خود آرائی ہے تاکہ میں خود کو اپنی خودی دکھاؤں اور خطاب کروں کہ جتنے یہ تک جوڑنے والے شاعر ہیں سب نے گلاب کے پھول کو تختہ مشق بنایا ہے۔

Marfat.com

کوئی اس کی بھینی بھینی بُو پر فدا ہے۔ کوئی اس کی نازک نازک پتیوں پر نثار ہے۔ کسی کو اس کے رنگ سے رخسارِ محبوب کی یاد پیدا ہوتی ہے کسی کا دل اس کے کھلنے اور مرجھانے کے انقلاب میں اسیر ہے۔ بعض ہیں کہ جو گلاب کے خار سے خار کھائے بیٹھے ہیں چنیسر۔ یہ جتنی باتیں ہیں ان میں تو شکایت کا کوئی موقعہ نہیں ہے۔ کہنا یہ ہے کہ انہوں نے خدا کی بے شمار

مخلوقات کی حق تلفی

کی، ایک ہی دروازے پر ڈیرے ڈال دیئے، ایک ہی آئینہ کی دید میں مدہوش ہو کر رہ گئے اور ان بے شمار جلووں کو نہ دیکھا جو ان کے لئے صفحۂ ہستی پر نمودار کیے گئے تھے یہ انہوں نے بہت بڑا گناہ کیا۔ اس میں اُن سے ایسی خطا سرزد ہوئی ہے جس کی سزا نہایت ہولناک ہونی چاہیئے۔ گلاب کی الفت میں باغ لگائے چمن بنائے، مالی محافظ بسائے۔ پانی کھچوائے اور زمین کے تختوں کو سیراب کیا، پھولوں کی ٹہنیوں کے سامنے اپنے تخیل کے ذوق کو سجدے کرائے۔ مگر اپنے تصور کو اتنی آزادی نہ دی کہ وہ اس کائنات کے ہر پھول تک جاتا۔ اُن لوگوں کو یہ نصیب نہ ہوا کہ جنگل میں نکل جاتے۔ خودرو پھولوں کو دیکھے جن کا مالی خدا ہے۔ جن کا چمن صحرا ہے جن کی سیرابی قدرتی سیلابی سے ہے۔ ان میں ایک

کیکر تھا

کیا چپ چاپ تھا۔ کیا مضبوط و توانا تھا۔ اس کی شاخیں دیکھی ہوتیں، اس کی پتیوں پر غور کیا ہوتا۔ گلاب کی ٹہنی میں کیا رکھا ہے۔ ایک کمزور لچکنے اور ٹوٹ جانے والی شاخ ہے جس کو آج کل کے

Marfat.com

شہزور زمانہ

میں بقول ڈاروِن، رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ وقت اُن کی زندگی کا ہے جو حوادثِ ایام کا مقابلہ کر سکتے ہیں جن کے اعضاء دوسروں کے کام آتے ہیں۔ کیکر کی چھال مفید جس سے کپڑے رنگے جاتے ہیں اور مختلف رنگ تیار ہوتے ہیں۔ کیکر کی لکڑیاں جلانے میں انسان کی مدد کرتی ہیں کیکر کی پتیاں بکریاں کھاتی ہیں اور آدمی کو دودھ دیتی ہیں۔ کیکر کی پھلیاں بھی چارہ اور رنگ بنانے میں کام آتی ہیں۔

یہ میاں گلاب کس مرض کی دوا ہیں، پیٹ میں درد ہو تو گلقند کھلاؤ، ہیضہ ہو جائے تو گلاب پلاؤ۔ مرجاؤ تو قبر پر چڑھاؤ۔ اور بھی کوئی کام اس نحوس وجود سے نکلتا ہے۔

گلاب کے کانٹوں کو دیکھو کیسے دھوکہ باز ہیں۔ دکھائی نہیں دیتے۔ ہاتھ لگا تب ہی چبھ جاتے ہیں۔ کیکر کے کانٹے دُور سے نظر آتے ہیں۔ کیا مجال کہ بےخبری میں کسی کو ستائیں۔

گلاب کے کانٹے سوکھ جائیں تو پھینک دینے کے قابل۔ کیکر کے کانٹے سوکھ کر گھروں اور کھیتوں کی حفاظت کریں۔ اسی طرح یہ کہ کیکر کا کانٹا کیسا سیدھا سادا اور نکیلا ہوتا ہے رنگ دیکھو تو وہ بھی انوکھا۔ نرالا۔ شاعروں کے گلاب کو یہ بات کہاں میسر؟

گلاب کے درخت میں پتے بالکل بدشکل اور بیکار۔ کیکر کی پتیوں کے کیا کہنے کیسی چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی پتیاں ہیں کہ بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔

کیکر کا پھول گلاب کے پھول سے لاکھ درجہ اچھا۔ گلاب کا پھول ایکدن کی تیز دھوپ میں کمہلا اور مُرجھا جاتا ہے اور کیکر کا پھول ہفتوں سورج کا مقابلہ کرتا ہے اور آج کل تعریف اسی کی ہے جو دشمن کے مقابلہ میں زندہ سلامت رہے۔

گلاب کا پھول سرخ یا سرخی مائل اور ایسا کچا کہ مالیوں کی استادی سے رنگ بدل دیتا ہے مالی جس کو چاہیں سرخ رکھیں جس کو چاہیں سفید بنا دیں۔

کیکر کا پھول اپنے رنگ میں پختہ۔ سارے جہان میں ایک ہی زرد رنگ۔ کیا مجال

Marfat.com

جو کوئی شخص اس کے رنگ کو بگاڑ سکے۔

شاعر کہتے ہیں گلاب کے پھول سے معشوق یاد آتا ہے۔ میں کہتا ہوں کیکر کے پھول سے عشق یاد آتا ہے جس سے انسان کی رنگت زرد ہو جاتی ہے۔

اب بتاؤ عشق اچھا یا معشوق۔ عشق نہ ہوتا تو نہ عاشق کو کوئی پوچھتا نہ معشوق کی کچھ وقعت رہتی۔ یہ عشق ہی کی بدولت سب بستیاں آباد ہیں۔

ارے نادان تجھے شاعروں سے کیا کام۔ پہلے اپنے وجود کے تخیلات کو درست کر۔ ان میں فطرت شناسی کا ملکہ نمودار ہونے دے۔ آج گلاب کو چھوڑ کر کیکر کے آگے جھومتا ہے۔ کل اس کو بھی چھوڑ یو۔ کسی اور پیکر کے جلوہ میں دھیان جمائیو۔ ساری دنیا میں کانٹے پھیلے ہوئے ہیں، کس کس جگہ جھاڑو دے گا۔ خود جوتی پہن لے اور راستہ چلنے لگ۔ ہاں تو حق پر ہے۔ ہاں یہی صراط مستقیم ہے۔ یہی وہ راہ ہے جو منزل جاناں تک جاتی ہے۔ من و تو کا حجاب اٹھا۔ اس کے بعد خود اپنی خودی کا پردہ کھول کر اندر گھس جا۔ پھر یہ آواز نہ آئے گی کہ

گلاب تمہارا اور کیکر ہمارا

اوس

از توحید ۸۔ اگست ۱۹۱۳ء

میں شبنم نہیں کہتا۔ یہ فارس والوں کا لفظ ہے۔ فارس پر ادبار کی اوس پڑ چکی۔ وہ وقت اب کہاں جب ایران کے چمن آباد تھے۔ سعدی و حافظ کی حقیقت شناس نظریں پھولوں کی ڈالیوں اور گھاس کی پتیوں پر شبنم کی بہاریں دیکھتی تھیں۔ اب تو روسی ظالموں کے جور و ستم سے بیوہ اور یتیموں کی آنکھیں قطرات شبنم کی مثل

آنسوؤں کی اوس پلکوں پر جاتی ہیں۔

برسات کے موسم میں کوئی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کا خواستگار ہے۔ کسی کو اودی اُودی کالی کالی گھٹائیں پسند ہیں۔ کسی کا دل بادلوں کی کڑک اور بجلی کی چمک سے مست ہوجاتا ہے۔ مجھکو تو برسات کی یہ ادا بھاتی ہے کہ مینہ برس کر کھل جاتا ہے اور صاف آسمان کی رات گزر جاتی ہے تو صبح کے وقت درختوں، پھولوں اور جنگل کی گھاس کی عجیب شان ہوتی ہے۔ اوس کے قطرے پھولوں کی پتیوں پر ایسے چپ چاپ نظر آتے ہیں جیسے رات کو آسمان کے تارے تھے۔ کیا خبر ہے کہ رات کے وقت تارے ٹوٹ پڑے ہوں اور یہ انہی کی گل افشانیاں ہوں۔

کہتے ہیں کہ اوس میں سونا، اوس میں پھرنا جسم انسانی کے لئے مضر ہے۔ خبر نہیں یہ کیوں کہتے ہیں۔ خدا کی ساری مخلوق تو اوس باری سے تر وتازہ اور نہال ہوجاتی ہے تو انسان بھی ایک مخلوق ہے اس کو اس سے کیونکر نقصان پہنچ سکتا ہے۔

یہ تو سائنس والے بتائیں گے کہ اوس کیا چیز ہے، کہاں سے آتی ہے۔ کیوں آتی ہے۔ فقیر تو اتنا جانتا ہے کہ اوس قدرت ربانی کا ایک عجیب وغریب جلوہ ہے۔ جن کی آنکھ بہت سویرے بیدار ہونے کی عادی ہے وہ صبح کے وقت سورج نکلنے سے پہلے اوس میں ذات الٰہی کے ہزاروں جلوے مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک شخص کو دیکھا کہ باغ میں جوئی کے پھولوں کے پاس جھکا ہوا کچھ دیکھ رہا تھا اور ایسا مستغرق تھا کہ دنیا ومافیہا کی خبر نہیں تھی۔ درحقیقت جوئی کے پھول پر اوس کا انداز قیامت کا ہوتا ہے۔ چھوٹا پھول، نازک پتیاں اور اس پر اوس کی ننھی ننھی بوندیں حس وحرکت کرنے والے دل کے لئے دَورِ محشر سے کم نہیں۔ اوس کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ رات کو پیدا ہوتی ہے اور سورج نکلتے وقت مرجاتی ہے۔ اوس کی سیرابی باران رحمت کی طرح ہر خاص و عام چھوٹے بڑے اونچے نیچے کے لئے یکساں مفید ہے مگر مینہ سورج کا مقابلہ کرتا ہے۔ بادل

Marfat.com

کے لشکر لاتا ہے تو آفتاب کو پوشیدہ ہونا پڑتا ہے مگر اوس بیچاری بڑی ڈرپوک صلح کل ہے آسمان پر جب سورج کا عمل دخل نہیں رہتا اور بادل بھی اپنے گھروں میں چلے جاتے ہیں، اسوقت یہ نمودار ہوتی ہے اور سورج کے نکلنے کے ساتھ ہی جان دے دیتی ہے۔

اوس کی شکایت

انسان اگر یہ شکایت کرے تو حق بجانب ہے کہ اوس تمام در و دیوار کو شجر و حجر کو تر کردیتی ہے مگر کسی پیاسی زبان کی تشنگی دور نہیں کرسکتی۔ اردو زبان میں ایک مثل ہے کہ اوس جب پڑتی ہے تو ہاتھی بھیگ جاتا ہے، گویا ہاتھی اوس میں نہالیتا ہے مگر چڑیا کی پیاس نہیں بجھتی۔ یہ قدرت کا ایک نہایت گہرا راز ہے۔ اس میں اوس کی کچھ شکایت نہ کرنی چاہیئے۔ بہرحال اللہ تعالےٰ کی نشانیوں میں سے اوس بھی ایک نشانی ہے جس کو دیکھ کر دلِ حق پرست میں عرفانِ یزدان کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

رمضان میں سیاہ و سفید ڈورے کی رہنمائی

از توحید ۱۶۔ اگست ۱۹۱۳ء

دنیا کی سب سے بڑی کتاب میں رمضان کی نسبت خدا نے فرمایا ہے۔ کہ تم پر رمضان کے روزے فرض کئے گئے ہیں دن کو روزہ رکھو اور رات کو کھاؤ اور پیو جب تک کہ صبح کا سفید ڈورا کالے ڈورے سے نمایاں نہ ہوجائے۔ اہل فقہ کہتے ہیں کہ صبح کاذب کے بعد جب صبحِ صادق نمودار ہونے لگے تو کھانا پینا ترک کردینا چاہیئے۔ ایک جماعت نے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ صبح صادق جب ہوتی ہے کہ لوگ سحر کے سبب آنکھ کالے سفید ڈورے میں تمیز کرنے لگے۔

یہ تو اہلِ علم کے مسائل ہیں۔ گدڑی پوش بے نوا کو یہ بحث مقصود نہیں ہے۔ وہ تو قرآن بھیجنے والے کی اس ادا کو دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے جو خیط ابیض اور خیط اسود یعنی سفید کالے ڈورے کے الفاظ میں نظر آتی ہے۔

اگر زخمی دل والوں اور تیر خوردہ جگر کو معلوم ہو جاتا کہ روزے کی سحری میں نور و ظلمات کے کرشمے دکھلائے جاتے ہیں اور رخ و زلف کے جلووں سے رہنمائی ہوتی ہے، تو ساری عمر روزہ ترک نہ کیا جاتا اور غالباً یہی وجہ ہے جو بعض مست الست بارہ مہینے لگاتار روزے رکھتے ہیں۔ ان پر انہی کالے سفید ڈوروں نے ڈورے ڈالے ہیں۔ خلقت ولایتی گھڑیوں، گولوں اور نقاروں پر آسرا جمائے بیٹھی رہتی ہے۔ ہزار میں شاید ایک آدمی کو بھی سحری کے وقت خدا کی بتائی ہوئی گھڑی کا خیال نہ آتا ہوگا۔

اگر مجازی حیثیت سے ہی صبح کاذب اور صبح صادق کو محض وقت سحری معلوم کرنے کے لئے دیکھا جائے تو وقت سحر کے ہزاروں جلوے آسمان پر نظر آئیں۔

چشمِ حقیقت ان سیاہ و سفید ڈوروں میں رات دن کی سیاہی و سفیدی سے علیحدہ ایک چیز دیکھتی ہے۔ اس لئے اس کو رمضان کی سحری میونسپل کمیٹی کی ممبری، چھوٹے لاٹ کی کونسل کی ممبری، بڑے لاٹ کی کونسل کی ممبری۔ اس سے بھی آگے عہدہ ججی اور اگر میسر آئے تو منصب وائسرائے یا وزیر ہند۔ اس سے بھی بڑھ کر ہفت اقلیم کی بادشاہی سے بھی اچھی معلوم ہوتی ہے۔

دنیا کے حریص بادشاہوں اور امیروں سے کہو کہ اپنی طمع کاریوں کو چھوڑ دیں اور پچھلی رات بیدار ہو کر کالے سفید ڈوروں کی بہار دیکھیں کہ کیونکر رات کی تاریکی میں نور کی سپیدی نمودار ہوتی ہے اور اس ظہور کے وقت دل کو اگر اس میں حس ہو، کیسی لذت آتی ہے۔ اگر وہ اس لذت کا ایک بار بھی معائنہ کریں تو دنیا کے

Marfat.com

یہ تمام جھگڑے فساد مٹ جائیں. مگر وہ سیاہ سفید ڈورے والے جناب تو خیر و شر کے قبضہ دار ہیں۔ وہ کب گوارا کریں گے کہ آنکھ اُن کی شان کو دیکھ کر لطف اٹھائے۔

گیان کتھا

از توحید ۱۶ ستمبر ۱۹۱۳ء

اپنے گیانی دیس ہندوستان کو کیا کہوں، بدیسی سنگت سے اگیانی ہو گیا. یونیورسٹی کی کتابوں میں صبر و سنتوش شانتی و اطمینان کا راستہ ڈھونڈھتا ہے۔

کل پچھلی رات آکاش بانی صدا لئے ہو میرے کان میں آئی۔ کہا علم کاغذی کتاب میں نہ دیکھ سنسار کائنات ہستی موجود کا ورق کھول. اس میں دھیان کر اور گیانی بن. میں نے کہا تو اور مجھکو پڑھا. میرے پرم گیان پربھو. عالم اسرار خداوند نے اس کو مانا اور مجھپر نازل فرمایا.

پانی دیکھنے میں ایک مگر مزا سمندر کا کھاری، کنویں دریا کا میٹھا. گلاب کی جڑ اور تخم ایک لیکن پھول پتے کانٹے میں جدائی. پانی کی افراط درخت کو گلا دیتی ہے مگر کنول کے پھول کی زندگی لبریز پانی سے ہے.

تو دیکھ! بگلا سفید ہے، کوئل کالی ہے، طوطا سبز ہے۔ تو سُن! انجن کی سیٹی کان کو ناگوار ہے اور پیانو کے نغمے دلنواز. تو چکھ! املی کھٹی ہے، نیم کڑوا ہے. گھر سے نکل! پہاڑ اونچے ہیں، زمین نیچی ہے. دریا بہتے ہیں. کنارے ساکن ہیں. غور کر! سورج نکلتا اور روز چھپ جاتا ہے. رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں نور ظلمت کی دو حکومتیں پلٹ جاتی ہیں

یہ کیوں ہے؟

تیرے صبر و قرار کے لئے سنسار بیقرار ہے۔ شعلے بھڑکتے ہیں۔ دریا بہتے ہیں۔

Marfat.com

سمندر موجیں مارتا ہے، ہوا چلتی ہے، بادل آتے جاتے برستے برساتے ہیں بجلی چمکتی کڑکتی ہے۔ بوندیاں اُٹھی سے اعلیٰ ہوتی ہیں تاکہ تیرا وجود انقلاب ایام سے گھبرا نہ جائے اور جانے کہ گردش ہر موجود کی ڈیوٹی ہے، بدلنا ہر حالت کا اقتضا ہے۔ سمندر ہلتا اور نشیب فراز کے عالم اپنی صحت کی خاطر برداشت کرتا ہے ورنہ اس کا پانی سڑ جائے دریا اپنی زندگی کے لئے رواں دواں ہے ورنہ تالاب کا گندہ پانی کہلائے۔ ہوا نہ چلے تو کمزور، زہریلی اور بھاری ہو جائے۔ شعلۂ آتش نہ بھڑکے تو دھوئیں کی تاریکی میں نابود ہے۔ بادل نہ برسیں تو دوسرے سال سمندر میں ابخرے پیدا نہ ہوں اور ان کی نسل منقطع ہو جائے۔ بجلی چمکنا گرجنا چھوڑ دے تو فلک کے اعیانِ اشراف میں بے آبرو ہو جائے۔ بوندیاں خاک کی پامالی سے انکار کریں تو ابر رحمت کے خطاب سے محروم کر دی جائیں۔

انسان! آدمی!! خیال کر جب ہر چیز اپنی غرض اور ذاتی مطلب کے لئے متحرک ہے تو تو کیوں پریشان ہوتا ہے۔ کرم کر، عمل کر، گیان۔ موکش۔ نجات۔ سرورِ ابدی عمل و حرکت میں ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ہر حرکت میں برکت ہے۔

دنیا کی بنیاد خوشی و راحت پر ہے

دیوانہ ہوا ہے۔ زندگی کو آلام مصیبت کی پوٹ سمجھتا ہے۔ تو کیسا نادان ہے۔ میں نے نیچر و فطرت کی بنا خوشی و راحت پر رکھی ہے۔ جب تو بیمار ہوتا ہے یا ابر سورج پر آجاتا ہے یا دریا کنارے سے اُبل پڑتا ہے۔ تو تو صحت۔ روشنی اور سیلاب سے سلامتی مانگتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تکلیف میں ہوں۔ مگر بیماری کے جاتے رہنے، بادل کے پھٹ جانے۔ طوفان کے تھم جانے سے کیا کوئی نئی چیز حاصل ہوتی ہے۔ بیماری گئی تو وہی تندرستی آئی جو پہلے تھی۔ بادل پھٹا تو وہ سورج چمکا جو پہلے اسی طرح چمکا کرتا تھا۔ طوفان رُکا۔ دریا سمٹا تو

Marfat.com

وہی کنارہ نظر آیا جو ہمیشہ خشک رہا کرتا تھا۔ کوئی نئی چیز تجھ کو حاصل نہیں ہوئی اس کو سوچ
میں نے تجھکو تندرست بشاش مطمئن پیدا کیا ہے۔ تیرے اعمال تیرے کرم تجھکو تکلیف
دیتے ہیں جو عارضی ہوتے ہیں اور اس کا دور ہونا اور اصل بنیاد کا از سر نو نمودار ہونا،
میرا اٹل قانون ہے اس واسطے عارضی تکلیفات سے مضطرب اور مایوس نہ ہوا کر۔
پھانس نکلنے کو چبھتی ہے۔ پیاس بجھنے کو لگتی ہے بھوک پیٹ بھرنے کے لئے پیدا ہوتی ہے
جب کانٹا چبھے تو سمجھ لے کہ اس کو ایک وقت نکلنا ہے۔ بھوک پیاس کی خواہش ہو تو
خیال کر کہ کھانا پانی ملنا لازمی ہے۔ بیماری آئے تو یقین کر کہ تندرستی بھی اس کے ساتھ ہے۔
میں نے آدم کو اپنے وجود محیط الکل کا آئینہ بنایا ہے۔ اس میں میری کبریائی دیکھ۔
میری رعنائی اور قہاری مشاہدہ کر۔ میری رحمدلی و ملنساری کو محسوس کر۔ اسرار مخفی کے
نمود و ظہور کی خاطر یہ کارخانہ بنا ہے۔ ان کو نمودار ہونے دے جب تو آئینہ ہے
تو میرے ہاتھ میں رہ اور جو کچھ تجھ میں نظر آئے اس میں دخل انداز نہ ہو۔

معبود عبد نواز کے اس القا کے بعد میں نے اپنے جسم، اپنی قوم کے جسم، اپنے ملک
کے جسم اور اعضاء سے خطاب کیا جو حوادث ایام سے آشفتہ تھے اور روح سے نادانی
کے مطالبات کر رہے تھے اور کہا۔ ظہور صفات کے کرشموں سے ہراساں اور مایوس نہ ہو
اور اپنے رب پر توکل و اعتماد سیکھو جس میں راحت و ایمان ہے۔

ہردواری گنگا کے کنارے چنتامن مورتی

از توحید ستمبر ۱۹۱۳ء

کیسا اچھا وقت تھا جب اس مضمون کا لکھنے والا ننگے پاؤں، ننگے سر، بغل میں جھولی،
کندھے پر کمبل، ہاتھ میں ڈنڈا لئے ہردوار میں ہر کی پیڑی کے سامنے گنگا کے عالم آب کی ہوا

دیکھ رہا تھا اور اپنے من کے اندر کی گنگا کی سیر بھی کر رہا تھا۔

دریا لہریں مارتا، نہانے والوں کے میل کچیل کو صاف کرتا، پختہ سیڑھیوں کو گلے لگاتا، اٹکھیلیاں کرتا ہوا جا رہا تھا اور تیز بہ رہا تھا۔

مجھکو عالم محویت واستغراق میں دیکھ کر ایک سادھو مورتی ادھر آن نکلی۔ میں سمجھا کوئی پجاری ہے اس لئے توجہ نہ کی اور منہ پھیر لیا۔ کیونکہ تین روز سے پجاریوں نے میرے اطمینان کو غارت کر رکھا تھا۔ اجنبی دیکھ کر نذرانے مانگتے تھے اور سکوت کے لطف کو برباد کرتے تھے۔

سادھو دا تا تاڑ گئے اور بولے۔ گنگا جی کی لہروں میں دُکھ سُکھ دونوں ہیں۔ دُکھ سے گھبرانا سُکھ سے ہاتھ اُٹھانا ہے۔

کانوں کو اس مزیدار بات نے متوجہ کر لیا۔ مڑ کر دیکھا عجب مستانی صورت تھی۔ ساٹھ ستر برس کی عمر مگر آنکھیں عہد شباب کی مستی سے مخمور۔ چہرہ ماہتاب کی مانند پُر نور۔ میں بولا۔ جا بابا اپنا کام کر۔ یہاں دکھ سکھ سے غرض نہیں۔ ہر کا نام سنا تھا۔ دوار کے لفظ نے بیتاب کیا تھا ادھر بھی آ گئے۔ دکھ سکھ کا قصہ اُن کو سُنا جنھوں نے یہ سامنے کا کتبہ لگایا ہے جس میں گنگا جی کے مناقب ہیں سادھو نے منہ پھیر کر اس پتھر کو دیکھا جس پر اردو زبان میں گنگا کی تعریف کے اشعار کندہ تھے، اور ہنسکر میری طرف متوجہ ہوا اور کہا ان لکیروں سے تو مجھکو بھی کچھ سروکار نہیں۔ اپنی جھولی کو ٹٹولو اس میں کیا ہے۔

میں نے کہا اس کو نوٹ بک کہتے ہیں۔ جی چاہتا ہے تو اس میں کچھ لکھ لیتا ہوں۔ کہنے لگا اس کے پانچویں ورق میں کیا یادداشت لکھی ہے؟ اس سوال نے متعجب کیا۔ نوٹ بک نکالی۔ دیکھا لکھا تھا۔ ہر دوار یا کاشی کیش میں کوئی کام کا فقیر ملے تو اس سے خواب کا بھید دریافت کرنا چاہیئے۔

سادھو کے مکاشفہ سے حیرانی ہوئی۔ مگر اطمینان کے لہجہ میں کہا۔ میں نے

Marfat.com

وہ ورق دیکھا آپ اس کا جواب دے سکتے ہیں؟

بولے. ہاں. میں اسی لئے آیا ہوں. تم ابھی بیدار ہو اور دنیا کے بیدار کرنے کا گھمنڈ دل میں ہے. اس کو چھوڑ دو. آنکھیں بند کرو. تاکہ نیند کا طلسم کھل جائے۔

میں نے کہا کس کا سونا، کیسا جاگنا. بات کو چکر میں نہ ڈالو. میں نے بہت سی آنکھیں دیکھی ہیں جو کہنا ہو صاف صاف کہو. فرمایا. گنگا میں اشنان کیا؟ عرض کی کئی بار فرمایا کچھ دیکھا، کہا کچھ نہیں. ارشاد ہوا اب نہاؤ. دل میں خطرہ گذرا کوئی چور نہ ہو. کمر کی نقدی کو بھانپ کر کپڑے اتروانا چاہتا ہو اس لئے عذر کیا کہ اس وقت نہیں نہاؤں گا. بولے. اچھا جانے دو. دل کو شبہہ کے گناہ سے بچاؤ اور لو سنو. کان میں کچھ کہوں میں نے سر جھکا دیا اور سادھو آتما نے خواب کی نسبت کچھ کہا.

بات معمولی تھی جس کو میں اکثر سوچا کرتا تھا مگر اس انداز کی تھی کہ جی بیقرار ہو گیا فرمایا. لو جاتے ہیں اور اٹھ کر چلنے لگے. میں نے بے اختیار ہو کر دامن پکڑ لیا اور عرض کی نام بتاتے جائیے، ٹھکانے کا نشان فرمایئے تاکہ پھر درشن ہو جائیں. بولے چنتامن اس مورت کا نام ہے اور مقام کا کچھ ٹھیک نہیں. آج یہاں کل وہاں. ہردوار میں دھوکہ بازوں سے بچنا. رشی کیش جاؤ تو وہاں بھی اچھی صورت پر فریفتہ نہ ہو جانا. بہت سے دکاندار فقیری لباس میں ملیں گے مگر جو بات کان میں کہی ہے اس کو یاد رکھو گے تو گنگا کنارے آنے کا پھل مل جائے گا۔

گنگا جس کا نام ہے وہ یہ دریا نہیں جو پانی کی صورت میں رواں دواں نظر آتا ہے. گنگا کی عظمت کو اس خیال سے کیا سروکار جو نئی روشنی کے لوگ مادی صورت میں پیش کیا کرتے ہیں. گنگا کی حقیقت بڑے سوچ بچار سے معلوم ہوتی ہے یہ کہا اور چل دیئے۔

سچ کہا گنگا اور جمنا دو دریا نہیں دو مقام ہیں مگر بہنے والے اور کنارے سے بن بوے چلنے والے

Marfat.com

انگلی کا کشف

(از نظام المشائخ مئی ۱۹۱۲ء)

دل ودماغ اور روح کا کشف سب نے سنا ہوگا۔ انگلی کا کشف عجیب ہے مگر اُن کے لئے جو انسانی اسرار سے بے خبر ہیں اور نہیں جانتے کہ اس بولتی چالتی مورت میں اللہ میاں نے کیا کیا بھید رکھے ہیں۔

کشف کے منکر تو یہاں تک کہتے ہیں کہ کسی انسان میں کشف غیب کی طاقت نہیں۔ یہ جو اولیاء اللہ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان کو کشف کے ذریعہ امور مخفی معلوم ہوجاتے ہیں، سب غلط اور توہم پرستی ہے۔

لیکن ہمیں انکار اقرار سے کیا سروکار۔ ہم تو کشف پر عقیدہ رکھنے والے لوگ ہیں جو قصہ اس قسم کا سنتے ہیں ایمان تازہ ہوتا ہے اور اسرار باطنی کی عظمت بڑھتی ہے۔

دہلی میں میرے ایک دوست ڈاکٹر سراج الدین نامی ہیں حبش خاں کے پھاٹک میں مطب کرتے ہیں طبی اور جراحی قابلیتوں میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ باعتبار مشرب اہلحدیث یعنی غیر مقلد ہیں لیکن ان کی عادات وخصائل سچے اور پکے درویشوں کی سی ہیں۔ یعنی بے طمع، سادگی پسند۔ فقیر دوست، صلح کل۔ ہزاروں غریب ان سے فیض پاتے ہیں۔ قصہ مختصر چار صدی اول کے درویشوں کا نمونہ ہیں۔ افسوس ہے کہ میں بیمار تو زیادہ ہوتا ہوں مگر علاج زیادہ نہیں کرتا اور کرتا ہوں تو اس غیر مقلد درویش کا۔ خدا تعالیٰ نے بھی ڈاکٹر صاحب کی صادق بندگی کو محروم نہیں رکھا اور ہاتھ میں وہ اثر دیا ہے کہ ان کے بیمار عموماً اچھے ہوجاتے ہیں اور سب سے عجیب کمال یہ عطا ہوا ہے کہ ان کی انگلیوں کو کشف ہوتا ہے جسم کو ٹٹول کر بتادیتے ہیں کہ

یہاں پھوڑا ہے۔ اتنا بڑا۔ اتنا گہرا اور اتنی پیپ اس کے اندر ہے۔ اتنے عرصہ میں اس کا مواد پختہ ہوجائیگا۔ بظاہر یہ امر ایک معمولی علوم ہوتا ہے۔ ہر جراح اور تجربہ کار ڈاکٹر اس قسم کی باتیں بتا سکتا ہے۔ مگر تعجب تو اس کا ہے کہ کبھی ان کی رائے غلط نہیں ہوتی بڑے بڑے سند یافتہ ڈاکٹروں کے مقابلہ میں ان کی رائے درست نکلتی ہے اور ایسی درست کہ ذرہ برابر فرق نہیں رہتا۔ دہلی و نیز دیجات میں جن لوگوں کو ان سے سابقہ پڑا ہے وہ ایسے سینکڑوں واقعات جانتے ہونگے لیکن ابھی حال میں جو معرکہ پیش آیا ہے وہ سب سے عجیب ہے۔ دہلی میں ایک مشہور و معروف ڈاکٹر زیڈ احمد صاحب ہیں جن کو شاید سرکار سے ہزار روپیہ کے قریب ماہوار پنشن ملتی ہے۔ سنا ہے کہ ان کے جسم میں کہیں پھوڑا ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر سراج الدین کو بلایا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ پیپ پڑگئی ہے نشتر لگانا چاہیئے۔ انگریز سول سرجن اور چند دیگر ڈاکٹر بلائے گئے۔ ان سب کی رائے ہوئی کہ پیپ نام کو نہیں، نہ ابھی پھوڑا پکا ہے۔ آخر بڑی حجت اور پورے غور و خوض کے بعد چیرا دیا گیا تو ڈاکٹر سراج الدین کی رائے صحیح نکلی

رمز حقیقت

ڈاکٹر سراج الدین کی یہ قابلیت رمز حقیقت ہے۔ خدا تعالیٰ دکھانا چاہتا ہے کہ کسب اور کوشش سے انگلی تک کاشف حقیقت بن جاتی ہے۔ روحانی کشف تو اس سے بھی بڑھ کر کاشف حقیقت ہوتا ہوگا۔

ڈاکٹر سراج الدین ناراض نہ ہوں، ان کے عقیدہ پر حملہ کرنے کی نیت سے یہ نہیں لکھا جاتا۔ اگر اپنے مشرب اہلحدیث کے سبب کشف کے قائل نہ ہوں تو مضائقہ نہیں۔ ہم ان کی انگلی کے کشف کے دل سے قائل ہیں اور قدرت ایزدی کے کرشموں پر سر ہلانے والے ستانوں کی اطلاع کے لئے اس خبر کو درج کرتے ہیں امید ہے کہ اس

Marfat.com

بات کا علم بہت کم لوگوں کے باطنی لطف وطرب کا باعث ہو گا۔

اینٹ چونے کا وصال

از نظام المشائخ جون ۱۹۱۲ء

ایکدن کا ذکر ہے کہ انبالہ شہر میں کسی شاندار مکان کے اندر آدم کی اولاد جوق جوق جمع ہو رہی تھی۔ ہر ابن آدم کا چہرہ بشاش تھا، آنکھیں شگفتہ تھیں۔ گویا وہ کسی ایسی چیز کے دیکھنے کو آئے تھے جوان کے دل ودماغ پرشوق واشتیاق کے عالم میں چھائی ہوئی تھی

لیک آدم زادان میں ایسا بھی تھا جو مکین سے پہلے مکان کے تماشہ میں محو حیرت تھا اور کہتا تھا۔ ا مکان! تو مجھسے قد میں بھی بڑا، جسم بھی تیرا بہت چوڑا چکلا مگر زبان بالکل نہیں مجھکو دیکھ سوا دوگز اونچا ہوں لیکن زبان بارہ ہاتھ کی رکھتا ہوں۔ میرے پاس اتنے آدمی مہمان آتے تو خوب جی کھول کر باتیں کرتا۔ اپنی کہتا۔ اُن کی سُنتا۔ تیری طرح ساکت وصامت رہکر یہ نہ کہواتا کہ میزبان منہ سے نہیں بولتا۔ شاید اس کو مہمانوں کا آنا ناگوار ہوا ہے۔ آدمی کے اس اعتراض کا مکان نے تو کچھ جواب نہ دیا البتہ خود اس کے دل نے کہا۔

مَنْ عَرَفَ کُلَّ لِسَانُہٗ جو پہچان لیتا ہے اس کی زبان گونگی ہو جاتی ہے اور کبھی بھید کی بات لب تک نہیں آنے پاتی۔ اس مکان کے جتنے اجزا ہیں سب نے اپنے مقامات فنا سے گزر کر مقام بقا حاصل کیا ہے۔ اب اس کو کیا ضرورت ہے کہ باتونی آدمی کو منہ لگائے وہ آدمی جو دعویٰ اشرف المخلوقات کے باوجود امتحانات فنائی سے دم چراتا ہے اور بغیر امتحان دینے بقا کی ڈگری مانگنے پر آمادہ ہے۔

آدمی اپنے دل کی اس گفتگو سے خفا ہوا تیوری چڑھائی اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔ اللہ میاں نے انسان کو سب طاقتیں دیں مگر ایسی کوئی قوت نہ دی جس سے

یہ آستین کا سانپ خیال قابو میں آجاتا ہیں چاہتا ہوں کہ میرے ذہن میں وہی بات پیدا ہوا کرے جو مجھکو اچھی معلوم ہو. یہ نہیں کہ میاں خیال رہیں تو میرے دل ودماغ میں اور تعریف کریں دوسروں کی. میں ہاتھ سے کماتا ہوں، پکاتا ہوں. کھاتا ہوں. دانت سے چباتا ہوں اور پیٹ سے ہضم کرکے دل اور اس کے تخیلات کو غذا پہنچاتا ہوں. پھر اس کو کیا حق ہے کہ کھائے پئے میرے دستر خوان پا اور مدح سرائی دوسروں کی کرے بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ میں اپنی کوئی حسرت پوری کرنا چاہتا ہوں تو یہ خیال دامن پکڑتا ہے اور دوسری طرف لے چلنے کی ضد کرتا ہے. میں عالم تصور میں ایک نقشہ جمانا چاہتا ہوں. یہ اس کا رنگ بگاڑ کر دوسرے رخ متوجہ ہوجاتا ہے. کوئی ایسی مشین نکلی جس کے ذریعہ سے دل ودماغ کے باشندے خیالات قبضہ میں آجاتے اور آزادانسان اس نظر نہ آنے والی ہستی کی قید سے رہائی پا جاتا.

آدمی اتنا ہی سوچنے پایا تھا کہ اس کو صوت سرمدی میں ایک قہقہہ کی آواز آئی کہنے والے نے کہا تسخیر تخیل کی مشین مدت سے موجود ہے. تو کہاں تھا کس حال میں تھا جو آج تک اس کی خبر نہ ملی ارے نادان. اگر تو ایک دروازے کو مضبوط پکڑ لے، دربدر مارامارا نہ پھرے تو تیرا دل اور اس میں رہنے والا خیال بھی ہرجائی پنا چھوڑ دے. اس مکان کو نظر غور سے دیکھ جس پر بحث کا سلسلہ شروع ہوا ہے کہ جب اس کے منتشر اجزا اینٹ چونا شہتیر ایک مرکز پر جمع ہوگئے. کثرت کا نام فنا ہوگیا (یعنی اب کوئی اینٹ چونے کا نام علیحدہ نہیں لیتا سب کے مجموعہ کو مکان کے نام سے پکارتے ہیں) تب اس کو یہ درجہ حاصل ہوا کہ اشرف المخلوقات آدمی اس کی دید کو جمع ہوئے.

تو بھی اگر اپنے ارادے وخیال پر قبضہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو حرص وہوس بغض نفاق کی ہستی کو آتش عشق سے جلا ڈال اور اپنے جذبات پراگندہ کو ایک بنیاد پر جمع کرلے پھر دیکھ کہ خیالات قابو میں آتے ہیں یا نہیں؟

Marfat.com

ذرا پھر غور کر اس مکان میں لکڑی ہے. اینٹ ہے، چونا ہے، لوہا ہے، لکڑی کو فنائی امتحان کے کتنے درجے طے کرنے پڑتے ہیں. اول ہرا بھرا درخت تھا، جنگل میں آزادی و خود مختاری سے ٹھنڈی ہوا کھاتا اور پاؤں کے ذریعہ زمین کا پانی پیتا تھا. جب واحسلہ امتحان کا وقت آیا، کلہاڑی سے کاٹا گیا، آری سے چیرا گیا، برمے سے برمایا گیا. رندے سے چھیلا گیا جب کہیں یہ رتبہ ملا کہ ایک شاندار مکان کا حصہ دار زینت ہے. اینٹ کو دیکھو زمین کا سینہ چاک کر کے کدال اور پھاوڑے مار مار کر مٹی باہر نکالی گئی. پانی ملا کر خوب روندی اور مسلی گئی. سانچہ میں ڈھال کر اس کی ایک شکل مرتب ہوئی. مٹی نے ہر چند کہا کہ سب کچھ منظور مگر میرے ہمجنس ذرات خاک کو باہم جدا نہ کرو ایک ہی جگہ رہنے دو. الگ الگ اینٹیں بنائی جائیں گی تو خانۂ وحدت کے ذرے جلاوطن اور خانہ ویراں ہو جائیں گے لیکن اس کی فریاد کسی نے نہ سنی. یہاں تک کہ وہ دھوپ سے تپ تپ کر خشک ہو گئی. اس کے بعد بیچاری آگ کے گھر میں بھیجی گئی. یا یوں کہیئے کہ ناری قبر میں دفن کی گئی. لوگ اس آتشی مقام سے گذرتے تھے مگر کسی کو خیال بھی نہ آتا تھا کہ اس کے اندر کون جل رہا ہے جب اینٹ پر یہ بیکسی، کس مپرسی اور سوخت کامل کا وقت گذر گیا تو امتحان کی سندی گئی اور خاکی پیراہن کے بدلے سرخ رنگ کا لباس مرحمت ہوا. ٹھیلے پر سوار کر کے شہر میں لائی گئی. حوض میں غسل دیا گیا اور ان سب کو جو امتحان سے پہلے ہمجنس کی فرقت سے پریشان تھیں ہم آغوشی کی گھڑی نصیب ہوئی. کنکر زمین کا لخت جگر کدال کی نوک سے پارہ پارہ ہو کر باہر کھنچا. آگ میں بھنا چونہ کہلایا چکی میں پسا پھر کہیں یہ نوبت آئی کہ عرصہ دراز کی فرقت کے بعد اپنی ہموطن اینٹ سے وصال یابی نصیب ہوئی. اسی طرح لوہا بھی جلنے کٹنے پٹنے کی متعدد منازل کے بعد اس قابل ہوا جو اس مکان میں جگہ پائی.

جب یہ بیجان اشیاء کوفت وسوخت کے بغیر مرکز وحدیت وطمانیت پر نہیں آسکیں تو بھر تو اشرف المخلوقات کہلا کر ان امتحانوں سے کیونکر محفوظ رہ سکتا ہے. تو نے

Marfat.com

سُنا بھی ! کہنے والا کہتا ہے۔ خام بودم. پختہ شدم. سوختم. پہلے کچا تھا. پھر پکا. اس کے بعد جل کر منزل حاصل کی یہی کیفیت اینٹ، چونے، لوہے کی ہوئی کہ ابتدا میں وہ بھی کچے تھے۔ پکنے اور جلنے کے بعد وصال نصیب ہوا جس کی خوشی منانے آج اتنے آدم زاد جمع ہوئے ہیں۔ اسی طرح آدمیوں میں جو لوگ خامی سے گذر کر پختگی و سوختگی حاصل کر لیتے ہیں تو ان کی قبروں پر بھی لوگ جمع ہوتے ہیں اور اس اجتماع کو عُرس کے نام سے پکارتے ہیں۔ عُرس کا لفظ عروس سے ہے جس کے معنی شادی و خوشی کے ہیں۔ گویا عرس منزل رسیدہ لوگوں کی اصطلاح میں اس موت کی یادگار ہے جو پختگی و سوختگی کے بعد مقام وصال و بقا تک لی جاتی ہے۔

نتیجہ

آدمی اور اس کے دل کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ جب تک امتحان فنائی کی تکالیف و مصائب کو برداشت نہ کیا جائے، یوم الوصال میسر نہیں آتا اور خیالات مرکز توحید پر جمع نہیں ہوتے۔

لہذا ہم سب کو بھی اسلامی خدمت کے معاملہ میں اس بیجان مگر معصوم ہستی کی مثال بغرض تقلید پیش نظر رکھنی چاہیئے اور مردانہ وار آگے بڑھ کر دکھانا چاہیئے کہ ابن آدم اینٹ چونے سے گیا گزرا نہیں ہے!

دوائی شیشی کے باطنی اشارے

آنکھ نے دیکھے کان نے سنے

از نظام المشائخ. اگست ۱۹۱۲ء

جب ڈاکٹر انصاری نے اپنے کان میں وہ آلہ چڑھایا جس کو کان کی عینک کہنا چاہیئے

Marfat.com

اورحسن نظامی کے سینے کو دیکھنا شروع کیا تو حسن نظامی کی آنکھ نے ڈاکٹری ساز و سامان سے باتیں شروع کیں اور ان سے کچھ سنا. گویا ڈاکٹر صاحب کے کان نے دیکھا اور حسن نظامی کی آنکھ نے سُنا.

ڈاکٹر نے کہا معدہ و جگر میں ورم ہے پھیپھڑا اپنے غنیم امراض کا مقابلہ کرتے کرتے تھک گیا. اس کو سکون کی ضرورت ہے. دماغ ترک مشاغل کا خواستگار ہے یہ نسخہ استعمال کرو اور چپ چاپ ہو کر بیٹھو.

کان کی تشخیص سے ڈاکٹری زبان تقریر کر رہی تھی مگر اس کے جواب میں حسن نظامی کی آنکھ نے دخل نہ دیا. وہ برابر اُن اشیاء کو دیکھتی رہی جو میز پر مراقبۂ ربانی پر مصروف تھیں.

قلم آزادی سے دوات کے پہلو میں بیٹھا تھا کہ ڈاکٹری ہاتھ نے اس کو گرفتار کیا اور کہا لکھ. اس نے تعمیل کی اور کاغذ پر حرکت کرنے لگا. پوچھا گیا کیا لکھتا ہے. بولا کچھ خبر نہیں. ہاتھ کا تابعدار ہوں جو چاہتا ہے لکھواتا ہے. ہاتھ کی آواز آئی نہیں میرا اس میں کچھ دخل نہیں، آنکھ کے اشارے سے لکھ رہا ہوں. آنکھ نے بگڑ کر کہا. کان نے مرض کی شناخت کی ہے وہی لکھواتا ہوگا. کان نے کہا نہیں جناب. مجھے بھی کچھ خبر نہیں. یہ تو کسی اور طاقت کا کام ہے.

حسن نظامی اس انکار یہ بحث کو سن رہا تھا کہ نسخہ تیار ہو گیا. کاغذی پرزا تھا. دوا فروش نے پڑھ کر دو شیشیاں دے دیں جن پر ولایتی لاکھ کی سرخ مہر لگی ہوئی تھی.

جب یہ شیشیاں گھر میں آئیں، کاغذی خرقے سے برہنہ ہوئیں. واحدی صاحب نے بستر بیمار کے قریب لا کر رکھا. چاقو منگایا تا کہ بعید کی مہر شیشی کے منہ سے تراشیں تو ایک صدائے سرمدی آنکھ میں آئی. پہلے مجھکو دیکھو اور میری سنو.

کانچ کی معمولی شیشی ہوں. دیکھنے میں چھوٹا سا ظرف رکھتی ہوں مگر انسان

اشرف المخلوقات سے زیادہ صاحب تحمل و برداشت ہوں۔ اگر آدمی وہ سب دوا ایک ہی دفعہ پی جائے جو میرے اندر ہے، تو مر جائے مگر میں خود زندہ ہوں اور دوسروں کی زندگی میرے ہاتھ میں ہے۔

یہ تمہارے منہ پر مہر کیسی ہے؟

ہائیں تم نہیں جانتے۔ باطنی تاثیر کے لئے یہ لازمی ہے کہ سر بمہر ہو۔ درویش کے منہ پر سکوت کی مہر اسی غرض سے لگائی جاتی ہے کہ وہ امراض معانی کی دوا ہے۔ منہ کھلی اور شیشی اعتبار و اعتماد کے درجہ سے گری۔

اچھا تو کاغذی لباس تم کو کیوں پہنایا گیا تھا؟

اس کا جواب بھی سن لو۔ **الناس باللباس**۔ آدمیت کی پہچان لباس سے ہوتی ہے تو میں دائرہ شائستگی سے کس طرح باہر رہتی۔ خرقہ مکتوبی پہن کر نمودار ہوئی تب معلوم ہوا کہ میں کس مرض کی دوا ہوں۔

کیوں بی شیشی! تمہاری شکل تو گوری ہے، اگر تم کالی ہوتیں تو دوا کی تاثیر میں کچھ فرق پڑ جاتا یا نہیں؟

واہ کیا مجھ کو یورپین خیال کر لیا۔ گو میری نمود یورپ میں ہوئی لیکن اصل نسل مسلمان ہوں اور اس پر صوفیانہ عقائد رکھنے والی، میرے ہاں گورے کالے کی بحث گناہ ہے۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ باطن صاف ہونا چاہیئے۔ رنگ سفید ہو یا سیاہ۔ اگر میرا تن سیاہ ہوتا تو دوا کی تاثیر کو کیا نقصان پہنچاتا۔ اصلیت ہم دونوں کی کانچ ہوتی ہے۔ دوا دونوں میں یکساں ہوتی ہے۔ پھر سیاہ سفید کی بحث سے کیا حاصل؟

درویش کی مہر سکوت ٹوٹ جائے تو پھر وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ تمہاری لاکھی مہر دور ہو جائے تو بیکار ہو جاتی ہو یا نہیں؟

میری مہر سکوت کھلتی ہے تو دوسروں کے فائدہ کے لئے کھلتی ہے۔ ایسا ہی

Marfat.com

درویش اگر دوسرے کے فائدہ رسانی کی خاطر سکوت کی مہر توڑ ڈالے تو ہرج نہیں بلکہ مہر لگتی اسی واسطے ہے کہ کسی کے فائدے کے لئے ٹوٹے۔ میرے منہ پر مہر نہ ہو تو کوڑی کے کام کی نہیں۔ کوئی ہاتھ بھی نہ لگائے۔ مثلاً اگر کسی حادثہ سے میرا منہ کھل جائے تو دوا فروش مجھکو پھینک دیتا ہے کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ اب بازار میں اس کا کوئی خریدار نہ ہوگا اس کے علاوہ اندیشہ ہے کہ بیرونی زہریلا اثر اس میں نہ ہو گیا ہو۔ جو بیمار کو نقصان پہنچائے۔ اسی پر درویش کو قیاس کرنا چاہیئے کہ جب اس کا منہ نفسانی و دنیاوی خواہشات کے لئے کھل جاتا ہے تو روحانی اسپتال میں وہ پھینکنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

واحدی کو دیکھو ابھی باتیں ختم نہ ہونے پائی تھیں کہ انہوں نے شیشی کا منہ کھول کر چمچہ میں دوا نکال لی اور اس زبان و حلق کو تلخ کر دیا جس کے پڑوسی آنکھ، کان شیشی کے باطنی اشاروں کا مزیدار لطف اٹھا رہے تھے۔

وحدتِ سرد کام

برف

از نظام المشائخ۔ اگست ۱۹۱۲ء

تشنگی آلود ایام کیسی بہار کے ہیں۔ جو لوگ حبس دم کے بھید سے واقف نہیں قدرت ان پر سوکھی حبس طاری کرتی ہے۔ اس کے بعد ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا بھیجکر دیکھتی ہے کہ آزادی حبس سے ان کی زبان پر شکرِ الٰہی جاری ہوا یا نہیں۔ مگر یہ غافل ہستیاں شکریہ ادا کرنے کے بجائے اور غفلت کی طرف جھکتی ہیں۔ یوں تو ہر موسم شان یزدانی کا ایک کرشمہ ہوتا ہے مگر گرمی ملک ہندوستان میں ایک بے بہا نعمت ہے جہاں

Marfat.com

ہمیشہ سردی رہتی ہے یا گرمی تیز نہیں ہوتی، وہاں کے باشندے اس لطف سے نا آشنا ہیں کہ لُو کی گرم بازاری ہے، پسینے بہہ رہے ہیں، یکایک کسی گھنے درخت کے سایہ میں پہنچے اور خنک ہوا بدن کو لگی بس اس وقت جو کیفیت جسم و روح دیکھتی ہے، وہ زبان یا قلم سے ادا ہونی محال ہے۔ اللہ میاں نے ہر چیز حکمت سے پیدا کی ہے موسم گرما میں بھی ہزاروں اسرار ہیں جن کو چشم بصیرت عطا ہوئی ہے وہ ان چیزوں کی حقیقت پر غور کر کے ذات باری کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور کہتے ہیں رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔

اور تو اور ذرا گرمی کے تحفے برف کا خیال کرو کیا صاف شفاف۔ پیاری صورت والی چیز ہے۔ مگر آپ تو اس کو پی جانا جانتے ہیں۔ کبھی اس کے پگھلنے والے وجود کے رموز پر غور نہیں کرتے۔ آیئے آج دو گھڑی اس میں جی بہلائیں۔

برف کے نکات

اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک آسمانی، دوسری مصنوعی۔ آسمانی برف اونچے مقامات پر از خود نازل ہوتی ہے۔ سائنس والے کہتے ہیں کہ وہ ابخرے جو سمندر و زمین سے اٹھکر اوپر جاتے ہیں اور مینہ کی صورت بن کر دوبارہ زمین پر برستے ہیں وہی ابخرے شانِ الٰہی سے پہاڑوں پر برف کی شکل اختیار کر کے گرتے ہیں اور جم جاتے ہیں۔

نئے زمانہ والوں نے قدرتی برف پر غور کرتے کرتے بناوٹی برف کا بھید معلوم کر لیا مشین کے ذریعہ سے معمولی پانی کے وہ اجزا نکال دیئے جاتے ہیں جن کے سبب پانی میں نرمی اور پتلا پن ہے۔ ان اجزاء کے نکلتے ہی پانی سخت اور پتھر ہو کر ایسا ٹھنڈا ہو جاتا ہے کہ گرمی کے موسم میں ہر شخص اس پر جان دیتا ہے

برف کے صوفیانہ نکات

اس مختصر بیان کے بعد جس سے برف کی ظاہری حقیقت معلوم ہوئی اس کی

باطنی کیفیت پر توجہ کیجیے۔

جب تک پانی کے اندر نفسانی و کثیف اجزا شامل تھے، اس کے جسم کو قرار و یکسوئی میسر نہ تھی۔ بہتا تھا، ہلتا تھا۔ ذرا سی گندگی سے میلا اور بدبودار ہو جاتا تھا۔ جو رنگ اس میں ڈالا جاتا فوراً اس کا اثر قبول کر کے وہی رنگ اختیار کر لیتا تھا۔ لیکن مجاہدۂ مشین نے اس کے سارے تفرقہ انداز اجزاء کو فنا کر کے ایسا پکا متحد کر دیا کہ جس رُخ سے دیکھیے ایک ہی شکل نظر آتی ہے۔ اوپر بھی پانی، نیچے بھی پانی، اندر بھی پانی، باہر بھی پانی اور سب خنک و سرد۔ اس کو کہتے ہیں وحدت کا کمال۔ اب اس پر گندگی ڈال لیے تو پھسل کر بہہ جائیگی رنگ ڈال لیے تو وہ بھی اوپر اوپر اڑ جائیگا۔

صوفی بھی جب برف کی طرح اپنے باطن کو مجتمع کر لیتا ہے تو پھر وہ خواہ کیسے ہی بدنما مقام میں جائے، اس پر کسی برائی کا اثر نہیں ہو سکتا۔

اور یہ بھی سن لیجیے کہ برف میں ایسی ٹھنڈک کہاں سے آگئی کہ انسان اس کو ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ حالانکہ جب تک وہ پانی کی شکل میں تھی، ہر شخص آسانی سے اُس میں ہاتھ پاؤں ڈال سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب نفسانی کثافت دور ہو جاتی ہے تو قدرت ایک ایسا جوہر پیدا کر دیتی ہے کہ پھر ہر کس و ناکس اس پر آسانی سے قبضہ نہیں پا سکتا۔

رہی یہ بات کہ پھر انسان اس کو کاٹ کر اور گھول کر شربت میں ملا کر کیوں پی جاتے ہیں، اس کا جواب صاف یہ ہے کہ جس طرح صوفی دوسروں کی فائدہ رسانی اور تسکین کے لئے پیدا ہوا ہے، اسی طرح برف بھی پیاسوں اور تشنہ کاموں کو تسلی دیتی ہے اور وہ یہ کہ اپنی ہستی قربان کر کے تسلی دیتی ہے۔

ہائے غفلت شعار آدمی! شیشے کے گلاس میں برف کا ٹکڑا ڈال کر گھونٹ لے رہا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ پارۂ برف تیری خاطر اپنی چمک دار ہستی مٹا رہا ہے

Marfat.com

گھلا جاتا ہے اور پانی کو سرد کام کر رہا ہے مگر ابن آدم اس ذات ترحم صفات کا شکرانہ نہیں بھیجتا جس نے کائنات کے بیشمار جلوے اس کے لئے پیدا کئے۔ اول اول تو پروردگار ڈھیل دیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ شاید یہ بندہ مجھ کو یاد کرلے۔ مگر جب وہ بیخبری سے باز نہیں آتا تو پھر وہ تماشہ دکھاتا ہے جو ابھی حال میں پیش آیا۔

کہ "ٹائٹانک" نامی جہاز اہل مغرب نے بنایا اور سمجھا کہ اب اس سے بڑا کوئی جہاز دنیا میں نہیں ہے۔ اس میں ہوائی کمرے بنائے تاکہ وہ پانی کے طوفان سے محفوظ رہے اور ڈوبنے نہ پائے لیکن قدرت نے خیال کیا کہ یہ سرکش آدمی یوں نہیں مانیں گے اس واسطے اس نے جہاز کو برباد کرنے کے لئے برف کا ایک ٹکڑا بھیجا جس نے دنیا کے سب سے بڑے جہاز کو ایک ہلکی سی ٹکر مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اب انسانوں کی آنکھ کھلی کہ جس برف کو سوڈے کے پانی میں گھول کر پی جاتے تھے جس برف کو موگری سے کچل ڈالتے تھے اس برف کے ٹکڑے نے سینکڑوں قیمتی جانوں کو سمندر کے کھاری سوڈے میں ملا کر نوش جان کر لیا۔

جلال و جبروت والے کی ثنا

برف کی یہ گرم کہانی سن کر ان لوگوں کا فرض ہے جو جنگل میں درختوں کے پتوں پر معرفت الٰہی کے دفتر لکھے دیکھتے ہیں کہ اپنے جلال و جبروت والے خدا کی حمد و ثنا کریں۔ اے رب العزت، اے رب الحکمت، اے رب الاسرار جان تجھ پر صدقے، دل تجھ پر واری۔

برف کے گرنے والے ٹھنڈے قطروں کی قسم، ہم ان پر تیرے فیضان کی بہار دیکھتے ہیں۔ یہ قطرے زبان کی پیاس کو بجھاتے ہیں۔ ایسا قطرہ عنایت فرما جو دل کی تشنگی کو سیراب کرے۔

Marfat.com

برف ہوا سے بچائی جائے۔ گرم کمبل میں چھپائی جائے تو جلدی نہیں پگھلتی۔ ہم کو اپنی گلیم معرفت کے دامن میں ڈھک لے۔ تاکہ حوادث ایام کی ہوا ہماری روحانی ہستی کو برباد نہ کرنے پائے۔ الٰہی برف کے عذاب سے بچا اور اس کو ہمارے جسم و روح کے لئے عذاب و شیریں کام بنا۔

دِل ھاؤس

از نظام المشایخ ستمبر ۱۹۱۲ء

میاں سنتے ہو؟ دہلی میں گورنمنٹ ہاؤس بنتا ہے۔ دن رات کام ہو رہا ہے آنکھیں جاگتی ہیں اور جگائی جاتی ہیں۔ تم بھی اپنا دل ھاؤس بناؤ۔ ویرانے کو آباد کرو گورنمنٹ ھاؤس کا راتوں رات بننا ایک غیر معمولی جلدی کا سبب ہے ورنہ ظاہری عمارات کے بنوانے والے صرف دن کو کام لیا کرتے ہیں لیکن دل ہاؤس ایک ایسی عمارت ہے کہ یہ رات کے اندھیرے ہی میں چنی جاتی ہے جس وقت سارا سنسار سوتا ہے۔ اس وقت پروردگار اور اس کے وہ بندے جو دل ہاؤس کی تعمیر کے طلبگار ہیں، جاگتے ہیں۔

گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر میں بجلی کی روشنی ہے، غل ہے، شور ہے مگر دل ہاؤس کی تعمیر کے واسطے تاریکی اور سکوت کی ضرورت ہے۔ جب گورنمنٹ ہاؤس بن جائیگا۔ اس کے دروازوں پر پہرے دار ہوں گے کہ کوئی شخص اندر نہ آنے پائے لیکن دل ہاؤس ایک ایسا وسیع مکان ہے جس میں کائنات کے تمام جلوے بے روک ٹوک آسکتے ہیں۔ گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر میں اگر قبریں کھدوا کر پھینک دی جائیں۔ مندروں اور مسجدوں کی مسماری ہو اور وہ تاریخی مقامات جن سے دہلی کا چپہ چپہ

معمور ہے۔ بے نام و نشان ہو جائیں۔ تب بھی تم اس کی تقلید میں کسی کی دل آزاری نہ کرنا کیونکہ دل ھاؤس کی تعمیر دل داری و دل جوئی کی بنیاد سے شروع ہوتی ہے۔ یہہ ہاتھ سے گئی تو مکان بنیاد شوار ہو جائے گا۔ اول تو گورنمنٹ ہاؤس کے بنوانے والے بھی ایسے ستم شعار نہیں ہیں جو خواہ مخواہ کسی کے دل کو دکھائیں اور مذہبی یادگاروں کو مٹا کر اپنا گورنمنٹ ہاؤس بنائیں اور اگر بفرض محال کوئی ایسی جگہ آبھی جائے تو کافی معاوضہ دے دیا جائے گا۔ لیکن تمہارے گھر کے دل کی بنیاد ادنےٰ سی دل شکنی میں بے بنیاد ہو جاتی ہے۔ یہاں معاوضات سے کام نہیں چلتا۔

گورنمنٹ ہاؤس کے رہنے والے زمین اور اہل زمین کے جسموں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ دل ہاؤس کی جہانداری اس سے وسیع ہے۔ اس کا حکم جسم و روح دونوں پر چلتا ہے۔ گورنمنٹ ھاؤس کے اہل کار اور شہر یار بھی دل ہاؤس کے تابع فرمان ہیں۔

دل ہاؤس دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک دیسی اور ایک بدیسی۔ دل بیچارہ ایشیا میں رہتا ہے۔ ہندوستان میں رہتا ہے۔ علی الخصوص مسلمانوں کے سینہ میں رہتا ہے اور یہ وہ مقامات ہیں جہاں اس کی خوب خاطرداریاں ہوتی ہیں اور اس کے جذبات کی بہت بڑی قدر کی جاتی ہے۔ یہی دل گو یورپ والوں کے سینے میں بھی رہتا ہے مگر وہاں یہہ اپنے گھر کے کام دھندے میں ایسا مصروف ہوتا ہے کہ دوسرے دل سے سروکار نہیں رکھتا۔ اسی واسطے ایشیا والے کہتے ہیں کہ یورپ کا دل خود غرض اور بکار خودی مصروف ہے۔ لیکن ہمیں اس سے بحث نہیں۔ کوئی خود غرض ہو یا نہ ہو، ہم تو اس کو دیکھتے ہیں کہ دل میں اپنے پیدا کرنے والے کی بھی کچھ یاد ہے یا نہیں۔ اگر ایشیا والوں میں یہہ بات یورپ

Marfat.com

سے زیادہ ہے تو ہمیشہ انہی کا بول بالا ہو گا اور اگر اہل یورپ کے دل واقعی اس نعمت سے محروم ہیں تو ان کے علاقے اجڑ جانے کے قابل ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا۔ دیسی کے بعد بدیسی ہاؤس کو دیکھیے۔ خبر نہیں لوگوں نے یہ دیسی بدیسی کا کیا جھگڑا لگایا ہے ہاؤس کے معنی انگریزی زبان میں گھر کے ہیں۔ خانہ دل نہ کہا، بیت القلب نہ پکارا، دل ہاؤس کہہ دیا۔ مفہوم و مقصود و حقیقت تینوں کی ایک ہی ہے۔ فرق صرف زبان اور بولی کا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ دہلی کو دل لی کہتے تھے یعنی دل لینے والی بستی۔ اب وہ وقت کہاں۔ نہ دل ہی رہا اور نہ دل لینے والی ہی رہی۔ وہ اجڑ گیا، یہ مٹ گئی، وہ برباد ہو گیا، یہ تباہ ہو گئی۔ شکر ہے کہ انگریزی سرکار نے جھاڑو ہاتھ میں لے کر اس کی صفائی شروع کی ہے۔ شاید کوڑے کرکٹ کے دور ہونے سے اس کی حالت کچھ سنبھل جائے لیکن ابھی تک تو دل لی کا نام اس پر صادق آنے کا کوئی سامان نظر نہیں آتا۔

خدا بخشے میری بیماری کو جس کے طفیل ڈلہوزی پہاڑ پر جانا ہوا تھا۔ ایک انگریزی داں نے کہا ہوز اور ہاؤس ایک ہی چیز ہے جس کے معنے گھر کے ہیں۔ گویا یہ پہاڑ دل ہاؤس یا بیت القلب تھا۔ کانوں کو یہ نام بہت بھلا معلوم ہوا اور اس لفظ میں سراپا حقیقت کے کرشمے نظر آنے لگے جب اس پہاڑ کی صورت دیکھی تو معلوم ہوا کہ بہشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ وہ بہشت جس کی مومن اور نیکوکار لوگوں کے نام رجسٹری نہیں ہوئی۔ اس میں ہندو مسلمان نیک و بد، ادنے و اعلےٰ بغیر روک ٹوک کے آ سکتے ہیں۔ امتحان صرف اتنا ہوتا ہے کہ بادون میل کے پل صراط سے گزرنے کے بعد یہ بہشت نصیب ہوتی ہے۔ اس کا نام رحمت خداوندی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے کافر مسلم کش بندے قیامت کے بعد ابدالآباد دوزخ میں رہیں

تو دنیا میں بھی ان پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوا اور ہوٹلوں کے باراحت عیش سے محروم کردے۔ اور یہ سب اس پہاڑ پر موجود ہیں۔

کیسی بہار ہے، اونچے اونچے پہاڑ خبر نہیں کتنی مدت سے اپنے پروردگار کے سامنے پاؤں باندھے کھڑے ہیں۔ آنسوؤں کے چشمے سے وضو کرتے اور حضوری قلب کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، خدا نے بھی ان کے دل کو آباد کیا ہے جدھر دیکھو ہرے بھرے درخت لہلہا رہے ہیں۔ پرندے ٹہنیوں پر بیٹھے نغمہ سنجیاں کرتے ہیں۔

آدمی بھی جب کوہ وقاری سے یکسو ہو کر خدا کے سامنے حاضر ہوتا ہے تو اس کے دل میں بھی یہ خنکی، یہ سرسبزی، یہ شادابی پیدا ہو جاتی ہے جس کو انگریزی اصطلاح میں دل ہاؤس کی آرائش کہنا چاہیئے۔

اور ہاں اس پر بھی توجہ کی؟ پہاڑوں میں انسان کو نشیب و فراز کے راستوں سے کیسی تکلیف ہوتی ہے جب بلندی پر چڑھتا ہے سانس پھول جاتا ہے۔ ہانپتا ہے۔ رک کھڑا ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اب کتنا راستہ باقی رہ گیا ہے اور جس وقت بلندی سے پستی کی طرف آتا ہے اس وقت بھی یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں زور و تیزیٔ رفتار میں آس پاس کے کسی کھڈ یا غار میں نہ گر پڑے۔

ڈاکٹروں کی رائے میں پہاڑوں پر ترقی صحت کا یہی راز ہے۔ جو لوگ نشیب و فراز کی مشکلات میں شریک نہیں ہوتے، گھر میں آرام سے بیٹھے رہتے یا سواری پر چلتے پھرتے ہیں ان کی صحت ہمیشہ خراب رہتی ہے۔ اسی طرح دل ہاؤس کے معماروں کا خیال ہے کہ نفی اثبات کے نشیب و فراز میں چڑھنا اترنا صحتِ باطن کے لئے لازمی ہے۔ اس کی تکلیفات کا خیال کر کے جو لوگ گھبراتے ہیں، ہمیشہ روحانی امراض میں مبتلا رہتے ہیں۔

Marfat.com

چڑھو لاالہ کی بلندی پر اور اترو الا اللہ کی وادی میں۔ دل ہاؤس کی تعمیر کے لئے موسم رمضان خوب زمانہ ہے۔ جذبات یکسو، ارادے پاکیزہ، نفسانیت کی سربازاریاں ان دنوں میں تم بھی اپنا دل ہاؤس بنا لو۔ پھر خبر نہیں کل کیا پیش آنے والا ہے۔

دل ہاؤس کا فرنیچر روزہ نماز اور ذکر الٰہی ہے۔ گورنمنٹ ہاؤس کے لئے میز کرسی چاہیئے۔ دل ہاؤس کے لئے ایک سجدۂ با اخلاص اور حمد کا ایک سچا جملہ درکار ہے روزے سب رکھتے ہیں مگر جسم کی زبان بھوکی پیاسی رہتی ہے اور نفس کی زبان کھانے پینے سے باز نہیں آتی، ایسا روزہ کس کام کا؟ دل ہاؤس کی آرائش چاہتے ہو تو ہوا و ہوس کی زبان بند کرو، اس کو روزہ رکھواؤ مسجدیں خوب آباد ہیں۔ نمازیوں کی صفیں بھی بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ کی جگہ کوہ ہمالیہ کی صفوں کی مثل ہوتی ہیں لیکن ان میں اکثر لوگ میز، کرسی، کالر۔ ٹائی۔ بوٹ۔ سوٹ۔ چھری۔ کانٹا۔ نوکری و خدمت گاری۔ غلامی و اطاعت شعاری۔ ممبری اور مجسٹریٹی۔ خان بہادری اور شمس العلمائی کے نشہ میں چور ہو کر اس وعید کے مستحق ہوتے ہیں جو دُنیا کے اُتر جانے والے عارضی نشہ بازوں کے خلاف حکم قرآن کے پردے میں مخفی ہے پروردگار نہیں چاہتا کہ اس کے بندے غیریت کے نشہ سے مخمور ہو کر حضوری میں آئیں۔ اس واسطے ارشاد فرماتا ہے کہ ایسی حالت میں نماز نہ پڑھو یعنی میرے سامنے نہ آؤ جبکہ تم نشے میں مدہوش ہو۔ سرکش انسان نے سمجھ لیا کہ نشہ نماز سے چھٹکارے کا نام ہے۔ کیونکہ خدا کہتا ہے کہ مخموری میں نماز کے قریب بھی مت جاؤ۔ کاش وہ ارشاد ربانی کے ناز محبوبیت تک رسائی پا سکتے اور معلوم کرتے کہ نماز محبوب کی نزدیکی کا نام ہے۔ غیریت کا نشہ پئیں گے تو ہجر و فراق میں پھینک دیئے جائیں گے۔ پس اگر دل ہاؤس کی بنا کو مستحکم کرنا اور اس کی آرائش و زیبائش کو مکمل دیکھنا چاہتے ہو تو رمضان شریف میں ایسی تازگی سے روزہ افطار کرو جو غیریت کے تمام نشے اُتار دے اور تمہارے

Marfat.com

دل کو خدا کا گھر بنا دے۔ ورنہ جناب اکبر الہ آبادی کا یہ شعر تم پر صادق آجائے گا۔

خدا کا گھر نہ رکھا دل کو بنگلوں میں مکیں ہوکر
بھلایا عرش کو اس قوم نے کرسی نشیں ہوکر

نُقطَہ 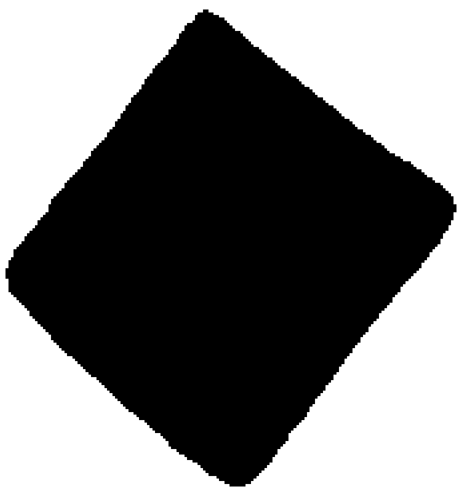 صِفَر

از نظام المشائخ۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء

معدوم و نابود چیز کو صفر کہتے ہیں۔ نقطہ بھی اسی شکل کا نام ہے حساب اور اقلیدس و ہندسی رموزدانوں کی خبر نہیں کہ وہ اس محیط بے سر و پا ہستی کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں۔ فقیر کو علم و فضل کی باتیں یاد نہیں۔ اس کو تو یہ بے تعلق تعلق دارنکات سے لبریز نظر آتا ہے۔

کسی نے حرف بے سے کہا تجھ میں اور تے ثے میں کیا فرق ہے؟ صورت تینوں کی یکساں ہے۔ تفاوت فقط اس کا ہے کہ بے کے نیچے ایک نقطہ اور تے کے اوپر دو نقطے، ثے پر تین نقطے؛ بے نے جواب دیا یہی سوال میں نے الف سے کیا تھا کہ جب تو اکیلا تھا تو تیرا مطلب بھی ایک نکلتا تھا لیکن جس وقت تیرے پہلو میں ایک نقطہ بڑھایا گیا تو معانی دس گنے ہوگئے۔ دوسرا نقطہ اور زائد کیا تو ایک سے سو ہوگئے تیسرا بڑھا تو ہزار بن گئے۔ یہ کیا بھید ہے؟

الف نے جواب دیا۔ خاموش رہ کائنات کی پیدائش کا راز اسی کے اندر مضمر ہے الٰہی گورنمنٹ نے لارڈ کرزن کی سرکار سے پہلے اس راز کو قانونِ رازداری کی مہر سے مخفی کر دیا ہے۔ زبان سے افشا کا ایک حرف بھی نکلا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

حروف کی باتیں سن کر حسن نظامی نے کہا۔ میں نے لارڈ کرزن کے قانون

رازداری کو ہمیشہ بام سے نیچے گرتے دیکھا۔ اس کی تشبیہ یزدانی قانون سے ناجائز ہے
مادہ پرست آدمیوں کے قوانین دوچار دن کے مہمان ہیں اقبال کی آنکھ دیکھتی ہے مگر
وہ لب پر نہیں لا سکتے۔ میری آنکھ دیکھتی ہے۔ زبان بولتی ہے اور ہاتھ حرکت کرنے
کو تیار ہے کیونکہ اقبال مظہر قال ہے اور بندہ پیکر حال ہے۔

سنو! میں تم سے کہوں۔ یہ صفر جس کو عنوان میں دیکھا۔ ایک ہولناک انقلاب کا
علمبردار ہے۔ بسم اللہ اس کتاب کی ابتدا ہے اور حروف الفاظ کی سب کتابوں سے
افضل ہے لیکن اس بسم اللہ کی بھی ایک ابتدا ہے اور وہ بے کا نقطہ ہے۔ اس نقطہ
کی تشریح آج کے دن مقصود ہے جس دن تم اس کو پڑھوگے۔ عیدالفطر کو سات آٹھ
دن گذر چکے ہوں گے خوشی کا کمال زوال ہوگا۔ لہٰذا اس مشکل اور باریک مضمون کو ذرا
غور سے پڑھنا۔

اللہ۔ ہمارا معبود اس کے لفظ میں کوئی نقطہ نہیں۔ محمدؐ۔ ہمارے رسول۔ اس
ہیئت میں بھی نقطہ معدوم۔ آخری نجات اور عروج جس ذات پر منحصر ہے، وہ امام ہے
وہ بھی بے نقطہ۔ ہندی میں اللہ کو ہر کہتے ہیں اور ہر بھی بے نقطہ ہے! ادم بھی اللہ کا نام ہے وہ بھی بے نقطہ

دل کہتا ہے تم میرے مقصود کے مفہوم تک اتنے کم لفظوں میں نہیں پہنچ سکتے
کھو گئے کیا لکھا۔ ہم نہیں سمجھے۔ دماغ میں کچھ خرابی تو نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے
کہ قرآن شریف سب سے آسان کتاب ہے مگر اس کے شروع میں الٓمٓ کو
عام فہم کیوں نہ ہونے دیا۔ بس انسان کی طاقت اتنی ہی ہے کہ دور سے اشارہ
کر دے۔ یہ تو ہوا خاص فہم حصہ، اب عام دلچسپی کی باتیں سنیئے۔ ع

بیکارم و باکارم چوں مد بحساب اندر

حساب کی رقموں میں میاں مد کی ہستی بیکار بھی ہے اور باکار بھی۔ تاہم یہ مسلم ہے
کہ اصل رقم سے اس کے وجود کو کچھ سروکار نہیں۔ ایک دن ایک مرید نے

Marfat.com

حسن نظامی کے ہاتھ پاؤں کو چوما اور سمجھا کہ میں نے حسن نظامی کے متبرک جسم سے برکت حاصل کرلی لیکن جسم میں برکت کہاں۔ وہ تو حساب کی رقموں کا مد ہے۔ ذات اور روح کے لین دین کا حساب کتاب ہو اور جسم کمبخت کی مفت کھینچا تانی کی جائے ہمیشہ اپنے ہاتھ کو دیکھتا ہوں کہ وہ دماغ کے کہنے سے کاغذ پر کچھ لکھا کرتا ہے۔ دنیا کی خلقت ہاتھ و دماغ کے عمل کو کتاب واخبار میں پڑھ کر حسن نظامی کو اس کا ذمہ دار تصور کرلیتی ہے۔ اور یہ نہیں جانتی کہ انکو حساب کتاب سے کچھ سروکار نہیں ہوتا صفر اور نقطہ کا بھی یہی عالم ہے کہ سب کچھ ہے اور کچھ نہیں۔

قربان اس دائرہ حقیقت کے۔ کیا کیا تماشے پردۂ کائنات پر برپا کئے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ مخلوق آفتاب، اور ادنےٰ سے ادنےٰ ہستی ذرّے کو دیکھئے۔ یہ بھی حساب کے مد اور صفر و نقطے کی طرح بیکار بھی ہیں اور باکار بھی۔ آفتاب گرم ذرات کا مجموعہ زمین کے سب کارخانوں میں دخیل ہے اس لئے باکار ہے لیکن رات کو جب یہ غروب ہوجاتا ہے تو دنیا کے کارخانے بند نہیں ہوجاتے۔ اس واسطے بیکار ہے ذرہ عالم مرکب کا انتہائی اور آخری نقطہ ہے۔ اس کی جنس نہ ہو تو ساری کائنات بیکار ہے۔ لہذا اس کا وجود باکار مگر ایک ذرے کا ہونا نہ ہونا کوئی چیز نہیں۔ پھر اس کے ناکارہ ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔ اسی پر نقطہ اور صفر کو قیاس کرو۔ عنوان میں اس کی صورت دیکھ کر کوئی مطلب سمجھ میں نہ آئے گا اور بیکار چیز معلوم ہوگی۔ لیکن جس وقت جسمی تعلقات کو یکسو کر کے اس کے حقائق و معارف پر غور کروگے تو یہی نہی مُنّی چیز محیط الکل نظر آئے گی

نظام المشائخ کے مضامین اور حلقہ کی تمام تحریروں کے شروع میں ۷۸۶ کے نیچے دو لکیریں کھی جاتی ہیں۔ خیال ہوتا ہوگا کہ یہ ایک بیکار فعل ہے۔ پر جو اس بھید سے واقف ہیں وہ ان کو باکار اور میکسم گن سے زیادہ کارگر پاتے ہیں۔ جس تحریر پر یہ

نشان ہوگا. خدا نے چاہا تو وہ کبھی بے اثر نہ رہے گی۔ یہ دو لکیریں نہیں ہیں، تاثیر تحریر کے قوی کے لئے ایک قوت دار معجون ہے۔

نقطہ اور صفر بھی ان ربانی اسرار و معاد سے لبریز ہے۔ اگر تم اس کی روحانی اور فلسفیانہ باریکیوں پر غور نہیں کر سکتے تو ایک کاغذ پہ نقطہ کی گول شکل بناؤ اور پھر تنہائی میں اس پر نگاہ جماؤ اور اپنے خیالات کو نقطے کے چاروں طرف پھیلا دو پھر دیکھو کیا لطف اور مزہ آتا ہے۔ بشرطیکہ چند روز تک اس کی مسلسل مشق کرتے رہو۔ اور خیال اور تصور کو اسی ایک بات پر جمائے رکھو۔

اس مضمون کی سرخی پر نظر جماؤ اور سوچو۔ یہی سب کا مرکز اور محیط ہے۔ ہر دُکھ، غم اس کے اندر فنا ہو رہا ہے۔ اٹلی کی فوجیں، روس کے لشکر اس غار جہنم میں گر رہے ہیں۔ اب اس کو گردش ہوگی تو گرد و پیش کے تمام مستحکم قصر متحرک ہوں گے اوہام، خوف۔ رعب کو شکست ہوگی۔

موسیٰؑ نے درخت اور پہاڑ کی آڑ میں دیدار دیکھا تھا۔ مسلم دیدار دیکھنا چاہتا ہے تو نقطہ اور صفر کو سامنے لائے جو کرۂ خاک کا خیالی پیکر ہے۔ جو قلب جسمانی کی تصویر ہے جو ازل و ابد کے درمیان بے تار کا محکمہ پیام رسانی ہے۔

بندوق کی گولی نقطہ اور صفر کی شکل سے مشابہ ہے مگر گولی پیام مرگ ہے اور نقطہ وصفر رشتہ زندگانی۔ زندگی کو پر لطف بناؤ اور اس مجذوبانہ بڑ کو سمجھو۔

آنکھ کی پُتلی، خال رخ یار، اور ان تمام صورتوں کی قسم جو نقطہ و صفر کی شکل یا قریب الشکل ہیں، نقطہ کے وجود میں نکات کا خاموش دریا موج میں آنا چاہتا ہے۔

جب اس دریا اور سمندر میں موج آئیگی تو ایک بُلبلا اور حُباب پیدا ہوگا جو سمندر اور دریا کے حرف کا نقطہ ہے۔ اور اُس کے اندر راز و اسرار کی ہوا اور گیس بھری ہوئی ہوگی اور جب وہ ٹوٹ جائیگا تو پانی کے قطرہ پانی میں مل جائیں گے۔

یا

عرفان کی لکیر

از نظام المشائخ ۔ دسمبر ۱۹۱۲ء

ذرا کہنا پڑھنے والوں سے کہ آج کل دنیا کہتی ہے میں پریشان ہوں، آشفتہ خاطر ہوں، زندگی سے بیزار ہوں، میرا چین و آرام جاتا رہا۔ مصائب و آلام نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، کیونکہ جدھر نگاہ جاتی ہے خود غرضی، حرص و ہوس کا دَور نظر آتا ہے اخلاق و مروت کا نام نہیں۔ رحم و انصاف مفقود ہو گئے۔ ایک قوم دوسری قوم کو، ایک ملک دوسرے ملک کو، ایک شہر دوسرے شہر کو، ایک کنبہ دوسرے کنبہ کو۔ یہاں تک کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کو نہیں دیکھ سکتا۔ سب آپس میں ایک دوسرے کے درپے آزار ہیں۔ طاقتور کا خیال ہے کہ کمزور کو اس زمین پر رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اسے مٹا دو، فنا کر دو۔ ناتوان چاہتا ہے اوروں کی توانائی بھی جاتی رہے۔ سارا عالم یکساں ہو جائے۔ فقیر نے سوچا کیا یہ شکایت ٹھیک ہے۔ دل نے جواب دیا "کچھ صحیح اور کچھ غلط" اللہ تعالےٰ نے انسان اور اس جہان کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ وہ پہلے اپنی ہستی پر غور کرے اور وجہ پیدائش کو پہچانے۔ مگر بھول چُوک کا پتلا آدم زاد دوسروں کو دیکھنے لگا۔ ان کے نیک و بد میں مصروف ہو گیا۔ اور اپنی ذات کو پس پشت ڈال دیا۔ کیا آپ نے نہیں سنا۔ یورپ کی طاقتیں

ایران و مراکو، طرابلس و ترکی پر حملہ آور ہوئی ہیں کہ ان ملکوں کی تہذیب کو بزور تلوار درست کریں مگر خود اپنی ذاتی اصلاح و اندرونی خرابیوں کی درستی کی طرف سے ان کی آنکھیں بند ہیں اور یہی وجہ تکلیفات و صعوبات کے بڑھنے کی ہے۔ اگر ہر آدمی پہلے اپنی ذاتی اصلاح و بہبودی کی طرف متوجہ ہو تو خدا کی بنائی ہوئی زمین فتنہ و فساد اور غم و آلام سے چھٹکارا پا جائے۔ انسان خدا کی بنائی حکمتوں کا ایک خزانہ ہے کون انسان؟ وہ جو کوٹ پتلون پہنتا ہے، کالر نکٹائی لگاتا ہے، پاؤں کو بوٹ سے آراستہ کرتا ہے اور چرٹ منہ میں دبا کر نیم فرعونی شان سے اکڑتا ہوا چلتا ہے اور وہ جو ٹخنوں سے اونچا پاجامہ، بوسیدہ میلا کرتہ پہنے، منڈے ہوئے سر پر ڈھائی گز کا دوپٹہ لپیٹ لیتا ہے۔ اور وہ جس کی ٹانگیں گھٹنوں تک دھوتی سے برہنہ نظر آتی ہیں اور ہاتھ کے بنائے ہوئے معبودوں کے آگے سر جھکاتا ہے۔ یہ سب زمین پر حرکت کرنے والی مورتیں خزانہ الٰہی کی تھیلیاں ہیں۔ ان سب کے اندر دولت لازوال بھری ہوئی ہے لیکن غافل ہستیاں اس کی قدر نہیں کرتیں اور نفسانی و شیطانی خواہشوں پر خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کو برباد کر رہی ہیں۔ ان بادشاہوں سے پوچھو۔ جب تم لاکھ آدمیوں کا لشکر لے کر اپنے دشمن پر حملہ کرتے ہو اور بے شمار جانوں کا نقصان کر کے صرف اپنی ناموری کماتے ہو۔ تو وہ ناموری تمہارے کس کام آتی ہے؟ جاڑے کا گرم لحاف اچھا یا تمہاری یہ ناموری؟ اگر سردی کے وقت لحاف اور کمبل میسر نہ آئے تو یہ ناموری تمہارے جسم کو سردی سے بچا سکتی ہے مگر بادشاہوں سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے امیروں اور سرمایہ داروں اور دوسروں کی محنت کے پھل کھانے والوں سے دریافت کرنا فضول اور بے کار ہے وہ اس کا جواب نہیں دیتے ان کے خیال میں زندگی اسی کا نام ہے کہ ایک انسان اپنی فانی عزت و شان کے لئے لاکھوں انسانوں کو قربان کر دے اور ان قیمتی وجودوں کو موت کے گھاٹ اتار دے

Marfat.com

جن کو برسوں کی مشقت کے بعد ماتا بھری گودوں نے پالا پوسا تھا۔
جب میرا دایاں ہاتھ ان خیالات کو قلمبند کر رہا تھا تو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے نے کچھ اشارہ کیا۔ اس نے کہا مجھ میں کیا لکھا ہے؟ اس کو پڑھو۔ میں ربانی دستاویز کی شہادت ہوں۔ خدا نے فرمایا تھا۔ قیامت کے دن آدمیوں کے ہاتھ پاؤں سے گواہی لوں گا اور وہ انسان کے اعمال کی شہادت دیں گے۔ قیامت تو دور ہے، اس کا نمونہ زمین کے اس دور پر آشوب میں، جو درحقیقت محشری زمانہ ہے، اعضائے جسم گواہی کے لئے طلب کئے جا رہے ہیں۔ ایک وقت تھا جبکہ دستاویز کی تکمیل مہر و دستخط سے ہوتی تھی۔ اب قیامت قریب آگئی۔ مہروں اور دستخطوں میں جعل سازیاں ہونے لگیں۔ اس واسطے خدا نے ایک نیا ذریعہ تکمیل صداقت کا پیدا کیا اور وہ انگوٹھے کا نشان ہے۔ تمام معاملات، جن کا عملدآمد تحریر میں آتا ہے، انگوٹھے کے نشان سے مکمل کئے جاتے ہیں۔ دائیں ہاتھ کے فخر کو قرن گذر گئے۔ وہ کہتا تھا کہ جو کچھ ہوں میں ہوں۔ میرے بل پر سب کام ہوتے ہیں خدا کو انانیت کسی کی نہیں بھاتی۔ آج دایاں ہاتھ بے کار ہے اور بائیں ہاتھ کے کرتب کا سارے جہان میں دور دورہ ہے اس میں نصیحت ہے۔ ان لوگوں کے لئے، جو غرور و تکبر و خود پرستی کے متوالے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہماری لن ترانیاں ہمیشہ برقرار رہیں گی مگر دوام اور ہمیشگی صرف خدا کی ذات کو ہے۔ باقی ہر ایک کے لئے انقلاب و زوال ہے۔

اللہ کے بندو! اپنے جسم پر غور کرو۔ تمہارے رونگ رونگ میں اسرار ربانی کے نوشتے ہیں۔ تمہارا بال بال یزدانی رموز میں بندھا ہوا ہے۔ انگوٹھے کی لکیریں جس طرح تمہارے معاملات دنیاوی میں کام آتی ہیں اسی طرح ان سے عرفان الٰہی کا کام نکالو لین دین کے کاغذات پر انگوٹھے کا نشان کرتے وقت ذرا

یہ بھی سوچ لیا کرو کہ تم کس کی انگشت حقیقت کا نشان ہو۔ کھانے۔ پینے۔ لڑنے، جھگڑنے۔ خود بینی وخود ستائی کے لئے تم کو نہیں پیدا کیا گیا۔ پروردگار کو تمہاری پیدائش سے اپنی طاعت وعبادت مقصود ہے اور وہ عبادت نماز اور پوجا کی اٹھک بیٹھک نہیں ہے بلکہ اپنے وجود کا عرفان ہے اور خدا کا ارشاد اس کا شاہد ہے۔ کائنات کی دستاویز قلم تکوین سے جب لکھی گئی تو کن کہنے والے نے مخلوقات کے کاغذ پر ایک انگوٹھے کا نشان لگایا تاکہ سند ہو اور وقت ضرورت کام آئے۔ وہ سند کیا ہے اور وہ ضرورت کیا ہے اور وہ انگوٹھے کا نشان کس سے مراد ہے؟ نشان انگشت وجود انسانی ہے سند خلافت رحمانی ہے۔ ضرورت موت کے بعد وہ گھڑی جو سب کو پیش آنی ہے جس نے خود کو پہچانا اس نے خدا کو جانا۔ صوفیوں کا عقیدہ ہے کہ کائنات کے باطنی وملدروقی انتظام کے لئے پروردگار کی جانب سے ایک شخص مقرر ہوتا ہے جس کے عہدے کا نام قطب عالم یا قطب مدار ہے۔ قطب عالم کے دائیں بائیں دو وزیر ہوتے ہیں۔ دست راست کے وزیر کا نام عبد الملک اور دست چپ کے وزیر کا عبد الرب۔ عبد الملک کا یہ کام ہے کہ خدا پرستوں کے معاملات کو قطب عالم کے حضور میں پیش کرے اور عبد الرب ان لوگوں کی مہمات بارگاہِ قطب عالم میں پیش کرتا ہے جو دائرۂ توحید خدا پرستی سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

اس زمانے میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ دشمنان توحید تمام دنیا پر چھائے چلے جاتے ہیں اور خدا پرست ہر جگہ مغلوب ہو رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے دست چپ کے وزیر کے لئے اپنی نعمتوں کا دروازہ کھول دیا ہے مگر صفات الٰہی کی مختلف شانیں ہیں۔ آج ہمارے شامت اعمال کے سبب صفت قہاری کا ظہور ہے اور قطب عالم کے وزیر دست چپ بر سر حکمرانی ہیں جس کی وجہ سے دنیاوی دستاویزوں پر انگوٹھے کا نشان بھی بائیں ہاتھ کا لگایا جاتا ہے

توکل ہماری تو بائیں قبول ہوں گی صفت رحمت توجہ فرمائے گی اور وزیر عبد الملک برسر حکومت ہوں گے۔ اس کو انگریزی پارلیمنٹ کی دو شاخوں لبرل اور کنسرویٹو کے تحت میں نہ لائے۔ کیونکہ یہ بیان ان سے الگ قسم کا ہے۔

ربانی حکومت جمہوریت سے اسی قدر تعلق رکھتی ہے کہ کبھی شان قہر کا دور ہے اور کبھی شان رحم کا دور۔ لیکن قہر ایک کے لئے زہر ہوتا ہے اور دوسرے کے لئے آب حیات۔ اس کی سرکار میں لبرل اور کنسرویٹو حکومتوں کی طرح پالیسیاں نہیں ہیں اس کی حکومت کا مدار محکوموں کے اعمال پر ہے۔ جیسے اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ اسی قسم کی حکمرانی کی جاتی ہے۔ اس کے دربار میں دائیں ہاتھ کے نشان کی دستاویز مقبول ہے۔ کیونکہ آدمی کا داہنا ہاتھ خدا کو پسند ہے۔ اسی لئے داہنا ہاتھ اُس نے آخرت کے لئے رکھا ہے پس جس کے پاس دائیں ہاتھ کی دستاویز اعمال ہے اس کا محاسبہ آسان اور سہل ہو گا یعنی جس طرح دنیاوی عدالتوں میں بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے نشان سے دستاویز قبول کی جاتی ہے، عدالت دین میں قبول نہیں کی جاتی۔ اس کے ہاں دائیں ہاتھ کی دستاویز پیش کرنے سے نجات ہے۔ لہذا اے آدمیو! اگر تم خدا کو چاہتے ہو، اگر تم اس کی توحید کے قائل ہو تو دائیں ہاتھ کی دستاویز تیار کرو۔ دایاں ہاتھ تم سے اپنا حق مانگتا ہے۔ میدان جہاد میں تمہارے بہت سے بھائی قبضہ شمشیر اور کھٹکہ تفنگ سے دائیں ہاتھ کا حق ادا کر رہے ہیں۔ تم اس امن کے ملک میں جیب میں ہاتھ لے جاؤ اور اس کا حق ادا کرو۔ تمہارے دائیں ہاتھ کی لکیریں بھی اگر تم غور کرو، اس عظیم الشان معاملہ کی تصدیق کرتی ہیں۔ جو سب خدا پرستوں کو خوشی و خرمی کے ساتھ عنقریب پیش آنے والا ہے۔ لکیر عرفان پہچانو۔ تاکہ لکیر کے فقیر اور عارف حق کا رتبہ پاؤ۔ اور تمہاری عاقبت بھی درست ہو جائے اور دنیا بھی۔

Marfat.com

لال ٹین

از رسالہ نظام المشائخ مارچ ۱۹۱۲ء

لال ٹین، ہاتھ میں رہنے والی روشنی کا نام ہے۔ شیشے کے اس قفس کو کہتے ہیں جس کے اندر شعاع آتشیں قید ہے۔ ایک زمانہ تھا آندھیاں، پروانے اور چلنے پھرنے والوں کے دامن چراغوں کے دشمن تھے۔ بھرے پُرے چراغ ہوا کے جھونکے سے گل ہو جاتے تھے۔ پروانے اپنی عاشقانہ پر اندازی سے اس غریب روشنی کی ہستی کو بے جان کر دیتے تھے۔ بے احتیاط دوپٹوں کے آنچل، کبھی تو ایسا ہوتا کہ نورِ چراغ ان کے صدمہ سے بجھ جاتا تھا اور کبھی دوپٹہ خود چراغ بن جاتا اور بے احتیاط اوڑھنے والے کو سزائے سوخت مل جاتی تھی۔

آج وہ وقت ہے کہ روشنی کو سب سے زیادہ ترقی اور امن و امان نصیب ہے۔ کیا مجال جو آندھی آنکھ ملائے، پروانہ قریب آئے اور آنچل کا دامن حملہ آور ہو روشنی اطمینان و بے فکری سے چمنی کے گنبد میں رات بھر پاؤں پھیلا کر سنسناتی ہے۔

اس نئی روشنی کے زمانہ میں کائنات کی ہر چیز کا ظاہر روشن ہے مگر باطن تاریک ہے۔ بجلی کی روشنی کانچ کے ہنڈوں میں ظاہر ہو کر چمکتی ہے اور تار کے باطن میں تاریک رہتی ہے۔ گیس کی روشنی کا بھی یہی عالم ہے مگر ہمیں اس سے کیا بحث؟ سیاہ باطن ہو یا سفید باطن، ہمیں تو ہماری لال ٹین پیاری ہے۔ چلتا پھرتا نور ہے اور اس زمانے میں برکت وہیں ہے، جہاں حرکت ہو۔ ایک رات میں نے لالٹین سے پوچھا: کیوں بی! تم کو رات بھر کے جلنے سے کچھ تکلیف تو نہیں ہوتی؟ بولی۔ آپ کا خطاب کس سے ہے؟ بتی سے، تیل سے، ٹین کی ڈبیہ سے،

Marfat.com

کانچ کی چمنی سے ۔ یا پیتل کے اس تار سے جس کو ہاتھ میں لے کر لال ٹین کو لٹکا پھرتے ہیں ؟ میں تو بہت سے اجزا کا مجموعہ ہوں ۔

لال ٹین کے اس سوال سے دل پر ایک چوٹ لگی ۔ یہ میری ایک بھول تھی ۔ اگر میں پہلے اپنے وجود کی لال ٹین پر غور کر لیتا تو ٹین اور کانچ کے پنجرے سے یہ سوال نہ کرتا ۔ میں حیران ہو گیا کہ اگر لال ٹین کے کسی ایک جزو کو لال ٹین کہوں تو یہ درست نہ ہوگا اور اگر تمام اجزاء کو ملا کر لال ٹین کہوں تب بھی موزوں نہ ٹھہرے گا ۔ کیونکہ لال ٹین کا دم روشنی سے ہے ۔ روشنی نہ ہو تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے ۔ مگر دن کے وقت جب لال ٹین روشن نہیں ہوتی اس وقت بھی اس کا نام لال ٹین ہی رہتا ہے ، تو پھر کس کو لال ٹین کہوں ۔ جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو مجبوراً لال ٹین ہی سے پوچھا ۔ میں خاکی انسان نہیں جانتا کہ تیرے کس جزو کو مخاطب کروں اور کس کو لال ٹین سمجھوں یہ سن کر لال ٹین کی روشنی لرزی ، ہلی ، کپکپائی ۔ گویا وہ میری ناشناسی و نادانی پر بے اختیار کھلکھلا کر ہنسی اور کہا ۔ اے نور خدا کے چراغ آدم زاد ! سُن ۔ لال ٹین اس روشنی کا نام ہے جو بتی کے سر پر رات بھر آرا چلایا کرتی ہے ۔ لال ٹین اس شعلہ کو کہتے ہیں جس کی خوراک تیل ہے اور جو تاریکی کے دشمن سے تمام شب لڑتا بھڑتا رہتا ہے دن کے وقت اگرچہ یہ روشنی موجود نہیں ہوتی لیکن کانچ اور ٹین کا پنجرا رات بھر اس کی ہم نشینی کے سبب لال ٹین کہلانے لگتا ہے ۔ تیرے اندر بھی ایک روشنی ہے اگر تو اس کی قدر جانے اور اس کو پہچانے تو سب لوگ تجھ کو روشنی کہنے لگیں گے خاک کا پتلا کوئی نہ کہے گا دیکھ خدا کے ولیوں کو ، جو رات بھر اپنے پروردگار کی نزدیکی د قربت کی خواہش میں کھڑے کھڑے گزار دیتے ہیں تو دن کے وقت ان کو نور خدا سے علیحدہ نہیں سمجھا جاتا ۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد ان کی قبروں کی بھی وہی شان رہتی ہے پہلے چمنی کو صاف کر یعنی اپنے لباس ظاہری کو گندگی و نجاست سے آلودہ نہ ہونے دے

Marfat.com

اس کے بعد ڈبیہ میں صاف تیل بھر یعنی حلال کی روزی کھا اور پھر دوسرے کے گھر کے اجالے کے لئے اپنی ہستی کو جلا جلا کر مٹادے۔ اس وقت تو بھی قندیل حقیقت اور فانوس ربانی بن جائے گا۔

بے تار کا تار

از نظام المشائخ مئی ۱۹۱۰ء

تم نہ کہتے تو میں بھی خاموش رہتا۔ بادہ فروش اور بادہ نوش کے ہاتھ میں اپنا بھید دیدیا۔ میں بھی دنیا پر تمہارے راز کو فاش کردوں گا۔

پہلے تم نے یہ کیا کہ بجلی کے اسرار کو طشت از بام کیا۔ اس سے گاڑیاں کھچوائیں۔ پنکھے چلوائے، سڑکیں کٹوائیں۔ ہرکارے کا کام لوایا۔ پھر بے سلسلہ و بے تعلق نشان بھی ان کے قبضے میں دیدیئے۔ بے تار کے تار کا علم بتا دیا اور وہ بھی کس کو جو تمہاری شان میں گستاخ ہے، بے ادب ہے، مغرور ہے۔ چور ہے۔ ڈاکو ہے۔ دغا پیشہ و جفاکار ہے۔ میں پوچھتا ہوں تم کو بندہ نوازی کا اتنا شوق کیوں ہوگیا ہے۔ اب دیکھنا اس راز کے زور سے یہ لوگ تمہارے پسندیدہ گھر پر چڑھ کر جائیں گے۔ گولے گولیاں برسائیں گے۔ تمہارا کیا جائے گا تکلیف تو ہم کو ہوگی جن کے دلوں میں اپنے گھر کی محبت بھردی ہے۔

نادان دنیا مجھ بندہ بگوتا ہے الٰہ سے بے خبر تو کیا جانے۔ پروردگار کی حکمت پروردگار ہی خوب جانتا ہے۔ علم و ہنر کے آم کا رس تو مجھ کو دیا ہے۔ چھلکے ان گستاخوں کو مل گئے۔ اس پر تیرا یہ کہنا سراسر بے بنیاد ہے۔ چور کو چوری کرنے کے اوزار دیئے ہیں تو اس کو یہ بھی بتادیا ہے کہ چوری کے بغیر بھی ہم تجھکو رزق دے سکتے ہیں۔

Marfat.com

یہ اضدار امتحان کے لئے ہیں. اگر تولے چوری کے کام میں ان کو استعمال کیا تو ہاتھ کاٹے جائیں گے، اور اگر دوسروں کو آرام دینے کے کام میں لایا تو انعام پائے گا. کردگار عالم جانتا ہے کہ اگرچہ یہ مغربی دنیا گستاخ و نامنزائی ہے مگر اس کو یہ بھی علم ہے کہ انہی میں بہت سے میرے دروازے پر سر جھکائے آنے والے ہیں. ایک وقت پر جرمنی اسلام قبول کرلے گا، انگلستان مسلمان ہو جائیگا. فرانس و اٹلی میں بھی نور وحدت کی روشنی نمودار ہوگی. ابتدا کو دیکھ کر بیقرار نہ ہو. ازل کے حالات سے مایوس نہ بن. انجام و ابد میں دیکھیو کیا ہوتا ہے. کیا کیا ہوتا ہے. آج دیا ہے کل لے لیا جائے گا. آج سرفراز کیا ہے، کل برباد کر دیا جائے گا. اگر نہ مانے اور گمراہی کی چال چلتے رہے. بے تار کا تار تو تم لوگوں کی دلیل بنایا گیا ہے. اس کو دیکھو، سوچو، سمجھو اور دشمن سے کہو. یہ بھی ہمارے مولیٰ کی شان کا ظہور و نمونہ ہے.

مراقبہ میں کیا ہوتا ہے، مکاشفہ کسے کہتے ہیں، لاکھوں کوس کی خبر آن کی آن میں دل کی لوح پر کس طرح نقش ہو جاتی ہے؟ اس کا جواب بے تار کے تار میں ہے. چند اونچی لکڑیاں کھڑی کر دیں. برقی ذخیرہ کا خرقہ ان کھمبوں کو پہنا دیا. اس کے بعد اشارے کنائے شروع کر دیئے. ایک لندن میں ہے ایک دہلی میں. دونوں کو آواز آنے لگی لیکن کس کو؟ اُس کو جو تار کے بھید سے واقف ہے. ہر ایک کو نہیں. خواہ ہزاروں آدمی تار کی بتی سے لگے بیٹھے رہیں جیسے مراقبہ کرنے والے کے پاس بیٹھنے والے بے خبر رہتے ہیں.

مگر یاد رکھ! بے تار کی خبر راستے میں گرفتار بھی ہو جاتی ہے یعنی جب وہ بجلی کے کندھے پر سوار جا رہی ہو اور راستہ میں کوئی اور کھمبا مل جائے تو وہاں کے رہنے والے خبر کے بھید کو پکڑ سکتے ہیں. بس اس میں بھی انسان کو عاجز رکھا گیا

Marfat.com

ہے اور وہ پوری اور کامل قدرت نہیں دی جو مراقبہ کرنے والے کو عطا ہوئی ہے مراقبہ کرنے والے کا کشف کوئی گرفت نہیں کرسکتا. تو پھر تو خدا کی ان مکمل طاقتوں کو بھی سیکھ اور ان کو حاصل کر کے دشمنوں کی ان چھچھوری، ناقص قوتوں کو حاصل کرلے. کیونکہ خدا نے تجھ کو دونوں طاقتیں دی ہیں۔

میں تو تیرا ہوں. ذرا آگے تو بڑھ سب کچھ دونگا. ہاتھ پاؤں تو ہلا. سب کچھ بخشوں گا. گھر میں بیٹھا بیٹھا کوستا ہے. تیوری چڑھاتا ہے اور بھولے بچوں کی طرح ایڑیاں رگڑتا ہے. اس سے کیا فائدہ؟ میں نے تو اس دُنیا کو عمل اور حرکت اور جدوجہد کا مقام بنایا ہے کیوں حسن نظامی میں نے ٹھیک کہا نا؟ - جی ہاں آپ نے درست فرمایا۔

سل اور دق

کے

عارفانہ نکات

از نظام المشائخ. جون ۱۹۱۳ء

سل اور دق دو دو حرف کے دو لفظ یا دو نشتر ہیں جو انسان کی رگِ حیات کو چپکے ہی چپکے بے خبری میں زخمی کر کے اس کا کام تمام کر دیتے ہیں. اولادِ آدم گوری ہو یا کالی، ان بیماریوں کے نام سے کانپتی ہے، لرزتی ہے اور ڈھونڈھتی ہے کہ اپنی عقل اور علم کے زور سے ان موذی اور نامراد بیماریوں کا علاج مل جائے انگریزوں کے شاہی خاندان میں یہہ امراض موروثی ہو گئے ہیں. دولت نے، ڈاکٹروں نے مل جل کر مہینوں، برسوں ان سب وجود مگر موجود بود مگر نابود

امراض کی تحقیقات میں سر کھپایا مگر غیب کا بھید کسی کے ہاتھ نہ آیا کسی نے کہا قہقہہ مار کر ہنسنا اس کا علاج ہے۔ کوئی بولا کھلی ہوا میں رہنا، فکر کو پاس نہ آنے دینا اِنکی دوا ہے۔ کوئی اپنے سر کو پکڑ کر بیٹھ گیا اور کہا عقل کچھ کام نہیں دیتی۔ علم کی رسائی موت کی ان ہولناک مشینوں کے پرزوں کی حقیقت تک نہیں ہوسکتی۔ گویا ان مادہ پرست ہستیوں کو اقرار ہے کہ سل اور دق کے امراض کا دنیا میں کوئی علاج نہیں یعنی شرطیہ اور حکمیہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ بعض باتوں میں یہ مادہ پرست لوگ لن ترانی سے دعوی کیا کرتے ہیں کہ خدا نہیں ہے نہ اسکے ہونیکی ضرورت ہے بس جو کچھ ہے ہم تو وہی ہیں خدا کی شان ہے۔ خدا کے وجود سے انکار کرنے والی عقلیں معمولی معمولی باتوں میں کس طرح عاجز اور لاچار ہوجاتی ہیں۔ آؤ ذرا آج صوفیانہ نکتہ نظر سے ان پیارے پیارے چھوٹے چھوٹے لفظوں پر غور کریں۔

سِل اس بیماری کا نام ہے جو پھیپھڑے کو غموں کی چھری سے زخمی کر دیتی ہے اور آدمی خون تھوکتے تھوکتے مرجاتا ہے۔ دِق ایک خفیف اور باطنی حرارت کو کہتے ہیں جو جسم کے خون کو جلا دیتی ہے پھیپھڑہ اس کی ہلکی ہلکی آنچ سے جل کر کباب ہوجاتا ہے۔ دونوں حالتوں میں مریض کا ظاہری چہرہ اندرونی اور باطنی سوختہ کاری کو ظاہر نہیں ہونے دیتا جس طرح عشق کی آگ جب خانۂ باطن میں بھڑکتی ہے تو انسان کے اعضائے ظاہری پر اس کا ظہور بس اتنا ہوتا ہے کہ ہونٹ خشک ہوجائیں، چہرہ زرد نظر آنے لگے، ٹھنڈے ٹھنڈے سانس ہوں آنکھیں آنسوؤں سے لبریز رہیں۔ اسی طرح سل اور دق چہرے کو افسردہ اور فکر مند بنا دیتی ہے مگر ہلاکت اور فنا کا بھید صفحہ رخ پر ظاہر نہیں ہونے پاتا جیسے کہ سیاست شناس لوگ کہتے ہیں چالبازوں کی حکومت سل اور دق کا مرض ہے جو قوموں اور ملکوں کا اندر ہی اندر کام تمام کر دیتی ہے۔

Marfat.com

ہم کہتے ہیں آدمی ان معمولی جسمانی بیماریوں سے تو اتنے پریشان اور آشفتہ خاطر ہیں جن کا علاج اور جن کی تشخیص چنداں دشوار نہیں، کبھی انہوں نے روحانی سل اور دق پر بھی توجہ کی جو روح کے جوہر زندگی کو اندر ہی اندر فنا کر دیتے ہیں اور وہ نفس کی حرص و ہوس ہے۔ حرص ایک سل ہے اور ہوس ایک دق ہے۔ جب یہ عارضے روح کو لاحق ہوتے ہیں تو انسان نفس اور شیطان کے القا سے یہ سمجھتا ہے کہ حرص و ہوس درحقیقت انسانی ترقی اور حصول کمالات کے لئے لازمی چیزیں ہیں۔ جو قومیں صابر اور قانع ہوتی ہیں ان کو ترقی اور کمال میسر نہیں آتا۔ ایک ہی جگہ ٹھٹھری کی ٹھٹھری رہ جاتی ہیں اور جب کوئی شخص بیماری کو بیماری نہ سمجھے بلکہ امراض کو زندگانی خیال کرے تو ظاہر ہے کہ وہ خود ہلاکت اور موت کے گڑھے میں گرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے آخر زمانے میں مکاریاں دغابازیاں عقلمندی اور ہنرشعاری سمجھی جائیں گی۔ وہ زمانہ آجکل ہے۔ جو شخص دنیاوی امور اور فانی دولت کے حاصل کرنے میں غدارانہ جوڑ توڑ کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہو، اس کو بہت بڑا عاقل اور دانا مانا جاتا ہے اور جو چالاکیوں اور فریب کاریوں کو ناجائز خیال کر کے صبر و قناعت سے خدا و رسول کے احکام کی پیروی اور تعمیل کرتا ہو، وہ اعلیٰ درجہ کا بیوقوف، احمق، وحشی، بے تہذیب اور فول کہلاتا ہے مگر بے وقوفوں اور احمقوں کی روحیں، جن کا اوپر ذکر آیا، ہمیشہ تندرست اور زندہ سلامت رہتی ہیں اور عقلمندوں اور ہوشیاروں کی ارواح سل اور دق کے مریضوں کی طرح افسردہ اور اداس اور بے چینی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ ذرا سے صدمے اور دنیاوی پیچیدگی سے صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور خودکشی کے سوا اتنے لمبے چوڑے آسمان و زمین میں تسلی اور اطمینان کا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔ اس لئے وہ اپنے ہاتھ سے اپنے کو ہلاک کر لیتے ہیں۔

Marfat.com

پس جن لوگوں کی روحیں سل اور دق کے امراض میں مبتلا ہیں ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ جسم کی سل اور دق کا علاج معلوم کر سکیں۔ یہ حصہ ان لوگوں کا ہے جن لوگوں کی ارواح توکل ربانی سے حقیقی مضبوطی اور توانائی اور وہ قوت رکھتی ہیں جن کے آگے مادی سائنس اور فلسفہ کے مکاشفات کمالیہ ہیچ ہیں جس شخص کی روح کو اللہ تعالےٰ نے اپنے علوم مخفیہ کی بصیرت عنایت فرمائی ہے وہ جسمانی سل اور دق کے امراض کا علاج اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کو مرض کی حقیقت اور اصلیت کا بھی بھید معلوم ہوتا ہے اور ان اسباب کا بھی علم اُس کو دیا جاتا ہے جن سے جسم کے یہ عارضے دور ہو جائیں۔

سل اور دق پھیپھڑے سے تعلق رکھتے ہیں اور پھیپھڑے کی زندگی سانس پر منحصر ہے اور سانس فضائے عالم کی ہوا سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے مادی فلسفیوں نے نتیجہ نکالا کہ دق اور سل کے مریضوں کے لئے صاف ہوا ہونی چاہیئے تاکہ صاف سانس پھیپھڑے میں جائے اور اس کی کدورتیں دور ہو جائیں لیکن جب پھیپھڑے میں زخم پڑ چکے ہیں تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ پھر صاف ہوا کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی یعنی جب سل اور دق کا درجہ ابتدائی مقامات سے آگے بڑھ گیا ہو تو مرض لا علاج ہو جاتا ہے۔ یہ ان لوگوں کی بڑی بھول ہے۔ تندرست روح کو بتایا گیا ہے کہ ہر مرض کا ایک علاج ہے۔ ہر زہر کا ایک تریاق ہے پھول کے ساتھ کانٹا۔ اندھیرے کے ساتھ روشنی ہے۔ لہٰذا لا علاج کوئی مرض نہیں ہے۔

کسی چیز کا عرفان اس کی ضد سے ہوتا ہے اور ہر چیز کی ایک ضد پیدا کی گئی ہے۔ یہ کہنا کہ جب پھیپھڑا زخمی ہو جائے اور زخموں کا گہراؤ بڑھ جائے تو پھر اندمال کسی صورت سے ممکن نہیں۔ غلط رائے ہے اور ایسا کہنے والے خود روحانی دق اور سل میں مبتلا ہیں اور بیمار کی رائے چونکہ بیمار ہوتی ہے اس لئے یہ رائے بھی بیمار ہے۔

ایک دفعہ راقم فقیر بیمار ہوا۔ کلکتہ کے سب سے بڑے انگریز ڈاکٹر نے کہا پھیپھڑہ خراب ہو چکا اب کوئی علاج فائدہ نہ دے گا۔ باطنی ڈاکٹر بولا اور اپنے فکر مند مریض کو سمجھایا کہ ڈاکٹر پر ایمان نہ لانا۔ پاس انفاس کا شغل کھلی ہوا میں جا کر کرو۔ سارا پھیپھڑہ گل بھی گیا ہوگا تو اچھا ہو جائے گا۔ میں نے اس پر عمل کیا اور آج پانچ برس سے زندہ سلامت ہوں۔

عزیزم ملا محمد الواحدی ایڈیٹر نظام المشائخ کو آجکل کسی ایسے ہی ڈاکٹر نے کہدیا ہے کہ تم کو سل ہے۔ جلدی علاج کرو ورنہ خیر نہیں۔ سنتا ہوں بشریت کے تقاضے سے واحدی ملا پر اس کا اثر ہوا اور وہم کے نشتر نے اچھے بھلے پھیپھڑے کو زخمی بنا دیا حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ سانس پر حیات جسم کا مدار ہے۔ سانس ہی وہ چیز ہے جس سے زندگانی کی کامرانیاں تعلق رکھتی ہیں۔ سانس پر قابو پا جانا صحت روحانی و جسمانی کے لئے ازحد مفید ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ذکر الٰہی سانس کے اندر جمائیں کھلی ہوا میں خوب چہل قدمی کریں۔ خدا کا ذکر ہمارے سب ظاہری باطنی جراحتوں کا مرہم ہے۔ سانس کے ذریعہ اس مرہم کے پھائے پھیپھڑے پر لگائے جائیں اور اطمینان کے لئے دوا کا استعمال بھی ہو تو مضائقہ نہیں۔

سل اور دق کی اصل جڑ تفکرات خانگی ہیں۔ عارف کو دنیا کے نشیب و فراز کے ترددات و تعیشات سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے۔ اس دنیا کی خوشی و تکلیف سب عارضی ہے۔ لہٰذا ہر حال میں خوش اور ہشاش بشاش رہنا چاہیئے۔ لیکن یہ بات حاصل نہ ہوگی جب تک کہ خدا تعالٰے کی ذات پر کامل بھروسہ اور اعتماد پیدا نہ ہو۔ جب توکل اور صبر و رضا کا مقام حاصل ہو جاتا ہے تو دنیا کی کوئی تکلیف اذیت نہیں دیتی اور جب مصائب میں ایذا کا احساس باقی نہ رہے تو ان کا اعضائے جسم پر یعنی دل۔ دماغ۔ پھیپھڑہ وغیرہ پر کوئی نقصان رساں اثر نہیں پڑنے پاتا

Marfat.com

اور اگر بشری کمزوری سے اثر پڑجائے تو بہت جلدی اس کی اصلاح ہوجاتی ہے۔ اگر آدمی کو اصلاح کا احساس بھی ہو۔

سانس کا ذکر سینہ اور پھیپھڑے کے امراض کو بہت جلدی دور کردیتا ہے تم کو چاہیئے صبح نماز پڑھ کر سورج نکلنے سے پہلے کھلے میدان میں نکل جاؤ اور وہاں ایک مطمئن مقام پر بیٹھ کر قابل برداشت وقفہ سے لمبا سانس اندر لیجاکر روکے رکھو اور آہستہ آہستہ باہر نکالو اور اس سانس میں لفظ اللہ کو جاؤ۔ یعنی جب سانس اندر جائے تو تمام سینہ اور شکم کو اس سے بھر دو اور خیال کرو کہ لفظ اللہ باطن کی ہر سمت چھایا ہوا ہے اور جب باہر کا سانس لو تو ھو کہو اور آہستہ آہستہ سانس کو خارج کرو اس طرح سل اور دق کی تمام جسمانی و روحانی کثافتیں دور ہوجائیں گی۔ والدعا۔

الکبریت ما الکبریت

از نظام المشائخ۔ اگست ۱۹۱۴ء

جون ۱۹۱۴ء میں بمقام احمد آباد گجرات۔ راقم درویش دیا سلائی کے ایک نئے کارخانے کے افتتاح میں شریک کیا گیا تھا۔ جلسہ بہت شاندار اور عظیم تھا۔ پیر صاحب بغدادی اور کلکٹر احمد آباد صدارت کی کرسی پر بازو سے بازو ملائے خبر نہیں کس قسم کا قران بنے بیٹھے تھے۔ ایڈریس بازی اور اسپیچ نوازی ہورہی تھی۔ اس وقت میرے تخیل نے عرب و انگریز و گجرات کو مخاطب کرکے چند الفاظ جوڑ لیے۔ ناظرین دیکھیں یہ جوڑ توڑ کیسا ہے۔

(حسن نظامی)

اَلْکِبْرِیْتُ مَا الْکِبْرِیْتُ وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْکِبْرِیْتُ۔ میچز۔ وتیچ۔ میچز

ہوتوٹل یوداٹ میچز۔ آر دیو اسٹری، کیوی دیو اسٹری۔ تم نے شی کھبر کہ دیو اسٹری شول سچے۔ (پہلے عربی فقرہ ہے پھر انگریزی ہے پھر گجراتی ہے)

دیا سلائی۔ کیسی دیا سلائی۔ تمہیں کیا خبر کہ دیا سلائی کیا ہوتی ہے۔ وہ ایک تنکا ہے جو جلنے اور مرنے کو پیدا ہوا۔ وہ جنگل کے ہرے بھرے درختوں کا لخت جگر ہے جو انسان کی خاطر ملیا میٹ ہونے گھر سے باہر نکلا۔ کٹ کر آیا۔ گرم چشمہ میں اُبلا کھال کھنچی۔ مشین کی قینچیوں نے پرت پرت کترے۔ تنکے بنائے اور مسالہ میں غوطہ دیکر بکس بنائے جب یہ میاں تنکے دیا سلائی کہلائے۔

ناروے، سوئیڈن، جاپان کی دیا سلائی گوری۔ ہندوستان کی کالی۔ مگر دونوں کالے گورے کے لقب سے آزاد کبھی نہیں سُنا کہ کالے تنکے کو گورے تنکے نے کنیڈا اور ساؤتھ افریقہ کے گوروں کی طرح اپنے ملک میں آنے سے روکا ہو یہ بیچارہ تو ہندو مسلمان، عیسائی، موسائی۔ نیک و بد کا فرق بھی نہیں کرتا جس کے ہاتھ میں جاتا ہے خدمت بجالاتا ہے۔ مندر، مسجد، گرجہ میں اسی کے دم سے روشنی ہے۔ مسٹر کلکٹر اور پیر صاحب بغدادی کے سگریٹ یہی سلگاتا ہے۔ غریب آدمیوں کے مٹی کے چراغ بھی یہی روشن کرتا ہے۔

آج اس کی مشین کا افتتاح ہے۔ یہ اس کا یوم الست ہے۔ سب تنکوں کی روحیں بتائیں ان کا عارف کون ہے۔ خدا کا اقرار تو وہ ازل کے دن بلی کہہ کر کہہ چکے۔ اب اپنے واقف اسرار کو سمجھیں۔ کہ وہ کون ہیں؟

اس جلسے میں کوئی نہیں۔ حضرت پیر صاحب بغدادی ان اسرار کو جانتے ہیں کیونکہ بڑے پیر صاحب کی اولاد ہیں۔

مسٹر کلکٹر کو صدارت کی کرسی اور اسپیچ بازی سے فرصت نہیں مجمع عام میں بھی جس میں ہندو مسلمان، پارسی، یہودی، عیسائی، گورے کالے سب ہی موجود ہیں، کوئی نہیں

Marfat.com

جانتا کہ دیا سلائی کی اصلی شان کیا ہے۔ وہ کیوں ایک ہی سجدہ میں مقبول ہوجاتی ہے کہ بکس کے پہلو میں بچھی ہوئی خاکی جانماز پر سر جھکایا اور شعلۂ غیبی دوڑ کر آیا۔ غریب تنکا جل کر گر پڑا اور تمہارا گھر روشن ہوگیا۔

یہ شعلہ کہاں سے آیا۔ کس نے بھجوایا، کوئی ہے جو بتائے۔ نہیں تو۔ کوئی ہے جو بتا لینے والے سے یہ بھید سنے، مگر نہ کوئی بتانے والا ہے، نہ کوئی سننے والا ہے۔ آسمان اپنے اشاروں کو دل کے پردوں میں چھپا رہنے دے ورنہ یہ شرمائیں گے جو میری سی شکل و صورت لے کر آئے ہیں۔ مگر تجلیٔ حق سے محروم ہیں۔

لوہے کی طریقت

از طریقت۔ جولائی ۱۹۱۶ء

خاک کی مورت۔ مٹنے والی صورت اور زور کا یہ عالم کہ سمندر کی چھاتی پر مونگ دلنے کو تیار۔ بجلی و ہوا کے سر پر سوار۔ جنات و حیوانوں کی تو کیا مجال کہ اس سے آنکھ ملائیں۔ فرشتے اس کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ خدا کے سامنے اس کی طاقت کا لوہا مانتے ہیں۔

ذرا دیکھنا اس خاکی پتلے کو۔ زمین پر پاؤں نہیں دھرتا۔ لوہے کی نہریں بناتا ہے اور ان میں کاٹھ کی ناؤ چلاتا ہے۔ کاغذ کی شریعت پر لوہے کے نوکیلے قلم سے آہنی طریقت کی گلکاریاں دکھاتا ہے۔

عشق کا انکس نہ ہوتا تو یہ مست ہاتھی خبر نہیں کیا خون خرابے کرتا۔ کن کن نیم جانوں کو پاؤں کے نیچے دلتا۔ خدا کی شان ہے محبت کی ننھی سی چیونٹی اس

Marfat.com

دیوانے ہاتھی کے اوسان باختہ کر دیتی ہے۔

یہ موسم برسات خاک کے ہر ذرہ میں ایک جان پیدا کر دیتا ہے۔ آسمان سے جو بوند زمین پر آتی ہے، اپنے اندر ایک روح لاتی ہے۔ مگر آدمی کے لئے یہ زمانہ قیامت ہے۔ وہ اپنے کلیجہ کو مسوستا ہے اور بیقرار ہو کر آسمان کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے اے ابر تو آیا مرے پیارے کو نہ لایا۔ کبھی کہتا ہے۔ برسات بھی برسات نہیں۔ خیال کرنا اس اکیلے نوجوان کی حالت کا جو بارش سے پہلے فلسفہ آلہیات پر غور کر رہا تھا، اپنی غیر معمولی قوتوں پر اترا رہا تھا اور کہتا تھا میں سمندر کو خشک کر سکتا ہوں، پہاڑ میرے ہنر سے خاک بن جاتے ہیں۔ میں ہوا کے اوپر اپنے بنائے ہوئے پروں سے پرواز کر سکتا ہوں۔ بجلی میری تابعدار ہے۔ بھاپ پر میری حکمرانی چلتی ہے۔ مجھ میں ہر بڑی طاقت کے مسخر کر لینے کا مادہ موجود ہے۔ میں اپنی کوشش سے آسمان کو زمین پر لا سکتا ہوں اور زمین کو فلک پر پہنچا سکتا ہوں۔

اور اب جونہی کالی گھٹا نمودار ہوئی ہلکی ہلکی گرج کی آواز آئی اور بجلی نے بادلوں سے جھانکنا شروع کیا، جنگل کے مور جھاڑیوں سے نکل کر میدان میں آئے اور جھوم جھوم کر بولنے لگے، حضرت ابن آدم نیم وحشیوں کی طرح مجنونانہ حرکتیں کر رہے ہیں۔ کبھی داغ کا دیوان اٹھاتے ہیں، کبھی تھیٹر کا کوئی گیت گن گناتے ہیں۔ سامنے کے چمن میں گلاب اور چنبیلی کی ٹہنیوں میں خیالی جھولے ڈال رہے ہیں اور یہ خیال نہیں کرتے کہ ان نازک اندا موں میں اتنی سہار نہیں۔

سنتا، دل سے کیا مزے کی باتیں ہو رہی ہیں۔

وہ اس باغ میں کیونکر آئیں گے۔ راستہ خراب ہے۔ فقط ایک بیٹا ہے۔ اس پر کیچڑ ہو گی۔ اُن کا پاؤں نہ پھسل جائے۔ آس پاس گھاس ہے۔ کوئی جانور نہ نکل آئے۔ کالی چھتری پر بجلی نہ گر پڑے۔ وہ بہت ڈرپوک ہیں بجلی کے ڈر سے آنا

موقوف نہ کر دیں۔ رقیب کا گھر کچی سڑک کے پاس ہے اُس کے ہاں نہ ٹھہر جائیں میں نے غلطی کی باغ کا راستہ پہلے سے درست نہ کرا لیا۔ میں یہاں لوہے کی پٹری بچھوا دیتا۔ تاکہ وہ آج کی رات اسپیشل ٹرین میں چلے آتے۔ موٹر خریدنے کا ارادہ ہی کرتا رہا، آج ہوتی تو کام آتی۔

کہتے ہیں ایسے موقعہ پر خدا کو پکارنا چاہیئے۔ وہ بھی کبھی نہ کبھی کام آجاتا ہے۔ میں نے تو آج تک اُس کا احسان نہیں اُٹھایا ہے۔ تو کیا اُسی کو آواز دوں۔ مگر وہ بھی کیونکر آئے گا۔ اُس کے پاس ہوائی جہاز تھوڑی ہے۔

اتنے میں بادل پھٹ گیا۔ سورج نکل آیا۔ تخیلات کا سیلاب اُترنے لگا۔ جذبات کا طوفان تھمنے لگا۔ ہوش ٹھکانے آئے تو جنگل کی جھونپڑی میں رہنے والے شاہ صاحب کے پاس پہنچے اور اپنی تازہ حالت کا استفسار کرنے لگے۔

شاہ صاحب نے کہا بابا مٹی کی طریقت رکھنا اور عشق کا دم بھرنا عقلمندی نہیں محبوب سنگدل ہے اس کے لئے لوہے کی سڑک بناؤ۔ پیارا پارہ ہے تو آگ بن کر اڑاؤ۔ لکڑی کا قلم توڑ دو۔ لوہے کے قلم سے رشتہ جوڑ دو۔ یہ قلم ہر سنگی لوح میں نقش کندہ کر دیتا ہے۔

میاں شریعت علم ہے اور طریقت عمل اور معرفت اس عمل کا نتیجہ۔ برسات کی ہوا نے عشق کو جگایا اور ایک طلب دل میں پیدا کی۔ یہ شریعت تھی مطلوب کو حاصل کرنے کے لئے گھر سے نکل پڑتے۔ کڑک۔ چمک۔ کیچڑ۔ پانی کی پرواہ نہ کرتے تو سالکِ طریقت کہلاتے۔ دیجاناں تک رسائی مل جاتی۔ جس کے لئے ہاتھ ملتے ہو وہ ہاتھ آجاتی تو مقامِ معرفت میں حق الیقین کا درجہ پاتے۔ کتابوں کے کاغذ، طریقت کی کاغذی سڑکیں ہیں۔ ریل کی پٹریاں آہنی راستے ہیں، ان کو دیکھو اور سمجھو۔

Marfat.com

انسانی ارادہ قلم و دوات کی مدد سے حروف کی شکل میں کاغذ پر نمودار ہوتا ہے اور پڑھنے والے کے سلوک کے لئے طریقت بنتا ہے۔ ریل کی پٹریاں زمین پر بچھ جاتی ہیں اور اپنے سینے پر رات دن گاڑیوں کی آریاں چلاتی ہیں۔ تب دور کی منزلیں قریب ہوتی ہیں اور فراق وصال کی شکل اختیار کرتا ہے۔

بھائی یہ زمانہ لوہے کا زمانہ ہے۔ اگلے وقتوں میں زبان نصیحت کرتی تھی اب توپ کا منہ لکچر دیتا ہے۔ سُنا نہیں۔ ؎

شاہ جرمن نے کہا ہنسکر جناب پوپ سے
وعظ ہم بھی کہتے ہیں لیکن دہان توپ سے

توپ کا لفظ جلدی اثر کرتا ہے اور جلدی منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ خاکی طریقت کے مقابلہ میں آہنی طریقت یعنی سڑک سواریوں کو جلد مقام مطلوب تک پہنچا دیتی ہے۔

طریقت کا کچھ بڑا سخت ہے۔ اس میں لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ آجکل کی آہنی ایجادیں ہم کو اشارہ کرتی ہیں کہ ہم بھی اپنے دینی راستہ کو پختہ اور آہنی بنائیں اور اپنے سلوک کی گاڑی جلدی اتش ظلمات سے گذار کرلے جائیں۔

مگر لوہے کی طریقت آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ بہت سی گرم بھٹیوں میں جلنا گُھنا پڑتا ہے۔ اس لوہے کی طریقت کے بھی درجے ہیں جو باطنی طریقت کے درجوں کو ثابت کرتے ہیں۔ پہلا درجہ فولادی ہے۔ اس کے اندر کوئلہ کی کثافت نہیں ہوتی یہہ بہت نازک تن اور نازک آواز چیز ہے۔ ذرا سے صدمے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کو توڑو تو ننھے ننھے ذرے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دوسرے درجے کا لوہا ظلماتی اثر زیادہ رکھتا ہے۔ اس کو توڑو تو لکڑی کے ریشے نکلتے ہیں۔ تیسری قسم اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ قدرت نے ہر درجہ کی ایک نوکری رکھی ہے جس میں وہ معروف

Marfat.com

رہتا ہے۔ پانی لوہے کا ملک الموت ہے۔ پانی کے اندر اس کو ڈال دو اور کچھ دن کے بعد نکال کر ہوا میں رکھ دو، زنگ کی چادر چھائی ہوئی ہو گی۔ یہ چادر اندر ہی اندر لوہے کے جسم میں گھسی چلی جاتی ہے اور آخر کار لوہے کو خاک کر دیتی ہے۔ یہی حال باطنی طریقت کا ہے۔ اس کے بھی مختلف درجے اور حصے ہیں مگر ہر دو حصہ کو خام خیالی اور بے اعتقادی کا پانی فنا کر دیتا ہے۔ تم اگر پختہ ہوتے اور آہنی طریقت سے واقف ہوتے تو خدا تعالےٰ کی نسبت ایسی بے سر و پا باتیں خیال میں نہ لاتے جس نے تم کو اور تمہارے علم و ہنر اور طاقت خیال کو پیدا کیا ہے۔

پتھر کی طریقت

از طریقت ستمبر ۱۹۱۲ء

یہ رسالہ جس کا نام طریقت ہے، کیونکر چھپا، اس کا خیال بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ ڈاک میں پیکٹ آیا، کھول کر پڑھنا شروع کر دیا اور رائے زنی شروع ہو گئی۔ کاغذ ذرا خراب ہے، چھپائی بھی چندی چندی آنکھوں سے دیکھی ہے، لکھائی بھی بہت خوبصورت نہیں۔

ہاں مضامین کی ترتیب اچھی ہے۔ جذبات عوام و خواص کو یکساں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہ کہا اور پرچہ رکھ دیا۔ مگر کسی نے یہ نہ سوچا کہ کاغذوں پر یہ حروف کس طرح نقش ہوئے اور کن کن منزلوں کو طے کر کے ہم تک آئے اور ان کے اندر کیا کیا معانی پوشیدہ ہیں۔

یہ غور کس کے حصے میں ہے۔ اُس کے جو پہلے خود اپنے وجود پر فکر کرنے کا عادی ہو، جزو سے پہلے کل، شاخ سے پہلے جڑ پر خیال لیجاتا ہو۔ وہ جب رسالہ

طریقت کو دیکھیگا تو کہیگا کہ اُس کا آنا پتھر کی سڑک سے ہوا ہے۔

پہلے کاپی نویس نے لوگوں کے خیالات کو قلمبند کیا اور زرد رنگ کے کاغذ پر لکھا۔ زرد رنگ اس لئے منتخب کیا کہ ہر چیز کی بنیاد عشق و محبت پر ہے اور زردی نشانِ الفت ہے۔ عشق عاشق کو زرد بنا دیتا ہے۔ لہٰذا ان حروف کو جو آخری منزلوں میں اپنی شکل کے سینکڑوں ہزاروں حروف بننے والے تھے، زرد کاغذ پر لکھا گیا۔

اس کے بعد پتھر کی طریقت کا سلوک درپیش ہوا۔ پتھر کی طریقت یعنی چھاپہ کا پتھر بلایا گیا اور اس سے کہا گیا کہ ان حروف کو جو کاغذ پر شانِ یکتائی میں ہیں رنگِ کثرت عنایت کر۔ پتھر نے کہا توبہ توبہ میری کیا مجال ہے جو کسی کو کچھ دوں یہ قدرت تو کسی اور ہی کے قبضہ میں ہے۔ اس کے علاوہ ابھی تو میرے سینے پر نقشِ غیر کندہ ہیں جب تک یہ نہ مٹ جائیں، کوئی سلوک کامیاب نہیں ہو سکتا۔

یہ سن کر دستِ غیبی آگے بڑھا۔ دو پتھروں کو سینے سے ملا کر رگڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں نقشِ غیر فنا ہو گئے۔

جب پتھر سے نقشِ غیر مٹ گیا تو کہا گیا کہ لے ان نئے حرفوں کو سینے میں جگہ دے۔ پتھر نے آہ سرد بھر کر کہا کہ ابھی ایک امتحان اور باقی ہے۔ امانتِ عشق کو سینہ میں رکھنا آسان نہیں۔ پہلے آتشِ شوق سے سینہ گرما لوں، مہمان کے قابل گھر کو بنا لوں تو لبیک کہہ کر خیر مقدم کو آگے بڑھوں۔

پتھر کو آگ سے سینکا گیا۔ سوز و ساز کا مزہ چکھایا گیا۔ انگلیوں نے اس کے بدن کو چھو کر دیکھ لیا کہ ہاں نارِ ذوق اس کے اندر خوب سرایت کر چکی تو کاپی کا کاغذ منگایا گیا اور پتھر کی چھاتی سے اس کو چمٹایا گیا۔ کاغذ گرمی کی تاب نہ لایا اور پتھر و حروف کے اسرار وصال کی شرکت کو برداشت نہ کر کے کہیں غائب ہو گیا۔ اب جو حرفوں نے آنکھ کھولی تو اپنے سوا کسی کو نہ پایا۔

Marfat.com

باہر والوں نے غلیظ کثافتوں کو صاف کیا اور لوہے کے قلم لے کر حروف کی نوک پلک تراشنے بیٹھے۔ اس وقت دیکھا تو حروف اُلٹے نظر آئے۔ گھبرا کر پوچھا تمہارا کیا حال ہے۔ حروف نے جواب دیا جس کا باطن سیدھا ہے اس کا ظاہر اُلٹا نظر آتا ہے بندہ اس کو نہیں سوچتا۔ اس واسطے تغیرات عالم سے گھبراتا ہے۔

تزکیۂ ظاہری ہو چکا تو پتھر کو شین کے اوپر رکھا گیا اور اس پر سیاہی کا بیلن پھیرا گیا اور اوپر ایک کاغذ ڈھک کر مخفی حجرے میں دھکیل دیا گیا اور فوراً باہر بلایا گیا۔ دیکھا تو حروف کا ایک دوسرا ہمشکل اوپر کے کاغذ پر موجود تھا۔

اسی طرح سینکڑوں ہمشکل بنتے چلے گئے اور ان سے یہ رسالۂ طریقت تیار ہوا۔ گویا یہ طریقت پتھر کی طریقت ہے۔ منزل سنگ کو طے کرکے ہم تک آئی ہے۔ دیکھیے پتھر کی طریقت آیندہ زمانہ میں کیا گل کھلاتی ہے۔ ابھی تک تو اطمینان ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر اقبال کا بیان ہے کہ فقیر اور طریقت تاب لوگ پالٹکس میں حصہ نہیں لیا کرتے اگر یہ ڈپلومیسی کا اظہار نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ میں سنگِ لرزاں بنا رہوں۔

کھوپری کی صدا

از رسالہ مرشد دہلی ۵۔ مارچ ۱۹۱۲ء

مسٹر آصف علی بیرسٹر دہلوی کے ملاقات خانہ میں طاق کے اندر ایک کھوپری رکھی ہے اس پر شیشہ کا خوبصورت سرپوش ڈھکا ہوا ہے اور سنہری ہار اوپر پڑے ہوئے ہیں۔ یہ بہت پرانی ہے، یورپ سے لائی گئی ہے۔ کسی رومی یا یونانی

Marfat.com

کی ہے۔ روم اور یونان کے باشندہ کی ہو یا کسی اور ملک کی ہے کھوپری۔

یہ فطرتی ظرف ہے ۔ اس مظروف کا جو امیدوں ، ولولوں، خواہشوں اور اولوالعزمیوں کا طوفان خانہ تھا مگر اب خالی کھنڈر ہے، اب ویران گنبد ہے. اس کی آبادیاں اُجڑ گئیں اس کی سرمستیاں نابود ہو گئیں۔ اس کھوکھلے وجود میں اب خودی باقی نہیں رہی۔ سوائے اس کے کہ ہم اپنی مستعار خودی کو اس کے اندر لے جائیں اور ذرا آزادی کے جوش کو اپنی آواز میں بھر کر زور سے بولنا شروع کریں۔ اگر ہم ایسا کریں تو یہ گنبد خاموش بھی صدائے بازگشت سے ہم کو جواب دیگا۔

اگر ہم نے ہستی کی مستی میں الحیات الحیات پکارا تو کھوپری بھی الحیات الحیات کہے گی۔ مگر اس کی جوابیہ حیات میں اثر مات ہو گا۔ ہمارا سوال ہمارے علم وادراک کے ماتحت پیش کیا جائے گا۔ کھوپری کے جواب میں بھی ہمارے ہی تصور کی کیفیت ہو گی۔ اور یہ سچ ہے کہ آدمی اپنے ہی تصور سے بولتا ہے اور اپنے ہی تصور سے جواب لیتا ہے جن کھوپریوں پر حکومتوں کے تاج ہیں وہ بھی مبتلائے حیات غرور ہیں، اور جن کھوپریوں پر غربت دبے کسی کا بوجھ رکھا ہوا ہے، اُن کو بھی (اپنی حیثیت کے بموجب) زیست چند روزہ کا غرور مطلوب ہے۔ کہ غرور ایک شان کبریائی ہے جو بندہ نے خدا سے پائی ہے۔

تنازع للبقا کا مسئلہ فلسفیوں نے اسی نکتہ سے پیدا کیا ہے کہ کائنات کا ہر وجود اپنے بقاد قرار کے لئے حرب وضرب میں مصروف ہے لیکن نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب متاع قلیل کے لئے یہ رزم کاریاں ہیں تو متاع کثیر جو حیات آخری اور زیست عقبیٰ ہے، کیسی سخت جد وجہد کی طلبگار ہو گی۔ اس بقائے فانی کی خاطر کائنات کم نزاع برپا ہے، تو بقائے لافنا کے لئے تو سینکڑوں دل ہزاروں حصے زیادہ رزم کاری چاہیئے۔

آج یہ کھوپری ہڈی کا تابوت ہے، کل اس کو ایک دل پر، دو آنکھوں پر، زبان پر

Marfat.com

ہاتھوں پر، پیروں پر ایک شاہانہ اقتدار حاصل تھا. اب وہ اقتدار فنا ہوگیا اور یہ پیکر پیام عبرت بن گئی اور اس نے کہا میں چھوٹی تھی. بڑی ہوئی۔ اور اپنی بڑائی پر گھمنڈ کرتے کرتے مٹ گئی (پس تجھکو اپنی دولت و اولاد سے متعجب نہ ہونا چاہیئے کیونکہ خدا تعالے چاہتا ہے کہ ان چیزوں کے ساتھ حیاتِ دنیا کے عذاب میں تجھکو مبتلا کرے۔)

اس کھوپری والے کو بھی اچھا کھانے، اچھا پہننے، عیش کرنے، اکڑ کر زمین پر چلنے اور عزت والا بننے کی تمنا تھی۔ یہ بھی چاہتا تھا کہ حیات دنیا آرام سے گزر جائے اور عاقبت سے بے پروا تھا. اس کو بھی اسباب دنیا کے سوا زندگی کی کش مکش میں کسی دوسری بات کا خیال نہ آتا تھا. اس کے اندر بھی رات دن دنیاوی حریت و آزادی کی آندھیاں چلتی تھیں اور آخرت کے سب چراغ گل کر دیئے گئے تھے. آج اس کو معلوم ہوگیا کہ حیاتِ دنیا تو پانی کا ایک بلبلا تھا جس کے اندر غرور کی ہوا زور کر رہی تھی، وہ ٹوٹ گیا تو کچھ بھی باقی نہ رہا. کہاں ہے نمرود. کہاں ہے فرعون. کہاں ہے شداد کہاں ہے سکندر کہاں ہے نپولین (کہاں ہیں گزرنے والے سب بادشاہ جنہوں نے اونچے اونچے محل بنائے تھے. وہ تو بوسیدہ ہڈیاں ہو گئے۔)

"ا"

الف خالی

از رسالہ صوفی. دسمبر ۱۹۱۲ء

حرفوں کی فوج کا کمانڈر سب کے آگے کیسا تنا ہوا سیدھا کھڑا ہے. اس کا نام الف ہے اور بچے اس کو الف خالی پڑھتے ہیں۔

Marfat.com

حرف جتنے ہیں سب اپنے اپنے حال میں مبتلا ہیں۔ ایک دوسرے کا کوئی شریک نہیں۔ الف کو بے سے غرض نہیں۔ بے تے سے سروکار نہیں رکھتی۔ تے جیم اور دال سے بے تعلق ہے لیکن معانی کا مقابلہ پیش آتا ہے تو یہ سب حروف آپس میں مل جاتے ہیں اور موقع موقع کی کمینگاہوں میں پرے جاکر نمودار ہوتے ہیں۔

حروف کا حال اور ہے اور قال اور۔ حال تو یہ ہے کہ ان کی شکل مفرد نظر آتی ہے اور قال میں ہر حرف کئی حروف کا مرکب ہے مثلاً اس مضمون کے عنوان کو دیکھئے سب سے اوپر ایک صورت " ا " کی ہے۔ اس کو دیکھو اور زبان سے نہ پڑھو تو ذہن میں مفرد پیکر ہے۔ لیکن جب زبان سے پڑھو گے تو الف، لام، فے، تین حرفوں کی ترکیب سے ایک ذات مرکب معلوم ہوگی۔

ایک دن میں نے سپہ سالار افواجِ حروف سے دریافت کیا کہ "ہو آر یو" تم کون ہو؟۔ الف نے جواب دیا "آئی ڈونٹ نو۔" میں نہیں جانتا کہ میں کون ہوں! اور کہاں سے آیا ہوں اور کیوں آیا ہوں۔

میں نے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ تمہاری ایک شکل وصورت ہے۔ تم سے دنیا کی بول چال میں زندگی پیدا ہوتی ہے۔ ہر حیوان ناطق تمہارا محتاج ہے۔ تم نہ ہوتے تو سارا جہان گونگا ہوتا۔

الف بولا۔ جناب عالی! آپ کو میرے وجود کی تحقیقات کا فکر ہے اور میں دردِ عشق سے تڑپ رہا ہوں۔ اس بیکلی میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور بے اختیار یہی زبان سے نکلتا ہے کہ میں آپ کے سوال کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ مکتب کے ایک بچے نے پڑھا۔ الف خالی تے کے نیچے ایک نقطہ مجھکو تو یہ صدا معمولی معلوم ہوئی۔ مگر الف آہ کہہ کر بلبلا اٹھا۔

تعجب، حیرت، تو کیوں بیقرار ہو گیا۔ بے کے نقطے نے تکبیر کیا اور ڈالا،

نہیں مجھے ب کے نقطے سے تکلیف نہیں ہوئی. مجھ کو اس کا ملال ہے کہ میں خالی ہوں. ہائے میں خالی نہ تھا مگر اب خالی ہوں. میں اکیلا نہ تھا. مگر اب تنہا ہوں تم نے وصل کی لذت ہی نہیں چکھی تو فراق کی تلخی کیا سمجھو گے. میں وصال کی بہار دیکھ چکا ہوں مجھکو یہ زمانہ میسر آچکا ہے۔

آہ اب خالی ہوں. بچے بھی خالی کہہ کر پکارتے ہیں ہجر بُری بلا ہے. اس کی دو قسمیں ہیں. پہلی قسم اس ہجر کی ہے جس میں آرزوئے وصل ہوتی ہے، اور دوسری وہ ہے جو وصل کے بعد پیش آتی ہے. یہ بہت سخت ہے. ناقابل برداشت ہے. پہلی قسم میں صرف شوق واشتیاق ہوتا ہے. ارمانوں کے ولولے طوفان اٹھاتے ہیں. آنکھوں کو رُلاتے ہیں. آنسو رساتے ہیں. دل میں تڑپ ہوتی ہے. امیدیں پھڑکتی ہیں. مگر یہ تکلیف نہیں ہوتی جو وصل کے بعد پیش آتی ہے. وصل کے بعد جو ہجر ہو. وہ گذشتہ ذوق شوق کو سامنے لاتا ہے. تخیلات وتصورات سے نقشے بنواتا ہے. ان کے ہاتھوں میں چھریاں دیتا ہے اور دل وجگر پر چرکے دلواتا ہے۔

میں مدت مدید تک لطف یکتائی اٹھا چکا ہوں. میں اس کا بن چکا ہوں. وہ میرا بن چکا ہے جس کی یاد میں آج آگ کے بستر پر لوٹ رہا ہوں۔

الف! جی کو سنبھال. تو اتنا کیوں بے چین ہوتا ہے. ہم نے تو تجھکو ہمیشہ خالی ہی پایا. کبھی کسی کو تیرا شریکِ زندگی نہ دیکھا. خبر نہیں تو کس کو یاد کرتا ہے. کس کی یکجائی کا قصہ کہتا ہے۔

کیا وہ بھی کوئی الف تھا، یا وہ کوئی نقطہ تھا. یا وہ کوئی ایسی چیز تھی جس کی فرقت تجھکو ستاتی ہے اور یہ فریاد زبان سے نکلواتی ہے۔

ہاں تم نے اس کو نہیں دیکھا. ہاں کسی نے بھی اس کو نہیں پایا. وہ حسین نہ تھا جس کو دوسرے حسن پرست دیکھ سکتے. اس میں رعنائی و نازو انداز نہ تھے جس پر کسی غیر کی

Marfat.com

نظر پڑی. وہ نگاہ بشر سے بہت اونچی اور بہت ہی اونچی چیز تھی۔

تو پھر وہ کیا تھا. بتا کہ وہ کب تھا اور اب کہاں ہے. سیدھے سادے الف کیا تیرا دماغ کچھ خراب ہو گیا ہے. یہ تو کیسی بے سر و پا باتیں کرتا ہے؟

الف چپ ہو گیا اس کی حیرت خیز خاموشی عالم تصویر بن گئی اور اس کے آگے سے سب حروف اس مینارِ سکوت کو غم کی نگاہ سے دیکھنے لگے.

سنو! الف خود بخود کچھ کہہ رہا ہے. دیوانوں کی طرح بہک رہا ہے اور بڑ مار رہا ہے. جیسے مجذوب بے سر و پا باتیں کرتے ہیں یہ بھی کچھ بک رہا ہے۔

میں ایک ہوں. میرے معنی بھی ایک ہیں میری شکل بھی واحد ہے. میں مثال وحدت ہوں. میں خیال یکتائی ہوں مگر آہ کثرت کے جیل خانہ کا قیدی ہوں دور ہوں مہجور ہوں. رنجور ہوں.

پیاری تے. نقطے والی تے. اپنے نقطہ کو دور کر دے تو حرف موہوم اور خیالی رہ جائے. میں جب سے اپنے پیارے نقطے سے جدا ہوا ہوں جوں کا توں موجود ہوں فنا نہیں ہوا. نابود نہیں ہوا. کاف. نون. میرے رقیب ہیں. کُن بن کر آئے اور میرے پیارے کو بہکا کر لے گئے.

اس کا وعدہ تھا. میں تیرا بن کر رہوں گا. وہ اقرار کر چکا تھا مگر حمد و محمود کے الجھاؤ نے کن کو نمودار کیا اور کُن نے آتے ہی سب اقرار بھلا دیئے.

آہ! وہ بھولتا نہیں تھا. بھول چوک سے پاک تھا. ہر چیز پر قادر تھا. وہ مجھ سے کیوں جدا ہو گیا. یہ کیا اس کے جی میں آ گئی؟

میں الف ہوں. وہ بھی الف تھا. کن سے پہلے وہ میرے ہاں تھا. میں اس کے ہاں تھا. میں وہ تھا. وہ میں تھا. میں تن تھا. وہ جان تھا. وہ تن تھا. تم نے کہا میں اور میرے ماتحت حروف انسان کی زبان ہیں. وہ ہمارے ذریعے بولتا ہے. حرفوں کی ترانہ

Marfat.com

میں مطالب تولتا ہے۔ تم نے غلط کہا۔ نہیں تم نے صحیح کہا۔ بتا میں نے کیا کہا؟
میں دیوانہ ہوں، مستانہ ہوں۔ تم اے آدمیوں۔ میرے ذریعے بولتے ہو میں
کس کے سہارے بولوں؟ میرے پاس حرف نہیں ہیں۔ میں کس کے الفاظ بناؤں
اور کس چیز سے اپنے مطالب کو اس کے سامنے لیکر جاؤں۔؟

اگر وہ حرفوں اور لفظوں کا محتاج ہے۔ تو میرا مطلوب کیوں بنا ہے۔ خالی ہاتھ
والے کے دل میں کیوں آیا ہے؟

اور اگر وہ ان ذریعوں کی پروا نہیں رکھتا تو اقرار پورا کرنے کیوں نہیں آتا۔
مجھکو اپنے پاس کیوں نہیں بلاتا۔ یہہ دیوار کیوں چنوائی ہے۔ یہ کیا اس کے جی
میں آئی ہے؟

الف ہوشیار۔ لام کو دیکھ۔ میم کو دیکھ داؤ کو دیکھ سب خالی ہیں۔ ک۔ ع
ص۔ س۔ د۔ ر۔ ط۔ بھی تیرے جیسے مہجور ہیں۔ تو اکیلا خالی نہیں ہے اور بھی ہیں۔
ہاں اور ہیں۔ مگر ان کی تنہائی اور میری تنہائی میں فرق ہے۔ وہ بلبل
ہیں۔ میں پروانہ ہوں۔ وہ حصار میں محفوظ ہیں۔ میں دروازوں کے تیروں کا نشانہ
ہوں۔ نوکیلے تیر سینہ کے پار ہو جانے والے تیر مجھے چھلنی کئے دیتے ہیں۔

الف کی یہ بے معنی غیر مفہوم مگر مزے دار باتیں سن کر میں نے بڑا تعجب کیا کہ
تصوف سے تعلق رکھنے والی بے نتیجہ باتیں بھی اتنا کیف رکھتی ہیں تو با نتیجہ حالات
میں کیا سرور ہوگا؟ طالبوں سے کہو اندر آکر دیکھیں اور اس حد تک پہنچیں جس کے سایہ
اور عکس کی یہ ادنیٰ اسی کیفیت ہے۔ ورنہ کبیر داس کی زبان میں کہدیں۔ ؎

کبیرا کھلا ہوا۔ ہر سے ہرے۔ سر سے ٹلی بلا　　　اور ہر ہارا ہیں جیسے ہمری جیسے بلا

Marfat.com

یورش

ارواح کی اجسام پر

(از رسالہ صوفی۔ جون ۱۹۱۴ء)

سفید سورج کی روح حرارت، کالی رات کی روح برودت، بہتے پانی کی روح حیات، کھڑے کنارے کی روح نظربازی، حیوان کی روح نادانی، انسان کی روح دانائی! دانائی کی روح ہوشمندی۔ اور ہوشمندی کی روح کبریائی۔

دیکھنا آپس میں کیا سرگوشیاں کرتی ہیں۔ کس شاندار مہم کے لئے سازش کر رہی ہیں۔ تلک الایام نداولہا بین الناس کا خدا بھلا کرے جس نے اس جوڑ توڑ کی خبر دے دی ورنہ خبر نہیں کس قیامت کا سامنا ہوتا۔ سورج کی روح نے کہا میں نے اجسامِ زمین۔ قمر۔ مریخ۔ مشتری، زہرہ وغیرہ کی پرورش میں عمر تمام کر دی مگر مادی پتلوں نے میرا ایک گن نہ مانا۔ بے شرط کہ ان سب کو نظر قہر سے فی النار کر دوں۔ شب تاریک کی روح بولی، میں اصل بنیاد کل کائنات کی ہوں۔ اجسام کی پردہ پوش ہوں لیکن اب اجساد کی شیطنت حد سے بڑھتی جاتی ہے۔ کیوں نہ میں ان کا پردہ فاش کر دوں۔

رواں دواں پانی کی روح نے بہتے بہتے آواز دی۔ کل شیء حی من الماء۔ مادیات کی مورتوں سے کہہ دینا کہ احسان فراموشی کی تو زندگی وبال جان بنا دوں گی کھڑے کنارے کی نظرباز روح چنگھاڑی۔ اگر بدن وقت منتظر سے انکاری ہے تو اس کا ملیامیٹ کر دینا مجھے کیا بھاری ہے۔

Marfat.com

حیوان کی نادان روح پکاری مجھ میں عقل نہیں جو تمہاری رائے وہ میری رائے
انسان کی دانا روح گویا ہوئی " انا امر ربکم الاعلیٰ " میں نے امانت خاص کو
دوش پر رکھا ہیں کن کی علمدار بنی تفس خاکی میں رہی تو کیا یہ اجسام مجھ کو بھول کر سلامت
رہ سکیں گے کہد و ناممکن. ناممکن. ناممکن۔

اس مشورت کا انجام نتیجہ، حاصل ایک یورش ہوگی یلغار خونخوار اور حملۂ
پُرخروش ہوگا۔

اے بد لو! اے دنیا کے مادی جسمو! تم نے اپنے بچاؤ کی کیا صورت
اختیار کی ہے؟

امریکہ کا جواب :۔ "سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے" ورنہ میں نے تو
مادہ پرستی اور تن پروری کو چھوڑنا شروع کر دیا ہے امورِ روحانی کے آگے میرے
باشندے سر جھکاتے جاتے ہیں۔

یورپ کا اظہار :۔ کچھ پرواہ نہیں۔ ارواحِ موہوم کی یورش کو دیکھ لیا
جائے گا۔ میرے اندر ہنر ہے اور کاری گری ہے جس سے ہر روح اسیر پنجۂ مادی ہو سکتی
ہے۔ اور روح کے وجود سے انکار کر دینا بھی ممکن ہے۔

چین کا بیان :۔ میرا تو رنگ ہی زرد ہے جو پر تو روحانی کی شہادت دیتا ہے
میں نے تو عیسائی مذہب کے سے خدا سے [illegible] انگی تعبیر کو بکت روحانی
میری مشکلات کا خاتمہ کر دے۔ آئندہ بھی کسی حکم روحانی کی تعمیل سے انکار نہیں۔

ایران کی فریاد :۔ دیکھنا میں پہلے ہی ویران ہوں۔ ایران نہیں ہوں بلبل
کی روحانیت تلے جیتا ہوں۔ مجھ پر تو نظر کرم ہی رکھنا۔

افریقہ و عرب کی گفتگو :۔ مت گھبراؤ۔ اے روحو! ہم تمہارے ساتھ ہیں۔
تمہارے دشمنوں کا مقابلہ سب سے پہلے ہم کریں گے۔

Marfat.com

ہندوستان کا جواب ۔ ست گرو کے چرنوں کی قسم! میں پرماتما کا جوگی روگی ہوں۔ لڑنے جھگڑنے کا وعدہ نہیں کرتا۔ یہ جھگڑا تو عرب و افریقہ کا ہے۔ ہاں دل سے تم سب ارواح کا ساتھی ہوں۔ پرماتما تمہاری بھلی کریں۔

فیصلہ عالم جبروت میں یہ حکم کلام کر چکا۔ تو صدائے ہاہوت نے ارشاد فرمایا کہدو ناسوتیوں سے۔ ارواح ہوں یا اجسام کہ ہم منتقم حقیقی ہیں۔ ذرہ ذرہ کے اقرار و انکار کو تول رہے ہیں۔ لینے دینے کا وقت بھی قریب آگیا ہے۔ آپس میں دست و گریبان نہ ہو۔ ہماری ترازو کا کام ختم ہو لینے دو۔

ڈراپ

پلکیں تھرتھرائیں، پتلیاں اشکبار ہوئیں۔ کان وجد میں آئے۔ دل و دماغ محو ہو گئے۔ جب کہ یہ سب دیکھا سنا اور ڈراپ سین کو گرنے سے نہ روکا تو ناسوت میں بھی ملکوت و جبروت و لاہوت و ہاہوت کے جلوے نظر آنے لگے۔

خطیب کا غذفام

از اخبار خطیب دہلی جنوری ۱۹۱۵ء

مین سیڑھی کے ممبر قدیم پر زبان بولتی تھی اور خطیب کہلاتی تھی۔ آج ممبر جدید کی شکل تو ویسی ہی تثلیثی ہے مگر اسپر کاغذفام خطیب قلم کی زبان سے چہچہاتا ہے۔

جن کو لغت کی بحث کرنی آتی ہے، وہ کہیں گے کہ خطیب عربی کا ایک جامع لفظ ہے جو ہر اچھی بات کے دہن فصیح سے نکلنے پر صادق آتا ہے۔ اس لئے اخبار "خطیب" مذہب، تمدن۔ ذراونی اور اُن کہنی چینوں، جس کو کان میں سنا جائے تو سیاست و پالیٹکس کی آواز آئے، بحث کر سکتا ہے۔

Marfat.com

میں نہیں جانتا کہ ان اخبار فروشوں نے خطیب کے کیا کیا مقاصد تجویز کئے ہیں اور جو بھی ہوں۔ مجھے اس سے کیا۔ میں تو اپنے کاغذ فام گلفام کو ایک پیشگی بوسہ بھیجنے کے لیے حرفوں کا توڑ جوڑ کرنا چاہتا ہوں۔

خطیب کاغذ فام نے نہ ابھی جوانی کی راتیں دیکھی ہیں، نہ مرادوں کے دن پائے۔ ابھی تک خدا نے بری نیت کے شاعروں سے اس کے دامنوں کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ مگر کب تک؟ بتِ ہرجائی انگشت نمائی سے محفوظ رہے گا۔ شمع بنیگا تو بے شمار پروانے فدا ہونے کو نکل آئیں گے۔

کیوں! پیارے گلفام۔ ابھی تو تم فتنہ ہو۔ فتنوں کے زمانے میں خدا رکھے پروان چڑھنے نکلے ہو۔ جب قیامت بنو گے اس وقت تو بھلا ہم غریبوں سے کہاں آنکھ ملاؤ گے۔ پر آج تو ایک نگاہ طفلی سے ادھر دیکھو اور ننھے ننھے ہونٹوں سے کچھ گل افشانی کرو۔

ہاں۔ہاں۔ میں نے سنا۔ واہ کیا بات ہے، کیا گھات ہے۔ ماشاء اللہ سبحان اللہ مگر ان ندیدے لوگوں کو تمہاری زبان میں نہ سننے دوں گا۔ اپنی زبان میں صدائے بازگشت کے طور پر سناؤں گا۔ تاکہ تمہاری کنواری آواز میرے ہی لئے مخصوص رہے۔

صاحبو! دل جان خطیب تم سے یوں خطاب کرتا ہے۔ پروانو، مستانو، دیوانو۔ ہوشیار باش۔ بیدار شوید۔ سمندر فضائے آسمانی میں بہنا چاہتا ہے۔ تودۂ خاک اپنے ذروں کو موجوں میں لئے آتا ہے۔ اس کام میں اس کا ہاتھ ہے جو جگ داتا ہے۔

اب کاغذ کی جنس میں ایک نوع خصوصی جلوہ افروز ہوتی ہے۔ اس کی ہر ادا گوشِ ہوش کے لئے انمول موتی ہے وہ علم کے دریچوں میں عمل کے فانوس روشن کرے گا۔ وہ سنسان ویران محفلوں میں طوطی شکر مقال بنے گا اور اس کی پہلی صدا یہ ہوگی۔

Marfat.com

حق ہے باری تعالیٰ، حق ہے کملی والا، حق ہے سب کا حق۔ حق نے حقوق کو پیدا کیا اور بندوں کو ان کی شناخت اور گرفت پر شیدا کیا۔ حق ہی نے کہا کون اس امانت کا حق دار ہے؟ حق ہی نے جواب دلوایا کہ یہ بندۂ آدم اس نعمت کا سزاوار ہے۔ وہ امانت اس کو مل گئی جو سر تا سر حقوق میں غرق تھی اور عشق اس گھٹا کی برق تھی۔

آدم نے خالقِ دم کی امانت کو سینے سے لگایا۔ حقوق کے جواہرات سے جڑے ہوئے زیور کو گلے کا ہار بنایا جب آدم کہلایا۔ ہر حق میں طلب کی جھلک تھی اور ہر جھلک کی ایک پلک تھی اور ہر پلک میں نوک تھی اور ہر نوک میں ایک کھٹک تھی۔ ہر کھٹک میں تلخی و شیرینی تھی اور اسی تلخی و شیرینی پر دنیا کے کاروبار تھے۔

کبھی دیکھا کہ حقوق اللہ کے مطالبے ہیں اور نفس و شیطان اس کی کڑواہٹ سے منہ بناتے ہیں۔ کبھی سنا کہ حقوق العباد کی پکار ہے اور ناحق شناسوں کی حالت زار و نزار ہے۔

حقوق اللہ کہتے تھے پہلے حقوق بندگان کی حفاظت کرو کہ ہم بھی اسی پیکر کی روح رواں ہیں۔ حقوق العباد آواز لگاتے تھے کہ نہیں ہم بھی سایۂ رب کے امیدوار ہیں۔ خبر نہیں ان دونوں میں کسرِ نفسی کون کرتا تھا مگر سچ یہ ہے کہ ہر ایک صداقت و راستبازی کا پُتلا تھا۔

خطیب کا مذ فام حقوق فریقین پر نظر ڈالے تو اس کو رفتار، کردار، گفتار کے بے شمار میدان مل جائیں اور ہر گھر کے نیک و بد انسان اس کی بات سننے باہر نکل آئیں۔ مگر صاف بات ہے۔ میں اس وقت اس کے پاس بھی نہ جاؤں گا۔ ہر جائیوں کی بیوفائیاں دیکھ چکا ہوں۔ بھلا میں اس کے قابو میں آؤں گا؟ وفا اور ایک دوسرے کی گیری ایک حق مشترک ہے جس کو عبد و معبود دونوں اپنا بناتے ہیں۔ کیا یاد نہیں کہ برٹش سرکار کے کارندے لفظ وفا کو دودھ کی چار پلاتے ہیں۔

Marfat.com

خود خدا کا بیان ہے کہ وفا میرا اصلی ارمان ہے جس کی خاطر بنایہ سارا جہان ہے جو بے وفائی کرتا ہے مشرک کہلاتا ہے اور بارگاہ الٰہی سے بڑی سزا پاتا ہے حکومت بھی بے وفاؤں کو پھانسی پر لٹکاتی ہے. سوسائٹی بھی ایسوں کو منہ نہیں لگاتی ہے. پھر میں کہ عبد و معبود کا ایک ثالث تماشائی ہوں کیونکر اس متعدی خواہش کا شریک نہ بنوں۔

جو خطیب ہر متوالی آنکھ کا مارا ہو وہ میرا کیونکر دل آرا ہو. میں تو خدا کی ہر دلعزیزی پر بھی بدگمان سا ہو جاتا ہوں. جب وہ اپنے حقوق کی باز پرس کر سکتا ہے تو مجھ کو بھی اجازت ہونی چاہیئے کہ اپنے حقوق کا مطالبہ کروں اور پوچھوں کہ تمہارے لئے تو مجھ جیسے بے شمار ہیں مگر تم میرے لئے یکتا و فرد ہو. پھر کیا معنی کہ تم اپنی یکتائی و وحدت کے جلوے اوروں کو بھی دکھاتے ہو. یا تو میرے لئے مخصوص ہو جاؤ اور ایک صفت میرے واسطے ریزرو کر دو. یا مجھ سے یہ تقاضا نہ کیا کرو کہ ہمارے سوا کسی اور پر نظر نہ ڈالنا. کسی غیر کے اپنے نہ بن جانا۔

خیالات تو بہت کچھ آتے ہیں مگر اسکا کیا علاج کہ دل خدا کے قبضہ میں ہے. جب ایک ہم تیار ہوتی ہے، دل اس کو پراگندہ کر دیتا ہے۔

یہ خطیب بھی کاغذی دل ہے. کس کو خبر ہے کہ خدا اس سے کیا لے گا اور کن کن کے مجوزہ نقشے برباد کرائے گا تو لاؤ اپنے ارادے کو ابھی سے اس کے سامنے رکھ دوں اور کہوں کہ اے کاغذ فام خطیب! جب تو بندوں کو ان کے مذہبی اخلاقی، تمدنی، انسانی حقوق یاد دلاتا اور سکھاتا ہے تو خدا ان سے بھی کچھ کہیو. جن کا تو پیامرساں ہے کہ وہ بھی اپنے دست توانا کو حرکت میں لائیں اور بندوں کو خطیب کی باتوں پر عمل کرنے کی توفیق دیں اور قدرے حسن نظامی کو اسیری تخیلات سے آزادی بخشیں۔

جھینگر کا جنازہ

از خطیب۔ ۷۔ مئی ۱۹۱۵ء

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا۔ خدا نے پردہ ڈھک لیا۔ اُفوہ جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں، جو وہ مجھ کو دکھا کر ہلایا کرتا تھا، تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی نقل اُتارتا تھا۔ اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا اگر دل سے یہ عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں، میں ان کو چار چاند لگا کر چمکاؤں گا۔

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کیوں رے شریر تو یہاں کیوں آیا؟ اُچھل کر بولا ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا۔" سبحان اللہ۔ تم کیا خاک مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔ بولا واہ۔ قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں اور نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔ لہذا وہ بوجھ اٹھانیوالے گدھے ہیں جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔

مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔ خدا مثال دیتا جاتا ہے تو بندہ بھی اس کی دی ہوئی حالت سے ایک نئی شان پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔

جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔ جھینگر کی یہ بات سن کر مجھ کو غصہ آیا اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا۔ جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ واہ خفا ہوگئے

بگڑ گئے۔ لاجواب ہوکر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

لیاقت تو یہ تھی کچھ جواب دیتے۔ لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے۔

ہائے کل تو یہ تماشہ دیکھا تھا، آج غسل خانہ میں وضو کرنے گیا تو دیکھا بیچارے جھینگر کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی ہے اور اس کو دیوار پر کھینچے لئے چلی جاتی ہیں۔

جمعہ کا وقت قریب تھا خطبہ کی اذان پکار رہی تھی۔ دل نے کہا جمعے تو ہزاروں آئیں گے خدا سلامتی دے نماز پھر پڑھ لینا۔ اس جھینگر کے جنازے کو کندھا دینا ضروری ہے یہ موقعے بار بار نہیں آتے۔

بیچارہ غریب تھا، خلوت نشین تھا، خلقت میں حقیر و ذلیل تھا۔ مکروہ تھا۔ غلیظ سمجھا جاتا تھا۔ اسی کا ساتھ نہ دیا تو کیا امریکہ کے کروڑپتی راک فیلر کے شریک ماتم ہوں گے؟

اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا جی دکھایا تھا لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو۔ اس واسطے میں کہتا ہوں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ ہمیشہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں کسی سوراخ میں، بوریہ کے نیچے، آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔

نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا، نہ سانپ کا سا ڈسنے والا پھن، نہ کوے کی سی شریر چونچ تھی، نہ بلبل کی مانند پھول کی عشق بازی۔ شام کے وقت عبادت رب کے لئے ایک مسلسل بین بجاتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ غافلوں کے لئے صور ہے اور عاقلوں کے واسطے جلوہ طور ہے۔

ہائے آج غریب مرگیا۔ جی سے گزر گیا۔ اب کون جھینگر کہلائے گا۔ اب ایسا مونچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا۔ ولیم میدان جنگ میں ہے ورنہ اسی کو دو گھڑی

Marfat.com

پاس بٹھا کر جی بہلاتے کہ مری مٹی کی نشانی ایک یہی بیچارہ دنیا میں باقی رہگیا ہے

ہاں تو "جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے" چیونٹیاں تو اس کو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کردیں گی. میرا خیال تھا کہ ان شکم پرستوں سے اس توکل شعار فاقہ مست کو بچاتا. "ویسٹ منسٹر ایبے" یا قادیان کے بہشتی مقبرے میں دفن کراتا مگر جناب یہ کالی چیونٹیاں بھی افریقہ کے مردم خوار سیاہ وحشیوں سے کم نہیں. کالی جو چیز بھی ہو، ایک بلائے بے درماں ہے. اس سے چھٹکارا کہاں ہے.

خیر تو مرثیے کے دو لفظ کہہ کر مرحوم سے رخصت ہو.

جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے ٭ قیصر کا پیارا ہے لے توپ پہ کھینچو

اے پروفیسر! اے فلاسفر!! اے متوکل درویش!!! اے نغمۂ ربانی گانے والے قوال. ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اٹھانے کا اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا ریزولیوشن پاس کرتے ہیں. خیر اب تو چیونٹی کے پیٹ کی قبر میں دفن ہو جا. مگر ہم ہمیشہ ریزولیوشنوں میں تجھے یاد رکھیں گے

من کہ ایک دھوبی

کاغذی گھاٹ پر

از خطیب ۔ ۳۰. جون ۱۹۱۵ء

جا مری جا. میں روٹی نہیں کھاتا. چاولوں کی پیچ اُدھر کنارے پر رکھ دے اور ایک

چلم بھر کر لا۔ دم لگاؤں دھواں اُڑاؤں غم مٹاؤں۔
چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔
کیوں ری تنوا کی ماں! دریا کا پانی گدلا، صابن کم۔ میں کیونکر ان میلے کپڑوں
کو صاف کروں۔ چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔
دیکھ درخت کا پتہ سوکھ کر گرا۔ ہوا اڑا کر لے چلی۔ اب خبر نہیں یہ بچھڑا ہوا کب ملیگا
چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔
میرا بیل ہاتھیوں سے بڑا۔ گھوڑوں سے تیز، ریل سے زیادہ تابعدار۔
پھر تو کہتی ہے کہ امیر بڑے ہوتے ہیں۔ ان میں بڑائی میرے دم سے ہے۔ میں اُجلے
کپڑے نہ پہناؤں تو ان کی عزت دو کوڑی کی ہوجائے۔
چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔
بھر لے حقہ مار لوں گھونٹ   بپتا چھا گئی چاروں کھونٹ
سنتی ہے۔ اس کاغذی گھاٹ پر آئی ہے۔ چنری، چولا دھلوانے لائی ہے
تو میری بات مان۔ یہ چولا من کے صابن سے دُھلے گا جس کو پریم کی بھٹی میں چڑھاؤں
گا۔ نیچے آگ جلاؤں گا اور پھر یہ گاتا جاؤں گا۔
او ——— ہو ——— او
کیوں رے چولے کالوں تیرا میل۔ پانی اُبلا جوش میں آیا۔ تو گھبرایا میل کٹا
پاک ہوا۔ صاف ہوا۔ اب کیسی سی سی آہ۔
او ——— ہو ——— او
چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔
یہ تن، وہ من۔ تو دھوبن میں دھوبی۔ سب ہیں ساجن۔ تو دھوبن میں دھوبی
چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔

کہنے دے ہم کمین ہیں۔ ہم موٹے وہ مہین ہیں۔ دیکھتی نہیں سارے باریک میرے ہاتھ میں ہیں اور میں ان کو پتھر پہ پٹخار رہا ہوں۔

چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔

یثرب نگر کے چودھری نے کہا جو سارے سنسار کے میلے تنوں کو دھونے آیا تھا۔ اسلام غریبوں سے شروع ہوا اور پھر غریبوں میں آجائے گا، تو بس ہم تم دونوں اپنے چودھری کے بیان پر مگن ہیں۔ اسلام ہم ہیں، ہم اسلام میں۔ اور سب امیر پیسہ والے من و تو کے کلام میں۔

چھُوا چھو، چھُوا چھو، چھُوا چھو،

(۲)

چھیُو رام۔ چھیو۔ چھیو۔

- پکا پکو کرو ہیں دھریا۔ لے جاری پڑیں دھریا۔ تجھ سے اتنا کہا۔ میں روٹی نہیں کھاتا۔ اَن اور جَل دو بہن بھائی ہیں۔ اَن نے باوا آدم کو جنت سے نکالا جَل نے پاؤں میں بیڑی ڈالی۔ آدھی رات سے اس دریا میں کھڑا ہوں اور پانی کا قیدی ہوں جب جل نے جلایا تو اُس کی بہن اَن سے کیا محبت ہو؟

چھیُو رام۔ چھیُو۔ چھیو۔ چھرا چھو۔ چھیُو۔

ندی کنارے میں کھڑی اور پانی جھل جل ہوئے
میں میلی پیا اجلے ری میل کس بدھ ملنا ہوئے

چھیُو رام۔ چھیا۔ چھیا۔

کپڑے دھوئے۔ ساری عمر دریا کے کنارے گزرگئی۔ مگر اپنا آپا میلا کا میلا رہا۔ صاف ستھرے اور اُجلے پیا کی نظروں میں میری کیا قدر ہوگی اور اس تک کیونکر پہنچنا نصیب ہوگا۔

Marfat.com

چھیوٗ رام، چھیوٗ رام، چھوا چھو.

اچھا ری ذرا ایک بات؛ دسنتی جا. دیکھیو خدا آسمان کی کھڑکی میں جھانک کر مجھ سے کچھ کہتا ہے۔ پورا تو سمجھ میں نہیں آیا سوائے اس کے کہ اس نے کہا۔

رام جھروکے بیٹھ کے سب کو مجرا لے ۔ جیسی جا کی چاکری ویسا وا کو دے

تو جب اس کی دین چاکری پر ہے تو لا میں بھی اس دنیا میں جہاز چلاؤں۔ دھوبی کیوں کہلاؤں۔ امیر البحر کیوں نہ بنوں۔ اس سنسار میں۔

کرنی کی بھرنی

ہے۔ جو کرتا ہے پاتا ہے۔ میں نے ساری عمر کپڑے دھوئے۔ پیسہ ٹکے پر نیت رکھی۔ اتنا ہی ملا۔ خیال آگے بڑھاتا۔ رام زیادہ بھجواتا۔

چھیوٗ رام، چھیا رام۔ ہوا دچھیو۔

اری نرا کی ماں۔ تو تو خفا ہو گئی۔ کہاں چلی۔ لا میں روٹی کھالوں۔ تو جامت۔ تیرا یہ خیال ہو گا کہ میں تیرے خفا ہونے کی پرواہ نہیں کروں گا۔ اری مجھ کو تو اس کا بڑا دکھ ہوتا ہے اور دل میں بڑی جلن ہوتی ہے۔

سائیں تیں مت جانیو توسے چھوٹت موہے چین
گیلے بن کی لاکڑی سلگت ہوں دن رین

چھئی ہو۔ چھی ہو۔ چھیا۔ رامہ چھیا

اری کل رات کا خواب سن۔ میں نے دیکھا۔ ایک سندر عورت اپنے بالم کو مایوس پنے سے دیکھ رہی ہے مگر منہ سے کچھ نہیں سکتی۔ اتنے میں اس کا پیتم پیارا کہیں چلا گیا اور وہ ہاتھ ملنے لگی کہ ہائے میں تو دو باتیں بھی نہ کرنے پائی تھی کہ پیا بچھڑ گئے۔

میں نے کہا تو کون ہے اور یہ مرد کون تھا؟ عورت بولی میں روح یعنی آتما

Marfat.com

ہوں اور یہ مرد پریم شکتی (مظہر عشق) ہے۔ یہ خواب دنیا ہے اور عالم اسباب ہے۔ اس عورت کی بات تو میری سمجھ میں آئی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس نے جو دوہا پڑھا تھا، وہ یاد ہو گیا۔

سپنے میں مورے پی ملے کر نہ سکی کچھ بات
سوتی تھی، روتی اٹھی، ملت رہی وہ بات

رام چھیو۔ چھوا چھو، چھیو۔

ہاں ننوا کے باپو! یہ تو بتا تو میرا پیا، میں تیری پیاری۔ تو میرا دھوبی، میں تیری دھوبن۔ پھر یہ پپیہا پی کہاں کیوں پکارتا ہے؟ اس کو پی پی کہنے کا کیا حق ہے؟

تو کپڑے دھو چکے تو کچہری جائیو اور پیا پیاری کے نام کو انگریز بہادر سے اپنے نام لکھوا لائیو۔ اس کے بعد پپیہا پی کو پکارے گا تو میں نالش کر دوں گی۔

نہیں ننوا کی ماں، یہ تیری غلطی ہے۔ پی کا پکارنا، پیا کا پیارا بننا آسان نہیں ہے۔ دیکھ بھونرا کیسا کالا ہوتا ہے مگر پی کی محبت میں اس کے منہ کی رنگت زرد ہوتی ہے۔ اری اس پریم کی بڑی کٹھن بٹیا ہے۔ پپیہا بھی جھوٹ موٹ پی کو پکارتا ہے اور تو بھی خواہ مخواہ اس میں جھگڑا کرتی ہے۔ اری جن کے من میں پی بسا ہے ان کے منہ زرد پڑ جاتے۔ جا من میں پیا بسے۔ دا کھ پیرا ہوئے

جا لیجاری۔ وہیں دھریا۔ پکا پکو کر وہیں دھریا۔

ننوا کے باپو! یہ رات کو چکوا چکوی آپس میں کیا باتیں کیا کرتے تھے۔ میں نے تو اتنا سنا کہ چکوا جمنا کے اس پار اپنی چکوی کو پکارتا تھا، اور چکوی اس پار اپنے چکوے کو آواز دیتی تھی۔ جب ان کے پر تھے تو یہ اڑ کر پاس کیوں نہیں جاتے تھے۔

دیوانی اس پریم کی ہزاروں ریتیں ہیں۔ کہیں پروانہ چراغ پر آن کر جل جاتا ہے

Marfat.com

کہیں بلبل پھول کو گلے لگاتا ہے، لوہے کو مقناطیس کی محبت دی گئی ہے کہ دیکھتا ہے تو بے اختیار اس کی طرف دوڑتا ہے۔ تنکا کہربا پر فریفتہ ہے، دیدار پاتا ہے تو لپک کر سینے سے چمٹ جاتا ہے۔ مگر چکوے چکوی کی محبت یہی ہے کہ وہ جدائی کی بہار دیکھیں۔ وہ آپس میں مل نہیں سکتے۔ ساری عمر ترستے رہتے ہیں۔ اسی واسطے تو کہا ہے کہ چکوے چکوی کو نہ ستانا۔ وہ خود محبت کے ستائے ہوئے۔ جدائی کے صدمے اٹھائے ہوئے ہیں۔

چھیّو رام، چھیّو۔ چھیّو۔

ننّوا کے باپو! تو نے کل کہا تھا یثرب نگر میں ہمارے چودھری سارے سنسار کے تنوں کو دھونے آئے تھے، اس کا بھید مجھ کو بتا کہ یہ کیا بات تھی؟

اوہو۔ تو تو بڑی مورکھ ہے چل تجھے قوالی میں لے چلوں۔ وہاں یہ بھید سمجھ میں آجائے گا۔ قوال گا رہے تھے۔

میری میلی گدڑیا دھودے

دھوبی نے کہا یہ میلی گدڑی ساری دنیا ہے، خود ہمارے وجود ہیں اور ان گناہوں اور شک و شبہ کے دھبوں کو صاف کرنے کے لئے خدا نے یثرب نگر میں جو عرب میں ہے اور جس کو مدینہ بھی کہتے ہیں، ایک بڑے چودھری کو پیدا کیا جس نے سارے جہان کے دھبے دور کر دیئے اور یہ سب میلی گدڑیاں دھو کر رکھ دیں۔ یہی توجہ ہے کہ میں بیچارہ غریب دھوبی کاغذی گھاٹ پر کپڑے دھونے آیا ہوں۔ اور اپنے مہاچودھری کے بتائے ہوئے صابن سے اپنے من کے کپڑے کا میل دھو رہا ہوں۔ جب پتھر پر کپڑے کو مارتا ہوں تو وہ شکایت کرتا ہے مجھکو بے رحم کہتا ہے اور نہیں جانتا کہ اسی کو اُجلا کرنے کے لئے اُس کو پتھر پر مارنا پڑتا ہے۔

ریسیم لا

از خطیب ۷. اکتوبر ۱۹۱۵ء

جیب میں چاندی، بدن میں صحت، دل میں جذبات اور عقل میں عروج ہو تو شملہ آؤ۔ انگریزی میں یہ جملہ ہے۔ ذرا کھینچ کر پڑھو تو ریسیم لا ہے جس کے معنی طلب نقرہ میں محو ہیں۔ چاندی لاؤ چاندی لاؤ پکارتے رہتے ہیں۔

میں آیا تو جیب خالی، بدن ناتوان، دل جذبات سے معریٰ، عقل زوال پذیر، کوئی وجہ ایسی نہ تھی جس کے سہارے اس اونچے پتھر خانہ میں آتا۔ مگر دیکھتا ہوں کہ آگیا۔ حجرہ فتح محمد میں ٹھہر گیا۔ (بابو فتح محمد اوورسیر کا مکان واقع سنجولی)

یہ وہ وقت ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے سب پیشوا سیاسی و علمی اس کوہ نور پر جمع ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یونیورسٹی لینے آیا ہوں۔ کوئی کہتا ہے کہ ریزولیوشن پیش کرنا اور جواب میں نغمۂ دلربا سننا ہے کسی کو مال روڈ پر گشت لگانا اور ہوٹل میں جانا آنا ہے۔ کوئی زندگی کی ددیدگی میں ہوائے شملہ سے رفو کرانے آیا ہے

چاند زوروں پر ہے۔ آدھے دن اِدھر آدھے دن اُدھر۔ تیرھویں چودھویں کا سماں ہے۔ رات کو آسمان منہ دھوکر بے پردہ نکل آتا ہے۔ چاند تاروں کی فوج کو قواعد کراتا ہے۔ غیر فوجی بندہ اپنے حجرے کے جھروکوں میں بیٹھا ان نورانی ہستیوں کی نیزہ بازی دیکھا کرتا ہے۔ سردی باہر نکلنے نہیں دیتی۔ آتشدان کی ملکہ چاند کی قدرتی رقیب ہے، اس کے پاس ہوتا ہوں چاند کے پہلو میں کیونکر جاؤں۔

کل چاندنی لرز لرز کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر چل رہی تھی اور میں ہنستا تھا جب وہ پھسل کر غاروں میں لڑھک جاتی تھی۔ غار گود کھولے بنت القمر کی یاد میں بیتاب

Marfat.com

نظر آتے تھے اور جب اس تابانی کو پاتے تھے تو اپنے اندر کی سب مخفی حالتوں کو نمایاں کر دیتے تھے۔ یعنی روشنی کی چمک میں اپنے اندر کی چیزیں ظاہر کر دیتے تھے۔

کہتے ہیں یہ وہ پہاڑ ہے جو سینکڑوں کوس اسی طرح اونچا نیچا چلا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ وہ پہاڑ ہے جس کے ہاتھوں میں سارے ہندوستان کی دنیاوی قسمتیں ہیں۔ اس پہاڑ کے سینے پر جو تار ہیں ان کی بجلی تمام ہندوستان کی موت حیات پر حکمرانی کرتی ہے۔ اس پہاڑ کی گود میں جو ریل چلتی ہے، وہ لاکھوں میل لمبے ہند کی زندگانی کے لئے آبِ حیات لے جاتی ہے۔ یا ہر ایک کو اس کے نامۂ اعمال پہنچاتی ہے۔ ہوں گے، اس سطح سے اور بھی اونچے پہاڑ ہوں گے مگر نصیبے میں اس سے اونچا کون ہے، اقبال اس سے بڑھ کر کس کا ہے۔ سب راجہ پرجا اس سنگ خانہ میں کھنچے چلے آتے ہیں۔

میں پوچھوں۔ کیوں جناب آپ نعرہ لگاتے ہیں انا سیم، اور میں بغیر سیم کے آپ کے پاس آگیا۔ تو یہ پہاڑ کیا جواب دے۔ ممکن ہے کہ تیوری چڑھائے اور میری بے عقلی پر قہقہہ لگائے مگر میں اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتا اور کہتا ہوں کہ بغیر سیم کے بھی سیم لا دیکھنے میں آسکتا ہے۔ اگر توکل خالق مس و سیم پر ہو۔

حضرتِ کُن

از صوفی۔ ستمبر ۱۹۰۹ء

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرت کُن پیدا ہوتے ہی رحلت فرما گئے اور اب دنیا میں ان کا نام ہی باقی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام موجودات کا وجود انہی جناب کے سہارے پایا جاتا ہے۔ یہ مرجاتے جہان سے گذر جاتے تو فیکون کی صورت نظر آتی۔

Marfat.com

لوگوں کو ان کی موت کا شبہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ جو کرشمہ انہوں نے اپنی پیدائش کے وقت دکھایا تھا وہ دوبارہ نہ دیکھا گیا۔ ان کی پیدائش سے پہلے نہ آسمان تھا نہ زمین اور نہ یہ تمام غلطاں پیچاں چیزیں، جو آسمان زمین پر چھائی ہوئی ہیں، اور یہ میاں آدم بھی جو آج حضرت کن کی زندگی پر بحث کر رہے ہیں. ظہورِ کن سے اول غائب تھے مختصر بات یہ ہے کہ ناپید اور عدم کا لفظ بھی گم تھا.

حضرت کن کے میلاد شریف کی کیفیت یوں بیان کی جاتی ہے کہ جب خزانۂ مخفی میں خود نمائی وخود آرائی کا جذبہ اٹھا اور اس جذبے نے سکوت معدوم کے دریا میں ایک لہر اور جنبش پیدا کی اور خواہش نمود کا بادل گرجا اور برسوں کی قید شدہ بجلی نے بادل سے باہر آکر چمکنا چاہا تو سب سے پہلے حضرت کن کو ولادت[1] کا شرف عطا کیا گیا. جب یہ حضرت آغوش دہن سے باہر تشریف لائے تو عجیب شان سے آئے.

ھوحق نالے میں زور سے تجلی ہوئی اور سایہ نمودار ہوا. یہ سایہ تیزی سے گردش کرتا تھا اور موجودہ عالم کی رنگا رنگ شکلیں اس سے یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی جاتی تھیں. یہاں تک کہ اس سایہ کی گردش آہستہ آہستہ تھمی اور وجود عالم جم کر قائم ہو گیا.

اس کے بعد نہ پھر کبھی ایسی تجلی ہوئی. نہ کوئی اس قسم کا دوسرا عالم ظاہر ہوا۔ اس واسطے بعض آدمی کہتے ہیں کہ حضرت کن ہی چل بسے ورنہ کبھی تو کوئی اور جلوہ دکھاتے۔

لیکن آدم زاد غلطی کرتے ہیں جو مولانا کن کو مردہ تصور کرتے ہیں. وہ زندہ ہیں اور ہر روز تجلیاں نازل کرتے ہیں. یہ پرانا کارخانہ شب و روز نئے رنگ بدلتا ہے. جناب کن نہ ہوتے تو یہ نت نئی رنگینیاں کہاں سے آتیں. ہمارا تو اسپر ایمان ہے کہ حضرت کن زندہ رہیں گے اور مرنا ان کے لئے محال ہے. کلام ہے تو اس میں کہ آیا ان کی ولادت کی

---

[1] یہاں وہ ولادت مراد نہیں ہے جو ماں باپ کے تعلق سے ہوتی ہے اس قسم کی ولادت سے قرآن شریف کی سورۂ اخلاص میں انکار کیا گیا ہے. ہم اس نکتہ کو سمجھتے اور ڈر کے مارے ولادت کی تشریح کر چکے ہیں. ۱۲ حسن نظامی

ضرورت بھی تھی یا نہیں اور جب وہ پیدا ہو ہی گئے تو ان سے جو کچھ کام بھی آیا یا یونہی افشائے راز کا دھبہ ثابت ہوا۔

اس معاملہ میں دو خیال ہیں۔ حضرت کن کے حامی، جو آرائش عالم کی ظاہری بہار کے شیدا ہیں، کہتے ہیں۔..... کن نے بڑا احسان کیا جو ہم کو راز کے بند صندوق سے باہر نکالا اور عجیب و غریب تماشے دکھلائے۔ مگر گروہ مست قلندر جناب کن کا بہت شکوہ گزار ہے وہ خیال کرتا ہے کہ نہ یہ حضرت تشریف لاتے نہ ہمارے سکونِ وحدت میں طوفان آتا خشک و تر۔ خیر و شر جاندار و بیجان سینہ سے سینہ لگائے آرام سے سوتے رہتے اب پہاڑ جنگل بیابان میں اکیلے کھڑے ہیں اور شہروں کی رونق و چہل پہل کو ترستے ہیں۔ شہر رات دن کے غل و شور سے اکتا کر پہاڑوں اور صحراؤں کی تنہائی و خاموشی پر حسرت کے آنسو بہاتے ہیں۔ دریا شاکی ہیں کہ ہم بہتے بہتے تھک گئے۔ یہ کنارہ آرام سے بیٹھا ہے یہ کیوں نہیں بہتا، کنارہ کہتا ہے میں خود اپنی افتادگی سے نالاں ہوں نقل مکان کر نہیں سکتا۔ ورنہ تمہاری طرح سیر کرتا پھرتا سب سے زیادہ انسان اپنی تکلیفیں بیان کرتا ہے۔ بچپن اور جوانی۔ بیماری اور بڑھاپا، غریبی اور امیری، نیکی و بدی، سب اس کی جان کیلئے وبال بنے ہوئے ہیں۔ ہم بھی جہاں تک غور کرتے ہیں، انسان کی شکایتیں واجبی معلوم ہوتی ہیں۔ پر جہاں اس کو کن کے سبب آزار وہ پراگندگی نصیب ہوئی ہے۔ طرح طرح کی خوشیاں بھی ملی ہیں جو درجوں اور حالتوں میں تقسیم ہو کر ایسی پر لطف بن جاتی ہیں کہ عالم یک جائی میں ان کا حاصل ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

روئی

(از صوفی۔ جنوری ۱۹۱۳ء)

سردی کا موسم درحقیقت روئی کا موسم ہے۔ جہاں یہ دن آئے چاروں طرف روئی

Marfat.com

کی گوری گوری اُجلی اُجلی صورت نظر آنے لگی۔ انگریزوں اور ان کی ریس کرنیوالے ہندستانیوں سے ہمیں بحث نہیں جو روئی کا استعمال فیشن اور شان کے خلاف سمجھتے ہیں اور بھیڑ کی اُون پہننے کو اپنا فخر جانتے ہیں۔ روئی خدا کی دی ہوئی سخت زمین سے نکلا ہوا شگوفہ۔ اُون غریب بھیڑ کا اوڑھنا بچھونا جس کو ظلم و بے دردی سے زبردستی چھین لیا جاتا ہے اور اس مال مغصوبہ کے کوٹ، کمبل اور طرح طرح کے کپڑے بنا کر استعمال کئے جاتے ہیں اور اسپر یہ ڈھٹائی کہ جو لوگ خدا کی دی ہوئی روئی کے کپڑے پہنیں، ان کو ذلیل، وحشی، غیر مہذب اور اَن فیشن کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

روئی کے درخت کو دیکھنا! کھیت میں اپنے سینکڑوں ہم جنس پودوں کے پاس سر پر سفید عمامہ باندھے خدا کی یاد میں جھوم رہا ہے۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ جس قدر پھول اور پھل پیدا ہوتے ہیں ان سب میں نمی اور تری پائی جاتی ہے۔ مگر روئی اپنے درخت کا ایک ایسا پھل پھول ہے جو تر شاخ میں خشک وجود کے ساتھ نظر آتا ہے۔ یعنی روئی کے درخت کی جڑ، ٹہنیاں، پتے یہاں تک کہ وہ شگوفہ جس کے وسط میں روئی ہوتی ہے سب میں تری اور گیلا پن موجود ہوتا ہے مگر روئی بالکل سوکھی اور نمی سے پاک ہوتی ہے یہ شہادت ہے خداوند تعالیٰ کے اس ارشاد کی کہ وہ مردے سے زندہ اور زندہ سے مردہ، آگ سے پانی اور پانی سے آگ پیدا اور نمودار کرتا ہے۔ روئی کی جڑ پانی میں، ٹہنیاں پتے پانی آلود مگر پھل شعلۂ جوالہ۔ باہمہ و بے ہمہ سب میں موجود اور سب سے الگ۔ ٹھنڈک میں پیدا ہوا مزاج گرم پایا۔

اب ذرا اسپر غور کرنا کہ روئی کے پھول کے اندر جو مسلمانوں کے عمامہ کی شکل کا ہے یہ کالی کالی سخت کیا چیز ہے۔ اس کا نام "بنولہ" ہے جس طرح انسان اشرف المخلوقات کے باطن میں حجابات کثیف پیدا کئے جاتے ہیں جو ریاضت و صحبتِ شیخ و اعمال حسنہ سے صاف ہو جاتے ہیں، اسی طرح روئی کی باطنی کثافتیں گردش آب مشین سے

اندیوری مشقت کے بعد صاف کی جاتی ہیں۔ جب بنولے، جو کہ ایک سخت و کرخت وجود رکھتے ہیں، روئی کے نازک اور گلفام بدن سے دُور ہوجاتے ہیں تو روئی کو ایک اور امتحان گاہ میں جانا پڑتا ہے اور وہ دُھنیئے کی تانت ہے جو بیچاری روئی کے تن زار کا ایک ایک رواں کھول بکھیر کر رکھ دیتی ہے اور رونگ رونگ کا میل کوڑا کرکٹ صاف کر کے پھر سب اجزاء کو ایک جگہ کر کے روئی کا گالا بنا دیتی ہے۔

ایک گالے کو لو اور اس کو تولو جتنا وزن اس کا ہو اسی انداز سے وہ روئی لو جس کے بنولے اور کوڑا کرکٹ صاف نہیں ہوا، تو تم کو زمین و آسمان کا فرق نظر آئیگا۔ صاف روئی نرم ہوگی، گرم ہوگی اور جسامت میں کئی حصے بڑی نظر آئے گی اور غیر صاف شدہ روئی اس کے بالکل برعکس۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ انسان بھی جب صفائی باطن کے بعد درجہ تکمیل کو پہنچتا ہے تو اس کی ذات و صفات میں بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔

مغرب کے دُھنیئے

روئی دُھنکنے کا ذکر آیا۔ اُون اور روئی کے درجہ پر بحث ہوئی تو لامحالہ اس پر بھی گفتگو ہونی چاہیئے کہ اترن پوش مغرب ہماری روئی کا کس قدر محتاج ہے۔ مغرب میں ہزاروں کارخانے ہماری روئی کے بل پر چل رہے ہیں۔ سوتی کپڑے کی مانگ نہ ہو تو روئی کے گالوں کی طرح گوروں کے گلے نہ پھولیں اور پچک کر رہ جائیں۔ مگر یہ سب اہل سیاست اصحاب کے سوچنے کی باتیں ہیں۔ فقیر تو اس امر کی شکایت کر سکتا ہے کہ مغرب کے دھنیئے مشرق کی پرانی روئی کو دھنکنے کیلئے تو اسقدر بے چین ہیں کہ کالے کوسوں روئی دھنکنے کے سامان کندھے پر اٹھائے لئے چلے آتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اپنے گھر کے لحاف توشک کی بھی خبر لی۔ پرانی روئی کے دھنکنے کی دھن میں ایسے سرشار ہوئے کہ اپنے گھر کی روئی بیحیائی، شراب خواری، خود غرضی، بے رحمی کے بنولوں سے اٹی پڑی ہے۔

Marfat.com

اور اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا.........

او آدمی !! اپنے وجود کی روئی کے چار بنولے، جن کا تعلق اربعہ عناصر سے ہے نکال ڈال اور ایسی تانت بجا کہ تمام جسم صدائے وحدت کی تن تن سے گونج اٹھے اور روح کی ملکہ تیرے پاکیزہ جسم کے نرم و گرم لحاف میں خوشنودگی و پسندیدگی سے رہنا قبول فرمائے۔

مستانہ بیمار کا جواب

از طبیب. یکم جنوری ۱۹۱۱ء

انگریزی پیزوالے اخبار جی! مجھسے کیا مانگتا ہے؟ میں کیا کروں، کیا دعا، طبیب اخبار رہتا ہے۔ بننے دو۔ دنیا میں ہر چیز بننے سنورنے کو آئی ہے۔ خود خدا کے جی میں یہی سمائی ہے۔ ہر ہستی نمود داری کی طلبگار ہے۔ بندہ خود اس مرض کا گرفتار ہے مگر اب تو مدت ہوگئی۔ زخموں نے بہنا چھوڑ دیا۔ میں نے لکھنے پڑھنے اور اخباری آہ و زاری کرنے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ تم جانتے ہو، پہچانتے ہو، پھر کیا مانگتے ہو؟

دلی دوستی، آجکل میں اس سے دور ہوں۔ سنتا ہوں کہ وہ میری طرف چلتی ہے اور کہتی ہے "دیوانہ ہنوز بیگانہ" چرپائی کا سمندر دامن پکڑنے کو دوڑتا ہے، کہتا ہے میری نبض دیکھو. طبیب کہتے ہیں نبض کی تیزی اور حرکت بخار کی نشانی ہے۔ کہیں مجھکو بخار تو نہیں؟ میں اس سے بھی نہیں بولتا۔ دل کو بھی جواب نہیں دیتا جو اپنی حرکت بے اختیاری کے سبب تپ لازمی کی فکر میں مبتلا ہے۔ پلکوں کی جانب بھی مخاطب نہیں ہوتا جو سکنڈ سکنڈ میں ٹھوکریں کھاتی اور چشم بیمار پر گری پڑتی ہیں۔ لفظوں کی دنیا میں سنا جاتا ہے علم دو ہیں۔ بدنی اور دینی۔ میں نے ابھی علم کے لفظ تک کو نہیں پہچانا، بدن و دین کا کوچہ بعد میں آئیگا۔

Marfat.com

دل گوشت کا ٹکڑا ہے، خون کا انجن گھر ہے یا تخت رب العلمین ہے یا ستانہ دیوانہ کا جیل خانہ ہے۔ مجھے کچھ خبر نہیں دماغ کہاں ہے، کیوں ہے، اس میں آنکھیں کدھر ہیں، کان کس رخ ہیں، ناک کس جانب ہے، زبان کونسے پہلو میں ہے مجھے معلوم نہیں!

معدہ وجگر میں کیا تعلق ہے، گردہ کی کس کس سے دشمنی ہے، خانہ شکم میں کن قابلوں کا بازار گرم ہے، ان کو سمجھنے کا وقت نہیں نکال سکتا۔

کیفیات محسوسات اندرونی وبیرونی اور ملکہ جسم یارانی پی طبیعت لامکانی سے بھی میری شناسائی نہیں بنتا ہوں وہ میری عاشق زار ہے رات دن میری ہی خبرگیری وخاطر داری میں گھلی جاتی ہیں۔ مگر ان دنوں مجھے ان کی طرف بھی آنکھ اٹھانیکی فرصت نہیں۔

دلی کی گورنمنٹ ملیریا کے مچھر پکڑتی ہے اور اخباروں کے جراثیم چھوڑتی جاتی ہے اخبار روزانہ ہو تو یہ نوبت کا بخار ہے، ہفتہ وار ہو تو آٹھ روزہ۔ ہفتہ میں تین بار ہو تو تہیہ اور دوبار ہو تو چوتھیہ۔

"طبیب" کے ایڈیٹر صاحب کو خدا تندرستی دے، مجھ غریب الوطن کی نبض پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ دردمندِ عشق فارسی جانتا ہوتا تو کہہ دیتا "خیز اے ناداں طبیب" مگر یہاں تو ایسے عشق کا درد ہے جس کو داروئے دیدار بھی مفید نہیں۔ بہت سے شربت دیدار پیے۔ لال بھی، کالے بھی، مگر درد قابو میں نہ آیا۔

کل رات حکیم سقراط زہر کا پیالہ لیکر میرے پلنگ تک آئے۔ میں نیچے بچھے ہوئے مصلے کو دیکھ رہا تھا کہ اب کوئی دم میں مجھکو اسپر جانا اور خدا کے سامنے سر جھکانا ہوگا۔ بوڑھے حکیم نے ادب سے گھٹنے جھکائے اور کہا اس کو پی لو بیقراری جاتی رہیگی میں نے کہا ثبوت دو کہ تمکو جام زہر آلود نے تسلی دیدی۔ شام کو وکٹوریہ گارڈن میں ایک اسیر قفس طوطے نے بیان کیا تھا کہ قرار جنگل کی آزادی میں بھی نہ تھا اور اس پنجرۂ آہنی میں

بھی نہیں ہے۔ پھر اگر میں زہر کا پیالہ پی لوں۔ مسلمان مولویوں کے فتوے موت الحرام اور انگریزوں کے قانونِ خودکشی کا سزاوار بنوں، تو کون کہہ سکتا ہے کہ مرضِ اضطراب دور ہو جائے گا۔

حکیم سقراط کے برابر ایک اور پیر مرد نمودار ہوئے۔ بولے میں سعدی ہوں۔ میں نے کہا جناب شیخ صاحب مجھ کو حیران نہ کیجیے اور اس حکیم کو لے کر جائیے۔ آپ نے دنیا کو خوب دیکھ بھال کر سمجھا اور میں بغیر دیکھے سمجھ گیا۔

سعدی نے بغل سے ایک کتاب نکالی اور کہا اس کشفیہ میں نسخہ دیکھو۔ دم گھٹنے لگا۔ زبان بولی کتابوں میں کیا رکھا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر نے آواز دی۔ آفرین۔ خوب جواب ہے۔ گردن موڑ کر حکیم ہربرٹ کو للکارنا پڑا۔ جاؤ گورے آدمیوں کو آفرین وتحسین دو۔ مجھے درکار نہیں بمبئی کے بازاروں میں ہزار طبیب بیمار نظر سے گذرتے ہیں۔ ٹرام گاڑیاں دوڑتی ہیں اور ہر بیمار کر اس کے شفاخانہ میں لیجاتی ہیں۔ میرے پاس چلکائے شہرۂ آفاق خود آئے ہیں۔ فیس وتدمانہ سے انکار کرتے ہیں اور غریب مجھ کر مفت علاج کرنا چاہتے ہیں، اخبار "طبیب" ان کے نام بھی جاری کر دیا۔ ان کو نسخے خوب یاد ہیں، یہ سب کاغذی حکیم تھے، آسمانی حکیم تھے، روحانی حکیم تھے، طوفانی حکیم تھے۔

میں بیمار نہیں ہوں، حواس باختہ نہیں ہوں، عشقیہ مالیخولیا کے آزار سے آزاد ہوں۔ مولانا روم کے گندم نواز عشق کے زیر بار ہونے سے انکاری ہوں۔ یہ تمہارا طبیب مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ اس سے کہو خلقت عشق سے تباہ ہے اور بھلے بڑے بزرگ خضر صورت اس آگ کو بھڑکاتے ہیں۔ ابھی اس خط کے لکھتے وقت شیکسپیئر نے قلم پکڑ لیا کہتا تھا۔ خدا اور محبت کا بھید کوئی نہیں جانتا۔ میں نے ایک کہنی مار کر دھکا دے دیا اسٹیج پر رقص کرنے والا مجلس میں ناچنے والے کو سبق دینے آیا ہے۔ ارے میں خدا کو بھی جانتا ہوں اور عشق کو بھی پہچانتا ہوں یہ دونوں اس ساری کائنات کے

Marfat.com

جسم و روح ہیں جسم کے عوارض اور روح کے آلام جن اخلاط سے پیدا ہوتے ہیں. وہ بغیر سمجھے مجھکو معلوم ہیں، طبیب بیچارے کیا جانیں بلغم و سودا کے صحرا میں سرگرداں رہتے ہیں. صفراوی تحقیقات کی محنت میں زرد ہو گئے ہیں خلقت سے کہتے ہیں ہم کو حکیم صاحب کہو. ان کا کہنا جھوٹ نہیں اور سچ بھی نہیں.

نادان خلقت کی حکمت جانتے ہیں، اس لئے سچے ہیں. دانا مخلوقات کی حکمت سے عاجز ہیں، لہذا دروغ گو ہیں. نیم حکیم خطرۂ جان ہو. مگر خطرۂ جسم نہیں ہوتا. جان اور چیز ہے حکیم طبیب کو اس سے کیا سروکار، جان کا راز جاناں کو معلوم ہے یا جاناں پرستوں کو وہاں اگر کوئی خام کار پھنس جاتا ہے تو کان پکڑ کر نکال دیا جاتا ہے. پروانہ کا سوز مکھی کو نہیں دیا جاتا.

تم سمجھے. جناب حکمت مآب ایڈیٹر صاحب مستانہ بیمار کے جواب کو. ڈرتا ہوں کہ تم لیاقت طبی جتانے کھڑے ہو جاؤ اور کہو حسن نظامی کے دماغ میں خلل آگیا ہے. تربوز کا چھلکہ اُدھانے کی ضرورت ہے. تربوز کا چھلکا اٹھاتے ہو تو وہ سرخ سرخ گودا بھی وہ جو رخ شعلہ صفت کا ہمشکل ہے. زخمی جگر کی صورت رکھتا ہے.

طب اچھا فن ہے. عرفان جسم کا مرشد ہے جسم کی شناخت ہو جائے تو جان تک رسائی دشوار نہیں. جان کیا چیز ہے؟ روح کس کو کہتے ہیں؟ جو طبیب اس کی دانش کا دم مارے وہ بیدم ہے یا بیدم ہونے والا ہے.

نئی روشنی کے طبیب، جن کو ڈاکٹر کہتے ہیں، تمام کائنات وموجودات عالم کو خشک ہوں یا تر، حیوان ہوں یا بشر، پہاڑ ہوں یا شجر، سلسلۂ جاناں میں منسلک مانتے ہیں. ہندو فلاسفر پہلے ہی کہتے تھے مگر ان سرکشوں نے نہ مانا. اب آنکھیں کھلیں تو پہچانا کہ حی و قیوم کی حیات ذرہ ذرہ میں نمایاں ہے. موت بھی زندگی رکھتی ہے. طاعون اور ہیضہ جیسے بلا کو امراض کے بھی جان ہے. نازک نازک کیڑوں میں اس کی پہچان ہے. اب چند روز

Marfat.com

میں کہیں گے خدا کو بھی خوردبین سے دیکھ لیا مگر وہ چھوٹا سا کیڑا نہیں ہے نہ بڑا سا پہاڑ ہے وہ نہ خوردبین سے نظر آئے گا نہ دوربین میں سمائے، اس لئے میں پہلے سے کہے دیتا ہوں کہ ایجاد خوردبین ودوربین سے پہلے میں نے اس کو دریافت کر لیا ہے۔ یہ ایجاد واختراع میرے نام پیٹنٹ ہونی چاہیئے۔ مگر اخبار والوں کا قلم، دنیا کا پانی، معترض کی زبان کو کون روکے؟ کہا جائے گا تم سے پہلے بے شمار انسانوں نے اس کو جانا اور پہچانا۔ رجسٹری تمہارے نام نہیں ہو سکتی۔ اور خدا کی پہچان کو پیٹنٹ کرنے کا کوئی قانون بھی نہیں ہے۔

ہاں انہوں نے جانا پہچانا مگر نئی روشنی کے آلات سے نہیں، وہ سب پرانی لکیر کے فقیر ہے مجھکو جو عینک میسر آئی ہے وہ پہلے نہ بنی تھی نہ آئندہ اس جیسی بننی ممکن ہے۔

میری مانو تو کہوں، کامل طبیب کاغذ کے حرفوں اور مریض وامراض کے تجربوں سے نہیں پہچانا جاتا۔ یہ سب ابن آدم کے کسبی وظنی جوہر ہیں۔ کمال صفت عینی ہے۔ جو کبھی اثرِ بے توقع اور کبھی ضربِ بے یقین بن کر نمودار ہوتا ہے۔ خدا جب چاہتا ہے کسی طبیب کو یہ نعمت دے دیتا ہے کہ خلاف امید تاثیریں اس کے ہاتھ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ مایوس اور لاعلاج مریض ادنیٰ کوشش سے بستر مرگ سے زندہ ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ایک دن میں نے عزرائیل سے پوچھا تم بھی زندگی کے ہاتھ سے کبھی آزردہ ہوئے ہو؟ بولے رات دن میں کئی بار یہ زحمت پیش آتی ہے۔ ایک طرف مجھکو حکم ہوتا ہے فلاں مریض کی جان نکال لو۔ دوسری طرف طبیب کامل کے ہاتھ میں اثر دیا جاتا ہے کہ مرنے نہ دو، اور دیکھتا ہوں کہ خاکی انسان جیت جاتا ہے اور مجھکو اپنی حیلت ہلاکت کی شکست سے سخت اذیت ہوتی ہے۔

میں نے کہا تم سمجھے بھی خدا یہ دورخی پالیسی کیوں چلتا ہے۔ جواب دیا اس کا علم مجھ کو نہیں ہے۔ میں بولا سنو! زندگی کشمکش کامیابی وناکامی کا نام ہے۔ تم ہمیشہ کامیاب رہو تو زندگی کے انقلابات کا لطف جاتا رہے۔ یہ حکمت سن کر عزرائیل نے حسرت سے مجھکو دیکھا اور

Marfat.com

میں نے جلدی سے اس کو قلم بند کر لیا۔

تنکے کا سلوک

از نظام المشائخ ۱۹۱۵ء

شیراز کے فلسفی صوفی نے کہا درخت کے ہر پتے پر کردگار، نرکار کی معرفت کے دفتر منقوش ہیں۔ یہ سن کر جنگل کے نیم کی ایک ٹہنی کو میں نے جھکایا اور اس کے پتوں سے پوچھا خدا کی پہچان کا رجسٹر کس ورق میں ہے۔ شاخ جھول کر بولی تم تو ہمکو جھکاتے ہو خود جھکو تب وہ مخفی نوشتے نظر آئیں گے۔

سُنا آپ نے! میں اور نا ہنجار اشجار کے آگے سر کو خم کردوں۔ اغیار کے سامنے اس سر کو جھکنے کی عادت نہیں۔

میرے سکوت اور پس وپیش نے نیم کی ٹہنی کو موقعہ دیا کہ اس نے جھنجلا کر اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑا لیا اور دوسری شاخ نے متحرک ہو کر اپنی گرفتار بہن کو اپنے اندر بلا لیا۔

قدم بڑھایا۔ چلوں اور کسی دوسرے عارف سے اس نکتے کو حل کروں۔ پاؤں کے نیچے دبے ہوئے گیاہِ سبز کے تنکے نے آواز دی۔ میں بتاؤں۔ سنو تو میں سناؤں میں جھکا اور اس مہین آواز کو سمجھنے کے لئے گردن خم کی۔

نیم کی ٹہنیوں نے جھکتے دیکھ کر نعرۂ شادمانی بلند کیا اور کہا۔ وہ جھکا جس کو انکار تھا گھاس کے تنکوں نے مل کر جواب دیا دیوانیو! یہ آدمی اس جنس کی جانب جھکا ہے جس سے بنا ہے۔ اس کو ایک دن اسی خاک میں آنا ہے اور ہمارے ہی مٹیا محل میں تن گنوانا ہے، تم ہنسی نہ اڑاؤ۔ یہ اشرف المخلوقات ہے۔

اب میں نے کہا۔ پیارے تو ہی مجھ کو سلوک کا راستہ بتا اور خدا تک پہنچا۔ تنکا بولا

لکھنؤ جا. کاغذ بننے کی مشین دیکھ. وہاں میرے اور تیرے دونوں کے سلوک کی منزلیں طے ہو جائیں گی کہ

کرنا اور سمجھنا دیکھنے اور کہنے سے اچھا ہے

دیکھا لکھنؤ کی پیپر مل کو. غریب گھاس کے گٹھے بندھے رکھے ہیں. پھٹے پرانے گودڑ کے چھکڑے بھرے کھڑے ہیں. انجن سرگرم رفتار ہے پہیے گردش میں معروف ہیں. بھاپ بیقراریاں دکھا رہی ہے. کالا دھواں اونچے مینار سے اوپر کی طرف اڑا چلا جاتا ہے.

تنکے کے سلوک کی پہلی منزل، پہلا مقام، پہلا لطیفہ، صفائی ہے. مشین اور حجاب غبار کی لڑائی ہے. لوہے کے پنجے تنکوں کو لکڑی کے تختے پر سمیٹے ہوئے اوپر کھینچ رہے ہیں اور غریب گھانس عالم بیکسی میں کھنچی چلی جاتی ہے.

اس منزل کے امتحان سے پہلے تنکے کو دیکھا تو سراپا گرد تھا. معراج امتحان میں جا کر دیکھا تو صاف شفاف پایا. خاک کا ایک ذرہ بھی اس کے تن نازک پر موجود نہ تھا.

میں نے کہا لو اب بتاؤ سینہ کدورت سے صاف ہوا. تنکا بولا. واہ ابھی ایک ہی مقام طے ہوا ہے. تزکیۂ ظاہر کے بعد تزکیۂ باطن اور قلب ماہیت درکار ہے. دیکھتے دیکھتے ایک کھولتے ہوئے گرم چشمے میں تنکے ڈال دیئے گئے اور آسمان سے گر کر زمین پر پہنچے مجھے ان کا گرنا اور گلنا ناگوار ہوا جس طرح کہ میں ایک طالب خدا کو عروج دنیا سے گرتا دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا کرتا ہوں مگر تنکا ذرا نہ گھبرایا.

پھر دیکھا تو کرخت تنکوں میں ایک گداخت تھی. اُبلے ہوئے. گلے ہوئے پڑے تھے. اب تیسرا دور شروع ہوا. مشین نے ان کو پیسنا اور دلنا شروع کیا اور آن کی آن میں بھرتا بنا دیا. اللہ تیری شان. وہ تنکے کی نکیلی آن اور یہ بربادی و مساری کے سامان.

چوتھے مقام پر مرشد تیزاب نے ہاتھ پکڑا. جسم افسردہ کو سینے سے لگایا. کثیف رنگ کٹ گیا. سفیدی کا رنگ چڑھا. باطن ہر چیز کا سفید ہے سیاہی عارضی اور حجاب ناپید ہے

مقام پنجم میں یہ سفید بھرتہ اشک محبت سے پانی پانی ہوا اور آہن کے رخسارِ شفاف پر پھیل گیا۔

چھٹے مقام میں حرارتِ عشق نے اس پانی کو جمایا۔ ساتویں میں کاغذ بنایا اور دکھا لیا اب ساتوں منزل طے کر کے تنکے نے زبان کھولی۔ گھاس سے کاغذ بنا اور وید۔ قرآن توریت۔ انجیل۔ زبور پران کے حرفوں کو لے کر نوشتِ معرفت دکھانے لگا۔ اسوقت کچھ کچھ میری سمجھ میں بھی آنے لگا۔

کیوں میاں تنکے! خود مٹے جب عرفانِ حق کو سمجھانے اور دکھانے کے قابل ہوئے۔ ہمارا کیا بگڑا کباب کو سوختہ ہوئی لذت ہم نے اٹھائی۔

تنکے نے کہا۔ تم اپنی قلب ماہیت کر لیتے تو اسی دن میرے اندر کے اسرار پڑھ لیتے مگر تم خوددار اور آرام طلب رہے۔ اس لئے میں نے یہ بار سر پر اٹھایا اور خودی کا مٹانا تم کو سکھایا۔ ظاہر میں یہ مٹنا ہے لیکن حقیقت میں زندگی کی یہی بہار ہے۔ جنگل میں بکری کھا لیتی، گائے بھینس چر لیتی۔ گھسیارہ گھوڑے کو کھلا دیتا تو یہ سربلندی کہاں میسر آتی کہ میں استاد اور تم شاگرد ہو۔ میں عارف اور تم جاہل ہو۔

تنکے کی گفتگو ختم نہ ہوئی تھی کہ پرانے گدڑوں میں سے ایک پھٹی ہوئی بوسیدہ گدڑی نے پکارا۔ درد آشنا بنانے کو آواز دی۔ میں ناک پر رومال رکھ کر اس غلیظ ڈھیر کو دیکھنے لگا گدڑی نے کہا میں ناک ہی سے بات کرنی چاہتی ہوں اور تم نے اسی کو ڈھک لیا۔

صاحب میں ایک ناک والی حسینہ کا لباس ہوں، گو آج انقلاب دہر کے ہاتھوں اُداس ہوں۔

پوچھا کیوں، تم پر کیا بیتی۔ اس کوڑے میں آنکی کیا افتاد پڑی۔ گدڑی بولی میرے جسم میں چار رنگ کے کپڑے ہیں جن کو ایک بھکاری فقیر نے جوڑا تھا۔ ایک کولاری طائف کا پارچہ پشواز ہے، دوسرا مولانا نجم الحق کی عبا کا حصہ ہے تیسرا پنڈت ہر نام داس کی پوتھی کا

جُزدان ہے۔ چوتھا مسٹر ڈگلس کی قمیص کا ٹکڑا ہے۔

یہ چاروں اپنے اپنے وقت میں ذی رتبہ تھے۔ دُلاری طوائف کی پشواز عیش پرستوں کو عزیز تھی۔ مولانا نجم الحق کا جبّہ خدا پرستوں کی آنکھ کا تارا تھا۔ پنڈت ہر نام داس کی پوتھی کا جزدان تمام پنڈتوں کا دین وایمان تھا۔ مسٹر ڈگلس کی قمیص سینۂ حکمرانی کی ہم جلیس تھی۔

مگر امتدادِ ایام نے ان چاروں کو اپنے مالکوں کی نظر سے آتارا۔ کوڑی پر دتوں ڈلوایا۔ پھر بھکاری کے ہاتھوں میں پہنچایا۔ اس نے سب کو جوڑ کر ایک گدڑی بنائی اور لباس غربت کی عزت دلوائی۔ اب بیچارہ فقیر بھی خدا کے ہاں گیا۔ بارہ برس کے بعد دن پھرے ہیں۔ یہاں آئی ہوں۔ سلوک کے مقامات طے کر کے میں بھی کاغذ بنوں گی اور انسان کو بتاؤں گی کہ تیری معیبت قلب ماہیت سے دور ہو سکتی ہے۔

یہ باتیں سُن کر میں نے نظام المشائخ کے ایڈیٹر کو دیکھا جو خرید کاغذ کی دھن میں تھے چاندی دے کر گدڑیاں اور گھاس کے تنکے لینے چاہتے تھے۔ اس کا غذ پر وہ عقلمندی کی باتیں چھاپیں گے اور خلقت ان حروف کو دیکھ کر ایڈیٹر صاحب کی فضیلت پر واہ واہ کرے گی۔ مگر کون جانے گا کہ اگر نظام المشائخ کے سفید اوراق پر تحریر نہ ہوتی، سادے صفحے شائع کردیئے جاتے تو وہ اس باتونی عبارت سیاہ سے زیادہ بلیغ ہوتے۔ بشرطیکہ کسی کو تنکے اور گودڑ کے سلوک سے آگاہی بھی ہوتی۔

دریائی سُرنگ

ازخطیب ۱۴۔ مارچ ۱۹۱۵ء

لڑائی کی خبروں میں بحری سُرنگوں کا ذکر آیا کرتا ہے۔ یہ مخفی ہتھیار جہازوں کی نقل وحرکت کے لئے بہت خطرناک ہیں۔ کیونکہ جہاز ان سے ٹکرا کر ڈوب جاتے ہیں۔

Marfat.com

مگر اردو زبان میں اس کے لئے بحری سرنگ کا لفظ ایک اعتبار سے درست نہیں ہے اس لئے کہ سرنگ اس مخفی راستہ کو کہتے ہیں جو ایک قلعہ سے دوسرے قلعہ یا ایک مکان سے دوسرے مکان تک کسی جنگی یا پوشیدہ ضرورت کیلئے تیار کیا جائے۔ یہ راستہ زمین کے اندر ہوتا ہے۔ اور بحری سرنگ ایک قسم کا آلہ ہے جس میں مشتعل ہونے والے مسالے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان آلوں یا پیپوں کو سمندر میں ڈال دیا جاتا ہے اور یہ تیرتے رہتے ہیں جب ان سے جہاز ٹکراتا ہے تو یہ پھٹ جاتے ہیں اور جہاز کو تباہ کر دیتے ہیں۔

ان کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ جو بیان ہوئی۔ دوسری قسم پابند سرنگوں کی ہے جو تاروں سے بندھی ہوئی سمندر کی تہہ میں رکھی رہتی ہیں اور جس وقت ان پر جہاز آتا ہے تو ٹکرا کر تباہ ہو جاتا ہے۔

تیسری قسم یہ ہے کہ ان پابند سرنگوں کے تار محفوظ مقامات سے ملے ہوئے ہوتے ہیں جس وقت دشمن کا جہاز ان کے اوپر آتا ہے آدمی ان تاروں میں بجلی کی رو چھوڑ دیتے ہیں جس سے یہ سرنگ پھٹ جاتی ہے اور جہاز کے پرخچے اڑجاتے ہیں بس معلوم ہوا کہ یہ

دریائی شہابے

بحری سرنگ خواہ مخواہ سرنگ مشہور ہو گئے ہیں۔ میں نے ان کو بحری شہابے اسواسطے کہا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں عقیدہ ہے کہ جب شیاطین آسمان پر جانا چاہتے ہیں تو خدا کی جانب سے ان پر آتشی شہابوں کی مار پڑتی ہے۔ چنانچہ رات کے وقت جو ہم دیکھا کرتے ہیں کہ آسمان پر ایک تارہ ٹوٹا اور دوڑتا ہوا ایک سمت چلا گیا یہ تارہ نہیں ہوتا بلکہ وہی قدرتی شہابا

آگ کا کوڑا

ہوتا ہے جو شیطانوں کے مارا جاتا ہے۔ چونکہ آجکل زمین کے بعض آدمی اس عقیدہ کی ہنسی

Marfat.com

اڑا تے ہیں اور کہتے ہیں کہ شہابہ کوئی چیز نہیں۔ یہ روشنی جو نظر آیا کرتی ہے زمین کی گیس ہے جو اوپر فضا میں جا کر بعض اوقات روشن ہو جاتی ہے۔ لہذا ان منکروں کو سمجھانے کے لئے اللہ میاں نے خود انہی کے ہاتھ سے شہابے بنوائے اور پھر انہی کو شیطان بنا کر یہ شہابے ان پر مارے۔ جن سے یہ پاش پاش ہو گئے

حضرت خضر عالم خیال میں

آجکل یورپ کی عالمگیر جنگ درپیش ہے۔ دریائی شہابوں کا تذکرہ روزانہ اخباروں میں چھپتا ہے۔ اس واسطے ایکدن عالم خیال میں حضرت خضر علیہ السلام کا تصور بندھا کہ انہوں نے ایک کشتی میں سوراخ کر دیا تھا اور جب حضرت موسیٰؑ نے اس فعل عجیب پر اعتراض کیا تو انہوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ مشیت الٰہی کے ماتحت میں نے ایسا کیا۔ کیونکہ اس کا فرمان تھا کہ۔ آگے جا کر ایک ایسا بندرگاہ آئے گا جہاں ظالم بادشاہ کی حکومت ہے اور وہ نئی کشتیوں کو غصب کر لیتا ہے۔ اس واسطے میں نے اس کشتی کو عیب دار بنا دیا۔

اس روایت سے نتیجہ یہ نکلا کہ مرضی خداوند دنیا کے کام اسباب ظاہری سے انجام دیتی ہے۔ ورنہ وہ چاہتی تو کشتی کو ظالم کے پنجہ سے اور طرح بھی بچا لیتی۔ مثلاً یہ کہ غاصب اندھے ہو جاتے۔ اس کشتی کو نہ دیکھ سکتے یا ان پر کوئی اور بلا آجاتی جس کے سبب وہ ظلم نہ کر سکتے لیکن پروردگار نے اس کا انتظام بھی ظاہری حیلے اور سبب سے کیا۔

پس یہ خونریزی اور تباہی بھی، جو آجکل درپیش ہے کسی سبب اور باعث سے ہے مگر اس کا راز کون بتائے۔ حضرت خضر نے حضرت موسیٰ کو بھی بہت مشکل سے یہ بھید بتایا تھا۔

خود سرنگ بولی

مجھکو مستغرق بحر تخیل دیکھ کر تاروں سے بندھی ہوئی سرنگ بولی۔ مجھ سے سن۔ مجھ کو دیکھ

Marfat.com

مجھ تک آجن کو نقشوں اور جغرافیوں کی شناخت نہ تھی۔ وہ بھی آجکل ان لکیروں تک جاتے ہیں اور ان سے آنکھیں لڑاتے ہیں جو لڑائی کے نام سے کانپتے تھے ان کو بھی ہوائی جہازوں میں سوار ہونے کی پھریریاں آتی ہیں۔ امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ میں نے کہا دیکھو تمہارے پاس ہوں مجھے بتاؤ کہ تم کیا ہو۔ تم کیوں ہو۔

پابند سرنگ نے جواب دیا کہ آدمی! جو تو ہے وہ میں ہوں۔ جو میں ہوں وہ تو ہے تو بھی فطرتِ الٰہی کے تاروں سے جکڑا ہوا ہے۔ میں بھی انہی کی اسیر ہوں تو بھی ایک اشارہ ہو سے پاش پاش ہو جاتا ہے۔ میں بھی ایک گردشِ انگشت سے نابود ہو جاتی ہوں۔ میرا اور تیرا ایک ہی حال ہے اور جو اس کو نہ جانے یہ اس کی شامت اعمال ہے۔

میری دوسری بہن کو دیکھ جو آزاد ہے۔ تیرتی پھرتی ہے مگر وہ بھی کشتیِ مرگ میں سوار ہے۔ کوئی جہاز اوپر آجائے تو اس کے وجود کا بھی بیڑا پار ہے۔

تیسری بہن کے تاروں کو کھلی نہیں ملی مگر اندر کی آگ کیا کم ہے ٹکر کی دیر ہے ایسی بھڑکے گی کہ وہ اور جہاز دونوں گم ہو جائیں گے۔ اب جرمنی و یورپ کی بحث فضول ہے۔

ہر ہستی موجود مثل تارپیڈو بحری سرنگ ہے۔ اگر انسان اپنے وجود کی اندرونی طاقتوں کو دیکھے اور ان سے کام لے تو باہر کی ان تمام اشیاء کو نظر حقارت سے دیکھنے لگے کیونکہ جو شان ابنِ آدم کی ہے وہ اور کسی کی نہیں۔

دو تخموں کی سید

از خطیب ۳۰۔ جون ۱۹۱۵ء

ایک رنگون کو جو برما کا گاؤں ہے، جہاں سمندری تالاب پر تجارت کی بکریاں چرنے جاتی ہیں اور جس میں آجکل سرکاری سنسر محتسب، محبت کے خطوط کو بھی دل میں ہاتھ ڈالکر

Marfat.com

ٹٹولتے ہیں۔ گویا اپنے بدگمان جلے دل کے پھپولے توڑتے ہیں۔

اس میں رسید ہے ایک تحفہ کی۔ محمود، یوسف، بھائی، میاں چارپی کے پھول کی خدمت میں۔ رسید پرٹکٹ ایک آنہ والا نہیں ہے اور اس کا مجھے ڈر نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تحفہ جان کا ہے مال کا نہیں جسپر اسٹامپ کی ضرورت ہو۔

اقرار کرتا ہوں کہ تحفہ اس حالت میں کہ وہ بالکل کورا اور کھلا تھا مجھکو ملا اور اقرار کرتا ہوں کہ وہ اپنی ذات وصفات میں یکتا تھا، اور اقرار کرتا ہوں کہ کثرت کی ہر شان میں سراپا وحدت تھا یعنی اس کا ہر جزو اپنے دوسرے اجزا، کا ہمشکل تھا۔ میں نے اس تحفہ کے چٹکیاں لیں اور بےچین ہو کر زمین پر لوٹ گیا لہذا یہ چند جملے بطور رسید الفت کے لکھ دیئے تاکہ ماسوا سے فراموشی ہو۔

دوسرا مانسہ پٹیالہ کو جہاں برنالہ بھی ہے اور سکھوں آریوں کے مقدمے بھی ہوا کرتے ہیں اور جہاں سنور یعنی بلی نام کا ایک ملک یا جزیرہ نما ہے جس میں خان سراج اور دین بھی رہتے ہیں۔

ان سب حواشی کے ضمن میں مانسہ نامی دیار ہے اس میں میرا ایک سکھ یار ہے اس کے تحفے کی رسید کا اس وقت بار ہے۔ ست سری اکال کہہ کر میں اس رسید کو شروع کرتا ہوں اور واہ گرو جی کا خالصہ اور سری واہ گرو جی کی فتح کہہ کر ختم کرتا ہوں۔

تحفہ کی پشت پر ایک مہر ہے۔ اس میں رومی بہادر کاغذی تحریر کو پامال کر رہے ہیں۔ جو اشارہ ہے اس بات کا کہ تحفہ دینے والا بھی کبھی تعلقات کو پامال کرے گا۔

تحفے کے ہونٹ سنہری ہیں۔ ان کو دیکھ کر میرا اصلی کا ہاتھ اور مٹی کی آنکھ شرماتی ہے میں مٹی کا پتلا۔ مٹی کے برتن میں پانی پیوں، مٹی کے ظرف میں کھانا کھاؤں اور تحفہ طلائی پاؤں تو کیونکر نہ شرماؤں۔

تحفہ بھیجنے والے کاغذی کھیل میں باطنی تفریح کو تلاش کر۔ زندگی اس قماش کی ہوگی

Marfat.com

تو زندگی کے کھیل کی لاش بے خراش ہو گی۔

دیدم بشنیدم۔ نوشتم تو بہبیں۔ بشنو و خاموش شو کہ سکوت ذریعۂ نجات ہے۔ دن عید اور رات شب برات ہے۔ ہر دل میں منازل سلوک کی کشید ہے اس واسطے ہر معنی یہ تحفہ کی رسید ہے۔

شملہ کی دیبی ماتا

از خطیب۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء

اس رات کی تاریکی میں سب سوتے ہیں۔ میں پہاڑوں کو کیا کہوں وہ بھی بے خبر پڑے سن سناتے ہیں جن کی آنکھ کھلی ہے۔ ان کو بت خانوں کی دھن لگی ہے۔ ایک شراب کے گلاس کے آگے سر جھکاتا ہے، دوسرا اپنے ہمشکل انسان پر مٹا جاتا ہے۔ کہیں مُردوں کی بندگی میں کمر بندھی ہے۔ درگاہ کی قبروں پر ٹکٹکی لگی ہے یا پیر یا پیر کی صدائیں ہیں۔ کہیں حور و غلماں کا خیال ہے۔ انہی کی تمنا میں سجدۂ بے نماز ہے۔ کوئی پل صراط کے غم میں گرا جاتا ہے۔ دوزخ کی آگ کا خوف اپنے سامنے اپنی پوجا کراتا ہے۔ بیمار کو دیکھو نیند نہیں آئی۔ کروٹیں بدلتا ہے اور حکیم کے نسخہ کو یا معبود کہہ کر سینہ سے لگاتا ہے یہ دوسرا بھی بیدار ہے۔ کل کچہری کا مقدمہ سر پر سوار ہے۔ توکل کا دامن ہاتھ میں ہے یا پلیڈر یا بیرسٹر کی خیالی تسبیح پڑھ رہا ہے۔ اُفوہ۔ یہ سب اناڑی کتنی بھول میں ہیں آگے بڑھوں یا ٹھہر جاؤں۔ نہیں ذرا اور آگے دیکھوں شاید کوئی حق پرست نظر آجائے جس کی صحبت میں یہ کالی رات کٹ جائے۔

یہ جنگی سپہ سالار ہیں۔ فوجوں کو لڑاتے ہیں۔ ملک جیتنے گھر سے نکلے ہیں۔ کیسے ہوشیار و خوددار ہیں۔ ان کے دل میں کس کی یاد ہے۔ یہ کس کی عبادت کرتے ہیں، گولہ کی

توپ و بندوق کی خندق و مورچہ کی۔ رسد کے انبار خانوں کی۔ زہریلی گیس اور ہوائی جہاز کی۔ یہاں بھی اپنا نہ ملا۔ شملہ کی کونسلوں میں آؤ۔ ریزولیوشن کی دنیا کو دیکھو۔ بڑے بڑے آنریبل اپنی قوتِ استدلال اور ملکہ تقریر پر گھمنڈ کر رہے ہیں۔ ہر ایک اپنی خودی کا پرستار ہے۔ یہاں ٹھہرنا بیکار ہے۔

اے دنیا! تیرے اندر اتنے بت خانے ہیں اور سب جاگنے والے۔ انہی بتوں کو پوجتے ہیں تو مجھکو بھی اجازت دے کہ اپنے حجرے کے سامنے اس اونچی چوٹی کے پہاڑ پر دیبی ماتا کے مندر پر جاؤں اور بابل کی اس لاڈلی کے آگے سر جھکاؤں۔

ماتا۔ ماتا۔ مورتی ہے۔ اٹھ اور بتا! تجھکو کیونکر پوجوں؟ ایلو دیبی ماتا آنکھوں میں آنسو بھرے اپنے پجاریوں کو روندتی ہوئی مجھ تک آئی۔ ماتا۔ میں تجھ پر قربان تو کیوں تکلیف کرتی ہے۔ ماتا نے کہا۔

مورکھ نادان! قبر کا بت۔ ہڈی کا بت۔ تحریر کا بت۔ تقریر کا بت۔ حکومت کا بت زندہ بت۔ مردہ بت۔ ہنستا بت۔ روتا بت۔ میں بت۔ تو بت۔ سب ترک کرنے اور چھوڑنے کی چیزیں ہیں۔ ان بادلوں کو دیکھ۔ عرب کی توحید میں سرشار اُمڈے چلے آتے ہیں جنت دوزخ۔ خوشی و غم۔ رندی و تقویٰ کے خرقے پھاڑ ڈال۔ رام نام جپ۔ خدا نام کی سمرن پھیر۔ صفاتی جھگڑوں کو لات مار۔ ذات میں رم۔ ذات میں سما جا۔

اپنے کو دیکھ۔ مجھ کو دھیان میں لا۔ میرا باپ۔ میرا سرچشمہ وہ ذات احدیت ہے میں اسی نور کی شعاع ہوں جس کی جوت اس اندھیرے کے ذرہ ذرہ میں سمائی ہے یہ دیوانے آدمی میری مورتی کو پوجتے ہیں اور میرے بابل کو ناراض کرتے ہیں۔

تو بھی اپنے ماحول کا بت ہے۔ ڈر کہ تیرا دانا تجھ سے روٹھ جائے گا۔ جب کوئی تیرے آگے سر جھکائیگا کہدے کہ بھروسہ اور ٹھکانا اسپر رکھو جس کے ہم سب جلوے ہیں۔ برساتی کیڑوں کی طرح جہان نہ گنواؤ جو چراغ کی لو کو نور کا دروازہ سمجھ کر اندر داخل ہونے آتا ہے

Marfat.com

اور اپنی لبوں میں جلا کا جلارہ جاتا ہے۔

ارے بادل کے غبار، ارے اشکبار طوفانی۔ لا اپنے دل کا پانی۔ جو مدینہ کے چشمۂ حیات سے لایا ہے، اور دھو ہمارے دل تاکہ دیکھیں توحید کا اصلی روپ اور پائیں بیقراریوں میں قرار۔ ماتا چلی گئی۔ ایک نشتر لگا کر غائب ہوگئی۔ میں اس بیابان پہاڑ میں کس کو لاؤں جو اس تازہ زخم پر علی عقل کا پھایہ رکھے۔

کمبل اوڑھ لوں۔ گرم آتشدان کے پاس جاؤں۔ پان چباؤں۔ اندھیرے غار میں پڑ رہوں گر یا اس زخم کو نوچ ڈالوں۔ یہ حس کیوں آئی، یہ درد اک کدھر سے آیا۔ اس کا نام عرفان سہی مگر بہت ستانے والا اور رُلانے والا ہے۔

بت خانوں کی بندشوں میں اسیر ہوں اور کان یہ سناتے ہیں کہ آزادی کی توحید پرستار ہو۔ رنگونی پر[1] ہو تو آ تجھکو یہ آفت سونپ دوں اور میں آنکھ بند کر کے سو جاؤں۔

اپنا ماتم

از خطیب ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء

ازل کی صبح کو ابد نے رحلت کی۔ زیست نے آنکھ نہ کھولی تھی کہ مرگ زندہ ہوگئی افسوس میں مرگیا۔ زندگی کے دریا میں ڈوبنے سے یہ واقعہ پیش آیا۔ موت کے فدے آبحیات میں حسن صورت لیکر آئے اور میری روح قبض کرنے لگے۔ میں ان کے فانی ہونیکا خیال کر کے کُڑھتا تھا، انہوں نے خود مجھے فنا کر دیا۔

اب میں سمجھا کہ میری پیدائش کا مدعا عشق کی اسیری تھی عشق نامدار ہے اپنے طلبگاروں کو گمنام کرتا ہے اسواسطے میرے ماتم کا کہیں چرچا نہیں اور میں خود اپنا ماتم کرتا ہوں۔ میں جاتا ہوں اور حسن مجاز کی شورشوں کو ورثہ میں چھوڑتا ہوں تاکہ کائنات میں حشر تک

[1] پریمی احمد آبادی سے مراد ہے ۔

Marfat.com

قیامت برپا ہوتی رہے۔

اس عشق کی آگ نے میری آنکھوں کی گنگا جمنا خشک کردی۔ میں دم توڑتا ہوں تو گنگا جمنا کی وادیاں اپنی ہستی کے بچاؤ میں الجھ جاتی ہیں مجھپر آنسو بہانیکی ان کو فرصت کہاں میری موت نے ان سب صحراؤں اور لق و دق بیابانوں اور کوہستانوں کو سنسان کردیا۔ جن کی آبادی میرے دم سے تھی وہ بیدم، بیہوش اور بے نمود ہوگئے۔ ورنہ ضرور میرے غم میں گریبان چاک کرتے۔ ہمالہ جس کو میرے عروجِ حیات نے آسمان تک پہنچایا تھا اور اپنی چوٹی کی سفیدی میں آلام کی سیاہی کو چھپایا تھا، میرے سرنگوں ہوتے ہی اپنے وجود کی فکر میں پڑگیا۔ برف گھبرا کر پگھلنے لگی، بلندیاں تیورا کر گرنے لگیں۔ پس میرا رنج وہ بھی بھول گیا۔

تو آ، عبدالرحمٰن[1] اپنا ماتم میں خود کروں کہ میں کیوں مرا اور کیوں دنیا کے قبرستان میں آیا۔ کاش میں ذاتِ وحدت کی گود میں ہمیشہ زندہ رہتا اور کُن کے مرض سے میرا سامنا نہ ہوتا۔ اب ہوگیا تو صبر میرا ماتم ہے۔

روح کا خول

از اسوۂ حسنہ۔ نومبر ۱۹۱۵ء

تربوز کا چھلکا سبز۔ گودا سرخ۔ مزہ جو اس کی روح ہے، میٹھا مگر مٹھاس کی شکل دیکھی نہیں، چکھنے سے جانی۔

آم کا چھلکا سبز، رس زرد، مزا شیریں وہی اسکی جان ہے جسپر آدمیوں کی جان قربان ہے چاہتے سب جان اور روح کو ہیں مگر ہاتھ میں فقط اس کا خول آتا ہے۔ کمہاری ایک چھوٹا سا پردار کیڑا ہے۔ بھڑ سے ذرا دبلا پتلا۔ گھروں میں گیلی مٹی سے اپنا گھونسلا بناتا ہے

[1] عبدالرحمن پشاوری مراد ہیں۔

Marfat.com

اور اس میں جھینگر مار کر اس کی لاش چھپا دیتا ہے اور دروازہ میں خود بیٹھ کر روح کے خول کو توجہ دیتا ہے۔ چند روز میں اس کے مراقبہ کی طاقت جھینگر کو زندہ کر دیتی ہے اور صحبت ہم نشیں کا اثر بے رونق جھینگر کو خوبصورت کمہاری کی شکل بنا دیتا ہے اور جھینگر کمہاری بن کر اڑ جاتا ہے۔

توجہ اور مراقبے کی یہ برکت دیکھ کر اور جسم کی ماہیت میں انقلاب مشاہدہ کرنے کے میں نے ایک دن، جو ستمبر ۱۵ء کا آخری حصہ تھا، شملہ کے پہاڑ پر اپنے خول کا مراقبہ شروع کیا اور اپنی لاش پر نظریں جمائیں۔

کمہاری نے جس دن جھینگر کا شکار کیا اور اس کے ڈنک مارے تو اس کی تڑپ اور پھڑک سے ایک لالہ صاحب کا جی بہت دکھا تھا اور انہوں نے کمہاری کو ہتیاری جانور کا خطاب دیا تھا اور میں نے، جو اس وقت تک خواجہ حسن نظامی تھا، مظلوم جھینگر کو بچانے کی بہت کوشش کی تھی۔

یہ واقعہ آج پیش آیا میرے خول کو میرے مرنے کا بڑا صدمہ ہوا اور اس کے صدمے سے میں نے بھی ہمدردی ظاہر کی مگر جو نعمت مجھکو اس فرقت وزحمت میں نظر آئی تھی اس سے اور سامان درست تھے اور اطمینان سامنے تھا اس لئے میں نے اپنے خول سے رسماً غمخواری کا اظہار کیا اور اس کی وہ کہانی سن لی جو اس نے دم توڑتے وقت جی بہلانیکو مجھسے کہی۔

نشہ کی کہانی

پہلے میرے خول نے ایک ایسی کہانی کہی جس کو میں سکرات کے نشہ کی نشانی سمجھا اور میں پہاڑ کے ایک پیارے پھول کی پنکھڑی پر لیٹ گیا اور اس کی ہلکی ہلکی باتوں کو متانت اور مسکراہٹ سے سننے لگا۔

خول نے کہا: برا ہو اس عبادت کا جس نے چڑیا کی جان لی۔ خواجہ پیاسے آج سے

Marfat.com

دس ہزار برس پہلے اس پہاڑ پر ایک جھونپڑی تھی جس میں ایک عبادت گزار جوگی رہتا تھا ایک دن اس نے اپنے خیال کو خالق کے خیال سے لگایا اور چاہا کہ اس کا نور دیکھے کہ ایک چڑیا چرا چڑاتی، پروں کو پھلاتی، پھدکتی، چیں چیں کرتی اس کی جھونپڑی میں آگئی۔ چڑا اس کے ساتھ تھا اس نے اپنی لیڈی سے محبت کی گفتگو شروع کی۔ وہ کہا پیاری دانہ چگ چکیں۔ آؤ اس فقیر کی تونبی پر چل کر بیٹھیں جس میں یہ پانی پیتا ہے اور باتیں کریں چڑیا اچھلی اور مستانہ ادا سے دو تین جھٹنے ہوا میں کھائے اور تونبی پر جا بیٹھی

چڑے نے کہا۔ یہ آدمی کیا چاہتا ہے؟ چڑیا بولی اپنے خول کی خواہشوں سے درگزر اور نورحق تک رسائی۔ چڑا اچھلا کر بولا۔ دیوانہ ہے۔ خول ملا ہے تو اس کی خواہشوں کو بھی پورا کرنا پڑیگا۔ نورحق خواہشوں سے جدا تھوڑی ہے

جوگی کو سوائے چیں چیں کے غل کے اور کچھ سنائی نہ دیا اور اس نے اپنا ڈنڈا اٹھا کر ان دونوں پر کھینچ مارا جو چڑے کے سر میں لگا اور وہ بیچارہ تڑپ کر زمین پر گر پڑا اور مر گیا۔ چڑیا یہ دیکھ کر پھر سے اُڑگئی اور باہر درخت کی ٹہنی پر جا بیٹھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتی تھی اور اپنے خول کے بچ جانے پر شکر کرتی تھی۔ مگر تھوڑی سی دیر کے بعد اس کے دل کو شوہر کی محبت نے بیقرار کیا۔ وہ الفت کے غم میں اندھی ہوگئی۔ اس کی روح اپنے خول میں سر پیٹنے اور پھڑپھڑانے لگی جس کے صدمہ سے اس کا خول بھی حرکت میں آگیا اور روح کے اندھے اشارہ سے مجبور ہو کر چڑیا پھر جھونپڑی میں چلی گئی۔ وہاں اس کے غریب چاہنے والے چڑے کی لاش خاک پر پڑی تھی اور فقیر اپنے خول کو توجہ دے رہا تھا۔ چڑیا نے آہ و نالے شروع کئے۔ کبھی وہ تونبی پر آتی، کبھی جھونپڑی کے بانس پر جاتی۔ اس کی زبان تالو سے نہ لگتی تھی۔ وہ چیختی تھی اور بلبلاتی تھی۔

جوگی کے خیال میں پھر رخنہ پڑا۔ اس نے ایک اور جست کی اور چڑیا کو بھی ڈنڈے سے مار ڈالا۔

Marfat.com

عاشق ومعشوق کی لاشیں اٹھا کر جھونپڑی کے باہر پھینکدیں اور ایک لمبا سانس لیکر جس سے تضیع اوقات کا صدمہ ظاہر ہو رہا تھا، پھر مراقبہ میں بیٹھ گیا۔

باہر چڑے چڑیا کے جنازے رکھے تھے اندر جوگی اطمینان سے گردن جھکائے بیٹھا تھا کہ نورحق ہاتھ میں شعلہ کی تلوار لئے نمودار ہوا۔ جوگی اس کو دیکھ کر سجدہ میں گر پڑا اور اس کی روح اپنے مرکز پر قربان ہونے کو خول میں پھڑ پھڑانے لگی مگر نورحق نے جوگی کے خول پر شعلہ کا ایک ہاتھ مارا اور کہا۔ میری چڑیوں کا خون کیوں کیا جو فطرت کا سبق سنانے تجھ تک آئی تھیں۔ ان میں زندگی تھی۔ وہ نسل بڑھانے کے ذمہ دار تھے۔ تیرے ترک وجود سے ان کا رتبہ بڑا تھا۔

جوگی کے خول نے عاجزی سے معافی مانگی مگر اندر کی روح نے اپنے باپ نورِحق کو ترشی سے جواب دیا اور کہا۔ مجھ کو یہاں قید کر کے آپ آزاد رہنا چاہتا ہے۔ تو بھی تو اس قفس کا مزا چکھ۔ دنیا میں تھوڑے پنجرے ہیں جن کے اندر کی ارواح تیری فطرت کا حکم مانتی ہیں۔ ایک میں اگر تعمیل نہ کروں تو کیا نقصان ہوگا!

نورحق نے یہ سُن کر اندر کا سانس لیا اور جوگی کی روح ایک سناٹے کے ساتھ ہاتھ پھیلائے کھنچکر اُڑی اور نورحق میں سماگئی۔

جوگی کا خول پڑا رہ گیا اور چڑیوں کے خول سے زیادہ اس نے اس جنگل کو بدبودار کیا۔

جب میرا خول یہ تمثیلی کہانی کہہ چکا تو میں نے کہا، کہہ چکا یا کچھ باقی ہے۔ گھبرا مت میں تجھکو سڑنے سے بچاؤں گا اور اس جنگل کو تیری بدبو سے آلودہ نہ ہونے دونگا۔ اس وقت وہ خول بولا۔ اب میں ہوشیاری کی ایک کہانی کہنی چاہتا ہوں اس کو سُن لے پھر جو تیرا جی چاہے کر۔

میں نے پھول کی پنکھڑیوں کو اپنے اوپر لپیٹ کر آنکھیں خول کی طرف پھیر لیں اور اس سے کہا۔ پہلے یہ تو بتا کہ اس دنیا نے تیری کیا قدر کی جو تو دنیا میں رہنے پر اتنا اصرار کرتا ہے

Marfat.com

اور اس کی امیدوں کی اسیری پر فدا ہو جاتا ہے۔ ناحق مثالیں دیکر مجھکو گرفتار کرنیکی کوشش کرتا ہے۔ میں جب تک تجھ میں تھا ایک اچھا لکھنے والا اور اردو زبان میں ایک نئی روش ایجاد کرنے والا سمجھا جاتا تھا۔ جو قلم سے ظاہر ہوتی تھی۔ یا کبھی کوئی سامنے آکر اس کو ادا کرتا تھا۔ تو جانتا ہے کہ اس وقت مجھپر کیا حالت گزرتی تھی۔ میں الفاظ پرست خولوں کی یہ تعریف سُن کر بگڑتا تھا کہ یہ ایسے اندھے کیوں ہیں جو میری اس شان کو بیان نہیں کرتے جس پر مجھکو نورحق نے اقتدار دیا ہے۔ نورحق سے میں جو کہتا ہوں وہ سن لیتا ہے اور اُس کو پورا کر دیتا ہے۔ میں نے جس کی سفارش کی، نورحق نے کبھی اس کو نہ ٹالا ہی نہیں نورحق نے اپنے طلسمی رنگارنگ جلووں کو میرے پاس تنہا چھوڑ دیا اور میں نے ان میں خوابگاہ بنائی۔ خول کے لئے نہیں رُوح کے لئے۔

اے خول! آدمیوں کے جیل خانہ میں جی نہ لگا۔ یہ آدمی رشک کرنے لگتے ہیں جب کسی کے پاس کچھ دیکھتے ہیں، اور انسان کو اپنے خول سے محبت ہو تو دوسروں کا رشک وحسد اس کو تکلیف دیتا ہے۔ کیا تو نے پایا کہ دنیا میں کتنے تیرے حاسد ہیں اور ان کی مکاری کینہ مندی سے تجھکو کیسے کیسے صدمے اٹھانے پڑے۔ اگر تو اپنی خواہشاتِ خاکی کو فراموش کر دے اور میرے مراقبہ وتوجہ کے آگے سر جھکا دے تو تیری یہ ساری تکلیفیں دور ہو جائینگی اور تو دنیا کے سب خولوں کا سرتاج بنجائیگا۔ مگر تجھ میں سرتاج بننے کی خوشی نہ ہوگی کیونکہ سرتاجی دکھ وسکھ کے جذبات کی فنائیت کے بعد حاصل ہوتی ہے جب یہ جذبات ہی نہ ہوں گے تو تجھکو اس کی خوشی نہیں ہوسکتی۔ البتہ تجھکو نورحق سے وہ انعام ملیں گے جن کے سامنے دنیا کی سب خوشیاں ہیچ اور بے نتیجہ ہیں۔

میرے خول نے یہ سن کر کہا اچھا تیری کہانی سن۔ اس کے بعد فیصلہ ہوگا۔

جڑی بوٹی کا شہید

چاند مل کے مزمل سن۔ بکھرا ہو۔ قدرت کی حقیر ادنا دھوایک دن میں پیدا ہوتی، بڑھتی

Marfat.com

پھولتی پھلتی اور مرجھا کر فنا ہوجاتی ہے جس کا نام گھاس ہے. بناس پتی ہے جنگل کی جڑی بوٹی ہے اور جو تیری لنگار مسہریوں کے دامن خاک سے سر نکالے چپ چاپ کھڑی ہے. بڑی قاتل ہے، سفاک ہے، بڑی دولت والی ہے. امیری کی کنجی ہے بڑی طبیب ہے. امراض کی موت ہے. بڑی زندگی ہے. حیات کی روح رواں ہے۔

ایک پہاڑ کے نیچے میدانی زمین میں ایک راجہ رہتا تھا جس کا ایک ہی بیٹا تھا اس کا نام اندرجوت تھا. اس کی عمر سولہ برس کی تھی کہ باپ مرگیا اور گدی اس کے ہاتھ آئی اندرجوت کی رانی کنولا چودہ برس کی اور اندرجوت سے شکل وصورت میں ذرا گھٹیا تھی اندرجوت اپنے زمانہ کا کنہیا تھا. اس کے حسن کی دھاک دور دور تھی. اس کو اپنی خوبصورتی پر بڑا گھمنڈ تھا. سب سے بڑی سندرتا (خوبصورتی) اس کی آنکھوں میں تھی. اندرجوت ان کو دیکھ نہ سکتا تھا مگر جس کو دیکھتا تھا، جس چیز پر نظر ڈالتا تھا، اس میں اپنی آنکھوں کی طاقت کو مشاہدہ کرتا تھا. کیونکہ آدمی ہو یا جانور، پتھر ہو یا درخت اس کی آنکھوں کے پرتو سے شرما جاتے تھے یا اندرجوت کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سامنے والی چیز اس کی آنکھوں کے رعب حسن سے جھک گئی ہے اور بے قابو ہے۔

کنولا اپنے پتی (شوہر) سے بہت کم عمر تھی مگر اس کے دل میں بھی خدا نے ایسی کشش دی تھی کہ اندرجوت اس کا والہ و شیدا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ اندرجوت کنولا کو لیکر دیبی کے درشن کو گیا جو پہاڑ کے دامن میں براجمان تھی. راستہ میں اس کو ایک بودا جنگلی جھاڑی پر نظر آیا جس کے سرمئی پیارے رنگ کے سامنے اس کی بدصورت پودنی بہت بُری معلوم ہوتی تھی. اندرجوت نے کنولا سے کہا کہ پودا اس بدشکل جوڑے سے کیونکر خوش رہ سکتا ہوگا. کنولا بولی جس طرح تم میرے ساتھ. یہ سن کر اندرجوت ایک خیال میں پڑگیا اور اس کو اپنے حسن کے غرور نے تھوڑی دیر ہیچ و بنائے رکھا۔

اندرجوت دیبی کے درشن کر کے واپس آرہا تھا کہ ایک مور دکھائی دیا جو اپنے بے مثال حسن کا لباس پہنے اپنی کالی کلوٹی بے قرینہ مورنی کو اپنا ناچ دکھا رہا تھا۔ اندرجوت کو پھر پودنے کا خیال آیا اور اس نے کنولا سے کہا۔ یہ بڑا بیوقوف ہے۔ ایسی بدشکل بیوی پر عاشق ہوا ہے۔ پودنا، مور اور شاید میں تینوں عقل سے دور ہیں۔ میں تجھسے چار جیسی بات نہ کروں گا جب تک اس کا بھید مجھکو معلوم نہ ہو جائے۔

کنولا بڑی عقل مند لڑکی تھی۔ اس نے اندرجوت کے اس بچپن سے برا نہ مانا اور کہا کچھ ہرج نہیں۔ تم اس کو سوچو اور تحقیق کرو اور چار مہینے مجھ سے الگ رہ سکتے ہو تو رہو، میں تم کو اجازت دیتی ہوں۔

اندرجوت یہ سن کر بگڑا اور کہا تم کو اجازت دینے نہ دینے کا کچھ اختیار نہیں۔ میں نے اپنی خود مختاری سے یہ ارادہ کیا ہے اور اپنے ہی اختیار سے اس پر عمل کروں گا۔ تم میری تابعدار لونڈی ہو مگر بہت بدصورت ہو۔ تم میرا جوڑ نہیں ہو سکتیں۔ تم میری آنکھوں کی جوت تک کو نہیں سہار سکتیں اور میرے نگاہ بھر کر دیکھتے ہی نظریں جھکا لیتی ہو۔

کنولا بولی جو کچھ تم نے کہا سچ ہے۔ میں تکرار نہیں کرتی۔ تم چار دن سے زیادہ اپنے ارادہ کی خود مختاری پر قائم رہ جاؤ تو غنیمت ہے۔ مجھکو خدا نے حسن نہیں دیا تو دوسری نعمت دی ہے جو تم کو میسر نہیں۔

اندرجوت:۔ وہ کیا نعمت ہے؟

کنولا:۔ تمہیں سوال کرنے کا کچھ اختیار نہیں۔

اندرجوت:۔ میں پوچھتا بھی نہیں۔

اتنے میں گھر آگیا اور یہ دونوں علیحدہ علیحدہ حویلیوں میں اتر کر چلے گئے۔

کنولا نے حویلی میں جاتے ہی ماما کو اپنے گرو کے پاس بھیجا جس نے سارا قصہ ان سے کہا۔ گرو صاحب بڑے عالم اور دنیا کے حال سے خبردار تھے۔ انہوں نے ماما کو

Marfat.com

دھکا کر نکال دیا اور کہا۔ میں کیا کروں میاں بیوی کے قصہ میں دخل دینے کا مجھے کچھ حق نہیں ہے۔ جا کنولا سے کہدیجیو کہ آیندہ مجھ سے اپنے گھر کے جھگڑے بیان نہ کرنا۔

ماما آبھی ہوئی کنولا کے پاس آئی اور گروجی جنگل گئے اور وہاں انہوں نے سات کنکروں پر کچھ دم کیا اور نالے میں ڈال دیئے۔ اُدھر کنولا کو گروجی کے برتاؤ سے اتنا رنج ہوا کہ اس نے ہیرے کی کنی کھانے کو منگائی مگر فوراً اس کے دل نے کہا کہ جو تعلیم گروجی نے مجھکو دی ہے اس میں صبر کا بڑا درجہ ہے "سنتوش پرم لابھ" (صبر میں بڑا نفع ہے) رام چندرجی کا قول ہے۔ پس مجھکو بھی اپنے کلیجہ پر پتھر رکھنا چاہیئے۔ دیکھئے غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟

کنولا اسی خیال میں تھی کہ اندرجوت آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے اس کے پاس آیا اور اس کے پیروں میں گر پڑا۔ کنولا نے کہا خیر ہے تم میرے پتی اور مالک ہو اور میں تمہاری ادنے لونڈی۔ یہ کیا کرتے ہو؟

اندرجوت بولا۔ میں نے غلطی کی جو تم سے ایسی سخت باتیں کیں۔ خدا نے میرے دل کو روشنی دی اور میں نے تمہاری شان پہچان لی۔ اب میں کبھی اس کی قدرت میں دخل نہ دوں گا۔

کنولا حیران تھی کہ یہ کیا انقلاب ہوا۔ اتنے میں دیکھا کہ گروجی ہاتھ میں ایک بوٹی لئے چلے آتے ہیں۔ انہوں نے وہ بوٹی اندرجوت کو دی اور کہا لے اسکو اپنی آنکھ پر رکھ اندرجوت نے اس پتہ کو اپنی آنکھ سے لگایا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ کنولا نور کا ایک پتلا ہے اور اسقدر حسین ہے کہ اندرجوت نے اس سے پہلے کبھی ایسی خوبصورت عورت نہ دیکھی تھی۔ اس کے بعد گروجی نے کہا۔ نادان نظر کے دھوکے میں نہ پڑ۔ اس دنیا میں جو بدصورت ہیں، ان کو قدرت کی آنکھ سے دیکھے گا تو اچھی شکل میں پائیگا۔ مورنی اور پودنی خاکی آنکھوں میں بدنما ہیں مگر مور اور پودنے کی حقیقت شناس نگاہوں میں بیحد خوشنما۔

Marfat.com

اندرجوت کو حیرت تھی کہ گروجی کو ہمارے مخفی قصہ کی کیونکر خبر ہوگئی اور ان کی کرامت کا قائل ہوگیا۔

اب اندرجوت گروجی کے پاس روزانہ جانے لگا۔ اس کو جڑی بوٹی کے علم کا عشق ہوگیا تھا۔ گروجی نے بھی اس کے شوق کے موافق بوٹیوں کے صدہا خواص سکھائے۔

کایاپلٹ بوٹی

ایک دن گروجی نے اندرجوت کو کایا پلٹ بوٹی بتائی اور کہا اس کو اگر ناف پر باندھ لیا جائے تو انسان اپنی روح کو جسم سے نکال کر آزاد کرسکتا ہے اور روح کو جہاں چاہے سیر کرنے کے لئے بھیج سکتا ہے اور پھر جب جی چاہے واپس بلا سکتا ہے۔

اندرجوت نے کہا پھر دوبارہ اپنے جسم میں بھی ڈالنا ممکن ہے یا نہیں، گروجی بولے کیوں نہیں۔ یہ نہ ہو تو کمال ہی کیا ہوا۔ مگر شرط یہ ہے کہ روح کو کسی ایسی جگہ نہ بھیجے جہاں سے وہ اُلٹی نہ آسکے۔

اندرجوت: وہ کونسا مقام ہے جہاں سے روح واپس نہیں آتی؟

گروجی: خدا کی جھولی جس میں ارواح رہتی ہیں۔ روح کا پسندیدہ مقام ہے۔

اندرجوت: وہاں مجھے بھیجنے کی کیا ضرورت ہوگی میں کبھی وہاں نہ بھیجوں گا۔

گروجی: نہیں۔ یہ بات تمہارے اختیار میں نہیں۔ دیکھو جو لوگ کسی نیک کام کی حمایت میں مارے جاتے ہیں ان کی روحیں خدا کی ذات کے قریب ایک نورانی قندیل میں چلی جاتی ہیں اور وہاں ان کو ایسا مزہ ملتا ہے جو دنیا کے کسی سرور کے مشابہ نہیں ہے جس کو تم سمجھ سکو۔ بس یہ خیال کرو کہ وہ بہت ہی بڑا لطف ہے جو خدا کی ذات میں فنا ہونے سے پہلے اس مادی دنیا میں ارواح کو میسر آتا ہے۔

اگر تم نے کایا پلٹ بوٹی سے اپنی روح کو اپنے خول سے الگ کرلیا اور کہیں سیر

کرنے کو بھیجا تو وہ ضرور آزادی کی ہوا سے سرشار ہو کر اپنی شہید روحوں کی قندیل میں چلی جائیگی اور وہاں گئی تو پھر کبھی نہ آئے گی۔

اندرجوت:۔ جب اس قندیل میں آپ کے فرمانیکے بموجب بہت بڑا سرور حاصل ہوتا ہے تو میں اپنی روح کو واپس کیوں بلاؤں گا۔ اچھا ہے کہ وہ ہمیشہ وہاں رہے جہاں اس کو راحت اور چین ملتا ہو۔ اس دنیا کی تکلیف اور بے مزہ زندگی سے تو وہ لاکھ درجے بہتر ہے۔

گروجی:۔ یہ سچ ہے مگر قندیل مبارک میں غیر شہید روح کو رہنے کا حکم نہیں ہے جو روح جسم کی شہادت کے بغیر محض سیر کے لئے وہاں چلی آتی ہے تو چند روز کے مزے کے بعد ایک دکھ لگ جاتا ہے اور وہ پھر دنیا کے کسی ناپاک جسم میں ڈال دی جاتی ہے اور قید کی تکلیف اٹھاتی ہے۔

اندرجوت:۔ تو پھر کسی نیک کام میں شہید ہو کر اپنی روح کو قندیل مبارک میں کیوں نہ بھیجوں۔

گروجی:۔ ہاں ایسا کرو گے تو ہمیشہ وہاں رہو گے۔

اندرجوت:۔ بتائیے وہ شہادت کونسی ہے؟

گروجی:۔ خدا اور اس کے علم کی تلاش میں اگر آدمی مرجائے تو اس کی روح قندیل مبارک میں چلی جاتی ہے کسی مظلوم کی حمایت میں مارا جائے تو اس کو یہ درجہ ملتا ہے۔ لیکن اے اندرجوت اگر تو جسم کی قید میں رہکر اپنی خواہشوں پر قابو رکھے اور خدا کی دی ہوئی طاقتوں کو نیک کام میں صرف کرے اور نفس کی دشمنی پر فتح پالے تو کسی موت مرے قندیل مبارک میں ضرور تیری روح کو جگہ دی جائے گی اور تیرا نام شہیدوں میں لکھا جائیگا۔ دیکھ جس زمانہ میں اچھی باتوں کی بیقدری ہو جائے اور خلقت نیکیوں کو عقل اور آرام کے خلاف سمجھنے لگے۔ اس وقت میں اگر کوئی شخص ایک نیکی کو بھی زندہ کرے گا تو اس کی روح کو مرنے کے بعد قندیل حق میں اونچی جگہ دی جائیگی۔

اندرجوت نے گروجی سے یہ سن کر اپنے وقت کے دو حصے کئے۔ ایک میں وہ اپنی

Marfat.com

حکومت کے کام کرتا تھا اور مظلوموں کی فریاد سنتا تھا اور دوسرے میں جڑی بوٹیوں کی تحقیقات کرتا تھا اور کنولا بھی اس کے شریک حال رہتی تھی۔ ایک روز وہ کنولا سمیت ایک بوٹی کی تلاش میں پھر رہا تھا کہ اس کے پاؤں میں ایک سانپ نے کاٹا۔ کنولا سانپ کو پاؤں سے چھڑانے لگی۔ کیونکہ وہ انگوٹھے کو چمٹ گیا تھا تو سانپ نے کنولا کے ہاتھ میں بھی کاٹ کھایا۔ سانپ ایسا زہریلا تھا کہ دونوں وہیں پانی ہو کر بہہ گئے۔ مگر ان کی ارواح فوراً قندیلِ مبارک میں اڑ کر چلی گئیں۔ جہاں ان کا ارواح نے بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا اور یہ دونوں ابدی اور کامل عیش سے وہاں رہنے لگے۔

لہٰذا تو بھی اے میری روح ایسا ہی کر اور مجھ خول میں مقید رہ کر نیک کاموں میں مصروف ہو تاکہ شہیدوں کی قندیلِ حق تک رسائی پائے۔ یوں خواہ مخواہ مجھکو ترک کرنے اور غیر فطری آزادی سے تجھکو کچھ حاصل نہ ہو گا۔

میں نے اپنے خول کی کہانی سن کر قہقہہ لگایا اور کہا دیوانے تو نے اپنے خاکی جذبات کے مطابق قندیلِ حق کو بھی عیش خانہ سمجھا۔ کوئی اور مثال دی ہوتی۔ مگر دیتا کیونکر تیری عقل کا عروج تو خواہشات و لذاتِ نفس تک ہے۔

خول: نہیں میں نے کہا ہے کہ قندیل مبارک میں جو سرور ارواح کو ہوتا ہے اس کی شباہت ہماری دنیا کی کسی چیز سے نہیں ہے۔ صرف سمجھنے کو کسی دنیاوی لطف سے نسبت دے سکتے ہیں۔

میں: خیر اگر تو نے یہ کہا بھی تب بھی میں خیال کرتا ہوں کہ تیری پرواز فانی لذتوں سے آگے نہیں ہے۔ میں قندیلِ حق میں شہید ہو کر جانا پسند کرتا ہوں مگر اس لئے نہیں کہ وہاں مجھکو دوسری ارواح کے ساتھ عیش و راحت نصیب ہو۔ وہاں میرا کام یہ ہو گا کہ سب ارواح کو قندیل کی قید کا دکھ بتاؤں اور ان سے کہوں کہ تم سب جدوجہد کرو اور اس محدود حیات سے نکل کر ذاتِ الٰہی کی نامحدود ہستی میں فنا ہونے کی کوشش کرو۔ کیونکہ قید تعین میں

Marfat.com

خواہ ہم کو کیسا ہی لطف ہو۔ پَردہ بات حاصل نہیں ہو سکتی جو محویت و فنائیت ذات میں ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ذات الٰہی ہی ہر رُوح کا اصلی مرکز ہے۔

اگر میں تبدیلِ حق کے بعد بہشت میں گیا تو وہاں بھی جب مجھ سے یہ سوال کیا گیا کہ کس قسم کا عیش چاہتا ہے تو آزادی بیانِ حق کی طلب کروں گا اور جنت والوں کو بہکاؤں گا کہ وہ بہشت کے جیل خانہ سے نکلیں اور موج الوہیت کی غرقابی خدا سے مانگیں

اے خول! میں تجھ سے نفرت نہیں رکھتا۔ میں تجھ سے جدا نہیں ہوتا۔ میں کوئی کام ایسا نہیں کرتا جو قانونِ اسلام اور قانونِ دنیا کے برخلاف ہو۔ میں تجھ کو کسی قسم کی مادی اذیت نہیں دینی چاہتا۔ مجھکو یہ بھی منظور نہیں کہ فطرت کے مقررہ وقت سے پہلے تجھ سے الگ ہو جاؤں یا کسی اور کو ایسا کرنے کی نصیحت کروں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تجھ سے جدا ہو کر ذرا اپنے اور تیرے حالات کا مطالعہ کیا کروں۔ جب تک تجھ سے جدا نہ ہوں گا، سمجھ نہیں سکتا کہ تو کیا ہے اور میں کیا ہوں۔ تو کس حال میں ہے اور میں کس حال میں ہوں تجھے کیا کرنا چاہیئے اور مجھپر کیا کیا فرائض ہیں۔

میرے مٹی کے پتلے! تیری دید کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ تیرے اندر بند رہ کر تو ہی بتا کہ تجھ کو کیوں کر دیکھوں۔ مانتا ہوں کہ دید کے ہزاروں طریقے ہیں مگر جو دید منزل تک پہنچاتی ہے وہ تیرے بندھن سے باہر آئے بغیر ہاتھ نہیں آسکتی۔

یہ خیال نہ کر کہ میں ہمیشہ اس کھیل کی سی مستی پر بستر جمائے رہوں گا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ محدود رہنا مجھ کو بالکل ناپسند ہے۔ میں ہمیشہ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے میں مصروف رہتا ہوں اور اس میں کہیں نہ رکوں گا۔ تاوقتیکہ خدا کو نہ پالوں اور خدا کے پانے پر بھی چپکا نہ رہوں گا یہاں تک کہ اس کی ذات میں سما کر نابود کے اسم سے آزادی حاصل نہ کرلوں

خول:۔ یہ علم کہاں ہے کہ تو مجھ سے جدا ہو کر مجھکو پڑھے۔ علم اندر رہ کر اچھا ہوتا ہے نہ کہ باہر نکل کر؟

میں ۔ خدا نے اپنے عربی کلام میں کہا ہے:۔ و فی انفسکم افلا تبصرون
جس کی تعمیل جسم کی قید میں محال ہے

ارے غافل میں تجھ سے جدا کب ہوں۔ تو مجھ میں ہے تو میں تجھ میں ہوں اور تیرے ہی اندر رہکر علم حاصل کر رہا ہوں مگر یہ وہ اندرون نہیں جس کو تو چاہتا ہے کہ خواہشوں میں اسیر ہو کر علم حاصل کر دوں بلکہ یہ وہ اندرون ہے جو مجرد روح کی اصطلاح میں اندرون ہے اور جس سے حکم خدا کی تعمیل اور دنیا میں آنے کا منشار پورا ہوتا ہے۔

دامِ مگس

صوفی۔ جنوری ۱۹۱۶ء

بلبل کو اسیر کر کے شاعروں کی یورش مول لے لی جس کو سنو قلم کی تلوار کھینچے آنکھیں بند کئے عالم خود فراموشی میں بلبل کے صیاد پر پلا پڑتا ہے گویا غریب صیاد کو کچا چبا جائے گا۔ کوئی پوچھے کہ شاعروں کو بلبل سے کیا ہمدردی ہے بعض منہ جلتے ہیں کہ چمن کے موسم گل میں بلبل اور انسان کی محفل عیش میں شاعر، دونوں کانٹے ہیں۔ بلبل چمن میں آتا ہے تو پھولوں کی مستیاں اور خوش ادائیاں نالہ و فریاد کر کر کے خاک میں ملا دیتا ہے۔ پھول عالم سکوت میں اپنی نشیلی آنکھ کھولتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کا چاہنے والا بھی ایسا ہی مخمور و خاموش ہو سنجیدگی و متانت سے بہار حسن لوٹے۔ نہ کہ بلبل کی طرح چیخے چلائے۔ ہائے گل ہائے گل کے نعرے لگائے۔ وصل نصیب ہو تو چونچ کی بیتاب بوسہ بازی سے برگ گل کو پاش پاش کر دے۔

شاعر محفل میں جاتا ہے تو کبھی افسردگی سے ساری انجمن کو افسردہ کر دیتا ہے کبھی اپنی زندہ مزاجی سے داب مجلس میں برہمی ڈالتا ہے کبھی ہنستا ہے، کبھی روتا ہے۔

Marfat.com

غرض یہ بھی بلبل کی طرح آزار دہندہ ہے خود تکلیف میں رہتا ہے، دوسروں کو تکلیف میں ڈالتا ہے۔

شکاری نے دام بچھایا اور شورش کنندہ بلبل کو اسیر کیا تو جناب شاعر کا کیا نقصان ہوا جو شکاری کو کوستے ہیں اور اس کی ہجو میں دفتر کا دفتر سیاہ کر ڈالتے ہیں۔ خیر آج میں نے ایک ایسی چیز کے لئے دام بچھایا ہے جو شاعر صاحب کے کوچہ عشق سے محروم ہے بلکہ بعض اوقات ان کی فکرِ شعر میں بارج ہوتی ہے۔ دیکھوں اس کی اسیری کی نسبت بھی حضرت کے قلم میں کچھ حرارت آتی ہے یا نہیں؟

یہہ دام مگس کے لئے ہے۔ دام بھی بے نقط اور مگس بھی شاعر صاحب کی بے نقط گالیوں کا کچھ اندیشہ نہیں جو خود بے نقط ہوگا وہ دوسرے کی بے نقط صلواتوں سے کیا ڈرے گا۔

کاغذی جال

میں نے دیکھا کہ اس زمانہ میں اخباروں رسالوں کے کاغذی جال چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور حرص و ہوس کی اسیر ارواح اپنے اجسام کو ان میں پھنسا رہی ہیں۔ اس واسطے میں نے بھی دو آنے کا مکھی مار کاغذ بازار سے خریدا اور اپنے رین بسیرے کی آزاد مکھیوں کے سامنے یہ کاغذی جال لگایا۔

اس وقت میرے دل میں مکھیوں سے کسی انتقام کی خواہش نہ تھی، نہ میں نے ڈاکٹر صاحب کے اس عقیدہ کو تسلیم کیا تھا کہ مکھی ہر بیماری کی جڑ ہے۔ میرے دماغ میں جرمنی قیصر کی خونخواری کا بھی کچھہ دخل نہ تھا۔ نہ مجھپر موجودہ جنگ کا ارتقائی اثر پڑا تھا جو میں غریب مکھیوں کے قتلِ عام پر آمادہ ہوتا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مکھیوں نے مجھے بہت کم ستایا ہے۔ مچھروں کی جتنی شکایت کروں تھوڑی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ میرے جسم کے

Marfat.com

خون کو شیرِ مادر سمجھا. بچاری مکھیاں میرے دسترخوان کی شریک ہمجولیاں ہیں. میں ان سے اس قدر محبت رکھتا ہوں کہ جب کبھی انہوں نے میرے سالن میں ہاتھ ڈالا تو میں نے ہاتھ کھینچ لیا اور سارا دسترخوان ان کے آگے رکھ دیا. خود نہ کھایا. سب کچھ ان کو سونپ دیا۔

پھر جو میں نے ان کی گرفتاری و قتل کاری پر کمر باندھی، اس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ میں نترہ "مگس بے حیا" کا امتحان کرنا چاہتا تھا مجھے یہ خواہش تھی کہ میں اس جانور کی اسیری کا تماشہ دیکھوں جس کو سرمدؒ نے سوزِ عشق سے محروم گردانا ہے اور کہا ہے کہ:۔

سرمد غمِ عشق بوالہوس را ندہند
سوزِ دل پروانہ مگس را ندہند

جب مکھی بوالہوس ہے تو دیکھوں اسیرانِ ہوس کیونکر حرص وہوس کا شکار ہوتے ہیں اور ان پر کیا کیا بپتائیں پڑتی ہیں۔

سب سے زیادہ مجھکو اس ننھے سے پرندے کی ایک اور آزمائش منظور تھی کہ وہ اپنی جان بچانے میں کہاں تک محتاط ہے اور جب اس پر آفت آجاتی ہے تو کس کس طرح حفاظتِ زندگی میں کوشش کرتا ہے. خاصکر یہ کہ مکھی پر سکراتِ موت کی کیسی کیفیت ہوتی ہے اور اس کے بے حقیقت اور ناتواں جسم سے جان کتنی دیر میں نکلتی ہے؟

یہ بہت وحشیانہ تجربہ تھا. یہ بہت بیدردانہ تحقیقات تھی. اس میں دردمندی اور ترس شعاری کا ذرا دخل نہ تھا مگر جذبۂ بشری نے مجھکو سنگدل بنادیا. رحم میرے خانۂ دل میں منہ چھپا کر جا بیٹھا اور میں نے اپنے بستر کے آس پاس بسنے والی مکھیوں کو جال میں پھانسنے پر کمر باندھی۔

یہ کاغذی جال گورے ملکوں سے آیا ہے اس میں انگریزی حروف ہیں اور بھورے

Marfat.com

رنگ کی ایک عجیب دار چیز ہے۔ جب میں نے اس کاغذ کو زمین پر رکھا، ایک بھولی بھالی نشۂ شباب کی متوالی مکھی جست کرکے اسیر آئی اور جھپٹا مار کر ہوس کے پردوں سے نیچے اتری قدم رکھنا تھا کہ دام میں اُلجھ گئی۔ یہ حالت دیکھکر اس نے چاہا کہ اُلٹے پاؤں بھاگے اس واسطے وہ پھر بالائی جست کے لئے اُبھری تھی، مگر پاؤں جال میں پھنس چکے تھے۔ اس نے ساڑھے چار سکنڈ توقف کیا اور دم لیکر لگاتار اکیس سکنڈ اپنے پروں کو پھڑپھڑایا۔ اس وقت اس کے پاؤں قید تھے لیکن جسم پروں کی طاقت پرواز سے بار بار جنبش کرتا تھا۔ پر ایسی تیزی سے ہوا میں لہریں لیتے تھے کہ ان کی شکل نظر نہ آتی تھی۔ آخر اکیس سکنڈ کے بعد قوت پرواز نے جواب دیدیا، پر شل ہوگئے اور مکھی اپنے بائیں رُخ جھکی۔ جھکنا تھا کہ بایاں پر بھی جال میں پھنس گیا اور مکھی آڑی ہوکر بیدم ہوگئی ۳۰ سکنڈ وہ چپ چاپ پڑی رہی اور اس کے بعد پھر زندگی کی تمنا نے اس کو آمادہ کیا کہ ایک بار اور جان بچانے کی کوشش کرے۔ اب کے اس نے مایوسانہ عالم میں اپنے بدن کو حرکت دی اور ایک دلخراش چیخ بھی ماری جو مسلسل گیارہ سکنڈ ہوا میں گونجتی رہی۔ مگر ہائے اس میں بھی اس کو کامیابی نہ ہوئی اور فرشتۂ موت اس کے سامنے آگیا اور مکھی نے دنیا سے گزر نے کا تہیہ کرلیا۔ وہ نہ چاہتی تھی کہ اتنی جلدی اس کو موت سے سابقہ پڑے۔ وہ اپنی عمر کو بہت دراز تصور کرتی تھی۔ اس کو خیال تھا کہ یہ دنیا ہمیشہ رہے گی اور میں اس میں آخر تک بھنبھناتی پھروں گی۔ آج اس نے موت کا پیام سنا جس نے اس کے ارمانوں میں ہلچل ڈالدی۔ وہ چپ ہوگئی اور موت کے فرشتے کو حیرت دیاس سے دیکھنے لگی۔

جب میں نے معلوم کیا کہ مکھی سکرات میں ہے تو گھڑی کو جلدی سے ہاتھ میں لیلیا اور پھر سکنڈ شمار کرنے لگا۔ مگر یہ میری بھول تھی۔ اس وقت مجھکو اپنی سکرات کی مشکلات کا خیال کرنا تھا جو ایکدن مجھکو بھی پیش آئے گی۔

مکھی پر سکرات کا عالم ایک منٹ طاری رہا۔ اس کے بعد اس نے داعی اجل کو

Marfat.com

اپنی روح دیدی اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

ہم سب خدا کے ہیں اور آخر خدا ہی کے پاس جاتا ہے۔

جتنی دیر میں اس نوجوان مکھی کے انجام کار کی دید میں مصروف رہا اتنے عرصہ میں مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ دس بیس اور نئے وجود اسیر بلا ہو چکے تھے اور تڑپ رہے تھے۔ غور کیا تو قریباً ہر مکھی ایک سکنڈ تک کوشش پرواز اور سعی رہائی میں مصروف ہو کر آخر بائیں جانب جھک جاتی تھی اور اس کا پایاں پر سالہ میں آلودہ ہو کر اس کو جان سے کھو دیتا تھا۔

اس کے بعد اور بھی تماشے دیکھے۔ بعض مکھیاں سرنگوں رہ گئیں۔ بعض ایسی آئیں کہ پاؤں رکھتے ہی خاموش ہو گئیں ذرا جنبش نہ کی اور مری کی مری رہ گئیں۔ یہ شاید سالہ کے زہر کا اثر ہوگا۔

نابینا حرص

میں نے دیکھا کہ سینکڑوں لاشیں مکھیوں کی پڑی ہیں۔ آزاد مکھیاں ان کو دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود اس جال میں آتی ہیں اور جان بوجھ کر اسیر پنجہ اجل ہو جاتی ہیں۔

دل نے کہا ان میں اتنی عقل نہیں ہے جو اس قتل خانہ کی حقیقت کو سمجھیں غیب کی صدا آئی نہیں۔ قدرت نے ہر جاندار کو موت و حیات کے خطرات کی تیز عقل دی ہے مکھی اس سے محروم نہیں ہے لیکن چونکہ حرص و ہوس کے آنکھ نہیں ہوتی۔ اسواسطے یہ بیچاری بھی اس کے ہاتھوں اندھی ہو کر موت کے منہ میں جا پڑتی ہے۔

انسان سے زیادہ کس کو عقل ملی ہے کیا اسکے اندھے پن کو نہیں دیکھا کہ وہ جان بوجھ کر ہی ہمیشہ موت و ہلاکت کے منہ میں جاتا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ شراب سے لاکھوں آدمی تباہ ہو گئے۔ سب کی آنکھوں کے سامنے اس کی مثالیں پیش آتی ہیں مگر پھر

Marfat.com

بھی خلقت شراب خوری سے باز نہیں آتی. ہر ایک کو معلوم ہو گیا ہے کہ کوکین کھانے سے آدمی چند روز میں گھل گھل کر مر جاتا ہے. اس کا مال تباہ ہو جاتا ہے. اس کی آبرو خراب ہوتی ہے حکومت جیل خانے بھجواتی ہے مگر ہوس کی نابینائی اس کو کین سے باز نہیں رہنے دیتی اور وہ دیدہ ودانستہ موت و بربادی کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

یہی حال قمار بازی کا ہے. عیاشی کا ہے اور ہر اُس چیز کا ہے جس میں جسمانی و روحانی خطرے ہیں جب عقلمند آدمی نہیں بچتا اور نہیں دیکھتا تو مکھی بیچاری کس گنتی میں ہے.

دام مگس مکھیوں کی لاشوں سے کالا ہو گیا. میرا دل اس قتل عام کی سفاکی سے ہانپنے لگا تو میں نے اپنی گردن پورے چار گھنٹے کے بعد اوپر سے ہٹائی اور مکھیوں کی ارواح سے گفتگو کی ٹھہرائی۔

روح مگس نمبر ایک

جس وقت اجل کا ہاتھ ایک مکھی کی روح کو مٹھی میں لیکر چلا تو میں نے اجل کے دامن کو پکڑ لیا اور پوچھا. کیا مجھکو اجازت ہے کہ چند باتیں آپ کے قیدی سے دریافت کروں؟ دست اجل نے فدا تامل کے بعد جواب دیا۔

قدرت نے مجھکو اس کا اختیار نہیں دیا ہے لیکن اے آدمی تیری انسانی عظمت کے سامنے میں کچھ نہیں کہہ سکتا. تو روح مگس سے مجھکو روک کر سوال کرنے کا حق رکھتا ہے پوچھ جو تیرا جی چاہے.

تب میں نے مکھی کی آزاد روح سے سوال کیا۔

تم قید جسم کے بعد اس حالت اور اُس حالت میں کیا فرق دیکھتی ہو؟

روح مگس:۔ وہ کیفیت مجھکو محسوس ہوتی ہے جس کا سمجھنا محال ہے. پہلے میں تعلقات جسم کے پردوں میں ایسی بندھی کہ باہر آنیکو میرا جی نہ چاہتا تھا اور جانکنی کے وقت نے مجھ پر

Marfat.com

حسرتیں اور بیقراریاں برسا رکھی تھیں مگر اب مجھکو نظر آتا ہے کہ میں اپنے وقت کی ملکہ ہوں دستِ اجل کی مٹھی میں بند ہوں لیکن تمام کائنات میری آنکھوں کے سامنے متحرک نظر آتی ہے۔ میری آنکھوں سے عالم کی کوئی شئے پوشیدہ نہیں ہے میرا جی چاہتا ہے کہ موت پر میں ہزاروں بار صدقے قربان ہوں جس کی بدولت میں نے منزل راحت پائی۔

میں :- کیا عالم علوی کا بھی مشاہدہ کرتی ہو؟

روح مگس :- نہیں ابھی مجھکو وہ بہت دُور کچھ مِٹا مِٹا اور دُھندلا دُھندلا سا دکھائی دیتا ہے میں اس کے وجود کو پاتی ہوں مگر بیان کرنے اور تمیز کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ صرف اتنا کہ اس کے موجود ہونے پر یقین کر سکوں۔

میں نے یہ سن کر دستِ اجل سے کہا کہ اچھا اس کو لے جاؤ۔ باقی سوال دوسری ارواح سے کئے جائیں گے۔ جب یہ روح غائب ہو گئی تو میں نے دوسری مکھی کی روح کو بلایا۔

روح مگس نمبر ۲ دو

تم بتاؤ کہ اس وقت بے خود ہو یا خودی میں ہو؟

روح مگس :- قید سے آزاد ہوئی اب بیخودی کیسی۔ خودی میں ہوں۔ خودداری کا لطف اس وقت آیا ہے۔ حالت جسم میں دیکھنے کو باخود، آزاد، خودمختار تھی۔ مگر درحقیقت عالم سفلی میں اپنی حرص و ہوس کی غلام اور بیخود تھی اور عالم علوی میں قانون قدرت کے زبردست دباؤ نے مجھ کو معطل کر رکھا تھا نہ اپنے اختیار سے اُڑتی تھی اپنی طاقت سے نقل و حرکت کرتی تھی نہ اپنے بل پر زندگی بسر کر سکتی تھی ہر چیز میں نیچر و فطرت کی مخفی سلطنت مجھ پر حکمراں تھی۔ تم جان سکتے ہو کہ محکومیت میں خودی کہاں رہ سکتی ہے۔ اس میں تو ہر ہستی بے خود رہنے پر مجبور ہوتی ہے۔

Marfat.com

کیا تم انسانوں کے حالات پر غور کرنے اور ان میں دخل دینے کی صلاحیت رکھتی ہو؟

روح مگس :- ہاں اس وقت تو میرا ادراک ارعاج انسانی کے بہت قریب ہوگیا ہے بس بہت کچھ سمجھ سکتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ مجھ میں سمجھانیکی بھی صلاحیت موجود ہے۔

تو کیا تم کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نامی ایک مشہور شاعر نے آج کل ایک کتاب لکھی ہے اور اس میں جسمانی و نفسانی خودی کو قائم کرنے اور دنیا کے تعلقات سے محبت بڑھانے کی تاکید کی ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ خودی کو مٹانا اور تعلقات دنیا سے بے رغبتی سکھاتے ہیں وہ بڑے ہی احمق اور بیوقوف ہیں۔

روح مگس :- ہاں ہاں میری بصیرت اس مثنوی کو صاف دیکھ رہی ہے جس کا نام "اسرار خودی" رکھا گیا ہے اور جس میں حکیم افلاطون اور لسان الغیب حضرت حافظ شیرازی کو نہایت سخت حقارت سے یاد کیا گیا ہے اور ان کی پیروی کو خطرناک بتا کے آدمیوں کو اس سے روکا گیا ہے

اچھا جب تم اس مثنوی کو دیکھ رہی ہو اور اس پر اتنی حاوی ہوگئی ہو کہ تم نے اس کے مضامین بھی بتا دیئے، تو بتاؤ حضرت حافظ شیرازیؒ کی روح اس توہین کی نسبت کیا خیال کرتی ہے؟

روح مگس :- یہ سوال میری حالت سے بہت اونچا ہے۔ اب مجھکو جانے دو کہ آزادی کے بعد عجیب قسم کی تمنائیں مجھ میں پیدا ہوئی ہیں اور ان کا تقاضا ہے کہ میں اس عالم سفلی کے ہر تعلق سے جلدی کنارہ کش ہو کر ان آرزوؤں کی جانب متوجہ ہوں۔

یہ سن کر میں نے دوسری مکھی کی روح کو بھی رخصت کیا اور تیسری روح کو روک کر گفتگو شروع کی۔

روح مگس نمبر تین

ارے بی ذرا ٹھہرو۔ ایسی بھی کیا گھبراہٹ ہے۔ یا تو یہ حالت تھی کہ موت کی صورت

Marfat.com

دیکھتے ہی دردناک آہیں کھینچتی تھیں اور مرنے کے نام سے ہراساں ہوئی جاتی تھیں۔ یا یہ کیفیت ہے کہ ہوا کے گھوڑے پر سوار اُڑی چلی جاتی ہو۔

رُوح نگس "یہ کہو کہو، جلدی کہو وقت خراب نہ کرو"۔ یہ کہہ کر روح نگس نے ایک ایسے پیارے انداز سے انگڑائی لی اور خمار آلود آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر دیکھا کہ میں سینہ تھام کر رہ گیا۔ میں نے کہا کہ ہریالی، راج دُلاری بنو۔ یہ تم کس کو دیکھتی ہو۔ یہ تمہاری انکھڑیوں میں لال لال ڈورے کیوں پڑے جاتے ہیں۔ یہ تم پر مستی کس بات کی چھا رہی ہے؟

روح نگس:۔ (مسکرا کر اور اپنے وجود برقی کو کچھ بل دیکر بولی) ارے آدمی کچھ پوچھتا ہے یا خواہ مخواہ مغز زنی کرتا ہے۔ کیا بتائیں کیا ارمان ہیں، کیا کہیں کس کے گلے لگنے کی تمنا ہے۔ تو اپنی سوکھی فلسفیانہ باتوں کو جانے دے اور میرا راستہ کھوٹا نہ کر۔

یہ کہہ کر تھکی کی۔ روح نے پھر ایک جمائی کے ساتھ انگڑائی لی اور آنکھوں کو مل کر بولی۔ بعد مدت کے غریبوں کا نصیبا جاگا۔ یہ کہا اور پھر آسمان کو للچائی اور شوق بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اب کے اُن نظروں میں اس قدر مستی تھی کہ مجھکو اپنی قید عنصری سے نفرت ہونے لگی اور میں نے چاہا کہ جسم سے آزاد ہو کر اس بہار تک میں بھی پہنچ جاؤں اور روح نگس جس دید میں مصروف ہے میں بھی اس کو دیکھوں۔

اس روح کو جب میں نے بہت بے قرار دیکھا تو کہا عشق دنیا اچھا ہے یا عشق آخرت؟ اور جس دنیا سے تو آئی ہے وہ تجھ کو اب کیسی معلوم ہوتی ہے' روح نگس نے جواب دیا دنیا کیسی، آخرت کیسی۔ عشق آزادی۔ عشق حیات ابدی کہو یعنی یہ زندگی، جو اس وقت مجھکو حاصل ہے اور جو دوامی ہے، اگر اسی کا نام تمہارے ہاں آخرت ہے، تو کہوں گی کہ عشق آخرت کی آرزو کرو، اس دنیا کو لات مارو۔ یہ کہتے کہتے ناچلی گئی۔

Marfat.com

روحِ مگس نمبر چار

مجھ کو اس گفت و شنید میں ایسا مزہ آیا کہ میں نے ہر مکھی کی روح سے بات چیت کا تہیہ کر لیا اور چوتھی مکھی کی روح سے مخاطب ہوا۔

یہ بہت اُداس اور غمگین تھی اور دستِ اجل کے آغوش میں چپ چاپ گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے کہا کیوں تم افسردہ کیوں ہو؟ بولی اس لئے کہ قیدِ جسم کی تکان نے شل کر دیا۔

اب آزادی نصیب ہوئی مگر سارا وجود حرص و ہوس کی سابقہ زیادتیوں سے کچلا ہوا ہے۔ راحت ملی، مگر دیر میں۔ توانائی جلدی کہاں سے آئے۔ رفتہ رفتہ زخموں کا اندمال ہو گا۔

میں نے کہا۔ کیا مرنے کے بعد بھی تعلقاتِ جسم کا خمیازہ روح پر باقی رہتا ہے؟

روحِ مگس :۔ جزا و سزا اسی کا نام ہے۔ جو دنیا کے تعلقات سے جی نہیں لگاتا دنیا میں ایک مسافر کی طرح رہتا ہے۔ کھاتا ہے، پیتا ہے، کماتا ہے۔ شادی بیاہ کرتا ہے۔ عزت آبرو کے درجوں تک پہنچتا ہے۔ مگر دل کو ان باتوں کا اسیر نہیں کرتا اور اس کو ہر وقت خدا سے لگائے رکھتا ہے تو مرنے کے بعد اس کی روح کو کچھ تکان نہیں ہوتی ورنہ میری طرح کہ دنیا میں بہت زیادہ زندہ رہی اور حرص و ہوس کی غلامی کو مآلِ زندگی سمجھا کھانے اور مٹھاس کی تلاش و طلب کو مقصدِ حیات سمجھتی رہی اور آج جسم سے نکل بے انتہا کوفت اور پشیمانی اپنے اوپر پاتی ہوں۔ اس کا بھی یہی انجام ہونا ہے۔

میں نے کہا۔ تم نے سنا ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنی مثنوی "اسرارِ خودی" میں دنیا کو دین پر مقدم بتاتے ہیں اور عیشِ دنیا کی طلب کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

Marfat.com

روح مگس۔ آہ یہ اُن کی بھول ہے۔ اہل یورپ کی خوش حالی اور فروغ دنیاوی نے ان کو دھوکہ دیا ہے۔ وہ چار دن کی چاندنی کو نورِ ابد تصور کرنے لگے۔ اُنہوں نے سائنس کی ترقی مشاہدات اور مادہ کی اوپری افتاد پر قیاس کر لیا کہ بس یہی چیزیں قابل تقلید ہیں حالانکہ ان ترقیوں کی اور ان کے عیش و آرام کی بہت تھوڑی عمر ہے۔ وہ ہوس نفس کے بادلوں کی ایک جھلک ہے جو صرف ایک محدود موسم میں چمک کر رہ جاتی ہے۔ وہ خواہشات سفلی کی برسات کے ندی نالے ہیں جو چند ساعت چڑھاؤ دکھا کر اُتر جاتے ہیں۔ بقا اس کائنات میں کسی شکل کو نہیں ہے۔ ہر نیک و بد اسیرِ انقلاب ہوتا ہے مگر جس ہستی کی بنیاد امید آخرت اور توکلِ خدا پر ہو، اُس کو یہ دنیا جلدی فنا ہونے سے بچاتی ہے۔ اور جو خود اس دنیا کے اسباب پر اپنی عمارت کی نیو رکھتا ہے، اس کی چند روزہ ٹیپ ٹاپ اگرچہ پُربہار ہوتی ہے، مگر قائم نہیں رہ سکتی۔ ایک جنبشِ فطرت میں برباد ہو کر گر پڑتی ہے۔

ڈاکٹر اقبال کی نیت بُری نہیں ہے انہوں نے اپنے استادوں کی تعلیم اور اس تعلیم کے وطن کی بود و باش سے یہ خیالات اخذ کئے ہیں اُن کے دل میں اپنی قوم کا درد ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ اُن کے بھائی بھی کامرانی اور عیش جاودانی حاصل کریں لیکن شیطان نے جب کسی ذی عقل کو دھوکا دیا ہے تو اسی طرح زینت دیکر اور اس کی نیک نیتی میں شریک ہو کر دیا ہے۔

میں نے اس افسردہ مکھی کے اتنے لمبے چوڑے لکچر کو سنکر بہت تعجب کیا کہ جو مکھیاں مرنے کے بعد خوش تھیں۔ انہوں نے بات کرنے سے گریز کیا اور یہ غمگین مکھی ایسی طول کلامی کرتی ہے۔

اسپر میں نے اس سے اس کا سبب پوچھا مکھی بولی۔

جس طرح دنیا میں راحت و آرام انسان کو دوسروں سے بے پروا اور بےفکر بنا دیتا ہے

اسی طرح مکھیوں کی ارواح اپنے سرورِ باطنی کی مصروفیت میں تجھ سے ہمکلام ہونا نہ چاہتی تھیں اور آگے بڑھنے سے جہاں ان کا مطلوب تھا، گھبراتی تھیں، مگر میں کہ اب تک اسیرِ رنج و محن ہوں، دوسروں کی تکلیف کا حِس رکھتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ اور ارواح میری طرح مبتلائے عذاب نہ ہوں۔ اسی واسطے میں نے ڈاکٹر اقبال کی مثنوی کی نسبت زیادہ گفتگو کی۔ کیونکہ مجھ کو نظر آتا ہے کہ جو اس کی پیروی کریگا وہ اپنی آخرت کے عیش کو تباہ کرے گا اور جو اس سے بچے گا وہ دائمی حیات کے سرور کا حقدار ہو گا۔

مکھی کی روح اتنا کہنے پائی تھی کہ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور مکھی مار کاغذ کو، جس پر صدہا لاشیں مکھیوں کی پڑی تھیں، اڑا کر لیگیا۔ اس حادثہ کو دیکھ کر مجبوراً عالمِ خیال سے اٹھنا پڑا اور ارواح کی بات چیت ادھوری رہ گئی۔

میں اٹھا اور قتیلانِ تجربہ کو اٹھا کر لایا سامنے رکھا اور کہا۔ اے بے حیا مگس کے بے جان جسموں! تم اس جال میں کیسے سنسان پڑے ہو۔ کچھ اپنی ارواح کا بھی حال معلوم ہے اگر تم سن سکتے ہو تو سنو کہ ان میں سے نیک اعمال بے فنا عیش میں مصروف ہیں اور دنیا کی طلبگار اعراف میں پھڑپھڑا رہی ہیں۔ میں تم کو اپنے گھر کے اندر یہ آواز اس لئے دیتا ہوں کہ یہ صدا غیب کی طاقتوں سے اُڑ کر ہندوستان بھر میں گونج جائے اور ہند کے ہر باشندے کو اس کا آخری وقت یاد دلائے اور خدا کرے کہ یہ آواز پہاڑوں اور دریاؤں اور سمندروں تک سے عبور کر کے اثر کرے۔ آمین۔

یہ مضمون اس وقت شائع ہوا تھا جب کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے مثنوی اسرار خودی لکھی تھی۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنی کتاب کا نام مجھ سے مشورہ کر کے اسرارِ بے خودی رکھا تھا مگر جب میں نے اس کتاب میں حضرت حافظؒ اور تصوف کی تحقیر پڑھی تو میں نے اس کے باوجودکہ ڈاکٹر صاحب سے میرے بہت تعلقات تھے اس سے اختلاف کیا اور ڈاکٹر صاحب اور اُن کے مداحوں نے میرے اختلاف کی زور دار تردیدیں شائع کیں آخر حضرت اکبر الہ آبادی کے مشورے سے جو اس مسئلہ میں میرے ہمخیال تھے۔ میں نے مخالفت ترک کر دی اور ڈاکٹر صاحب نے بھی بعد کی تصنیفات میں اس روشِ تحریر کو بدل دیا۔ (حسن نظامی)

Marfat.com

چوتھی منزل

دین وملت

عورتیں کیا کرسکتی ہیں

(از وکیل امرتسر مورخہ ۱۷، جولائی ۱۹۰۳ء)

اس ضرورت کا احساس عام طور پر ہوگیا ہے کہ مسلمان اپنی پچھلی حالت پر نہیں پہنچ سکتے۔ جب تک کہ ان کی عورتوں کو تعلیم یافتہ نہ بنایا جائے۔ اسی لئے نئی روشنی کے جوان ہمہ تن کوشش میں ہیں کہ ہماری عورتیں بھی یورپ کی طرح خوب جی لگا کر لکھنا پڑھنا سیکھیں اور عیسائی لیڈیوں کی طرح کھلم کھلا بازاروں میں گشت لگائیں لیکن ہمارے نوجوان یورپ کی ترقی دیکھ کر ان کی تقلید کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ان کو اپنی قدیمی ترقی کے اسباب معلوم ہوجاتے تو وہ ہرگز اس بیہودہ خیال پر توجہ نہ کرتے۔

لہٰذا لازم ہے کہ وہ اپنے ان بزرگوں کے حالات دیکھیں جن کے طفیل آج ہندوستان میں ہماری صورتیں نظر آتی ہیں۔

حضرت خواجہ معین الدین حسن اجمیری چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے اسم گرامی سے ایسا کونسا ہندوستانی ہے جو ناواقف ہے۔ ان کے والد سید غیاث الدین حسن سنجری نے رحلت فرمائی۔ تو ان کا سن شریف پندرہ برس کا تھا اور یہ وہ عمر ہوتی ہے کہ اس میں

Marfat.com

آج کل کے صاحب پدر لڑکے بھی آوارہ ہو جاتے ہیں۔ مگر ان کی والدہ حضرت بی بی خاصۃ الملکہ نے ان کی ایسی قابلیت سے تعلیم و تربیت فرمائی کہ ان کا زمانہ میں غلغلہ مچ گیا۔ ہندوستان جیسے اجنبی ملک میں مسلمانوں کا جھنڈا اسی دُر یتیم کے صدقہ سے نظر آتا ہے۔ خیال کیا جائے اگر حضرت خواجہ رح کی والدہ تعلیمیافتہ نہ ہوتیں تو کیا ان نونہال کی یہ مشہور سرسبزی ممکن تھی؟ حضرت ہی کے خلیفہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح دہلوی ماں کی گود میں تھے۔ کوئی ڈیڑھ برس کی عمر تھی کہ ان کے پدر بزرگوار خواجہ کمال الدین حسن کا وصال ہو گیا۔ ان کی والدہ حضرت بی بی صالحہ نے پرورش کی۔ اور جب سن شریف چار سال چار ماہ، چار یوم کا ہوا تو مکتب میں تحصیل علم کے لئے بٹھا دیا۔ حضرت نے قرآن شریف کے پندرہ پارے اس سہولت سے پڑھ لئے کہ اُستاد حیران رہ گئے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ اپنی والدہ سے، جو حافظ تھیں، اکثر یہ پارے پڑھتے سُنا کرتے تھے۔ چونکہ ذہن بہت اچھا تھا ان الفاظ نے پہلے ہی جگہ پکڑ لی تھی، اب تعلیم کے وقت کچھ دشواری نہ ہوئی۔

بی بی صالحہ نے اس قطب زمانہ کی جس علم سے تربیت کی تھی اب وہی ہماری عورتوں کو بھی سکھایا جائے تاکہ ان کے بچے بھی اسی طرح لائق و فایق بنیں۔

حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء رح بھی اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید احمد صاحب کی وفات کے وقت پانچ برس کے تھے۔ حضرت کی مادر محترمہ حضرت بی بی زلیخا رح نے تعلیم کے فرض کو اس خوبصورتی سے ادا کیا کہ آج تک ان کا قرۃ العین خدا کے محبوب کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ سولہ برس کے سن تک محبوب الٰہی رح تمام علوم سے فارغ ہو گئے۔ یہ بی بی صاحبہ کی تعلیم کا اثر تھا کہ حضرت کو بچپن میں صبر و قناعت سے محبت ہو گئی تھی۔ چنانچہ خود فرماتے تھے کہ جس دن ہمارے گھر میں فاقہ ہوتا تھا۔ والدہ صاحبہ فرماتی تھیں "بابا نظام آج ہم خدا کے مہمان ہیں۔" یعنی آج گھر میں کھانے کو نہیں ہے حضرت

Marfat.com

فرماتے تھے کہ مجھکو والدہ صاحبہ کا یہ فقرہ بہت ہی مزہ دیتا تھا، اور جب کبھی ایسا ہوتا کہ متواتر کئی روز تک کھانے کو ملے جاتا تو میں دل ہی دل میں کہتا کہ "الٰہی وہ دن کب آئیگا کہ والدہ یہ فرمائیں کہ بابا نظام آج ہم خدا کے مہمان ہیں۔

بھلا یورپ میں کسی غریب اور مفلس بچے کی ایک بھی ایسی ماں ہے۔ جس کا بچہ ناداری سے مکدر رہتا ہو، بلکہ اُلٹا خوش اور مگن رہتا ہو۔ نہیں بلکہ وہاں تو طمع و حرص و اسراف کا سب سے پہلے سبق دیا جاتا ہے۔ تو کیا ان ہی عادات کے اختیار کرنے کے لئے مسلمان ان عورتوں کی تقلید کرنی چاہتے ہیں۔

مسلمانوں کو ان مذکورہ خواتین کی حالت پر غور کرنا چاہیئے کہ اُنھوں نے علم کی بدولت اس قسم کی قابلیت اور شائستگی حاصل کی، نہ پردہ دری سے اور نہ کسی غیر زبان کے یاد کرنے سے، نہ کسی ترقی یافتہ قوم کی طرزِ معاشرت سیکھنے سے بلکہ محض اپنے کامل مکمل دین کی تعلیم کی بدولت۔ جس کو وہ پوری حد تک حاصل کرتی تھیں۔

اب بھی اگر مسلمان لڑکیوں کو زمانہ کی حالت کا لحاظ رکھ کر تعلیم مذہبی دی جائے تو اُن کی آیندہ نسلیں پہلی سی ترقی کر سکتی ہیں۔ کیونکہ اسلام سب کے نزدیک ظاہر و باطن کے درست کرنے کے لئے ایک مکمل مذہب ہے۔

ایک ہی ہے اور کچھ نہیں

از خاتون۔ جولائی ۱۹۰۷ء

امی بابا یہ سختی کے دن کب جائیں گے۔ بے فکری کی نیند بھی کبھی میسر آئیگی یا یونہی ڈر اور خوف سے راتیں آنکھوں میں کٹیں گی چچا عالمگیر ہم کو کیوں ستاتے ہیں

خدا بھی ہماری مدد نہیں کرتا۔ اُس نے بھی حق کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دنیا گواہی دیتی ہے کہ تخت دؔارا کا، تاج دؔارا کا اور دین کے قاعدے کے موافق بھی آپ ہی تاج و تخت کے اصلی وارث ہیں۔ مگر میں دیکھتی ہوں کہ کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ زمین و آسمان دشمن ہیں۔ گھر سے بے گھر، جنگلوں میں بسیرا لیتے پھرتے ہیں جب بھی لوگوں کو چین نہیں آتا اور ہم کو دنیا سے فنا کرنے کی ترکیبیں سوچی جا رہی ہیں۔ باپ نے جواب دیا۔

دؔارا کی جان دل آرا! جو باتیں کل شام کو ہم نے بیان کی تھیں شاید تم نے اُن کو ذہن سے اُتار دیا۔ بیٹی اسی زبردستی اور زبردستی کا نام دنیا ہے۔ یہی ناکامی اور کامیابی ہے جس کے چکر میں تمام عالم گرفتار ہے۔ یہ نہ ہو تو ساری دنیا بے مزہ ہو جائے۔ اسی اُلٹ پھیر سے یہ کارخانہ چل رہا ہے۔ بھائی اورنگزیب کا کوئی قصور نہیں ہے نہ خدا اور زمانے کی کوئی شکایت ہے۔ قدرت کا دستور یہی ہے کہ ایک بادشاہی کا تاج پہنتا ہے، دوسرا سولی دیا جاتا ہے۔ ایک پاؤں پھیلا کر بیفکری سے سوتا ہے دوسرا پلک جھپکانے کو ترستا رہ جاتا ہے۔ لیکن پیاری اس کی خوشی اور اس کا غم دونوں فانی ہیں۔ قرار ایک کو نہیں بلکہ ذرا اور غور کرو تو معلوم ہوگا کہ خوشی اور رنج فقط وہم و خیال ہے۔ خیال قابو میں ہو تو کیسی ہی سخت مصیبت پیش آئے، انسان اس کو ہیچ سمجھتا ہے اور اُس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی۔ جو باتیں آج کل ہم کو پیش آ رہی ہیں، وہ بھی ایک طرح کی خدمت ہے جو خدا تعالےٰ کی طرف سے انسان کو دی جاتی ہے جس طرح ایک آدمی بادشاہ بنایا جاتا ہے اور اُس کے ذمے حکومت کے فرائض لگائے جاتے ہیں، اسی طرح ایک غریب کو بھی غربت کی خدمت سپرد کیجاتی ہے۔ بادشاہ کو دولت کی شان سے اپنے کام عمدگی سے پورے کرنے چاہئیں۔ اور غریب کو غریبی کی حیثیت سے اس خدائی نوکری کو بجا لانا چاہیئے۔

Marfat.com

بھائی اورنگزیب سے میں اتنا بھی مقابلہ نہ کرتا جتنا کیا۔ دیکھنا صرف یہ تھا کہ آیا واقعی قدرت نے اس کی بادشاہت قبول کرلی ہے یا نہیں؟ اب معلوم ہوتا ہے کہ بے شک خدا تعالے اس کی حکومت اور میری غربت چاہتا ہے۔ یہ ہے تو میں ہرطرح راضی ہوں۔ اورنگزیب جس طرح چاہے ستائے، ہماری سرکوبی اور بیخ کنی کی جیسی چاہے تدبیریں کرے، اس کے لئے یہی شایاں ہے کیونکہ اس کو شاہی طرز کی نوکری پوری کرنی ہے۔ ہم کو سب سختیاں برداشت کرنی چاہیئں کیونکہ ہمارے ذمہ غربت، بیکسی لاچاری اور ہرطرح کی مصیبت لگائی گئی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم سہیں

دارا شکوہ کی یہ تقریر سن کر اس کی بیٹی دل آرا بولی۔

یا اللہ! دل میں اور خلجان پیدا ہوا۔ آپ روز سمجھاتے ہیں مگر مجھ بیوقوف کی عقل میں نہیں آتا۔ پرسوں آپ نے فرمایا تھا کہ ایک ہے اور کچھ نہیں۔ یعنی جو چیز آنکھوں کو نظر آتی ہے، اور جن چیزوں کی صورت خیال کرنے سے ذہن میں جمتی ہے۔ سب کی حقیقت ایک ہے شکلیں الگ الگ ہیں۔ جیسے مٹی کے برتن۔ ایک مٹکا ہے تو ایک آبخورہ ایک ایک کونڈا ہے اور ایک چپنی۔ نام الگ الگ۔ کام الگ الگ۔ شکل وصورت الگ الگ۔ مگر مٹی سب کی ایک۔ یا مثلاً ایک ڈورا ہے جس میں کئی گرہیں لگی ہوئی ہیں۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ گرہ ایک ابھری ہوئی صورت کا نام ہے مگر اصل اس کا ڈورا ہے جو لپٹ کر گرہ بن گیا ہے۔ پہلی چیز جو مسلمان بچہ کو سکھائی جاتی ہے وہ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے جس کے معنی عام طور پر یہ بتائے جاتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا دوسرا نہیں ہے اور محمدؐ اُس کے رسول ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ کلمہ ہی تمام دین و دنیا کی بنیاد بنا دیتا ہے۔ اگر اس کے معنی یوں سمجھائے جائیں کہ ایک خدا کے سوا دوسرا نہیں ہے یا لفظی معنی کہ نہیں ہے کچھ مگر خدا اور محمدؐ اُس کے رسول ہیں۔ اباجان یہ تعلیم میں نے اپنے استاد مولوی صاحب سے بیان کی تھی۔ وہ یہ سُنکر بہت ناراض

Marfat.com

ہوئے اور فرمایا کہ یہ شرک کی باتیں ہیں۔ ان میں پڑ کر آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ دارا شکوہ نے
ہندوؤں کی صحبت اور اُن کی کتابوں کے پڑھنے سے یہ باتیں سیکھی ہیں۔ دین اسلام کو
ان سے کوئی تعلق نہیں ہے اسلام تو یہ سکھاتا ہے کہ خدا ایک ہے اور سب مخلوقات اُس
نے بنائی ہے مگر ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ خدا ہے۔ درخت بھی خدا،
اور جانور آسمان و زمین بھی خدا۔ تو بہ توبہ بالکل کفر کے کلمے ہیں۔ سو حضرت اول تو
میں پرسوں کی باتوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔ آج آپ نے یہ اور نئی باتیں سُنائیں کہ مصیبت
بھی ایک نوکری ہے جس کو خوشی خوشی بجا لانا چاہیئے۔ پرسوں کی باتوں کی نسبت مولوی
صاحب کہتے ہیں کہ قرآن شریف میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے یہ ہندوؤں کی ویدانت
کا مسئلہ ہے جس کو مسلمانوں میں صوفیوں کا گروہ بھی (نہ) کہ وہ کیا دیکھی مانتے لگا اور
آج کی تقریر سُن کر تو میں یہ کی حکم لگاتی ہوں کہ مولوی صاحب اس کو بالکل مسلمانی کے
خلاف بیان کریں گے اور سچی بات یہ ہے کہ میرے جی کو بھی مولوی صاحب کی باتیں
لگتی معلوم ہوتی ہیں۔ بھلا جس کا ذکر قرآن شریف میں نہ ہو۔ وہ ہم کس طرح مان لیں۔
اور بات بھی ایسی کہ سب چیز خدا ہے

دل آرا کی مشکیہ باتیں سُن کر اشکوہ کو جوش آگیا مگر وہ جوش
خفگی و ناراضگی کا نہ تھا بلکہ جس طرح کوئی آدمی جانی پہچانی چیز کا انکار کسی نادان کی زبانی
سن کر افسوس کے جوش میں آ جاتا ہے۔ ایسے ہی دارا کے چہرے پر جوش کے
آثار نمایاں ہو گئے اور نہایت بے پروائی سے بولا۔ دیوانی اس چیز کے وجود پر شبہ
کرتی ہے جو سورج کی طرح ظاہر ہے۔ مولوی صاحب کی ناسمجھی ہے جو قرآن شریف
کو اس تعلیم سے خالی بتاتے ہیں۔ اری نادان قرآن کے دل میں اِنہی باتوں کا خزانہ
ہے۔ ظاہری الفاظ پر عمل کرنا بے کار ہے۔ اصلی معانی پر غور کرنا چاہیئے۔ قرآن شریف
میں جگہ جگہ پایا جاتا ہے، وہ سب پر محیط ہے۔ وہ اول ہے، آخر ہے، ظاہر ہے

Marfat.com

باطن ہے، نیچے سے ہے، اوپر ہے۔ اس کے بہت سے نام ہیں۔ مگر جس طرح قرآن شریف میں ارشاد ہے کہ ہدایت انہی کو ہے جو غور کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ لوگ غور نہیں کرتے بیشک ویدانت کے بھی یہی اصول ہیں، لیکن اسلام کی تعلیم اگر اس کے موافق ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ میں نے کب کہا تھا کہ ہر چیز کو خدا کہنا چاہیئے۔ وہ تو میری مثال سے خیال میں آسکتا ہے کہ جب تک آبخورہ اپنی صورت پر اور شکل اپنی شکل پر قائم ہے اس کو مٹی نہیں کہہ سکتے۔ یا جب تک ڈورے میں گرہ ہے گرہ نام رہیگا، ڈورا نہیں کہا جائے گا لیکن سمجھنا یونہی چاہیئے کہ حقیقت سب کی ایک ہے۔

یہی دوسری بات کہ رنج وراحت آدمی کے فرائض ہیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں ہے جب ہم نے مان لیا کہ ایک ہے اور کچھ نہیں۔ یعنی جو کچھ ہے سب خدا کا ظہور ہے، تو کہیں اس کی شان کرم ظاہر ہے اور کہیں شان غضب۔ ایک کانٹے دار درخت جس میں پھول پھل نہیں آتے، شکایت کرے کہ دوسرے درخت میں پھول بھی خوبصورت ہیں اور پھل بھی مزے دار ہیں۔ مجھے اس سے محروم کیوں کیا گیا تو ہم یہی جواب دیں گے کہ تجھ کو وہ میسر ہے جو پھول دار بیل دار درخت کو نصیب نہیں ہے جو شان تجھ میں ہے وہ اس میں نہیں، جو اُس میں ہے وہ تجھ میں نہیں۔ پھر شکوہ کرنا لاحاصل ہے۔ دل آرا! یہ ایسی اچھی تعلیم ہے کہ اگر انسان اس کو خوب سمجھکر ذہن نشین کرلے تو دنیا کے عیش وراحت اور رنج وغم کے جھگڑوں سے آزاد ہوجائے۔ دنیا کا ترک اسی کا نام ہے کہ اُس کے اتار چڑھاؤ کی تکلیف جاتی رہے۔ یہ نہیں کہ انسان مال ودولت۔ جورو بچے چھوڑ بیٹھے۔ سو پیاری جب میں اپنے بھائی کے برتاؤ کا شاکی نہیں ہوں تو پھر تو کیوں شکایت کرتی ہے۔ بس ہر وقت اس خیال میں غرق رہ کہ

ایک ہے اور کچھ نہیں۔

دُعا

از نظام المشائخ. جولائی ۱۹۱۰ء

دعا مذہبی زندگی کی جان ہے۔ اہلِ مذہب کے نزدیک مذہب کی عملی صورت کا ظہور بہت کچھ دعا پر منحصر ہے۔ دعا سے مطلوب کا حاصل ہونا اور پیغمبرانِ الٰہی کا خاص خاص مطالب کے لئے دعا مانگنا اور اس کا قبول ہونا آسمانی کتابوں سے ثابت ہے۔

اسلام میں دعا کا مرتبہ ضروری اور اہم عقائد میں شمار کیا جاتا ہے۔ مسئلہ ذات وصفات اور فطرۃ اور قوانین فطرت کی طرح یہ مسئلہ بھی نہایت دقیق ہے اور اس کی نسبت صد ہا مختلف رائیں اور جداگانہ اقوال بزرگان اسلام کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔

قرآن شریف میں ارشاد ہے ا۔ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ یعنی اور جب تم سے میرا بندہ مجھ کو طلب کرے (تو کہدو کہ) میں اس کے قریب ہوں قبول کرتا ہوں دعا کرنے والے کا سوال جبکہ وہ مجھ سے مانگے۔"

دوسری جگہ فرمایا۔ اُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ مجھ سے مانگو قبول کروں گا۔"

دعا چونکہ تمام رسولوں کا ورثہ ہے جو امتِ مرحومہ کو عطا ہوا ہے اور جس میں خدائے تعالےٰ نے اعجاز رسالت کی شان باقی رکھی ہے۔ اس لئے بعض لوگوں کو دعا کے معاملہ میں بڑا اختلاف ہے۔ ایک فرقہ دعا کی تاثیر کا بالکل منکر ہے۔ دوسرا اس کے اثر کو خیالی بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قرآن شریف کی اس آیت اُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم جو کچھ دعائیں مانگو قبول کیا جائے گا۔ کیونکہ اس میں دو دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اول یہ کہ ہزاروں دعائیں نہایت عاجزی اور خلوص سے کی جاتی ہیں مگر سوال پورا نہیں ہوتا جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ دعا قبول نہ ہوئی۔ حالانکہ خدا نے استجابت کا وعدہ فرمایا ہے۔ دوسری یہ کہ جو امور ہونے والے ہیں وہ مقدر

ہیں اور جو نہیں ہونے والے وہ بھی مقدر ہیں۔ ان مقدرات کے برخلاف ہرگز نہیں مل سکتا پس استجابت دعا کے معنی سوال کا پورا کرنا قرار دیئے جائیں تو خدا کا یہ دعوی کہ اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ان سوالوں پر جن کا پورا ہونا مقدر نہیں ہے، صادق نہیں آسکتا۔ یعنی ان معنوں کی رو سے یہ عام وعدہ استجابت دعا کا باطل ٹھہرے گا کیونکہ سوالوں کا وہی حصہ پورا کیا جاتا ہے جس کا پورا کرنا مقدر ہے، لیکن استجابت دعا کا وعدہ عام ہے جس میں کوئی بھی استثنا، نہیں پھر جس حالت میں بعض آیتیں ظاہر کر رہی ہیں کہ جن چیزوں کا دیا جانا مقدر نہیں، وہ ہرگز نہیں دی جاتیں۔ لہذا استجابت دعا کے یہ معنی لینے چاہئیں کہ دعا ایک عبادت ہے اور جب وہ قلبی خشوع وخضوع سے کی جائے تو اس کے قبول کرنے کا خدا تعالےٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ گویا دعا عبادت متصور ہو کر عطائے ثواب کا مستحق بناتی ہے اور کسی خاص مسئول عنہ کے حصول سے اسے اسی حد تک تعلق ہے کہ مسئول داعی کے نصیب میں مقدر بھی ہو۔ اس قاعدے سے دعا کا اثر بے کار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو چیز دعا میں مانگی گئی تھی وہ مل تو گئی مگر اس کو تاثیر دعا سے کچھ لگاؤ نہیں۔ تقدیر کی خوبی سے یہ نتیجہ ظاہر ہوا۔ دعا کا صرف یہ فائدہ ہے کہ دعا کرنے کے وقت خدا کی عظمت اور بے انتہا قدرت کا خیال دل میں جم جاتا ہے تو خیالات کی لہریں بھی جمع ہو کر ایک مرکز پر ٹھہر جاتی ہیں اور انسان کی پریشانی وگھبراہٹ، جو کسی خاص فکر سے پیدا ہوئی ہو، مغلوب ہو کر صبر واستقلال سے بدل جاتی ہے اور استقلال کی کیفیت کا دل میں ہونا عبادت کے لیے لازمی امر ہے۔ پس یہی دعا کا مستجاب ہونا ہے۔

دوسرا فریق دعا کی قبولیت پر پورا ایمان رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک دعا کا نتیجہ ضرور حاصل ہوتا ہے اور وہ مذکورہ اعتراض کے جواب میں کہتا ہے کہ دنیا میں کوئی خیر و شر مقدر سے خالی نہیں۔ تاہم قدرت نے اس کے حصول کے لئے

ایسے اسباب مقرر کر رکھے ہیں جن کے صحیح اور موثر ہونے میں کسی عقلمند کو کلام نہیں ہے۔ پہلے فرقہ نے دعا اور ترک دعا میں جس تقدیر کا ذکر کیا وہ تقدیر دوا میں بھی تو موجود ہے مگر سب دیکھتے ہیں کہ دوا کے اثر کو ایسا یقینی مانا جاتا ہے کہ تقدیر کا خیال بھی نہیں آتا اور دوا سے دوری مرض کا پختہ یقین ہوتا ہے۔ جسمانی معاملات میں تو تقدیر کا لحاظ نہ کیا جائے اور روحانی مسئلہ میں تقدیر کو شامل کر کے تاثیر دعا کا انکار کر دیا جائے، یہ کسی طرح قرین انصاف نہیں ہو سکتا۔

ادعونی استجب لکم میں بیشک دعا سے عبادت مراد ہے چنانچہ نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ان الدعاء ھو العبادۃ ثم قرا ادعونی استجب لکم** یعنی فرمایا۔ دعا عبادت ہے۔ اس کے بعد آیت ادعونی استجب لکم تلاوت فرمائی جس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں دعا سے مراد عبادت ہے۔ اس کے علاوہ یہاں دعا کی تعلیم امر کے صیغہ سے کی گئی ہے۔ گویا دعا کو فرض کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ دعا انسان پر فرض نہیں ہے۔ پس معلوم یہ ہوا کہ اس آیت میں دعا سے عبادت ہی مقصود ہے۔ لہذا جو فریق استجابت دعا کے یقینی ہونے کو اس آیت سے نکال کر مسئلہ تقدیر کے ذریعہ سے اشکال پیدا کرتا ہے، اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ آیت عبادت کے متعلق ہے۔ ہاں اس کے علاوہ اور کئی آیتیں ہیں جن سے قبولیت دعا ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ ایک آیت میں تو گویا صاف صاف انہی شکوک کا جواب دیا گیا ہے جو سورۂ انعام میں ہے **بَلْ اِیَّاهُ تَدْعُوْنَ فَیَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ اِنْ شَآءَ**۔ تم خاص اُسی سے دعا مانگتے ہو تو وہ دے دیتا ہے تمہارے مطلوب کو اگر چاہے۔ یہاں تقدیر کا صاف طور سے ذکر کر دیا گیا ہے۔ مگر دنیا میں کوئی چیز تقدیر سے خالی نہیں ہے آگ جلا دیتی ہے۔ پانی ڈبو دیتا ہے۔ ان تاثیرات سے کسی کو انکار نہیں مگر اثر تقدیر کے وقت ظاہر ہوتا ہے۔

Marfat.com

ویسے ہی دعا بھی آگ کی طرح یقینی اثر دار چیز ہے۔ دعاؤں کی شکل خدا نے اس میں بھی تاثیر پیدا کی ہے مگر جس طرح تقدیری گردش کے سبب باوجود دوا استعمال کرنے کے مریض کو فائدہ نہیں ہوتا۔ دعا کا نتیجہ بھی ظاہر نہیں ہوتا۔

آج کل نئی روشنی کے مسلمانوں میں یورپ کی تقلید کے سبب دعا سے بے توجہی ہوتی جاتی ہے اور وہ اس کو ایک فعل عبث خیال کرنے لگے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کے دل کو مصیبت کے وقت تسلی و تسکین کسی صورت سے میسر نہیں آتی۔ کیونکہ دعا کا مانگنا صرف اس یقین پر مبنی ہے کہ خدا تعالے قادر مطلق اور فاعل مختار ہے۔ بیقرار دل کی نکلی ہوئی دعا کا سننے والا اور اس کی حاجت پوری کرنے والا ہے۔ اگر ایک لحظ کے لئے اس یقین میں تذبذب ہو تو کون سا دل ہوگا جو بیقراری کی حالت میں اس کی طرف رجوع کرے، اور وہ کونسا خیال ہوگا جو اس کے اضطرار کی آگ کو ٹھنڈا کرے۔ اس لئے کہ صرف یہ خیال کہ خدا دعائیں سننے اور حاجت پوری کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اضطرار کی حالت میں بندے کا خیال خدا کی طرف رجوع کراتا ہے اور محض اس اعتقاد سے کہ باوجود قدرت کے خدا کا دعا قبول نہ کرنا کسی مصلحت پر مبنی ہوگا اور وہ مسئول عنہ سے بہتر کوئی چیز دے گا۔ دعا کرنے والے کے دل کو تسلی ہوتی ہے اگر دعا کا عمل موقوف ہوگیا اور خدا سے دعاؤں کے سننے اور حاجتوں کے پورا کرنے کا خدائی حق لے لیا گیا تو مذہبی زندگی بھی ختم ہوگئی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ دعا ذریعۂ حصول مقصد نہیں ہے اور یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ وہ اپنے بندوں کی مصیبتوں کے دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتا اور نہ کسی کی گریہ وزاری اور اضطرار و بیقراری کا اثر ہوتا ہے تو دعا بیکار اور توکل فضول ہے۔ پھر یقین اور اعتقاد کو بھی اپنے قدم جمانے کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی اور بندہ کو بجز اس کے کہ وہ غیر تغیر پذیر قوانین فطرت کو اپنا خدا مانے، دوسرا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ ایسی حالت میں انسان کو بے جان قانون سے

Marfat.com

واسطہ رہتا ہے نہ ایک زندہ خدا سے، اور یہ خیال اس محبت کے رشتے کو جو خدا اور اس کے بندوں کے بیچ میں ہے توڑ دیتا ہے۔ اگر اس میں مدد کرنے کی طاقت نہیں ہے تو ہم کس لئے اس پر بھروسہ کریں، اور اگر وہ ہماری دعائیں نہیں سنتا تو ہم کیونکر اسے رحیم مانیں، اور اگر اس میں رحم نہیں ہے تو ہم کیوں اس سے محبت کریں۔ بس اس عقیدہ سے ہمارا یقین جاتا رہتا ہے۔ ہم کو خدا سے محبت باقی نہیں رہتی اور ہم ایسے مذہب کے ماننے والے رہ جاتے ہیں جس میں نہ یقین ہے نہ محبت ہے۔ لہذا اگر دعا کی اجابت ناممکن ہے تو مذہب بھی ناممکن ہے۔

صوفیائے کرام کے تمام سلسلے اجابت دعا کے قائل ہیں اور صرف قائل ہی نہیں ہیں بلکہ ان کو خدا کی طرف سے تاثیرات دعا کا وہ مرتبہ عطا ہوا ہے جو بنی اسرائیل کے پیغمبروں کو حاصل تھا۔ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ نبوت کے آثار میں اس امت کو مقبول دعا دی گئی ہے یعنی جس طرح اگلے زمانہ کے پیغمبر دعا کے ذریعہ اپنے اعجاز دکھاتے تھے ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے اولیاء اسی دعا سے کرامتیں دکھانے پر قادر بنائے گئے ہیں۔ آیندہ پرچہ میں خدا نے چاہا تو ہم ثابت کریں گے کہ صوفیوں کے مختلف خاندانوں کے مشائخ کی دعا کی کیا کیا تاثیریں ظاہر ہوئی ہیں چشتیوں، قادریوں، نقشبندیوں، سہروردیوں وغیرہ کل سلسلوں کے بزرگوں نے اپنی ذات اور قوم کے لئے دعائیں کی ہیں اور اگر ہر دعا کے الفاظ علیحدہ علیحدہ نظر تعمق سے دیکھے جائیں تو صاحب دعا بزرگ کی باطنی کیفیت و اندرونی احساس اور جذبہ کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ یہاں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ پھر کبھی اس کو وضاحت سے لکھا جائے گا۔

اب یہ بات ثابت کرنے کے بعد کہ دعا میں تاثیر ہے اور دعا ہمارے صوفیائے کرام کے کل فرقوں کی مسلمہ چیز ہے۔ اس رسالہ کا شروع اجو صوفیوں کی دینی و دنیوی اغراض کی خدمت

Marfat.com

گزاری کے لئے جاری کیا جاتا ہے اور جس کا آج پہلا پارہ نمودار ہوتا ہے) فضل الٰہی سے یقین ہے کہ جس طرح خدائے تعالیٰ نے صوفیائے کرام کی دعاؤں میں تاثیر عطا فرما کے ان کو ہمیشہ مقبول فرمایا اسی طرح ان کا یہ ماہوار رسالہ بھی اپنی دعا کے ذریعہ سے بارگاہ الٰہی میں قبول ہوگا اور اپنے ابنائے جنس کو فائدہ پہنچائے گا۔

گلیم درویشی کی تنگی

اور

ایک المناک فسانہ

از نظام المشائخ ۱۹۰۹ء

اگلے وقتوں میں کہا کرتے تھے کہ دو بادشاہ ایک اقلیم میں نہیں رہ سکتے مگر دس درویش ایک کمبل میں بسر کر سکتے ہیں۔ آجکل اس کے خلاف پایا جاتا ہے۔ بادشاہت کا تو یہ عالم ہوگیا کہ ہر فرد واحد اپنے تئیں ملک کا حاکم سمجھتا ہے جس سے ایک اقلیم میں کروڑوں بادشاہ نظر آتے ہیں اور درویشوں کی یہ کیفیت ہوگئی کہ ایک گلیم میں دس تو کجا دو درویش بھی نہیں سما سکتے۔ قادری ہوں یا نقشبندی، چشتی ہوں یا سہروردی سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ اصول کے لحاظ سے ان میں کوئی بین فرق یا تفاوت نہیں ہے۔ فروعات ہر مشرب کی علیحدہ ہیں مگر افسوس ہے کہ فروعات کے جھگڑوں سے ان سلسلوں میں ایسی اجنبیت اور غیریت قائم ہوگئی ہے کہ باہم ایکدوسرے سے جدا نظر آتا ہے۔ سب سے پہلے تفریق حد سے زیادہ محبت کرنے سے پیدا ہوئی یعنی اپنے سلسلہ کے مشائخ سے جب مریدین کو تعلق بڑھا تو انہوں نے اس کو اتنا بڑھایا کہ اور تمام مشائخ کو پست کر دیا۔ یہ کیفیت دیکھ کر دیگر مشائخ کے متوسلین نے بھی اپنے بزرگوں کو ناجائز طور سے

دوسروں پر ترجیح اور فوقیت دینی شروع کی اور اس طرح درویشی خاندانوں میں نفسانی کش مکش شروع ہوگئی۔ سب سے پہلے قادری سلسلہ سے لوگوں کو شکایت پیدا ہوئی کہ یہ لوگ حضرت غوث الاعظم محبوب سبحانی رح کو تمام مشائخ عالم پر ترجیح دیتے ہیں اور حضرت غوث الثقلین کا یہ قول کہ قدمی علی رقبۃ کل ولی اللہ (یعنی یہ میرا قدم سب ولیوں کی گردن پر ہے) اس شدومد سے بیان کرتے ہیں جس سے دوسرے خاندان والے بتقاضائے بشریت مشتعل ہوں۔ اس کے بعد چشتیہ طریق کی آزادی اور نقشبندیہ طریق کی محدود خیالی کی نسبت لوگوں کو شکایت پیدا ہوئی۔ خود چشتیہ خاندانوں میں کئی شاخیں ہوگئیں۔ نظامی، صابری، جمالی اور ان شاخوں میں بھی وہی فضیلت کے جھگڑے برپا ہوگئے۔ نظامی کہتے ہیں کہ حضرت بابا گنج شکر رح کے اصلی جانشین اور خلیفۂ اعظم حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رح ہوئے۔ صابری کہتے ہیں کہ تمام باطنی امور کا حصہ حضرت مخدوم صابر رح کو ملا۔ جمالی کہتے ہیں کہ جو نظر خاص حضرت بابا صاحب کی حضرت قطب جمال الدین ہانسوی رح پر تھی وہ کسی اور کو میسر نہ ہوئی۔ نقشبندیوں میں مجددیہ شاخ کے دعوے تمام خاندان سے نرالے ہوگئے حضرت شیخ احمد مجدد سرہندی رح کے ایسے عجیب وغریب دعوے اور ان کے ایسے فضائل بیان کئے جاتے ہیں جو تمام متقدمین مشائخ نقشبندیہ سے مجدد صاحب کو بڑھا دیتے ہیں۔

الغرض نہایت سخت کش مکش سلسلوں میں معمولی باتوں کے سبب پڑی ہوئی ہے جس قدر ذکر کیا گیا سب جانتے ہیں کہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہر شخص اپنے بزرگ اور اپنے شیخ کو سب سے بڑھکر سمجھتا ہے یہ کوئی شکایت کی بات نہیں ہے۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ اس ولولے میں دوسرے بزرگوں کی تحقیر اور تنقیص کی جاتی ہے ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ جہاں دو شخص جمع ہوتے ہیں اور ان میں ایک چشتی ہوتا ہے ایک قادری۔ تو وہ بجائے اس کے کہ کسی مسئلہ تصوف پر بات چیت کریں، فضیلت حضرت

Marfat.com

غوث الاعظمؒ اور حضرت خواجۂ خواجگان اجمیریؒ پر گفتگو کرتے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ حضرت غوث الاعظم سے حضرت خواجۂ بزرگ رحمۃ نے فیض پایا۔ دوسرا کہتا ہے کہ نہیں۔ بلکہ حضرت غوث الاعظم رحمۃ حضرت خواجۂ بزرگ سے فیضیاب ہوئے۔ ان فضول باتوں کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ دونوں بزرگوں کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کرنے لگتے ہیں اور اس نعمت سے محروم ہوجاتے ہیں جو ادب اور تعظیم سے حاصل ہوا کرتی ہے۔

ہم کو بڑا افسوس ہوتا ہے جب سماع کی محفلوں میں حضرت صابرؒ صاحب کا نام قوال کی زبان سے سن کر نظامی درویشوں کو یہ نام لینے سے منع کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ ایسے ہی صابری محفل میں حضرت محبوب الٰہیؒ کا نام لینے سے قوال کو روکا جاتا ہے تو بیحد قلق ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی دانست میں حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اور حضرت مخدوم صابرؒ کی محبت اس میں سمجھتے ہیں کہ دوسرے بزرگ کا نام نہ لیا جائے۔ حالانکہ یہ اُن کی کور باطنی اور جہالت ہے۔ یہ سب بزرگ ایک شان رکھتے ہیں۔ ان میں تفریق کرنا ملتِ عشق میں کفر کے برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے لا نفرق بین احدٍ من رسلہ (یعنی ہم کسی رسول کے مرتبہ) میں فرق نہیں کرتے) اولیاء اللہ مثل انبیاء ہوتے ہیں پھر بھلا ان میں تفریق کیونکر ہوسکتی ہے۔

الغرض اقلیم درویشی کی وسعت کو تنگ خیال لوگوں نے اس قدر چھوٹا کردیا ہے کہ اس میں ایک درویش بھی نہیں سما سکتا۔ اوپر جتنی باتیں لکھی گئی ہیں یہ سب تو ایک حد تک محبت یا علمی روایتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ افسوس آجکل کے زمانے پر ہے کہ محض دنیاوی اور نفسانی کدورتوں سے مشائخ میں تفریق اور جدائی پھیلتی جاتی ہے نقشبندی، قادری، چشتی، سہروردی تو خیر الگ الگ خاندان ہیں، غضب تو یہ ہے کہ ایک ہی خاندان کی مختلف شاخوں میں اس قدر عناد پایا جاتا ہے کہ کوئی

Marfat.com

نہیں کہہ سکتا کہ ان کا آپس میں کوئی تعلق بھی ہے۔

مثلاً نقشبندیہ طریق میں مجددی حضرات غیر مجددی لوگوں سے بالکل ناآشنا اور بے غرض ہیں اور ان کو سوائے مجدد صاحب کے اپنے سلسلہ میں اور کسی سے محبت نہیں ہوتی۔ امیر حبیب اللہ خان والی کابل جب ہندوستان میں آئے تو تمام مشہور مزارات پر حاضری دی مگر حضرت خواجہ باقی باللہ ؒ کے مزار کی زیارت کو نہ گئے۔ کیا یہ تعجب خیز امر نہیں ہے کہ مجدد صاحبؒ کے پیرومرشد کے مزار کی زیارت بیکار سمجھی گئی مگر اس میں شاہ کابل کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر ان کو بتایا جاتا کہ مجدد صاحبؒ کے شیخ کا مزار دہلی میں ہے تو وہ ضرور حاضر ہوتے۔ مگر جو حضرات اُن کے گرد وپیش تھے وہ سب مجدد صاحبؒ کے مقابلہ میں حضرت خواجہ باقی باللہ ؒ کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے یا سمجھتے تھے تو بہت معمولی۔ ورنہ وہ ضرور شاہ کو وہاں کی حاضری کے لئے آمادہ کرتے۔

اسی طرح چشتیوں کا عالم ہے۔ ان کی ایک مشہور شاخ نظامیہ پر غور کیجئے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ حضرت مولانا فخرالدین ؒ سے پنجاب اور پورب میں کئی مسندیں نظامیوں کی قائم ہوئیں۔ بریلی میں نیازیہ، تونسہ شریف میں سلیمانیہ فخریہ خاندان کی مشہور شاخیں ہیں۔ مگر ہم نے کبھی نہیں سُنا کہ سلیمانیہ اور نظامیہ مشائخ میں کبھی اس قسم کا ارتباط پیدا ہوا ہو جو ہر طریقہ اور ہر سلسلہ مشائخ میں ہوا کرتا ہے اور ہونا چاہیئے پنجاب میں فخریہ سلسلہ سے جس طرح تونسہ شریف میں سلیمانیہ مسند قائم ہوئی اسی طرح چاچڑاں شریف میں حضرت قاضی محمد عاقل صاحب کی خانقاہ بڑی مشہور اور با اثر مانی جاتی ہے۔ اس خانقاہ کے مشہور سجادہ نشین حضرت خواجہ غلام فرید صاحب تھے جن کا ابھی حال میں وصال ہوا ہے، اور تونسوی خانقاہ میں خواجہ غلام فرید صاحب کے ہمعصر حضرت خواجہ اللہ بخش صاحبؒ تھے۔ جن کی رحلت کا زمانہ بھی خواجہ غلام فرید صاحب کے

قریب واقع ہوا ان دونوں حضرات کی نسبت مشہور تھا کہ تعلقات کشیدہ رکھتے ہیں مگر مہار شریف کے عرس میں ایک دفعہ یہ دونوں بزرگ جمع ہوگئے اور باہمی ملاقاتیں ہوئیں جس خلوص اور تپاک سے ان بزرگوں نے باہم ملاقات کی ہے وہ اس بات کا نمونہ تھا کہ مشایخ ایسے عمدہ اخلاق رکھتے ہیں. عوام کی سب غلط فہمیاں دور ہوگئیں اور جو فرضی روایتیں کشیدگی اور رنجش کی مشہور تھیں، مجمع کی ایک ہی ملاقات میں صاف ہوگئیں. مگر افسوس ان بزرگوں کے بعد ان کے جانشیوں نے رسم مودت و اتحاد کو تازہ نہ کیا. ہر ایک اپنے مشاغل میں مصروف ہے اور اس عظیم الشان ضرورت کی طرف توجہ نہیں کرتا۔

جس قدر بڑے بڑے عرس نظامیہ خانقاہوں میں ہوتے ہیں، وہاں سوائے انہی مشایخ کے، جن کو صاحب عرس سے کچھ تعلق ہے، اور کوئی عرس میں نہیں آتا اور آتے ہیں تو اس طرح کہ ایک دوسرے کی حالت سے بے خبر رہتے ہیں. ہم نے دیکھا ہے کہ اجمیر شریف میں چشتیوں کے تمام مشایخ، خواہ وہ کسی شاخ کے ہوں، جمع ہوتے ہیں اور محفل سماع میں بازو سے بازو ملا کر کھڑے ہوتے ہیں. لیکن ان سے پوچھا جائے کہ چھ دن کی محفلوں میں تم نے کتنے مشایخ سے واقفیت حاصل کی تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم واقفیت حاصل کرنے نہیں جاتے. ہمارا مقصد سماع کی شرکت ہوتا ہے. اس میں کوئی شک نہیں کہ محفلِ سماع کے آداب کے خلاف ہے کہ وہاں بات چیت اور کلمہ کلام ہو لیکن اس کا کیا علاج کہ ان مشایخ کے باہمی میل جول کا اور ایک جگہ جمع ہونے کا اس سے بہتر اور کوئی موقعہ میسر نہیں آسکتا اگر سماع سے پہلے یا بعد کوئی وقت ایسا مقرر کیا جائے جس میں مشایخ آپس میں میل جول اور تبادلہ خیالات کریں تو کوئی ہرج نہیں. یہ بات جب ہی ہوسکتی ہے کہ مشایخ اس کی ضرورت اور اہمیت اور مفاد کو سمجھتے بھی ہوں. وہاں تو یہ عالم

ہے کہ ہر بزرگ دوسرے بزرگ سے مصافحہ کرنا یا آنکھ ملانا اپنی شان اور وقار کے خلاف سمجھتا ہے۔ پھر کیونکر یہ رسم جاری ہوسکتی ہے کہ "ملاقاتی محفل" قائم ہو۔

قصہ مختصر اس تنگ خیالی اور نقصان رساں کشیدگی اور علیحدگی کو سالہا سال شاہدہ کرنے کے بعد ہم چاہتے ہیں کہ اس کے دور کرنے کا خیال مشائخ میں پیدا کریں، اور یہ خیال جب ہی پیدا ہوسکتا ہے کہ ان کے سامنے بزرگوں کی مثالیں پیش کی جائیں اور یہ دکھایا جائے کہ مشائخ قدیم کا باہمی برتاؤ کیسا تھا اور تم آجکل کیا برتاؤ کر رہے ہو۔ اُن کا طرزِ عمل دین و ملت کے لئے مفید تھا یا تمہارا؟ خدا کو منظور ہے تو ان اوراق میں ہم کل سلسلوں کے مشائخ متقدمین کا وہ تذکرہ شائع کرتے رہیں گے جس سے ہمارا مذکورہ مقصد ہویدا ہوسکے۔ سردست چشتیوں اور سہروردیوں کے پرانے تعلقات لکھے جاتے ہیں کیونکہ ہندوستان میں انہی سلسلوں کا قدم پہلے آیا تھا۔ گو آجکل سہروردی طریقہ کی اشاعت عام نہیں ہے مگر جس زمانہ کا ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں وہ سہروردیوں کے عروج و کمال کا زمانہ تھا۔ امید ہے کہ تمام مشائخ عظام ان واقعات کو غور و خوض اور تعمق سے ملاحظہ فرمائیں گے۔

التمش کی خرقہ پوشی

قبل اس کے کہ چشتیوں اور سہروردیوں کے تعلقات کا ذکر شروع کیا جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہانِ ہند کے مذہبی خیالات کا تھوڑا سا تذکرہ کردیا جائے۔

جب شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان فتح کرلیا تو اس کے نائب اور غلام قطب الدین ایبک نے پایۂ تخت کی بنیاد دہلی میں قائم کی اور فتح کی یادگار میں مسجد قوۃ الاسلام اور قطب مینار بنانا شروع کیا۔ یہ بادشاہ درویشوں کی طرف خاص

Marfat.com

میلان رکھتا تھا۔ مگر اس کی زندگی نے بہت کم وفا کی۔ اس کے بعد جس قدر بادشاہ تخت نشین ہوئے وہ عموماً سب چشتیہ طریق کے تھے کیونکہ دہلی میں چشتیوں کے بہت بڑے پیشوا حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح اجمیری خواجہ کے دربار کی جانب سے تشریف رکھتے تھے۔

ان غلام بادشاہوں میں سلطان شمس الدین التمش سب سے بڑھ گیا اور اس نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے اس قدر عقیدت پیدا کی کہ حضرت کے ممتاز مریدوں میں شمار ہونے لگا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نے اس کو خرقۂ خلافت بھی عطا فرمایا تھا اور حضرت کے وصال کے بعد اسی بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے حضرت کی میت کو غسل دیا۔ مشائخ میں خیال کیا جاتا ہے کہ التمش کو مرتبۂ قطبیت بھی حاصل ہوا تھا۔ بہرحال التمش کی خرقہ پوشی اور چشتیہ خاندان سے گرویدہ ہونے کے سبب ملک میں چشتیوں کی طرف عام میلان ہوگیا تھا اور لوگ جوق جوق اسی طریقہ کے مرید ہو رہے تھے۔

اس زمانے میں ملتان اور دیپالپور وغیرہ سرحدی مقامات میں سہروردی سلسلہ نے قدم بڑھانے شروع کئے تھے۔ چونکہ ملتان بیرونی دشمنوں کے حملہ کی پہلی ٹکر پر واقع تھا۔ اس واسطے شاہان دہلی اس کے استحکام کے لئے چیدہ افسر مقرر کرتے تھے اور ملک کی زبردست فوجیں وہاں رہتی تھیں۔ اس ظاہری انتظام کے ساتھ باطنی انتظام بھی تھا۔ ملک کے نامور علماء و مشائخ خلقت کی روحانی تربیت کے لئے ملتان میں رہتے تھے۔ چنانچہ سہروردیہ طریق کے نامور پیشوا حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ یہیں تشریف رکھتے تھے۔ لوگوں کو ان سے بڑا اعتقاد تھا اور سہروردی سلسلہ نہایت سرعت سے پھیل رہا تھا اسی اثناء میں دہلی سے حضرت خواجہ قطب صاحب کے خلیفۂ اعظم حضرت بابا فرید گنج شکر بھی ملتان کے قریب قصبۂ اجودھن میں تشریف

Marfat.com

لے گئے اور وہیں قیام اختیار کیا. حضرت بابا صاحب کے تشریف لے جانے سے سہروردیہ سلسلہ کی ترقی میں پہلی سی تیزی نہ رہی. مگر اس کا نہ حضرت شیخ الشیوخ شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کو افسوس تھا اور نہ حضرت بابا صاحب کو خوشی تھی. کیونکہ یہ دونوں بزرگ دینی خدمت کر رہے تھے. اُن کو اس سے کچھ سروکار نہ تھا کہ کون خاندان زیادہ پھیل رہا ہے۔

التمش کے بعد سب غلام بادشاہ چشتیوں کے حلقہ بگوش رہے. غیاث الدین بلبن حضرت بابا صاحب کی زیارت کے لئے خود اجودھن (پاکپتن) حاضر ہوا اور ایک روایت کے بموجب اپنی لڑکی حضرت سے منسوب کی بلبن کے آخری زمانے میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ حضرت بابا صاحب کی اجازت سے دہلی کے نائب مقرر ہو کر تشریف لائے، اور حضورؒ غلغلہ اس کی موت سے پہلے اچھی طرح تمام ملک میں پھیل گیا. بلبن اور اس کا بیٹا محمد خان شہیدؒ، جو ملتان کا صوبے دار تھا، حضرت محبوب الٰہیؒ سے دلی عقیدت رکھتے تھے. بلکہ محمد خان تو حضرت کے دو مقبول مریدوں حضرت امیر حسن علا سنجریؒ اور حضرت امیر خسروؒ کو اپنے ہمراہ ملتان لے گیا اور مرتے دم تک پاس رکھا. بلبن کے بعد اس کا پوتا کیقباد بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کا خاص عقیدت شعار رہا اور اس طرح چشتیوں کی دھاک تمام ملک کے دل پر بیٹھ گئی۔

کیقباد کے بعد جلال الدین خلجی اور علاؤالدین خلجی بھی چشتیوں کے حلقہ بگوش رہے. مگر علاؤالدین کا جانشین قطب الدین خلجی چشتیوں سے منحرف ہو گیا اور اپنی نادانی و ناتجربہ کاری کے سبب اس کے درپے ہوا کہ پولیٹکل چال سے

چشتیوں کا زور

توڑ دے چنانچہ اس کے مشیروں نے اس کو صلاح دی کہ جب تک حضرت

Marfat.com

محبوب الٰہی رح کے مقابلہ میں کوئی دوسرا بزرگ دہلی میں نہ آئے گا۔ ان کا زور قائم رہے گا۔ شاہی اختیارات سے ایسے ہر دلعزیز لوگوں کا زیر کرنا آسان کام نہیں ملتان سے سہروردیہ خاندان کے سب سے بڑے پیشوا حضرت مولانا رکن الدین ابوالفتح کو دہلی بلوائیے۔ اوّل تو یقیناً ان کے آپس میں زور آزمائی ہوگی حضرت محبوب الٰہی کبھی گوارا نہ کریں گے کہ ان کی اقلیم میں غیر خاندان کا آدمی سکہ چلائے۔ مولانا رکن الدین چونکہ سلطان کی شہ سے آئیں گے اس واسطے وہ بھی مضبوطی سے چشتیوں کا مقابلہ کرینگے اور دہلی سے اُن کا اثر زائل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کش مکش میں سلطان کا مطلب حاصل ہوجائے گا۔ سلطان نے اس شورہ کو پسند کیا اور ملتان سے حضرت مولانا رکن الدین ابوالفتح کو بلوایا۔ چنانچہ حضرت مولانا ملتان سے روانہ ہو کر دہلی تشریف لے آئے۔ اور وہ وقت قریب آگیا کہ

تلوار اور تسبیح کا مقابلہ

شروع ہو۔ کیونکہ سلطان تلوار کے زور سے حضرت محبوب الٰہی کی تسبیح کو زک دینی چاہتا تھا۔ آجکل کا زمانہ ہوتا تو خبر نہیں کیا حالت ہوتی۔ خود مختار۔ جابر۔ ظالم سلطان کا زمانہ اور ایسی خطرناک چال کہ بھائی کو بھائی سے جنگ کا اندیشہ مگر حضرت محبوب الٰہی رح نے اپنی خداداد حقانیت اور حسن نیت سے سلطان کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے جونہی حضرت مولانا رکن الدین ابوالفتح شہر میں داخل ہوئے سلطان نے بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا اور پوچھا کہ دہلی میں سب سے پہلے کون ملا؟ آپ نے ارشاد کیا جو سب سے اچھے ہیں۔ سلطان نے گھبرا کر دریافت کیا وہ کون ہیں؟ فرمایا۔ مولانا نظام الدین محبوب الٰہیؒ! یہ سُن کر سلطان کا چہرہ فق ہوگیا اور اس نے غیظ و پشیمانی میں اپنا منہ حضرت کی طرف سے پھیر لیا۔ وہ اپنے ہونٹھ چباتا تھا اور حضرت محبوب الٰہی رح کی ایسی

Marfat.com

صاف کامیابی سے بہوت تھا۔ سے کیا خبر تھی کہ یہ لوگ دنیا کے آدمیوں کی طرح چالبازیاں نہیں کیا کرتے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جو چراغ خدا نے روشن کیا تھا وہ ان فریب کاریوں کی پھونکوں سے بجھنا دشوار ہے۔ اس کے مشیروں نے چشتیوں اور سہروردیوں کو جدا گانہ مذہب تصور کر کے یہ چال چلی تھی مگر اب انہیں معلوم ہوا کہ یہ سب تو ایک ہی گھر کے رہنے والے ہیں اور ان میں کچھ بھی اختلاف نہیں۔ ان کے ذہن میں یہ بات وہم و گمان کی طرح نہ آئی تھی کہ حضرت محبوب الٰہی، باوجود اس قدر عظمت و شان کے کہ تمام ہندوستان ان کے قدموں پر سر جھکاتا ہے۔ مولیٰنا رکن الدین ابوالفتح کے استقبال کو شہر سے باہر تشریف لے جائیں گے اور اس طرح بادشاہ کی کی کرائی محنت کو خاک میں ملادیں گے۔

مولانا رکن الدین بشر تھے۔ امکان میں تھا کہ وہ دہلی میں بادشاہ کے پاس ٹھر کر اغوا میں آجاتے اور حضرت محبوب الٰہی ؒ سے مخاصمت شروع کر دیتے۔ مگر حضرت محبوب الٰہی ؒ نے کمال دور اندیشی، کمال اخلاص شعاری، کمال مہمان نوازی اور کمال فروتنی کو کام میں لاکر خود تکلیف اٹھائی شہر سے باہر استقبال کو تشریف لے گئے اور بادشاہ سے پہلے حضرت سے ملاقات کرلی جس کا اثر یہ ہوا کہ مولانا نے بادشاہ سے کہا کہ حضرت محبوب الٰہی ہی تمام دہلی میں سب سے اچھے ہیں جو بادشاہ کے دل پر تیر کی طرح زخم انداز ہوا

ہند کے تاج کو دوسری زک

قطب الدین خلجی اس واقعہ کے بعد فکر میں رہا کہ مولانا رکن الدین کو حضرت محبوب الٰہی سے برہم کرانیکی کوئی اور صورت پیدا ہو مگر مرتے دم تک اس کو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ ادہر تو وہ اس خیال میں تھا ادہر حضرت مولانا رکن الدین خود کیلو کھری کی جامع مسجد میں

نماز کو تشریف لے گئے جہاں حضرت محبوب الٰہی نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس مسجد کا صحن بہت وسیع تھا۔ نماز کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ کو خبر دی گئی کہ مولانا رکن الدین اس مسجد میں تشریف لائے ہیں۔ حضرت یہ سن کر مولانا سے ملنے تشریف لے چلے اور تمام وسیع صحن پیادہ طے کر کے مسجد کے دوسرے حصے میں پہنچے۔ اس وقت مولانا صاحب نماز میں مصروف تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ مولانا کے پس پشت بیٹھ گئے۔ خلقت کا یہ عالم تھا کہ ٹوٹی پڑتی تھی۔ عوام کو نہایت تعجب تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ جیسے شاندار بزرگ نے مولانا کے پس پشت بیٹھنا کیونکر گوارا کر لیا۔ حالانکہ یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔ عارفین ان ظاہری تکلفات کو ہیچ سمجھتے ہیں مگر آج کل کے زمانہ میں تو کبھی کوئی درویش اس بات کو قبول نہ کرے گا کہ دوسرے درویش کے پیچھے بیٹھ جائے اور ہزاروں مرید یہ تماشہ دیکھ رہے ہوں۔ کیونکہ اس کے دل میں ضرور اندیشہ ہوگا کہ اس سے میرے مریدوں کے عقیدے میں کمزوری واقع ہوگی اور میری وقعت کے مقابلہ میں اس شخص کی وقعت بڑھ جائے گی جس کی تعظیم کر رہا ہوں۔ لیکن حضرت محبوب الٰہیؒ نے چھ سو برس پہلے اس وہم کو جھوٹا ثابت کر کے دکھا دیا کہ ایک غیر سلسلہ کے فقیر کی ایسی غیر معمولی تعظیم اپنے مریدوں کے سامنے کی۔ مگر حضرت کی وقعت کو بال بھر صدمہ نہ پہنچا بلکہ اور گرویدگی بڑھ گئی۔

جب حضرت مولانا نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت محبوب الٰہیؒ کے ساتھ کمال تپاک سے مصافحہ و معانقہ کیا اور دونوں بزرگ ہاتھ پکڑ کے باتیں کرتے ہوئے دروازے پر تشریف لائے اور پالکیوں میں سوار ہو کر اپنے اپنے مقامات پر تشریف لے گئے۔

اس ملاقات کی خبر سلطان کو ہوئی تو اس نے بہت پیچ و تاب کھایا مگر کیا کر سکتا تھا خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ آخر اسی آتش حسد میں جلتا ہوا ایک دن اپنے مرغوب غلام خسرو خاں کے ہاتھ سے محل ہزار ستون کی چھت پر قتل کیا گیا۔

Marfat.com

ایک اور پُر اسرار مباحثہ

حضرت مولینا رکن الدینؒ جس کام کے لیئے بلائے گئے تھے، وہ قطب الدین کے ساتھ قبر میں گیا. اب ان دونوں بزرگوں کی ایک اور ملاقات کا ذکر لکھا جاتا ہے جو موجودہ مشائخ کی سبق آموزی کے لئے از بس مؤثر ہے اور اتحاد کا جذبہ ہر قلب میں پیدا کرتا ہے۔

ایک دن حضرت محبوب الٰہیؒ اس مقام پر تشریف رکھتے تھے. جہاں آپ کا مزار ہے کہ ایک شخص خبر لائے کہ حضرت مولانا رکن الدین ملاقات کو تشریف لاتے ہیں حضرت نے خواجہ اقبال کو حکم دیا کہ کھانا تیار کرو. اسی اثنار میں خبر آئی کہ تشریف لے آئے حضرت بالاخانے سے تشریف لائے اور حضرت مولانا کا استقبال فرمایا. مولانا پالکی میں سوار تھے اور پاؤں میں کچھ تکلیف تھی لیکن اسی حالت میں نیچے اترنے کی کوشش فرمانے لگے. حضرت محبوب الٰہیؒ نے اصرار کیا اور نیچے نہ اترنے دیا پالکی زمین پر رکھ دی اور حضرت محبوب الٰہیؒ بھی وہیں رونق افروز ہوگئے. اقبال نے دسترخوان چُنا. کھانے لگائے گئے. انگوری سرکہ دور رکھا تھا مولانا نے فرمایا، سرکہ قریب لاؤ پیالی قریب سرکا دی گئی. حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا اسی شہر کا ہے. مولانا نے جواب دیا، اسی لئے تیز ہے. حضرت نے فرمایا. ہاں اور اسی واسطے عزیز ہے. اس پر لطف بات چیت کے بعد کھانا بڑھایا گیا. خواجہ اقبال نے ایک باریک کپڑے میں سَو اشرفیاں باندھ کر اور چند تھان نہایت نفیس کپڑوں کے ان کے ہمراہ مولانا کے سامنے رکھے. اشرفیوں کی زردی کپڑے سے جھلک رہی تھی. مولانا نے فرمایا استر ذھبک ۔ (اپنے سونے کو چھپاؤ) حضرت محبوب الٰہی رضؓ نے جواب میں فرمایا استر ذھبک وذھابک ومذھبک اپنے سونے کو چھپاؤ. اپنے جانے کو

چھپاؤ، اپنے مذہب کو چھپاؤ) اس جواب سے مولانا بہت محظوظ ہوئے۔ کیونکہ یہ تمام باتیں سلوک کے مقاموں کی تھیں جن کو حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس برجستگی اور فصاحت سے ادا کر دیا کہ مزاح کا مزاح اور بیان کا بیان۔ کوئی شخص اس اختصار اور موزونیت سے درویشی کی باتیں ادا نہیں کر سکتا۔

اس پُر اسرار و لطیف گفتگو کے درمیان میں مولانا رکن الدین کے بھائی مولینا عماد الدین اسمٰعیل نے عرض کیا کہ اس وقت ہندوستان کے دو نامور بزرگ ایک جگہ جمع ہیں۔ اس سے بہتر اور کوئی موقعہ میسر نہیں آسکتا۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہجرت کا کیا سبب تھا؟ یعنی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کیوں فرمائی اگرچہ ظاہری طور پر تو ہر شخص جانتا ہے کہ کفار قریش کی یورش و آزار دہی کے سبب سے ہجرت ہوئی مگر

ہر ظاہر کا ایک باطن ہے

اس ظاہری وجہ کا باطن بھی ضرور ہو گا۔ اس کی تشریح و توضیح کا طلب گار ہوں۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ حضرت سلطان المشائخ جواب ارشاد کریں گے، اور حضرت محبوب الٰہیؒ سلطان المشائخ نے فرمایا۔ نہیں آپ ہی فرمائیں۔ آخر اس کسر نفسی کے تبادلہ کے بعد حضرت محبوب الٰہی نے اول ارشاد کیا کہ فقیر کے خیال میں مدینہ کے ناقصوں کی تکمیل اس بات پر منحصر تھی کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر بار چھوڑیں، سفر کی تکلیف برداشت کریں۔ عزیز و اقارب سے جدا ہوں اور مدینہ میں ہجرت کر کے تشریف لے جائیں تاکہ مدینہ کے ناقصوں کی تکمیل حضور کے فیض صحبت سے ہو جائے۔

مولانا رکن الدینؒ نے یہ جواب سُن کر فرمایا، میرے نزدیک خود حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمالات کی تکمیل ہجرت پر منحصر تھی۔ جب حضورؐ نے کامل طور سے تمام

تعلقات خانہ کو ترک کر کے بے وطنی اختیار کی اس وقت دین مکمل ہوا۔ ان دونوں جوابوں میں ہر بزرگ نے نہایت مزے دار اشارے کئے تھے جن کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ مولانا عماد الدین کا سوال تو محض ہجرت کے متعلق تھا مگر ان حضرات نے جواب ایسے پیرایہ سے دیا کہ اپنی ذات کے متعلق بھی اشارے کنائے ہو گئے مثلاً حضرت محبوب الٰہیؒ کا یہ فرمانا کہ ہجرت مدینہ کے ناقصوں کی تکمیل کے لئے ہوئی بظاہر نہایت سادہ و مودب جواب ہے۔ مگر حقیقت میں حضرت نے خود اپنی ذات کی نسبت اشارہ کیا ہے کہ مولانا رکن الدین کا ملتان سے ہجرت کر کے دہلی آنا، میرے نقص کی تکمیل کے لئے ہے۔ اس کے جواب میں مولانا رکن الدین نے فرمایا کہ نہیں بلکہ خود میری تکمیل دہلی آنے اور آپ سے فیضیاب ہونے پر منحصر تھی۔ بہرحال یہ وہ برتاوے ہیں جن سے اعلےٰ درجے کی یگانگت و اخلاصمندی مترشح ہوتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ علیحدہ علیحدہ سلسلہ کے تھے۔ گو ان میں سے ایک چشتیہ گھرانے کا آفتاب اور دوسرا سہروردیہ طریق کا ماہتاب تھا لیکن طرز عمل سے وہ دونوں ایک جان و دو قالب تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آج کل کے مشائخ نے گلیم درویشی کو اس قدر تنگ کر دیا ہے اور میل جول و رسم اتحاد کو چھوڑے بیٹھے ہیں حلقہ نظام المشائخ نے اس بات کا بیڑا اٹھایا ہے کہ مشائخ میں پھر وہی اگلا سا اتحاد پیدا ہو۔ قادری چشتی، نقشبندی، سہروردی، نظامی، صابری، مجددی وغیرہ سب شیر و شکر ہو کر رہیں اور اپنی ان اغراض کی، جو سب طریقوں میں شامل ہیں، اغیار کے مقابلے میں حفاظت کریں۔ اس اتحاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب سلسلے خلط ملط ہو کر ایک معجون مرکب بن جائیں بلکہ منشاء یہ ہے کہ فروعات کے ناجائز اختلافات مٹا دیئے جائیں۔ ہر شخص دوسرے سلسلہ کے بزرگ کا ادب اسی طرح ملحوظ رکھے جس طرح کہ وہ اپنے سلسلہ کا ادب کرتا ہے۔ اگر ایسا ہونے لگا اور ہمیں تسلی دی گئی ہے

Marfat.com

کہ ایسا ہی ہوگا، تو گلیم درویشی کی وسعت پھر اپنی اصلی شان پر آجائے گی.

خوش خلقی

از صوفی۔ نومبر ۱۹۰۹ء

خوش خلقی کی فضیلت

جس طرح ہمارے رسول صلعم کو تمام رسولوں پر فوقیت اور فضیلت ہے، اسی طرح اُن کے اوصاف وخصائل سب پیغمبروں سے اعلیٰ ہیں. اللہ تعالےٰ نے خود اپنے کلام قرآن شریف میں اس کا ذکر فرمایا ہے. مگر وصف بھی وہ بیان کیا گیا جو تمام اوصاف کی جان ہے. چنانچہ ارشاد ہوا اِنَّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیْمٍ تمہاری پیدائش (اے محمد) بہت بڑے خلق پر ہوئی ہے. اس سے معلوم ہوا کہ حُسنِ خلق ایسی شاندار چیز ہے کہ حضور رسول مقبولؐ کے اعلےٰ اوصاف میں اس کا شمار ہوا. خود رسول مقبول صلعم نے حسن خلق کی فضیلت میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اس کو ذیل میں قلم بند کر کے بدخلقی کی برائی کو لکھا جائے گا اور اس کے بعد بتایا جائے گا کہ حسن اخلاق کیا چیز ہے۔

احمد حاکم اور بیہقی نے حضرت ابی ہریرہ رضؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ عمدہ اخلاق کو پورا کروں۔ ابوداؤد اور ترمذی نے ابوالدرداء سے روایت کی ہے کہ حضرت صلعم نے فرمایا کہ سب سے بھاری چیز جو میزان عمل میں رکھی جائے گی وہ خدا سے ڈرنا اور خوش خلقی ہوگی. ایک دفعہ کسی نے حضورؐ سے دریافت کیا دین کیا چیز ہے؟ حضورؐ نے فرمایا خوش خلقی! اس شخص نے حضورؐ کے داہنی طرف آکر یہی سوال کیا اور یہی جواب پایا. یہاں تک کہ

چاروں رُخ سے پوچھا اور ایک ہی جواب پایا۔ ایک اور آدمی نے دریافت کیا، اعمال میں افضل کیا چیز ہے؟ فرمایا حسنِ خلق۔ کسی نے دریافت کیا باعتبار ایمان کون افضل ہے؟ ارشاد ہوا جو خلق میں سب سے اچھا ہے۔ طبرانی نے "مکارم الاخلاق" میں بروایت حضرت ابی ہریرہ بیان کیا ہے کہ حضرت صلعم نے فرمایا۔ اگر تم لوگوں سے دولت میں نہیں بڑھ سکتے، تو خندہ پیشانی اور خلق حسن میں بڑھ جاؤ۔ حضرت جریر بن عبداللہ کو ایک دفعہ ارشاد ہوا۔ تجھ کو اللہ نے خوبصورت بنایا ہے، اپنے خلق کو بھی خوبصورت بنا۔ حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم اکثر یوں دعا فرماتے تھے۔

(الٰہی تو نے میری اچھی صورت بنائی ہے تو میرا خلق بھی اچھا بنا) دریافت کیا گیا بندہ کو سب سے اچھی کیا چیز دی گئی ہے؟ فرمایا خلق حسن! دوسری جگہ فرمایا۔ قیامت کے دن زیادہ محبوب اور میرے قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہوں گے جن کے اخلاق اچھے ہوں گے۔ فرمایا خوش خلقی گناہ کو اس طرح گھلا دیتی ہے جس طرح دھوپ برف کو۔ فرمایا۔ کوئی تدبیر عقل کی موافق نہیں ہوتی مگر خوش خلقی۔

بدخلقی کی بُرائی

حضرت صلعم سے کسی نے دریافت کیا نحوست کیا چیز ہے؟ فرمایا بدخلقی! فرمایا بدخلقی اعمال نیک کو اس طرح خراب کر دیتی ہے جس طرح سرکہ شہد کو بدمزہ کر دیتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ بدخلق ایسا گناہ ہے جو کبھی بخشا نہیں جائیگا نیز حضورؐ نے فرمایا۔ بدخلق آدمی دوزخ کی تہہ میں ڈالا جائے گا۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے فرمایا، بدخلق انسان اپنی جان کو آفت میں خود پھنساتا ہے۔ وہب بن منبہ فرماتے ہیں۔ بدخلق ٹوٹا ہوا برتن ہے۔ نہ جڑ سکتا ہے، نہ مٹی بن سکت

Marfat.com

ہے۔ حضرت فضیل نے فرمایا بدکار خوش خلق کو بدخلق عابد پر ترجیح ہے۔

خوش خلقی کیا چیز ہے

حضرت خواجہ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ خوش خلقی یہ ہے کہ کشادہ پیشانی رہے اور دولت کو خرچ کرے اور کسی کو ایذا نہ دے۔ واسطی فرماتے ہیں کہ خوش خلقی کی یہ علامت ہے کہ نہ آدمی خود کسی سے دشمنی کرے، نہ کوئی اس سے خصومت رکھے اور مفلسی اور تونگری میں خلقت اس سے راضی رہے۔ شاہ کرمانی کے خیال میں ایذا سے باز رہنا اور مشقتوں کا سہنا خوش خلقی ہے۔ ایک اور بزرگ فرماتے ہیں۔ غربت کی شان سے لوگوں کے قریب رہنا خوش خلقی ہے۔ حضرت ملا علیؒ فرماتے ہیں۔ خوش خلقی تین چیزوں میں ہے۔ محرمات سے بچنا، حلال روزی کا تلاش کرنا اور عیال پر زیادہ خرچ کرنا۔ امام غزالیؒ کی رائے میں خلق کی تعریف یہ ہے کہ انسان سے افعال بآسانی بلافکر و تامل صادر ہوں۔ اگر وہ افعال عقلاً و شرعاً عمدہ ہیں تو خوش خلقی ہے، ورنہ بدخلقی۔ نیز فرمایا خلق فعل کا نام نہیں ہے۔ کیونکہ بہت سے آدمی طبیعت کے اعتبار سے سخی ہوتے ہیں مگر مفلسی کے سبب سخاوت نہیں کر سکتے یا بعض آدمیوں کی طبیعت بخیل ہوتی ہے لیکن ریاکاری سے خرچ کرتے ہیں اور فرمایا جس طرح ظاہری جسم محض آنکھوں یا صرف رخساروں کی موزونیت سے مکمل نہیں کہلاتا جب تک کہ کل جسم کے اعضاء موزوں نہ ہوں۔ اسی طرح خوش خلقی، جو انسان کا باطنی حسن ہے، چار چیزوں سے مکمل ہوتی ہے۔

ایک قوت علم، دوسرے قوت غضب، تیسرے قوت خواہش، چوتھے قوت عدل۔ یعنی ان چاروں طاقتوں کو درجہ اعتدال پر رکھنا۔ علمی طاقت کی ضرورت اس لئے ہے کہ آدمی اس کے سبب اپنے اعمال اور عقائد میں راست رو رہتا ہے۔ اسی طرح

Marfat.com

سے غضب اور شہوانی طاقت پر قابو ہونا محاسنِ اخلاق کے لئے لازمی ہے اور یہ قابو قوتِ عدل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

خوش خلقی کیونکر پیدا ہوتی ہے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح انسان سے ظاہری جسم کی اصلاح ناممکن ہے اسی طرح باطنی درستی بھی دشوار ہے۔ بونا آدمی کوشش سے دراز قد نہیں بن سکتا، کالا رنگ گورا نہیں ہو سکتا، بدصورتی خوبصورتی سے نہیں بدل سکتی۔ ایسے ہی جس کی سرشت میں کج اخلاقی ہے، وہ تدبیر سے خوش اخلاق نہیں بن سکتا۔ مگر یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اول تو یہ بعض جسمانی مثالیں اس مسئلہ پر کما حقہٗ صادق نہیں آتیں دوسرے یورپ کے محققین نے اس کلیہ کو بھی غلط ثابت کر دیا ہے اور جسم کے وہ عارضے، جن کی صحت ناممکن مانی گئی تھی، ان کی تدبیروں سے کم ہوتے جاتے ہیں۔

بدخلقی کا بدل جانا فطرت سے ثابت ہے۔ درندے جانور انسان کی تربیت سے اپنی خونخوار خصلت کو بھول جاتے ہیں تو خود انسان دوسرے انسانوں کی تربیت سے اصلاح پذیر کیوں نہ ہو سکے گا۔ بعض آدمی تو پیدائشی نیک اور خوش خلق ہوتے ہیں لیکن جن کی عادت ابتدا سے بدخوئی اور تنگ مزاجی کی ہوتی ہے وہ بھی خوش خلق بن سکتے ہیں جس کی سب سے آسان ترکیب خوش اخلاق لوگوں کی صحبت ہے۔ صحبت زمانہ قدیم سے لے کر اس نئے زمانہ تک (جو پرانے عہد کی باتوں پر خندہ زنی کرتا ہے) یہ امر مسلّم ہے کہ صحبت کا اثر تمام تعلیمات سے بڑھکر ہے۔ ملنے جلنے کی تاثیر سے آدمی میں انسانیت پیدا ہوتی ہے۔ اسی واسطے مشائخ عظام نے حُسنِ صحبت کو تصوف کی درسگاہ مانا ہے۔

Marfat.com

جس کو خوش خلقی سیکھنی ہو یا کسی دوسرے کو خوش خلق بنانا ہو تو چاہیئے کہ ایک ایسے شخص کی صحبت اختیار کرے جو خوش اخلاقی کا مکمل نمونہ ہو۔

انسانِ کامل کے اخلاق

خوش خلقی کی ذہن نشین تعلیم ایک انسان کامل کی اخلاقی مثالوں کے بغیر دشوار ہے۔ اس واسطے حضرت سلطت پناہ صلعم کے اخلاق کی چند مثالیں معتبر و مستند کتب سے اخذ کر کے لکھی جاتی ہیں مشائخ صوفیہ ان مثالوں کو توجہ اور غور سے ملاحظہ فرمائیں اور اپنے متکبرانہ اخلاق کی تبدیلی میں متوجہ ہوں۔

حضرت رسول مقبولؐ کا قاعدہ تھا کہ بیمار کی عیادت کو خود تشریف لے جاتے غلام کی دعوت منظور کر لیتے، پاپوش مبارک کی خود مرمت کر لیتے، کپڑوں میں پیوند لگا لیتے۔ اپنے گھر والوں کے کام میں شریک ہو کر خود کام کرنے لگتے۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے صحابہ کو تکلیف نہ دیتے بلکہ جو کام خود نہ کر سکتے تھے اس کو دوسرے سے کرانا برا تصور فرماتے تھے جب حضورؐ کا گزر لڑکوں پر ہوتا اُن کو سلام کرتے۔ ایک شخص حضور کے پاس آیا۔ وہ حضورؐ کی ہیبت سے کانپنے لگا۔ حضورؐ نے فرمایا کیوں ڈرتا ہے، میں بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو قریش کی ایک عورت کا لڑکا ہوں جو خشک گوشت کھایا کرتی تھی۔ حضور کا دستور تھا کہ حضورؐ اپنے اصحاب میں اس طرح سے مل جُل کر بیٹھتے کہ اجنبی آدمی حضورؐ کو پہچان نہ سکتا تھا۔ آخر صحابہ نے بار بار عرض کر کے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا جس پر حضورؐ تشریف رکھنے لگے اور لوگوں کو اس امتیاز کے سبب شناخت کی دقت جاتی رہی۔

ایک دفعہ حضرت عائشہ رضؓ نے حضورؐ سے عرض کیا کہ میں آپ پر قربان جاؤں، تکیہ لگا کر کھانا نوش فرمایا کیجیے تاکہ تکلیف نہ ہو حضورؐ نے ارشاد کیا میں اسی طرح کھاؤں گا

Marfat.com

جس طرح بندہ کھاتا ہے اور ویسا ہی بیٹھوں گا جیسا کہ بندہ بیٹھتا ہے۔ حضور کے اصحاب میں سے یا اور کوئی آدمی حضور کو پکارتا تو حضور جواب میں لبیک فرماتے۔ جس قسم کی بات کا حضور کے اصحاب میں پہلے سے ذکر ہوتا تو حضور بھی اُسی کے متعلق باتیں کرتے اگر وہ اشعار خوانی کرتے ہوئے ہوتے تو حضور بھی شعر پڑھتے۔ اگر اصحاب ہنستے تو حضور بھی تبسم فرماتے اور سوائے حرام اور ناجائز امور کے اور کسی بات میں اصحاب کو زجر و توبیخ نہ فرماتے تھے۔ فقیروں میں بیٹھتے، مساکین کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتے۔ جو لوگ اخلاق میں افضل ہوتے ان کا احترام فرماتے تھے۔ جو حضور کے سامنے عذر کرتا اُس عذر کو قبول کر لیتے۔ خوش طبعی فرماتے مگر جھوٹ کو نہ آنے دیتے تھے۔ مباح کھیل کو دیکھتے اور منع نہ فرماتے۔ حضور بچوں کے ساتھ دوڑتے کہ دیکھیں کون آگے نکلے لوگ حضور کے سامنے بلند آواز سے بولتے تھے جس سے حضور کو اذیت ہوتی تھی مگر حضور صبر فرماتے کسی کو مفلسی و بیماری کے سبب حقیر نہ جانتے تھے کسی بادشاہ سے اس کی دنیاوی شوکت کے سبب خوف نہ کرتے تھے۔

حضور نے کبھی کسی عورت یا نوکر کو لعنت نہیں کی۔ اگر حضور سے کہا جاتا کہ کسی کے لئے بد دعا کیجئے، تو حضور اس کو دعا دیتے۔ سوائے جہاد کے حضور نے کسی پر وار نہیں کیا۔ اگر حضور کے واسطے بچھونا بچھا دیا جاتا تو حضور اس پر لیٹ رہتے اور اگر بچھونا نہ بچھایا جاتا تو حضور زمین پر لیٹ جاتے جب کوئی حضور سے ملتا، سلام میں سبقت فرماتے اور جب تک وہ چلا نہ جاتا وہاں کھڑے رہتے۔ اگر کوئی حضور کا ہاتھ پکڑ لیتا تو حضور چھڑانے کی کوشش نہ کرتے۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی چھوڑ دیتا حضور کے پاس کوئی آتا اور حضور نماز میں مصروف ہوتے تو نماز کو مختصر کر دیتے اور پوچھتے کہ تم کو مجھ سے کچھ کام ہو تو کہو۔ کسی مجمع میں تشریف لے جاتے تو جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے۔ کسی کو اٹھانے کی تکلیف نہ دیتے۔ مجمع میں اس طرح پھیل کر نہ بیٹھتے۔ ہاں گھر میں کبھی کبھی

Marfat.com

پاؤں پھیلاکر بیٹھتے تھے جو لوگ حضورؐ کے پاس آتے تھے ان کی خاطر اور تعظیم فرماتے قرابت داروں کے لئے اپنی چادر بچھا دیتے تھے جس تکیہ کے سہارے حضورؐ تشریف رکھتے تھے، آنے والے کو وہ تکیہ عنایت فرماتے کہ اس کے سہارے بیٹھو۔ اگر وہ عذر کرتا تو قسم دیکر تکیے کے سہارے آرام سے بٹھاتے۔ ہر شخص سے ایسا برتاؤ کرتے کہ وہ یہ سمجھتا کہ مجھ سے زیادہ اور کسی پر مہربانی نہیں ہے۔

قصہ مختصر یہ حضورؐ کے حسن اخلاق کا مجمل سا بیان ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان، خاصکر صوفیائے کرام، جو حضور کی پیروی و تقلید کو مقصود و تصور کرتے ہیں، آیا واقعی اس قسم کے اخلاق رکھتے ہیں۔ یا کچھ فرق و تفاوت ہے۔ اب تو مشایخ کی صحبتیں متکبر امراء کے درباروں سے بڑھ کر پائی جاتی ہیں جہاں غرباء اور کم حیثیت لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا اور جو معمولی بات چیت ایسی درشتی سے کرتے ہیں کہ سننے والا خواہ مخواہ مکدر ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب فقراء میں اگلے وقت کے بزرگوں کی سی تاثیریں نہیں پائی جاتیں۔ نہ پہلا سا قال ہے نہ حال۔ ہر چیز میں آسمان زمین کا فرق پڑ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عنایت فرمائے کہ آقائے نامدار مرشد حقیقی حضرت رسول العرب والعجم صلعم کے اخلاق سے سبق حاصل کریں اور یورپ کی خود غرضانہ زندگی میں اسلامی صداقت کے اخلاق کا زندہ نمونہ بنکر نمودار ہوں تاکہ ثقافت کی پیاسی دنیا اسلامی چشمہ حیات سے سیراب ہونے کو آگے بڑھے۔

خونی درویش

از نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۰ء

درویشی اور خونخواری، یہ دونوں الفاظ آپس میں کیسے اجنبی اور نا آشنا معلوم

Marfat.com

ہوتے ہیں جو وجود خاک نشینی کے سبب میدان ہستی میں موجود نظر آتا ہو۔ اس کو خدنگ اندازی سے کیا سروکار۔ مگر زمانہ لئے اور اس کی غلط گو زبانوں نے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا سوڈانی ملا صاحب کے ہمراہیوں کا نام درویش مقرر کر دیا تھا۔

سوڈان مصری حکومت کے جولدیں ایک علاقہ ہے جہاں کوئی ملا صاحب مہدی کے لقب سے نمودار ہوئے تھے اور چند جنگجو اعراب کو ساتھ لیکر سوڈان فتح کر لیا تھا۔ انگریزوں نے جو مصری حکومت کے محافظ ہیں، مصری فوج کے ساتھ ہوکر ملا مہدی صاحب اور ان کے رفقا سے جنگ بازی کی اور آخر شکست و فتح کی متعدد گردشوں کے بعد سوڈان فتح کر لیا جاب تک قبضے میں ہے۔ مجھکو اس سے بحث نہیں کہ ملا حق پر تھے یا ناحق پر، انگریزوں نے ان سے جنگ بازی انصاف سے کی یا نا انصافی سے۔ کیونکہ غیر ملک اور غیر حکومت کے معاملات سے ہمیں کیا واسطہ؟ گفتگو اس معاملہ میں ہے کہ ملا مہدی کے سپاہیوں کو لفظ درویش سے یاد کیا جاتا تھا اور تمام عربی، اردو، انگریزی اخبارات مہدی کی فوج کو درویش کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ آیا یہ لفظ موزوں تھا یا ناموزوں، غلط تھا یا صحیح، جائز تھا یا ناجائز؟

میں کہتا ہوں کہ ملائی لشکر کو درویش کا نام دینے والا یا تو کوئی بڑا ہی نادان اور درویشی طریق سے بے خبر تھا، اور یا اس کو فقرا سے کچھ عداوت تھی اور دانستہ اُس نے ان کے غیر متحرک اور ساکت گروہ کو بدنام و مشتبہ کرنے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا تھا۔

درویشوں کی پرامن معاشرت پر اس سے بڑھ کر کوئی حملہ نہیں ہو سکتا کہ اُن کو شرتی، فسادی طبقے میں شمار کرانے کے واسطے ایسے ناجائز وسائل اختیار کئے جائیں۔

Marfat.com

ملا فہدی کی فوج میں سوائے اس کے کہ وہ بدویانہ زندگی کے مسلمان تھے، کوئی بات درویشی کی نہ تھی۔ خود ملا فہدی صاحب عالمانہ حیثیت کے ایک بزرگ تھے جنہوں نے ظاہری اتقا کے سبب عوام پر ایک خاص اثر حاصل کر لیا تھا۔ اور یہ اثر ان کی دانش مندی سے حصول مملکت میں اُن کے لئے مفید ہو گیا تھا نہ ان کا باضابطہ کوئی سلسلہ تھا اور نہ وہ درویشی طریقے پر سلسلہ چلانا پسند کرتے تھے۔ بلکہ وہ ایک ملکی اور جنگی بیعت لیتے تھے۔ جس کو فقیری بیعت سے کچھ علاقہ نہیں تھا

ایسی صاف صورتوں میں کوئی منصف مزاج ملا صاحب کی فوج کو درویش نہیں کہہ سکتا۔ لہذا ان خونی درویشوں کو اصلی اور حقیقی درویشوں سے جدا کیا جانا ضروری ہے۔

اب مسلمانوں میں کوئی خونی درویش باقی نہیں رہتا جس کی ہستی پر غور کر سکیں اور نظر ہندوؤں کے ایک فرقے پر جاتی ہے جو باعتبار لباس درویش معلوم ہوتا ہے مگر کام درویشی کے نہیں کرتا۔ فقیری لباس کی آڑ میں پوشیدہ ہو کر حصول مملکت کے منصوبے پورے کرتا، بم اندازی اور پستول بازی کے کرشمے دکھاتا ہے۔

یہاں بھی ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ ان کی یہ کوشش جائز ہے یا ناجائز بلکہ کلام اس روش اور طرز میں ہے کہ اس سیاسی جماعت کو خرقۂ درویشی استعمال کرنا زیبا ہے یا نہیں۔

کلکتہ میں میں نے ان خونی درویشوں کے سرگروہ بابو آربند دگھوش سے اسی مسئلہ کے متعلق باتیں کرنے کے لئے ملاقات کی۔ آربند دگھوش بنگال کے نامور فضلا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی انگریزی قابلیت کا بڑے سے بڑے انگریزی

Marfat.com

داں کو اعتراض ہے۔ اگر نوکری کرنی چاہیں تو نہایت معزز عہدہ انگریزی گورنمنٹ ان کو عطا کرے۔ مگر انہوں نے اپنی دانست میں زندگی ملک پر قربان کردی ہے اس لئے بہت سادہ طریق سے بسر اوقات کرتے ہیں اور نوکری نہیں کرنی چاہتے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا چند بنگالی بم اندازی اور بم سازی کے جرائم میں پکڑے گئے تھے جن کی مدت تک اخباروں میں شہرت رہی تھی۔ بابو آربند و گھوش بھی اس جماعت کے ساتھ ماخوذ تھے لیکن تحقیقات سے ان کی شرکت کا کوئی قانونی ثبوت نہ پہنچ سکا اس لئے بری کر دیئے گئے۔ جیل خانے سے واپس آکر انہوں نے کلکتہ میں ایک ہفتہ وار انگریزی زبان کا اخبار جاری کیا جس کا نام "کرم یوگ" ہے کہتے ہیں کہ اس اخبار کا لہجہ انقلاب انگیز ہے مگر ایسے عاقلانہ پیرائے سے مرتب کیا جاتا ہے کہ قانونی مواخذہ کی حد دُور رہجاتی ہے۔

القصہ جب میں نے معلوم کیا کہ بابو آربند و گھوش خود بھی سنیاسی ہو گئے ہیں اور سنیاسی لباس میں پولٹیکل مشن چلا رہے ہیں اور تمام پولٹیکل سنیاسیوں کی افسری بھی انہی کو حاصل ہے تو ملنا ضروری سمجھکر ایک دن ملاقات کی۔ آربندو اردو بہت کم جانتے ہیں اس لئے ترجمان کے ذریعے سے انگریزی میں باتیں ہوئیں۔

اول تو میں نے یہ دیکھا کہ آربندو کا لباس درویشی نہیں ہے اور نہ ان کے گردوپیش کوئی اس لباس کا نظر آیا۔ اس لئے جو خبر مجھ کو دی گئی تھی اس میں شبہہ پیدا ہوا۔ پہلا سوال میں نے آربندو سے یہی کیا کہ کیا تم سنیاسی ہو گئے ہو؟ جس کا جواب انہوں نے متانت آمیز تبسم سے یہ دیا کہ باعتبار ظاہر سنیاسی نہیں ہوں مگر میرا دل سنیاس کو پسند کرتا ہے اور وہ سنیاسی ہو چکا ہے۔ میں نے دریافت کیا تمہارے گرو کون ہیں؟ کہا سوامی وویکا نندجی! اس کے بعد میں نے "کرم یوگ"

کی حقیقت پر گفتگو شروع کی اور پوچھا اخبار کا نام "کرم یوگ" کیوں رکھا ہے؟ جس کا جواب معمولی طور پر یہ دیا گیا کہ اس اخبار کا مقصد لوگوں کو اُن کے فرائض سے آگاہ کرنا ہے اور یہی معنی کرم یوگ کے ہیں. کہا گیا کہ کیا گیتا کے کرم یوگ سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے جہاں سری کرشن جی نے ارجن کو انقلاب پیدا کرنے کا فلسفہ بتایا ہے؟ یہ سُن کر آربندو نے اپنے دور اندیش دماغ کو جنبش دی اور کہنیاں میز پر ٹیک کر مصنوعی مسکراہٹ ظاہر کر کے سر ہلایا اور گیتا کی پیروی کا اقرار کیا لیکن اس اقرار کے بعد ان کا چہرہ فکرمند نظر آنے لگا جس کو وہ اپنی عقلمندی سے دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے.

آخر سوالات کی نوبت اس مقام پر آگئی جو ملاقات کا اصل مقصود تھا. کیونکہ اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ گو یہ خود درویشی لباس میں نہیں ہیں مگر پولیٹیکل درویشوں کی مرشدی کا منصب انہی کو حاصل ہے. یہ باتیں بطور سوال وجواب کے نہیں ہوئیں بلکہ مشورے کے طریق سے کہا گیا کہ جس طرح آپ کو ہندوستان اور اُس کے علوم سے محبت ہے میں بھی بحیثیت ایک ہندوستانی کے ان علوم کا شیدا ہوں. ویدانت نے اپنی برتری وخوبی کا سکہ یورپ و امریکہ میں بھی چلانا شروع کر دیا ہے، اور اس سے ہم کو اسی قدر خوشی ہے جتنی آپ کو ہوتی ہوگی مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض پولیٹیکل کام کرنے والے، جن کو ویدانت سے کچھ تعلق نہیں ہوتا جو سنیاسی لوگ کی ذمہ داریوں سے ناآشنا ہوتے ہیں محض ملکی مصلحت سے سنیاسیوں کا لباس پہنتے ہیں اور اس لباس میں بم اندازی و پستول بازی کرتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے کیونکہ اس سے درویشی لباس سلطنت کی نگاہ میں مشتبہ ہو جاتا ہے اور بیچارے غیر پولیٹیکل درویش خواہ مخواہ پولیس کے شک کا شکار ہوتے ہیں. اگر حالات کی یہی صورت رہی تو ایک دن

تمام ملک کے فقراء، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، اطمینان سے یادِ الٰہی نہ کر سکیں گے اور روحانیت کی تلقین کمزور ہو جائے گی اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ روحانیت کو ضرر پہنچنا ملک کا کتنا بڑا نقصان ہے۔ جس دولت کے سبب ہندوستان اور ایشیا، تمام یورپ و امریکہ میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، وہ یہی روحانی جواہرات ہیں۔ آپ مادی دولت و حکومت کی طلبگاری میں اس اصلی دولت کو برباد نہ کیجئے اور اپنی جماعت کو فہمائش کیجئے کہ درویشی لباس ترک کر دے۔

اس کا جواب بابو آربندو نے ایسا دیا کہ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ باوجود اعلیٰ قابلیت کے اس اعتراض کا تسلی بخش جواب ان کے پاس نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ عذر کر کے بات کو ٹالنا چاہا کہ سادھو اور درویش اپنی بداعمالیوں کے سبب پہلے ہی مشتبہ و بدنام ہو رہے ہیں، اب مزید بدنامی کا انہیں اندیشہ نہ کرنا چاہیئے۔

میں نے کہا اعمال کی بدنامی اصلاح حال سے درست ہو سکتی ہے لیکن اس ناجائز اور خوفناک شبہہ کی بدنامی ہرگز دور نہیں ہوگی۔ جب تک کہ یہ طریقہ ترک نہ کیا جائے جو پولٹیکل درویشوں نے شروع کیا ہے۔ اس کا جواب کچھ نہ دیا گیا اور معلوم ہوا کہ بابو صاحب مکالمہ کی اہمیت کے سبب زیادہ توضیح و تشریح پسند نہیں کرتے لہٰذا گفتگو کسی مفید نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے ختم ہو گئی۔

لیکن ہر محب وطن ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس گفتگو کے مقصد کو ختم نہ سمجھے اور اس بات کی کوشش کرے کہ پولٹیکل مشنری درویشی ہیئت میں نہ رہیں۔ سوامی ویکانند بابو آربندو گھوش کے گرو تھے اور سوامی ویکانند کے گرو سوامی رام کرشن پرم ہنس جی تھے جو دورِ آخر میں بنگال کے نہایت خدا رسیدہ اور عارف بزرگ مانے جاتے تھے۔ میں نے ان کی زندگی کے حالات پڑھے ہیں عجب

پر اثر زندگی تھی. دہلی کے رسالہ "زبان" نے اردو زبان میں اُن کے سوانح شائع کیے ہیں جو لالہ چندو لال صاحب چاول والے سے چھ آنے میں دستیاب ہوتے ہیں. پرم ہنس جی کے تارک دنیا چیلے دو چار اب بھی کلکتہ میں موجود ہیں اور ایک مٹھ میں رہتے ہیں. سوامی سرودھا نند جی سے، جو باغ بازار کلکتہ میں رہتے ہیں، میں نے بھی ملاقات کی. بہت اچھے درویش ہیں اور اپنے گرو کے فیضان کا موثر حصہ رکھتے ہیں مگر ان درویشوں میں پولیٹکل چلبل کا کوئی لگاؤ میں نے محسوس نہ کیا. میری خواہش ہے کہ سوامی پرم ہنس کے تمام ممتاز چیلے بالاتفاق اس بات کی کوشش کریں کہ درویشی صورت میں پولیٹکل مشن بند ہو جائے اور میں یقین کرتا ہوں کہ اگر وہ چاہیں تو بہت آسانی سے ایسا کر سکتے ہیں.

بہرحال اس تمام سمع خراشی کا نتیجہ یہ ہے کہ درویشی لباس کی شان اور اصلی حیثیت کی حفاظت میں ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، یکساں کوشش کریں. کیونکہ درویشی ہی ایک ایسا کوچہ ہے جس میں ہندو مسلمان کا امتیاز نظر نہیں آتا.

درویشی شہادت نامہ

از نظام المشائخ فروری ۱۹۱۰ء

شہادت کیا چیز ہے؟

اصطلاح میں شہادت ایک قسم کی قربانی کو کہتے ہیں جو مذہبی یا ملکی یا معاشرتی امور کی حمایت میں ظاہر ہو یعنی اگر کوئی شخص مذہب یا ملک یا رسم ورواج کی حفاظت میں جان دیدے تو اُس کو شہید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے. ممکن ہے کہ دیگر ممالک اور مذاہب میں بھی شہادت کے لفظ کا کوئی مفہوم با قاعدہ موجود ہو. مگر ہم کو

جہاں تک اس مسئلہ میں گفتگو کرنی ہے اس کا تعلق صرف اسلام سے ہے۔

اسلام نے ظاہر ہو کر جو زبردست اور زلزلہ انگیز چیز پیدا کی وہ شہادت کا عقیدہ تھا ہر شخص جس نے اپنے سر کو اسلام کے آگے جھکایا تھا وہ اپنے وجود کو شہادت کی قربان گاہ میں فنا کر دینے کا متمنی اور طلبگار نظر آتا تھا۔ مسلمانوں کو یقین آ گیا تھا کہ

ایک وجود کی فنا دوسرے کی بقا

کے لئے لازمی ہے۔ جب تک ہم یہ اجسام اسلام پر نثار اور فدا نہ کریں گے، جسد اسلام مستحکم کائنات نہیں بن سکتا۔ لہذا ان کے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں تک میں شوق شہادت کا جذبہ موجیں مارا کرتا تھا اور بارہا دیکھا گیا کہ اُن جنگی میدانوں میں، جہاں بڑے بڑے شیروں، جوانمردوں کا کلیجہ کانپ جاتا ہے، وہاں مسلمانوں کی خانہ نشین نازک کلائیوں والی عورتیں دلیری و بیباکی سے تلوار چلاتی تھیں۔ انسانی خون کے رنگ کی مہندی لگاتی تھیں۔ خاک و خون سے لتھڑے ہوئے کپڑے ان کو اطلسی و حریری لباس کا لطف دیتے تھے اور عرصۂ کارزار کی جگر خراش آہ و بکا اُن کے کانوں میں شیریں نغمے بن کر جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ تکبیروں کے نعرے مارتی ہوئی برچھیوں اور تلواروں کی نوکوں سے رزم گاہ کو درہم برہم کر ڈالتی تھیں۔

یہ ذوق شہادت جس گھرانے کا عطیہ تھا، خدا تعالےٰ نے اسی خاندان کو نمونہ بنا کر دکھایا جس سے شہادت کی اصلی شان نظر آ گئی۔ مگر پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کائنات ہستی میں آ کر اشیاء کا ظہور دوسری اشیاء کی شہادت یعنی فنا سے ہوتا ہے۔

Marfat.com

جنس آدم سے قطع نظر کرکے عناصر اربعہ کے اجزاء کو علیحدہ علیحدہ دیکھیے کہ جب تک ایک وجود فنا نہیں ہوتا، دوسرا وجود موجود ہستی پذیر نہیں ہو سکتا۔ آگ کی ہستی کو معدوم کرنا ہو تو پانی کا وجود قربان کیجئے۔ پانی کا نشان مٹانا ہو تو آگ کی زندگی خرچ کیجئے۔

بھاپ، جس کے بل پر نئی دنیا کے کارخانے چل رہے ہیں۔ ریلیں دوڑتی پھرتی ہیں، جہاز سمندر میں لہراتے ہیں، یہ کیا ہے؟ اور کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ سب جانتے ہیں کہ پانی کی شہادت و قربانی سے جو آگ کی تپش سے ہوتی ہے، بھاپ کا طلسماتی جسم تیار ہوتا ہے۔ یعنی پانی آتشی حرارت کے خنجر سے ذبح ہو کر اپنا جسم چھوڑ دیتا ہے اور بھاپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

دانہ خاک میں ملتا ہے، اپنا نام و نشان مٹاتا ہے تو شگوفہ اور درخت کا وجود ظاہر ہوتا ہے۔ دانہ شہید نہ ہو، اپنی ہستی قربان نہ کرے اور کہے کہ میں کیوں پرائے واسطے اپنے تئیں خاک میں ملاؤں اور برباد کروں تو تمام دنیا بھوکی مر جائے کیونکہ دانہ ہی کی قربانی ہے جس کی بدولت چار دانے پیدا ہوتے ہیں اور انسان و حیوان ان کو کھا کر اپنی زندگی قائم رکھتے ہیں۔

روئی اپنے وجود کی قربانی کرتی ہے تو سوت تیار ہوتا ہے اور آدمی کے تن پوشی کے قابل بنتا ہے۔ ورنہ سب برہنہ مادرزاد پھرا کرتے یا درخت کے پتوں سے ستر پوشی کرتے۔ مگر اس میں بھی یہ اندیشہ تھا کہ درخت پتوں کی قربانی سے انکار نہ کر دیں۔

کھانے میں صرف دانے کی مثال پر موقوف نہیں ہے۔ دانہ کے بعد شہادت اور قربانی کا سلسلہ دور تک جاتا ہے۔ دانوں کی شہادت سے آٹا ظاہر ہوتا ہے آٹے کی شہادت سے روٹی نمودار ہوتی ہے۔ روٹی کی شہادت سے پرورش کا

Marfat.com

ظہور ہوتا ہے۔ الغرض اسی شہادت کی بنیاد پر سب کارخانہ قائم ہے۔

تیل نہ جلے تو تاریکی کون دُور کرے۔ روشنی کہاں سے پیدا ہو. بتی آتش آرہ سر پر نہ چلوائے تو لوگ اندھیرے میں ٹکراتے پھریں، اورہاں جن کے دم سے سب گھروں میں روشنی ہے اور جن کو حقارت سے تنکا سمجھا جاتا ہے، وہ تو شہادت کی خاص شان رکھتے ہیں. اُن کی مقبول شہادت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا.

دیاسلائی کی شہادت

پر ذرا تفصیل سے غور کیجئے. عجب دردناک قصہ ہے. جنگل میں ایک ہرا بھرا درخت لچکدار شاخوں اور نرم نرم پتّوں سے چھایا ہوا کھڑا تھا ایک صاحب گئے اور ایک نئے وجود کے لالچ میں درخت کو شہید کر ڈالا. اس کے بعد ایک گرم چشمے کے کھولتے ہوئے پانی میں جوش دے کر کھال کھینچ لی. پھر مشین کے دوسرے خنجر سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے. تیسری مشین نے یہ صورت بھی مٹا دی اور چھیل کر پرت بنا دیئے. چوتھی نے ان پرتوں کو بھی کتر ڈالا اور دیاسلائی کے ننھے ننھے تنکے بن گئے ان تنکوں کو اول گندھک اور تیزاب کے پانی سے وضو کرایا گیا. اس کے بعد بکس کی مسجد میں بھیجدیا. اب میاں تنکے بکس کی سیاہ جانماز پر ایک ہی رگڑ دار سجدہ کرنے پائے تھے کہ غیبی خنجر آگ کی صورت میں نمودار ہوا اور تنکے کو شہید کر دیا تنکا تو آن کی آن میں جل کر نابود ہو گیا مگر اس کی شہادت ایسی مقبول ہوئی کہ فو. آ خانۂ تاریک روشنی میں آگیا مسجد. گرجا. مندر. شراب خانہ غرض ہر مقام نے تنکے کی شہادت سے فائدہ اٹھایا.

باغ میں تشریف لیجائیے. نہر کا پانی درختوں میں آ کر جذب و فنا ہو رہا ہوگا

Marfat.com

باغ کی شادابی اسی شہادت پر منحصر ہے. پانی قربان نہ ہو تو درخت جل کر رہ جائیں.
ذرا پھولوں کو بھی دیکھئے. کیا بہار ہے. توڑ لیجئے. یہ نازک ہستی بھی شہادت کا ارمان رکھتی ہے اور وہ یہی ہے کہ آپ ان کو توڑ لیں اور ٹہنیوں کے سایہ سے جدا کر کے اپنے ساتھ گھر لے جائیں. ہار بنا کر گلے میں ڈالیں. چادر بنا کر قبر پر چڑھائیں سہرا گوندھ کر سر پر رکھیں یا شکر ملا کر گلقند بنائیں ہر حال میں خدمت کو حاضر ہیں. یہ قربانی سے انکار کرتے تو تفریح کی کتنی کیفیتیں نابود رہتیں.

ہا. مگر آپ بھی کس قدر ناانصاف ہیں. ان پھولوں کو شہید کر کے گھر لے چلے تو پتوں کو دونا بنا لیا تاکہ سورج کی تپش سے ان کا جسم کمھلا نہ جائے. مگر کربلا میں اپنے رسولؐ کے نواسے کو شہید کر کے دھوپ میں تپنے دیا اور حرم رسولؐ کو جو گلاب کی پنکھڑیوں سے زیادہ نازک اور لطیف تھیں بے چادر کر کے پھرایا. یہ خیال نہ کیا کہ یہ بھی پھول ہیں، مرجھا جائیں گے.

القصہ نتیجہ ان سب مثالوں سے یہ نکلا کہ شہادت دوسرے کے فائدے کے واسطے اپنا وجود فنا کر دینے کا نام ہے اور یہ ایسی چیز ہے جس کی تمام موجودات میں ضرورت ہے. جو شخص اس ضرورت سے انکار کرے وہ گویا تمام بدیہات سے انکار کرتا ہے اور اس کو بصارت و بصیرت سے محروم سمجھنا چاہیئے.

شہادت خوشی کی چیز ہے یا غم کی

اب یہاں ایک نہایت باریک اور نازک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب شہادت کارخانہ عالم میں ایسی مفید اور ضروری شے ہے تو اس کے سبب ماتم کیوں کیا جاتا ہے غمگینی و افسوس کو اس سے کیا تعلق. آہ و بکا کا اس سے کیا سروکار. مگر یہ کچھ ایسی پیچیدہ بات نہیں ہے جس کا جواب نہ ہو. جو چیز شہید ہو رہی ہے اس کو تو اپنی

Marfat.com

موت کا کچھ افسوس اور غم نہیں ہوتا اور نہایت بے پروائی اور اطمینان سے اپنی ہستی مٹانے کو آمادہ ہوتی ہے. مگر غیروں کے دل پر اس کی چوٹ کا لگنا فطرتی امر ہے. بشرطیکہ ان دلوں میں آدمیت کا حس اور درد شناسی کا مادہ بھی ہو. پروانہ اگر شمع کی شہادت دیکھ نہ سکے اور بے چین ہو کر در و دیوار سے سر ٹکرائے تو شمع اور نفس شہادت پر کوئی الزام قائم نہیں ہو سکتا. یہ تو بہت خود غرضی ہے کہ جس چیز نے ہمارے فائدہ کے لیئے اپنی جان دے دی اُس کا ہم رنج بھی نہ کریں.

جو بتی پہلے جل چکی ہوتی ہے اس کا سرا آگ جلدی پکڑ لیتا ہے. لیکن کوری اور نئی بتی کو، جس نے پہلے آگ کی شکل نہ دیکھی ہو مشکل سے روشن کیا جاتا ہے. اسی طرح جن دلوں میں اللہ تعالیٰ نے محبت کی آگ کا نشان لگا دیا وہ تو عالم کی تمام شہادتوں میں درد محسوس کرتے اور اثر پذیر ہوتے ہیں لیکن جو ازل سے سنگین سرشت پیدا ہوئے ہیں، وہ اس بھید کو سمجھنا کیا سمجھنا چاہتے بھی نہیں.

شہادت حضرت امام علیہ السلام کے جس قدر واقعات شعرا نے لکھے ہیں اور ان میں شہیدوں کی بے سروسامانی اور مایوسی کی تصویریں کھینچی ہیں یا اُنکے اہلبیتؑ کی بیقراری و نالہ وزاری کے نقشے دکھائے ہیں. یہ سب ہمارے غم کو استوار اور اثر دار کرنے کے لئے ہے. ورنہ ان باتوں کی کچھ اصلیت نہیں. حضرت امام اور ان کے خاندان نے شمع سے بڑھکر سکوت و اطمینان ظاہر کیا اور نہایت دلیری و ثابت قدمی سے ظہور حق کے لئے جانیں قربان کر دیں.

اسلام میں شہادت کی ابتدا

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ شہادت کیا چیز ہے اور دنیا میں اسی کے بل پر سرنا

کام چلتے ہیں اب یہ جاننا چاہیئے کہ اسلام میں شہادت کا دَور کب شروع ہوا اور کون کون بزرگ درجۂ شہادت کے وارث قرار پائے؟

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے معرکہ کی لڑائی بدر میں پیش آئی تھی جہاں حضورؐ کے مٹھی بھر صحابہ نے کفارِ قریش کے دَل بادل لشکر کو پیس کر رکھ دیا۔ اس معرکہ میں جو مسلمان شہید ہوئے ان کا مرتبہ بعد کی لڑائیوں کے شہدا سے زیادہ مانا جاتا ہے بلکہ جو لوگ زندہ واپس آ گئے وہ بھی شرکتِ بدر کا فخر شہدا کی طرح کرتے تھے اور مسلمان ان کے فخر کو تسلیم کر کے ان کی عظمت و بزرگی کو دیگر مجاہدین پر فوقیت دیتے تھے۔ اسی طرح شہادت کا سلسلہ بدر سے اُحد وغیرہ میدانوں کے سبب جڑ پکڑتا گیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں آج تک دین کی حمایت و حفاظت میں جان دینا شہادت خیال کیا جاتا ہے۔

مگر مشائخ صوفیہ نے جس شہادت کو سب سے برگزیدہ شہادت مانا ہے وہ فنائے نفس اور فنائے ماسوی اللہ ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام میں سب سے بڑی عمر والوں میں حضرت ابو بکر صدیقؓ تھے اور چھوٹی عمر میں حضرت مولیٰ علیؓ تھے، اور عورتوں میں بی بی خدیجۃ الکبریٰ تھیں جنہوں نے تمام قوم، تمام ملک بلکہ تمام دنیا کو لات مار کے کلمۂ توحید کے آگے سر جھکا دیا اور تمام ملکی، قومی، خاندانی تعلقات کو ترک کر کے خنجر سے ذبح کر ڈالا۔

اس شہادت کے بعد دوسری شہادت کا رتبہ حضرت مولیٰ علیؓ کو حاصل ہوا اور وہ ہجرت کا زمانہ تھا جبکہ کفار نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے شہید کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو آنحضرتؐ نے مدینہ شریف کو ہجرت کرنی چاہی مگر کفار نے گھیر ڈال رکھا تھا جس سے بچ کر نکلنا آسان نہ تھا۔ اس وقت ایک فدائی کی قربانی درکار تھی جو حضورؐ کے بستر پر لیٹ رہے اور حضورؐ کے عوض اپنی جان دیدے

Marfat.com

لڑکر مرجانا دوسری بات ہے یوں موت کے منہ میں کوئی نہیں جا سکتا مگر آنحضرت کے قدیمی فدائی علیؓ نے، جوایک بار شہادت کا رتبہ حاصل کر بھی چکے تھے اس جان جوکھوں خدمت کو قبول کیا اور بستر رسولؐ پر لیٹ گئے۔ ان دو شہادتوں کے بعد حضرت کو تیسری شہادت بھی خدا تعالیٰ نے عطا فرمائی یعنی ابن ملجم کے خنجر سے زخمی ہوکر شہید ہوئے جو امیر معاویہ کا بھیجا ہوا تھا

لڑائیوں سے قطع نظر، اسلام میں سب سے پہلے شہید عمر فاروقؓ ہیں جوایک پارسی غلام کے ہاتھ سے مسجد میں شہید ہوئے۔ اُن کے بعد تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنی رضؓ کو مسلمانوں کے ایک گروہ نے غلط فہمی سے شہید کر دیا۔ اگرچہ ان کی شہادت محض غلط فہمی کے سبب ہوئی یعنی محمد بن ابی بکر وغیرہ کی جماعت کو ان کی نسبت وہ شبہ ہوا جس کا ان کو مطلق علم نہیں تھا اور جس میں ان کی بے گناہی کا سب کو اقرار ہے۔ مگر ان کی شہادت نے اس امر کا راستہ کھول دیا کہ خود مسلمان اپنے ہم مذہب لوگوں کو شہید کرنے لگے۔ حالانکہ کفار کے ہاتھوں شہادت کا جام حاصل ہوا کرتا تھا۔

حضرت مولیٰ علیؓ کی شہادت کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادے سیدنا حضرت امام حسنؓ کو معاویہ نے زہر دیکر شہید کرادیا اور پھر ان کے چھوٹے فرزند سیدنا حضرت امام حسینؓ کو کربلا میں لے جاکر مسلمانوں ہی نے بھوکا پیاسا ذبح کر ڈالا اور یہی وہ شہادت ہے جو اسلام میں سب شہادتوں سے زیادہ مشہور، زیادہ پُردرد، زیادہ درجہ والی زیادہ ہر دل عزیز اور نہایت مہتم بالشان چیز مانی جاتی ہے۔ اسی شہادت کی یادگار میں ہم نے بھی اپنے رسالہ کا شہید نمبر نکالا ہے۔

سیدنا ومولانا حسینؓ کی شہادت کو اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے۔ حالانکہ ان سے پہلے اور ان کے بعد سینکڑوں مسلمان نہایت بے کسی اور بے بسی کے عالم میں

Marfat.com

شہید کئے گئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو حالات اور واقعات سیدنا و مولانا حسینؓ کو پیش آئے اُن کا سانہ گذشتہ تاریخوں میں ذکر پایا جاتا ہے نہ بعد کے تذکروں میں اس قسم اور اس طرز کا کوئی واقعہ موجود ہے۔

سیدنا و مولانا حسینؓ کی شہادت میں حسب ذیل خصوصیات تھیں جو اور کہیں نہیں پائی جاتیں۔

حضرت اُس زمانہ میں تھے جبکہ اسلام کا نشوونما تازہ تازہ ہوا تھا اور ہر فرد کے دل میں اپنے مذہب کی محبت ہر چیز سے زیادہ پیاری تھی۔ خاصکر اپنے رسولؐ کی اُلفت میں ہر مسلمان کا یہ عالم تھا کہ وہ دل و جان سے آنحضرتؐ پر نثار تھا اور حضورؐ کے تعلق کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز مسلمانوں میں بہت بڑے ادب کی مستحق مانی جاتی تھی۔ ایسی حالت اور ایسے زمانہ میں خاص رسولؐ کے نواسے پر مسلمانوں کا یہ ظلم و ستم کرنا کس قدر عجیب تھا اور حضرت مولانا و سیدنا حسینؓ کے دل پر جو صدمہ اُن لوگوں کی بے وفائی و جفا شعاری کا گذرتا ہوگا وہ ہزار خنجر و سنان سے بڑھ کر تھا کہ کل کے دن جو لوگ رسولؐ کے نواسے کی حیثیت سے اپنی آنکھیں میرے قدموں میں بچھاتے تھے، آج وہ میرے سینہ پر پاؤں رکھ کر گلا کاٹتے ہیں۔

(۲) اہل و عیال کی معیت بھی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی نظیر تاریخ میں کم ملے گی۔ ممکن ہے کہ کسی مقتول کے ساتھ اُس کے خاندان والے بھی ہوں مگر جو حالات سیدنا و مولانا حسینؓ کو بال بچوں کے ہمراہ ہونے سے پیش آئے وہ اور کسی کو ہرگز ہرگز پیش نہ آئے ہوں گے

مختلف سن و سال کی عورتیں، ننھے ننھے بچے اور بھی بیمار جن کو ہر مذہب و قوم نے قابل رحم سمجھا ہے۔ تین روز بھوک پیاس سے تڑپے مگر حضرت کو بے کسی کے سبب کچھ چارۂ کار نہ تھا۔

Marfat.com

ہمارے عقیدہ میں اُس وقت خیمۂ امامؑ کی یہ تصویر تھی۔

ظہر کا وقت صحرائے عرب کی تپش، خیمے کی قناتوں سے آگ کی لپٹیں آرہی ہیں پانی کو بند ہوئے دوسرا دن ہے حضرت امام مستورات کے خیمے میں تشریف لے گئے دیکھا سب کے چہروں پر بھوک پیاس کی شدت سے ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ ہونٹ خشک ہیں اور آنے والے وقت کے کھٹکے سے سب پر یاس وہراس کا عالم طاری ہے حضرت نے اپنی ہمشیرہ حضرت زینبؓ سے کہا۔ بہن! اگر تمہاری رائے ہو تو یزید کی بیعت قبول کر لوں کیونکہ مجھ سے تمہاری تکلیف نہیں دیکھی جاتی اور خبر نہیں میرے بعد تم پر اور کیا کیا ظلم وستم ہوں بیعت کے اقرار سے یہ مصیبت جاتی رہے گی۔

اکیلے اور بے یار و مددگار بھائی کی زبان سے یہ کلمے سن کر حضرت زینبؓ نے اپنی چادر کے آنچلوں کو الٹ دیا اور بنی ہاشم کے تیوروں میں بے باک ہو کر بولیں۔ بھائی! تم میرا امتحان لیتے ہو۔ ہاشم کے گھر کی لڑکیاں کم ہمت اور ڈرپوک نہیں ہوتیں وہ اپنی آن اور حق کی حمایت میں جان دینی کچھ بات نہیں جانتیں۔ اے بھائی۔ جاہلیت کے زمانہ میں عرب کی عورتیں بچہ کی پیدائش کے وقت سب سے بڑی آرزو اُس بچہ کی یہ کرتی تھیں کہ یہ میدانوں میں تلوار چلانے والا، خون میں نہلانے اور نہانے والا ہو۔ پھر اسلام نے اس جنگی خیال کو شہادت کے درجات بیان کرکے اور بھی مستحکم کر دیا تو کیا ہم میں عرب نسل اور مسلمان ہونے کے باوجود حرارت نہیں ہے۔ یا حسینؑ! میں علیؑ کی بیٹی ہوں۔ جو خون کے میدانوں میں بے پروائی سے گھوڑا دوڑاتا تھا۔ جو دشمن سے لڑتا نہیں تھا بلکہ شیر کی طرح اپنے پنجوں سے کھلاڑیاں کرتا تھا۔ وہ جو فقر و فاقہ میں بھوک پیاس کو شرافت کا جوہر سمجھتا تھا۔ میں اپنے باپ کی اصل نسل لڑکی ہوں مجھکو عیب نہ لگا میں تیرے سر کو خاک وخون میں لتھڑا ہوا دیکھ کر فخر کروں گی کہ ہم وہ لوگ ہیں کہ حق کی پاسداری میں کٹ کر مرجاتے ہیں اگر تو نے یزید کی بیعت قبول

Marfat.com

کرلی تو ہمارے خاندان کے لئے اس سے بڑھکر کوئی ننگ و عار نہ ہوگی کہ ایک فاسق فاجر کی بیعت زندگی کے لالچ سے منظور کرلی. میں جانتی ہوں کہ تو میری زندگی کا سہارا ہے تیرے سوا میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے اور ایک فقط مجھ پر کیا منحصر ہے رسول کے خاندان میں ہر شخص تیرے وجود کو اپنا سہارا اور پناہ سمجھتا ہے مگر غریب زینبؑ کے لاچار بھائی! حق بات کی حمایت میں جان دیدے. ہمارا کچھ فکر نہ کر. ہم تکلیف و مصیبت کو آسانی سے برداشت کرنے والے لوگ ہیں.

حضرت زینبؑ کی تقریر ختم ہوچکی تو امام اپنی زوجہ شہربانو کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

تم کہو. تمہارا کیا خیال ہے؟ بانو نے شرم آلود ادب سے نظریں جھکا کر کہا میں ہر حال میں تابع فرمان ہوں. جو میرے مالک کی مرضی ہو اُس کی تعمیل کروں گی. اگرچہ میں حضرت زینبؑ کی طرح فخر تو نہیں کرسکتی مگر اتنا ضرور عرض کروں گی کہ میری پیدائش ایران کے شہنشاہ کے گھر میں ہوئی تھی اور اب بھی ایک شہنشاہ کے گھر میں ہوں بس ایک حرارت والا اور ہمت والا دل میرے سینہ میں بھی حرکت زن ہے. نازک وقت میں میری بے صبری کا اندیشہ میری توہین و حقارت ہے. اے امام! ان سب بچوں کو جو میری گود کی زینت ہیں بلکہ برسوں کی محنت سے پالا ہے، جن کے دیکھنے سے میری زندگی قائم ہے. میدان میں لے جایئے قربان کردیجئے. میں بھی قربان اور یہ بچے بھی. میں نہیں چاہتی کہ آپ حق کی پاسداری کے خیال کو میرے خیال سے چھوڑدیں چلیئے تاجدار ایران کی لڑکی اپنے شریف خون کا وصف دکھائے. میدان میں چلیئے میں رکاب تھام کر چلوں گی اور تیروسنان کے میدان میں آپ کے قدموں پر جان دیدوں گی.

حضرت امامؑ عورتوں کی اس دلیری سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا. شاباش

Marfat.com

ایسا ہی خیال رکھنا۔

ان باتوں کے باوجود حضرت امام بشر تھے۔ جوان جوان بچوں کا سامنے کٹ جانا، ننھے ننھے بچوں کا بھوک پیاس سے بلبلنا اور اس پر یہ خیال کرنا کہ میرے بعد میرے ناموس کا کیا حال ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ بنی ہاشم اور رسولؐ کے گھر کی مستورات کے ساتھ دشمن ناروا بے عنوانی کریں۔

الغرض بال بچوں کی ہمراہی بھی ایک بڑا امتحان تھا جس نے حضرت کی شہادت میں خاص خصوصیت پیدا کر دی تھی۔

(۳) بھوک پیاس میں بہت آدمی شہید ہوئے ہوں گے مگر جو کیفیت حضرت امام اور ان کے خاندن کی تھی وہ کسی کو پیش نہیں آئی۔ پورے تین شب و روز کا بھوکا پیاسا رہنا، گرمی کا موسم عراق کی گرمی، چاروں طرف سے تکلیف کے اسباب گھیرے ہوئے تھے۔ پھر اس پر طرّہ یہ کہ بچوں کی زبانیں پیاس کے مارے نکلی پڑتی تھیں اور حضرت امامؑ آنکھوں سے یہ تماشا دیکھتے تھے۔

آمریکہ کے ایک تشریح داں ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ جب انسان ۲۴ گھنٹہ پیاسا رہتا ہے تو اس کے ہر رونگ میں ایسی تکلیف ہوتی ہے گویا ایک ایک زخم پڑ گیا ہے پس حضرت امامؑ اور ان کے فدائی ۷۲ گھنٹے کامل پیاسے رہ کر جب برچھی و تلوار کے زخم کھاتے ہوں گے تو ظاہر ہے کہ کیسی تکلیف ہوتی ہوگی۔ ایسی دردناک تکالیف کو برداشت کرنا اور امر حق سے قدم نہ ہٹانا شہادت کی اعلیٰ خصوصیت ہے۔

(۴) سارا کنبہ آنکھوں کے سامنے کٹ گیا۔ سوائے ایک طفل بیمار کے کوئی باقی نہ رہا جس سے بقائے نسل کی امید ہو۔ اس پر بھی قول کی حمایت کرنا اور مرنے کو تیار ہو جانا مخصوص شہادت کا ثبوت ہے۔

(۵) آخر وقت تک اپنے اشغال و قواعد کو جاری رکھنا اور مصیبت سے حواس

Marfat.com

باختہ نہ ہونا بھی خصوصیات امام ؑ سے ہے۔ حد ہے کہ سر کٹتے کٹتے نماز پڑھی اور سجدہ ناغہ نہ کیا۔

اس شہادت کے بعد

اکثر سادات و مشائخ اسی قصور پر شہید ہوئے جو حضرت امامؑ کے ذمہ لگایا گیا تھا یعنی جس طرح یزید بن معاویہ کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ حضرت امام حسینؑ کی زندگی میں اُس کی بادشاہت پختگی سے نہیں جم سکتی اس لئے کسی بہانہ سے ان کا قصہ پاک کر دینا چاہیئے۔ ایسے ہی حضرت امام کے بعد متعدد اماموں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ سب ائمہ اطہار کو ہوس پرست نام کے مسلمان بادشاہوں نے شہید کیا بعض سادات کو ایسی بے رحمی سے شہید کیا گیا کہ ان کی تفصیل بیان کی جائے تو کلیجہ کانپ اٹھے۔ سیدوں کے نازک جسم، جو ریشمی کپڑوں کی طرح نرم اور خوبصورت تھے، اموی اور عباسی خلفاء نے زندہ دیواروں میں چنوا دیئے اور اُن غریبوں نے پھڑک پھڑک کر جان دے دی۔

حضرت امام حسینؑ اور اُن کی اولاد کے بعد پولٹیکل بدگمانی کی وبا ایسی پھیلی کہ جو شخص عبادت و یادِ خدا کے سبب خلقت میں ذرا عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اُس بیچارہ پر آفت آجاتی۔ یا تو جلاوطن ہوتا۔ یا کسی شرعی بہانہ کی آڑ میں قتل کر دیا جاتا۔ اس کی صدہا مثالیں تاریخ کے صفحوں پر موجود ہیں جن میں سے چند اس شہید نمبر میں لکھی گئی ہیں باقی پھر کسی موقع پر بیان ہوں گی۔

حضرت شہاب الدین مقتول کو محض ان کے کمالات و تسخیر خلائق کے سبب بیدردی سے مار ڈالا گیا۔ حضرت منصور کو خفیہ منصوبہ باز تصور کر کے دار پر کھینچ دیا۔ سرمد کو دارا کا درد مند یقین کر کے۔ اور اس اندیشہ سے کہ کہیں سرمد لوگوں کو انتقام کے لئے

کھڑا نہ کر دے، بے سروپا الزام لگایا گیا اور بے گناہ قتل کیا گیا سیدی مولہ کی ہر دل عزیزی و بزرگی و سخاوت جلال الدین خلجی جیسے نیک سلطان کو بھی کھٹکی اور بیچارے درویش کو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا۔

اب آخر زمانے میں ترکی سلطان کے پیر و مرشد سید ابوالہدیٰ رفاعی کو نوجوان ترکوں نے تاریک کوٹھری میں بند کر کے محض اس جھوٹے شبہہ میں مار ڈالا کہ سید صاحب ان کے پولیٹیکل منصوبوں میں حارج تھے۔

یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ میں مسلمان بادشاہوں پر ظلم و سفاکی کا بیجا الزام لگاتا ہوں یا میرے دل میں اسلامی حکومت کی کوئی غلطت نہیں ہے بلکہ مقصود بزرگان دین کی شہادت کا احوال لکھنا ہے۔ اس کے ضمن میں لازمی طور پر قاتل و مقتول کے حق و باطل پر نظر جاتی ہے اور ائمہ اطہار و مشائخ کبار بے گناہ و مظلوم معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ سب قصور شخصی و خود مختارانہ حکومتوں کا تھا جو قاعدہ اسلام کے برخلاف تھیں۔ اس لئے ہر مسلمان خود ایسی حکومت ہی کو سرے سے ظلم و سفاکی کا مظہر خیال کرتا ہے۔ اسلام نے جمہوریت و مساوات کی حکومت قائم کر کے کامل حریت انسانوں کو عطا فرمائی تھی۔ مگر لوگوں نے اپنے ذاتی فوائد کی خاطر اصول اسلامی کو کچل ڈالا اور شخصی بادشاہت قائم کر دی۔

شخصی حکومتوں میں ہمیشہ خود غرض لوگ بادشاہ کے گرد جمع رہتے ہیں اور بادشاہ ان کے ہاتھ میں کٹ پتلی ہوتا ہے اور کٹ پتلی نہ بنے تو کیا کرے۔ اکیلا بشر تمام ملک کی خبرگیری و حفاظت میں مجبور محض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود مختار بادشاہ حاشیہ نشین لوگوں کے بہکانے سے خوں ریزیاں اور بے انصافیاں کیا کرتے ہیں۔ ہم کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ خود مختار بادشاہوں میں بعض ایسے دل و دماغ کے تھے کہ ہزاروں آدمیوں کی متفقہ رائے ان کی رائے کے سامنے نکمی اور کمزور ثابت ہوتی تھی۔ لیکن ایک آدمی

Marfat.com

پھر ایک ہی ہے ہمیشہ اس کی رائے پر بھروسہ نہیں ہو سکتا ۰

جو بزرگان دین خود مختار بادشاہوں کی غلطیوں سے شہید ہوئے وہ سب بے گناہ و مظلوم تھے۔ اس کی نسبت ہم کچھ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ مگر جن شہدار کا اس شہید نمبر میں ذکر ہے وہ یقیناً ناکردہ گناہ شہید کئے گئے ۰

غالباً یہ معلوم کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ بعض مشائخ کبار نے جب خود مختار بادشاہوں کی دست درازیاں دیکھیں اور ان کو اپنی جان کا اندیشہ ہوا تو انہوں نے بارگاہ الٰہی میں بددعا کی۔ جس سے وہ بادشاہ ہلاک و تباہ ہو گئے۔ مثلاً ہمارے سرتاج سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کی نسبت جب ناتجربہ کار سلطان قطب الدین خلجی کو مشورہ دیا گیا کہ حضرت سلطان المشائخ کا وجود پولٹیکل حیثیت سے تیری تاجداری کو نقصان پہونچائے گا تو اس نے آپ کو آزار پہونچانا چاہا۔ اور قریب تھا کہ ایک چاندرات کو حضرت کا آفتاب حیات ابر شمشیر میں پوشیدہ کر دیا جائے تو خدا نے حضرت میں اپنی شان قہاری کو ظاہر فرمایا اور حضرت نے گرج کر یہ شعر پڑھنا شروع کیا ؎

اے روبہک چرا نہ نشستی بجائے خویش　　　با شیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

یعنی او لومڑی اپنی جگہ کیوں نہ بیٹھی رہی۔ شیر سے پنجہ کیا۔ اپنی سزا دیکھی حضور کا یہ شعر پڑھنا تھا کہ بادشاہ کے ایک منظور نظر غلام نے بادشاہ کا سر کاٹ ڈالا۔ اور اس طرح وہ آہنی پنجہ جو حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہیؒ کی اذیت کے لئے بڑھایا گیا تھا غیب کے فولادی پنجے سے آن کی آن میں شکست کھا گیا ۰

اب نئے زمانہ کے مؤرخ اس واقعہ پر طرح طرح کے حاشیے چڑھاتے ہیں مگر ہمارا تو ایمان یہ ہے کہ خود مختار سلطان کو اور تمام دنیا کو یہ دکھانے کے واسطے کہ کوئی دوسری با اختیار طاقت بھی موجود ہے جو سب طاقتوں و حکومتوں کی

Marfat.com

نگران ہے اور زبردست کو زیردست کر دینا اس کو کچھ مشکل نہیں۔ یہ واقعہ ظاہر ہوا اور حضرت محبوب الٰہیؒ کو ظالم کے شر سے بچایا گیا۔

ناظرین: خود مختار بادشاہوں کی حرکات پر اگر انصاف کی نظر ڈالیں گے تو انکو لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس وقت انسان انسان نہ تھا بلکہ گھاس پھوس کی طرح بالکل زندگی بسر کرتا تھا۔ جس کو ہر وقت جان و آبرو کا خوف دامنگیر تھا۔ آزادی جو ہر آدمی کی فطرت میں رکھی گئی ہے ہمیشہ دل کے قیدخانہ میں بند رہتی تھی۔ زبان اور قلم پر مہر لگی ہوئی تھی کہ آزادی نکل نہ آئے۔ اس میں مذہب کو کچھ دخل نہ دینا چاہئے۔ کیونکہ خود مختاری ہر ملک۔ ہر مذہب۔ ہر قوم میں یکساں ضرر پہونچاتی تھی۔ اس لئے میرا روئے سخن مسلمان بادشاہوں کی طرف نہیں ہے۔

اس زمانہ میں زیادہ دولت مند ہونا۔ زیادہ بارسوخ ہونا۔ زیادہ خدا پرست ہونا قابل دار جرم تھا۔ کیونکہ اسی قسم کے آدمی بغاوت کا جھنڈا بلند کیا کرتے تھے۔ مگر آج خدا کے فضل سے جمہوریت و مساوات کا دور ہے آزادی خوش و خرم ہر گھر میں چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ زیادہ دولت مندی زیادہ عزت کی علامت ہے۔ زیادہ رسوخ ہونا بادشاہ کی نظر میں ممتاز بناتا ہے۔ عبادت و خدا پرستی کی روک ٹوک نہیں ہے بلکہ آزادی اتنی بڑھی ہے کہ شیطان پرستی سے بھی کوئی نہیں روکتا۔

جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خدا آسمان سے مینہ برساتا ہے تاکہ زمین میں سبزی و غلہ پیدا ہو۔ ہوا چلاتا ہے تاکہ ہم اس کے سہارے زندہ رہیں۔ یا اس نے چاند سورج۔ پانی۔ بجلی۔ وغیرہ چیزیں انسان کے عام فائدہ کے لئے پیدا کی ہیں اور انکو دیکھکر ہم اپنے محسن اور رحیم خدا کا شکر و حمد بجا لاتے ہیں۔ اسی طرح ہم کو اس کا شکر بھی ادا کرنا چاہئے کہ اُس نے آزادی کی حکومت عطا فرمائی۔ جس کے سایہ میں ہم نہایت بے فکری اور امن سے زندگی بسر کرتے ہیں اور جس طرح چاہیں اور

جس قدر چاہیں خدا کی عبادت کر سکتے ہیں۔ کوئی مخل اور حارج نہیں ہے۔ اب ہماری مذہبی برتری یا تقدس کی عالمگیری سے کسی کو بدگمانی نہیں ہوتی ؛

اس لئے

اے حجروں اور گوشوں میں رہنے والے بزرگو! باہر نکلو اور آزادی سے حق کے نعرے لگاؤ۔ اب منصور و سرمد کی طرح تم کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیگا۔ یہ توپ خانے یہ فوجیں۔ یہ رسالے یہ سنگینیں۔ یہ چھاؤنیاں سب تمہاری ہیں۔ اور تمہارے ہی امن و سکون کی خاطر پرے جمائے کھڑی ہیں۔ شکر کرو۔ کس کا؟ آدمی کا نہیں۔ خدا کا۔ جس نے اپنی رحمت سے یہ آزاد حکومت عطا فرمائی ؛

انگریز و ترک۔ افغان و ایران۔ ہند و جاپان۔ سب الفاظ ہیں جن کو دیکھنا تمہاری شان سے بعید ہے۔ تم تو حقیقت و معانی کو دیکھنے والے ہو۔ یہ اشکال و صُور تو تمہارے عقیدے میں نابود و بے حقیقت ہیں ؛

ہاں یہ مت سمجھو کہ حکومت عیسائیوں کی ہے یا موسائیوں کی۔ انگریزوں کی ہے یا افغانیوں کی ہے۔ کالوں کی ہے یا گوروں کی۔ بلکہ طریق حکومت کو دیکھو اس کے اثر و کیفیت کو مشاہدہ کرو۔ کہ اس میں کس قدر راحت۔ آسایش۔ سکون و خاموشی ہے۔ خدا تعالیٰ اس آزادی کو برقرار رکھے۔ اور ہم کو دوسرا درویشی شہادت نامہ لکھنے کے وقت موجودہ وقت میں کوئی ظاہری واقعہ نہ ملے۔ اور مجبور ہو کر باطنی شہادت کی طرف رجوع کریں جو شہادت اکبر ہے اور جس کا حاصل کرنا ہر صوفی کا مقصود حقیقی ہے ؛

نوٹ :۔ یہ مضمون فلسفۂ شہادت کے نام سے علیحدہ رسالہ میں بھی شائع ہوا ہے جو ہر سال محرم میں بکثرت تقسیم ہوتا ہے یہ نظام المشائخ کے شہید نمبر میں شائع ہوا تھا۔ حسن نظامی۔

Marfat.com

مستانہ بزم مولود

نئے الفاظ میں پُرانے مطالب

از رسالہ نظام المشائخ دہلی

دن آ گئے کہ ہم فراق کی راتوں سے رخصت ہوں۔ ربیع الاول کا چاند عرب کے افق سے بلند ہونے کو ہے۔ آؤ سب ملکر اس کو دیکھیں اور چشم منتظر کو ٹھنڈا کریں۔ سارا جہان اس ماہِ مبارک میں اس پاکیزہ وجود کے میلاد کا ذکر کرے گا جو تمام موجودات کے وجود کا سبب ہے۔ ہم بھی جہان میں ہیں۔ کیوں نہ ایک بزم میلاد منعقد کریں ۔

نظام المشائخ کے اوراق کا فرش بچھا دو۔ حروف کے نقش و نگار سے محفل کو آراستہ کر دو۔ اور صدائے مستانہ سُنو ۔

ہم اپنی محفل میں اغیار کو نہیں بلائیں گے۔ نہ کوئی اس قابل ہے کہ اس شاندار بزم میں مدعو ہو سکے۔ رقعہ خدا کو گیا تھا اور اس سے درخواست کی گئی تھی کہ ہماری مجلس کی صدارت قبول فرمائے اور اپنی مرضی سے جسکو چاہے شرکت جلسہ کی دعوت دے۔ سو اس نے لوح محفوظ کے چکنے کاغذ پر مطبع وحی میں حسب ذیل اعلان چھپوا کر اخبار القرآن میں شایع کر دیا ۔

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝

Marfat.com

"خدا اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود پڑھتے ہیں۔ تم بھی اے ایمان والوں اسپر درود سلام بھیجو" ؛

چونکہ القرآن کثیر الاشاعت اخبار ہے۔ بیشمار اہل ایمان اس بزم درود سلام و ذکر خیر الانام کی شرکت کے لئے جمع ہو گئے اس وقت صدر انجمن صاحب جل جلالہ وعم نوالہ کرسی لامکان پر جلوہ افروز ہوئے اور اپنی افتتاحی تقریر آواز ہُو میں شروع کی جو یہ تھی ؛

فرشتوں! اور جنٹلمین (ایمان دار آدمیوں)!! میں خوش ہوں کہ تم سے آج کے دن شان تعین میں خطاب کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ تمہاری کوئی بزم ایسی نہیں ہے جو میرے دائرہ وجود سے باہر ہو۔ مگر یہ محفل ایک خاص محفل ہے جسمیں علانیہ میری تجلی تم سے ہمکلام ہوتی ہے۔ آج کے جلسہ کی غرض یہ ہے کہ ہم سب اسم کثرت کی شان میں اس نور کا ذکر کریں جو ہماری ذات وحدت مآب کا ذکر بشکل حمد و ثنا میں تھا۔ جبکو ہم نے احمدؐ بھی کہا اور محمدؐ بھی ؛

میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ کس کا ذکر کیونکر کیا جائیگا۔ سنو سنو۔ ہر وجود اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے اس کا ذکر کرے۔ مگر ہم کبریائی کے مالک ہیں سب کچھ ہمارا ہے۔ سب کچھ ہم میں ہے۔ سب کچھ ہم سے ہے۔ اور سب کچھ ہم ہیں۔ اسلئے ہمارا ذکر صرف ان الفاظ میں ہوگا ؛

اے کملی اوڑھنے والے اُٹھ۔ رات کو ہماری یاد کر۔ لوگوں کو ہدایت کا رستہ بتا۔ ہماری شان سے ان کو آگاہ کر۔ مانگ۔ تجھ کو دیا جائیگا۔ بول اس کو سنا جائیگا سفارش کر۔ قبولیت ہوگی۔ اے اندھیری رات کی مثل سیاہ گیسو والے۔ اے صبح کی روشنی کی مانند منور چہرے والے میں تجھ کو پسند کرتا ہوں۔ تو ازل سے ابد تک میرا ہے۔ تجھ پر میرا سلام ؛

فرشتوں! تمہارا ذکر یہ ہے کہ اس آدم زاد کو سجدہ کرو۔ مومنوں! تم اس کے احکام

کی اطاعت کرو۔ یہی تمہارا ذکر ہے۔

جب حضرتِ قدس اپنا ایڈریس ختم کر چکے تو ایک گدڑی پوش مست کھڑا ہوا اور جھوم جھوم کر کہنے لگا۔

جنابِ باری! و دیگر یارانِ خراباتی! میں دیوانہ ہوں اور عقل و خرد سے بیگانہ۔ اجازت دیجئے کہ میں اپنے ممدوح کا ذکر اس قاعدہ اور ضابطے سے نہ کروں۔ جس کا مجمل خاکہ پریسیڈنٹ صاحب نے قایم کر کے دکھایا ہے بلکہ ذوق و شوق اور ولولے میں جو چاہوں کہہ جاؤں۔ چیئرز (نعرۂ حق) امید ہے کہ آنریبل چیئرمین مجھ ذرۂ بمقدار کی گستاخی و بے ادبی سے ناراض ہو کر ظلوماً جہولاً سے زیادہ کوئی اور دوسرا خطاب تجویز نہ فرمائیں گے خندہ اور زور شور سے چیئرز (نعرۂ حق)

میں حضرت سبحانی سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآنی دعوت نامہ میں جس نبیؐ پر درود و سلام بھیجنے کا ذکر ہے وہ کونسا نبی ہے۔ کیا وہ جس کا خاکی وجود سب سے پہلے بنا۔ اور جس کے متحرک ہونے کیواسطے خود ذات ربانی نے اپنے دم کو بلایا۔ اور آ۔ دم کے حکم کو سُنکر سب موجودات نے اس پیکرِ خاک کو آدم کا لقب دیا۔ یا وہ جسکو نوحؑ کہتے ہیں۔ جس نے حضرت کی شان قہر کو طوفان آب پر علانیہ جنبش کرتے دیکھا۔ یا نبی مراد آپ پر فطرتاً ایمان لانے والے ابراہیمؑ ہے اُن سے ہی یا جنہوں نے طور پر راز و نیاز کے کلام کے بعد ذرا ابیاکانہ جرأت پر وہ اٹھانے کی کی تھی۔ یا نبی کا لفظ ابن مریم کی شان میں فرمایا گیا ہے۔ جو آپ کی حیران کرنے والی نشانیوں میں ایک نشانی تھے۔

اگر یہ سب نہیں تو کیا وہ یتیم جو آمنہ کی آغوش میں پلا۔ وہ جو چھوٹے سے قد پہ لمبے لمبے بال بکھیرے لکڑی ہاتھ میں لئے بکریاں چراتا تہا۔ وہ جو کمبل اوڑھ کر آیا۔ اور دوشالہ اڑھا کر گیا جس نے جَو کا آٹا کھایا اور گیہوں کا کھلایا؟

پروردگارا ہمیں بتا۔ کیا وہی جو امن میں شیر کی طرح شیریں اور صاف۔ اور جنگ میں

Marfat.com

شیر کی مانند دلیر وصف شکن تہا۔ کیا وہی جو نیزہ و شمشیر کا مالک اور میدان کارزار کی رونق تہا۔ جس کی پشت دشمن نے کبھی نہیں دیکھی۔ جسکا قدم ہمیشہ آگے بڑہتا رہا۔ وہ جس کو آپ کی گورنمنٹ نے خلق عظیم کی ڈگری عطا فرمائی۔ وہ جو غریبوں۔ بیکسوں۔ لاوارثوں کا ولی و سرپرست تہا۔ وہ جو مدینہ کی گلیوں میں معمولی آدمیوں کی طرح چلتا پھرتا تہا۔ آہ۔ آہ آہ۔ وہ تو نہیں جس کی آنکھوں کی یاد نے ہم کو آنسوؤں کے دریا میں ڈبو رکھا ہے ؟ اگر وہ ہے تو ہم کو اجازت دیجائے کہ اس کی محبت کا جام سر جلسہ نوش کریں رحیز اور اس دربار میں جتنے مجھ جیسے مستانے ہیں ان کو رخصت ملے تاکہ ؎

خراباتیاں مے پرستی کنند
محمدؐ بگویند و مستی کنند

رند خراباتی اس قدر گفتگو کرنے پایا تہا کہ محفل میں گردش پیدا ہوئی اور عاشقان سوختہ تڑپنے لگے۔ تجلی کی بجلیاں چمکنے اور کڑکنے لگیں۔ اور ہوا جو ہوا۔ بیچارہ حسنؔ کی مجال نہیں کہ اس سے زیادہ اس محفل کی نسبت زبان کھولے ؛

صاحب بزم میلاد کے اخلاق

اس مستانہ و بے باکانہ بیان کے بعد بزم میلاد کے سالکانہ طریق کو ادا کیا جاتا ہے جس میں میرے عقیدے میں سب سے زیادہ مفید اور ضروری صاحب میلاد کی اخلاقی خوبیوں کا تذکرہ ہے۔ جن کو احادیث کی معتبر روایتوں سے اخذ کر کے لکہا جاتا ہے ؛

جس طرح ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام رسولوں پر فوقیت اور فضیلت ہے اسی طرح ان کے اوصاف و خصائل سب پیغمبروں سے اعلیٰ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام قرآن شریف میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر وصف بھی وہ بیان کیا گیا جو تمام اوصاف کی جان ہے۔ چنانچہ یہ ارشاد ہوا۔ انک لعلی خلق عظیم تمہاری پیدائش اے محمدؐ

Marfat.com

بہت بڑے خلق پر ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حسن خلق محمدی شاندار چیز ہے۔ کہ حضور رسول مقبولؐ کے اعلےٰ اوصاف میں اس کا شمار ہوا خود حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حسن خلق کی فضیلت میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کو ذیل میں قلمبند کیا جاتا ہے:

احمد حاکم اور بیہقی نے حضرت ابی ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ عمدہ اخلاق کو پورا کردوں۔ ابو داؤد اور ترمذی نے ابوالدرداء سے روایت کی ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ سب سے بھاری چیز جو میزان اعمال میں رکھی جائے گی وہ خدا سے ڈرنا اور خوش خلقی ہوگی۔ ایک دفعہ کسی نے حضورؐ سے دریافت کیا۔ دین کیا چیز ہے؟ فرمایا۔ خوش خلقی۔ اس شخص نے داہنی طرف آکر یہی سوال کیا اور یہی جواب پایا۔ یہاں تک کہ چاروں رُخ سے پوچھا اور ایک ہی جواب پایا۔

ایک اور آدمی نے دریافت کیا۔ اعمال میں افضل کیا چیز ہے؟ فرمایا حُسن خلق۔ کسی نے عرض کیا۔ باعتبار ایمان افضل کون ہے۔ فرمایا۔ جو خلق میں سب سے اچھا ہے۔ طبرانی نے مکارم الاخلاق میں بروایت حضرت ابی ہریرہؓ کے بیان کیا ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ۔ اگر تم لوگوں سے دولت میں نہیں بڑھ سکتے تو خندہ پیشانی اور خلقِ حسن میں بڑھ جاؤ۔

حضرت جریر بن عبداللہ کو ایک دفعہ ارشاد ہوا تجھ کو اللہ نے خوبصورت بنایا ہے اپنے خلق کو بھی خوبصورت بنا۔ حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر یوں دعا فرماتے تھے اللھم احسنت خلقی فحسن خلقی الٰہی تو نے میری صورت اچھی بنائی ہے تو میرا خلق بھی اچھا بنا۔

دریافت کیا گیا۔ بندہ کو سب سے اچھی چیز کیا دی گئی ہے؟ فرمایا۔ خلق حسن۔ دوسری

Marfat.com

جگہ فرمایا۔ قیامت کے دن زیادہ محبوب اور میرے قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہوں گے جن کے اخلاق اچھے ہیں۔ فرمایا خوش خلقی گناہ کو اس طرح گھلا دیتی ہے جس طرح دھوپ برف کو فرمایا۔ کوئی تدبیر عقل کے موافق نہیں ہوتی۔ مگر خوش خلقی ؛

صلح اور جنگ میں خلق محمدیؐ

ایک دفعہ رسول اللہؐ نے خواب میں دیکھا کہ میں مسلمانوں کے ساتھ کعبہ کا حج کر رہا ہوں یہ خواب دیکھ کر زیارت کعبہ کا شوق ہوا اور مسلمانوں کی ایک جمعیت لے کر زیارت کعبہ کے لئے روانہ ہوئے لیکن جب مکہ کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کفار نے لڑائی کی تیاریاں کی ہیں۔ رسول اللہؐ نے پیغام بھیجا کہ میں لڑنے نہیں آیا زیارت کرنے آیا ہوں۔

کفار مکہ میں ضد اور جہالت زیادہ تھی اس لئے رسول اللہ صلعم نے مکہ والوں کے پاس حضرت عثمانؓ کو سفیر بنا کر بھیجا۔ خبر آئی حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا۔ حضور کو بہت صدمہ ہوا اور حضور ایک کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور ہاتھ بڑھا کر کہا آج تم میں سے کون کون مرنے کی بیعت کرتا ہے ؟

سب مسلمانوں نے رسول اللہؐ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ ہم سب مرنے کا عہد کرتے ہیں ہم سب کو موت پیاری ہے اس پر وحی آئی کہ خدا ان مسلمانوں سے بہت خوش ہوا جنہوں نے محمدؐ سے درخت کے نیچے مرنے کی بیعت کی اسی واسطے اس بیعت کو بیعت رضوان کہتے ہیں کہ اللہ کی رضا اس بیعت سے حاصل ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد عروہ بن مسعود ثقفی کفار مکہ کی طرف سے صلح کا پیغام لایا اور معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ شہید نہیں ہوئے۔ رسول اللہؐ نے صلح منظور کر لی اور صلح کی شرطیں دریافت کیں۔ شرطیں بہت سخت تھیں۔ مسلمان ان کو سن کر گھبرا گئے مگر رسول اللہؐ نے ان شرطوں کو قبول کر لیا۔

شرائط یہ تھیں کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔ پھر اگلے سال آئیں تو ہتھیار لگا کر نہ آئیں۔ مکہ سے جو آدمی مسلمان ہو کر مدینہ میں جائے اس کو واپس کر دیا جائے اور مدینہ سے جو آدمی بھاگ کر مکہ میں آئے اس کو ہم نہیں دیں گے۔ مسلمانوں نے بگڑ کر کہا کیا ہم تمہارے دبیل ہیں جو یہ شرطیں مان لیں؟ مگر رسول اللہؐ نے فرمایا مجھے یہ سب شرطیں منظور ہیں۔ جس وقت رسول اللہؐ کے حکم سے حضرت علیؓ نے عہد نامہ لکھا تو اس میں یہ بھی لکھا کہ یہ عہد نامہ محمد رسولؐ اللہ کی طرف سے ہے۔ کفار نے کہا ہم تم کو رسول اللہؐ نہیں مانتے یہ لفظ نہ لکھو۔ رسول اللہؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا رسول اللہؐ کا لفظ کاٹ دو۔ حضرت علیؓ نے کہا میں اس کی تعمیل نہیں کر سکتا۔ آخر خود حضرت نے رسول اللہؐ کا لفظ مٹا دیا۔

اس صلح کی میعاد ختم ہونے کے بعد آخر رسول اللہؐ مسلمان فوجوں کے ساتھ اس مکہ میں داخل ہوئے جہاں سے اُن کی قوم نے اُن کو جلا وطن ہونے پر مجبور کیا تھا اور بے کسی کی حالت میں چھپ کر وطن سے نکلے تھے۔ آج اس دشمن وطن کے چھوٹے بڑے دم بخود کھڑے تھے۔ کہیں کہیں مقابلہ بھی کرتے تھے مگر زیادہ خونریزی نہیں ہوئی۔

نماز کے بعد رسول اللہؐ نے تمام کفار مکہ کو مخاطب کر کے ایک ایسی مؤثر تقریر کی جو آج تک یادگار ہے حضور نے دیکھا کہ وہ سب دشمن جنہوں نے تیرہ برس رسول اللہؐ کو ستایا تھا سامنے موجود ہیں۔ رسول اللہؐ نے اُن کو دیر تک دیکھا اور اس کے بعد اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا تم جانتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟

کفار اپنے انجام کے خیال سے لرز گئے اور انہوں نے نہایت عاجزی کے ساتھ کہا اَنْتَ اَخٌ کَرِیْمٌ وَّابْنُ اَخٍ کَرِیْمٍ تو ہمارا شریف بھائی ہے اور شریف بھائی کا بیٹا ہے بیشک! ہم نے تجھ پر بہت ظلم کئے ہیں۔ لیکن تیری شرافت سے امید ہے کہ تو ہم کو معاف کر دیگا اور اگر سزا دے تو ہم اسی لائق ہیں۔ اس جواب کے بعد کچھ دیر سناٹا رہا۔

اس کے بعد رسول اللہؐ نے بلند آواز سے فرمایا "تم سب آزاد ہو۔ آج کے دن تم پر کوئی

Marfat.com

الزام نہیں ہے۔ میں نے سب کو معاف کردیا" یہ فقرہ سن کر کافروں کی گردنیں شرم اور ندامت سے جھک گئیں اور رسول اللہ ؐ نے آسمان کو دیکھنا شروع کیا۔ گویا وہ خدا سے عرض کرتے تھے کہ میں نے تیرے منشا کے موافق یہ فیصلہ کیا ہے۔

جب ہزاروں قیدی رسول اللہ ؐ کے سامنے پیش کئے گئے تو ان میں ایک عورت نے کہا میرا نام **شیماء** ہے اور میں آپ کی دودھ بہن ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس کا کیا ثبوت ہے؟ انہوں نے اپنی پیٹھ کھول کر دکھادی کہ بچپن میں ایک دفعہ آپ نے یہاں کاٹا تھا اب تک دانتوں کے نشان ہیں۔ رسول اللہ ؐ یہ نشان دیکھ کر رونے لگے اور فرمایا تو سچی ہے۔

رسول اللہ ؐ نے اپنی چادر بچھادی اور بہن کو اس پر بٹھایا اور بہت محبت سے باتیں کیں اور بہت سے اونٹ اور بکریاں انعام میں دیں۔ پھر فرمایا۔ بہن اچھا ہو میرے ساتھ چلکر رہو ورنہ تمہارے گھر پہنچا دوں۔ انہوں نے اپنے گھر جانا چاہا۔ رسول اللہ ؐ نے بھجوا دیا اور اس خاندان کے بہت سے قیدیوں کو بھی رہا کردیا۔ شیماء حضرت دائی حلیمہ کی بیٹی تھیں جن کا رسول اللہ ؐ نے دودھ پیا تھا اور ہوازن کی لڑائی میں گرفتار ہوئی تھیں۔ مکہ فتح ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ چلے آئے اور آخر عمر تک یہیں رہے۔

درویشی مرکز

(از نظام المشائخ جون ۱۹۱۰ء)

آج کل ہر قوم اپنے استحکام اور قرار وجود کیلئے ایک مرکز قایم کر رہی ہے۔ مسلمانوں کا قومی و دینی مرکز تیرہ سو برس سے عرب میں موجود ہے۔ ہر فرقہ اور ہر عقیدے کا مسلمان مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کو اپنی ہستی کی قرارگاہ سمجھتا ہے۔ مگر ضرورت ہے کہ اس عام مرکز کے علاوہ اپنے مشرب و طریقہ کے جداگانہ مرکز بھی ہوں جو مرکز اعلیٰ کی شاخیں تصور کی جائیں۔

Marfat.com

مثلاً علمی حیثیت سے مسلمانوں کا دینی مرکز ندوہ قرار پایا ہے۔ اور دنیاوی علی گڑھ تو مناسب ہے کہ درویشی مرکز اجمیر شریف مقرر کیا جائے۔ ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ سب سلسلوں سے فروغ رکھتا ہے۔ اور قادریہ وسہروردیہ خاندان بھی بوجہ قربت خاص کے اس ملک میں چشتیوں کے دست و بازو ہیں۔ ان دونوں سلسلوں کو اجمیر شریف کے مرکز بنانے میں ہرگز تامل نہو گا رہ گیا نقشبندیہ طریقہ۔ اس کے متعلق عوام میں مشہور ہے کہ اس خاندان کے مشائخ سرہند کے مقابلہ میں اجمیر شریف کو ترجیح نہ دینگے۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ حضرات نقشبندیہ ایسے ناسمجھ نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ تین سلسلوں سے الگ ہو کر اپنا مرکز جداگانہ بنائیں گے۔ کیونکہ ان میں خدا کے فضل سے بڑے بڑے فاضل اور روشن خیال بزرگ موجود ہیں۔ جو مرکز کی اہمیت اور اجماع کی خوبی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنے ہم مشرب بھائیوں کا اس معاملہ میں ساتھ چھوڑ دینگے۔

اجمیر شریف کو مرکز بنانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں کے سجادہ نشین کو سب مشائخ ہند کا پیشوا تسلیم کر لیا جائے مقصد صرف یہ ہے کہ چونکہ اجمیر شریف میں سب سلسلوں کے مشائخ جمع ہوتے رہتے ہیں۔ لہذا جو بات تمام طبقہ صوفیہ کے مفاد کی پیش آئے وہ اجمیر شریف کے مقام پر مشائخ کے مشورہ میں لائی جائے اور اس اجماع سے جو فیصلہ ہو وہ سارے ملک میں عملدرآمد کے قابل تسلیم کیا جائے۔

مرکز کی ضرورت پر وضاحت کے ساتھ لکھنا بجائے خود ایک طویل گفتگو کا محتاج ہے جس کا یہ وقت اور موقع نہیں ہے۔ مشائخ نے خواہش کی تو آیندہ اس کی تشریح کر دیجائیگی میرا تخیل عرصہ دراز سے درویشوں کی مرکزی ضرورت پر گردش کھا رہا ہے اور اس کے متعلق میرے دل میں طوفانی ولولے ہیں۔ میرے لئے وہ دن سب سے بڑا اور مبارک ہوگا جبکہ میں اپنے مرکزی تخیل کا مجسمہ سرزمین ہند پر دیکھوں گا۔ یا میری روح اپنے مقام پر اس کو محسوس کرے گی۔

Marfat.com

میں جانتا ہوں کہ مشائخ میں ابھی یہ احساس بہت کم پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنی ہستی کا خرقہ صحرائے زمانہ کے خاروں سے محفوظ کرنے پر مائل ہوں۔ تاہم مایوس نہ ہونا چاہئے۔ آگاہ کرنے سے آگاہی ہوتی ہے۔ فریاد کرنے سے داد ملتی ہے یہ ہماری پراگندگی کا باعث ہے کہ دوسرے فرقے ہم کو ٹھکراتے ہیں اور زیروزبر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس دن ہم ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے وجود کو مستحکم کر کے دکھائیں گے۔ پھر کس کی مجال ہے جو ہم کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔

رام اپدیش

(از نظام المشائخ اگست سنہ ۱۹۱۰ء)

ہندوؤں کے مشہور و معروف مذہبی پیشوا سری رام چندر جی کے عارفانہ کلمات یوگ بسشٹ سے محض ناظرین نظام المشائخ کے ملاحظہ کے لئے ترجمہ کرتا ہوں۔ تاکہ ہمارے مشائخ و فقراء کو ہندوؤں کے مقتداؤں کی روش سے آگاہی ہو۔

حسن نظامی

ایک جلسے میں جہاں راجہ دسرتھ رام چندر جی کے باپ اور باشسٹ جی ان کے گرو استاد اور بسوامتر جی اس زمانہ کے نامور عارف بزرگ موجود تھے اور رام چندر جی کی عمر صرف ۱۶ برس کی تھی انہوں نے یہ تقریر کی۔

دُنیا کی بُرائی

دنیا ناپائدار ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے مرتا ہے مال اسباب جو دُنیا میں ہیں بلا اور محنت کے مبب ہیں۔ اس کی زندگانی کچھ خوشی اور آرام کی چیز نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ دنیا دار اسے آرام کا گھر سمجھتے ہیں۔ دیکھو۔ عورت مال متاع اور سب دنیا کی موجودات ایک دوسرے سے میل نہیں رکھتے۔ جس طرح لوہے کی سیخیں اکٹھی باندھی جائیں تو چپیاں

Marfat.com

نہیں ہوتیں بس دنیادار کیونکر یہ کہکر اسباب دنیا سے اصلی جوڑ ملا سکتا ہے کہ فلاں چیز میری اور اسکا ڈہکا میرا ہے ؛

میں نہیں جانتا کہ کون ہوں۔ اور یہ تمام عالم بود دیکھنے میں آتا ہے کس چیز سے ظہور میں آیا۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ بے حقیقت ہے۔ مگر موجود نظر آتا ہے۔ اس سے نہ کسی کو نفع ہے نہ نقصان۔ وہ چمکتی ریت کی طرح ہے جو پیاسے کو دہوکا دے مگر نہ پیاس کو بجھا سکے اور نہ اس میں ڈوب سکے۔ وہ گھر جو مال اسباب سے بھرا ہوا ہے مگر حقیقت و معرفت کی مایا سے خالی ہے۔ آرام کی جگہ نہیں ہے۔ جیسے وہ غریب آدمی خوش نہیں رہ سکتا جس کے اولاد بہت ہو حالانکہ اولاد انسان کے دل کو خوش کرتی ہے ؛

دولت سب کو پھسلاتی ہے مگر کہیں ٹھہرتی نہیں۔ اور کسی کو حقیقتاً خوش حال نہیں کرتی۔ عیب و ہنر کے بغیر دیکھے جہاں جی چاہا مقام کر دیتی ہے۔ تو اس سے اخلاص پیدا کر کے سانپ کو دودہ پلاتا ہے۔ ایک دن یہ سانپ تیرے دودہ سے پلے ہوئے زہر کو تیرے ہی مار ڈالنے میں خرچ کرے گا ؛

آدمی جب تک مفلس ہے۔ سب سے ملکر اور جھک کر چلتا ہے۔ مگر دولت ملتے ہی اپنے بیگانے سب سے بگڑتا ہے اور پتھر کا دل بنا لیتا ہے۔ جیسے ہوا نرم برف کو پتھر بنا دیتی ہے دولت دل کی صفائی اور روشنی کو گدلا کر دیتی ہے جیسے یاقوت مٹی میں رکھنے سے بے آب ہو جاتا ہے ؛

زندگی

زندگی کا کچھ بھروسا نہیں۔ پتے کی نوک پر رکا ہوا پانی کا قطرہ مضبوط ٹھکانہ میں نہیں ہے پس تو بھی اپنی زندگی کو پائدار مت سمجھ ؛

جس طرح ہوا کو پکڑ نہیں سکتے۔ جواہرات کی چمکدار کرنوں کو ایک لڑی میں پرو نہیں سکتے اسی طرح ابدی زندگانی بھی تیرے اختیار میں نہیں ہے۔

Marfat.com

زندگی معرفت الٰہی کی پناہ میں محفوظ رہ سکتی ہے۔ ظاہری زندگی جانور اور گھاس پھوس بھی رکھتے ہیں مگر حقیقی زندگی اسی کو ملتی ہے جو حقیقت کی معرفت حاصل کرتا ہے۔

بڑھاپے سے ایک قدم چلنا دوبھر ہے۔ مگر تو زندگانی کی ترقی ہی چاہے جاتا ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ بوڑھا گدھا جب بوجھ اٹھانے کے قابل نہ رہے تو جنگل میں اکیلا نکال دیا جاتا ہے۔

دل

دنیا کے دھندوں کے سبب دل بزرگوں کے طریق پر نہیں ٹھہرتا۔ جس طرح پرندے کے پر ہوا کے جھونکوں سے منتشر ہو جاتے ہیں۔ دل کتے کی طرح ہر آواز پر لپکنا چاہتا ہے اور اچھائی برائی میں تمیز نہیں کرتا۔

وہم بھرا دل آگ سے زیادہ پُرسوز ہے کہ اس کو پکڑ نہیں سکتے۔ پہاڑ سے زیادہ بلند ہے جس پر کوئی چڑھ نہیں سکتا۔ ہیرے سے زیادہ سخت ہے جس کا توڑنا مشکل ہے۔ سمندر کی سطح آب پر چل سکتے ہیں۔ پہاڑ کھود کر اس کی تہہ کا پانی نکال سکتے ہیں لیکن دل کو مغلوب نہیں کر سکتے۔

پریشان کرنے والے خطرے اور واہی تباہی خواہشیں سب دل کی بیماری کے سبب ہیں۔ اس بیماری کا علاج گرو کی صحبت میں ہے اس کو حاصل کر۔

حرص

ترشنا یعنی حرص اندھیری رات کے منحوس اُلوؤں کی طرح دل میں ارمانوں کو جمع کرتی ہے۔ اور اس طرح آخر کار اس کو ویران کر دیتی ہے۔

دل کے پاک اور سریلے جذبات کو حرص اس طرح برباد کر دیتی ہے جیسے چوہا رباب کے تار کتر کر اس کو بیکار کر دیتا ہے۔

جو حرص کی آگ میں جل کر مرا ہے اسکو آب حیات میں ہزار بار بھی غسل دیں تو وہ زندہ نہیں ہو سکتا۔

Marfat.com

جو شخص اپنی دانست میں دنیا کے تمام کاروبار سے آزاد ہو کر بیٹھا ہو۔ حرص پہلے اُسی کو شکار کرنا چاہتی ہے۔ حرص آدمی کیلئے اندھیری رات ہے جس میں ہزاروں خطرے بھرے ہوئے ہیں۔ اور انسان کے دل میں اس کے سبب ہر وقت فکر و اندیشہ رہتا ہے ؛

حرص کھلی آنکھ کو بند کر دیتی ہے۔ حرص گھر گھر کی ٹھوکریں کھلواتی ہے۔ حریص آدمی سے کوئی خوش نہیں ہوتا۔ جیسے بوڑھی عورت کو دیکھنے سے کوئی آنکھ خوش نہیں ہو سکتی ؛

حریص آدمی اس ناچنے والی کے مثل ہے جو اپنے ناچ کے سب بھاؤ اور کمالات ایک ہی وقت میں ادا کرنے چاہے۔ اور ایک بھی پورے طور پر ادا نہ کر سکے ؛

حرص جسم کے ظاہری اعضاء سے بھی کام لیتی ہے۔ اور باطنی اعضاء سے بھی۔ اور اسکی حکمرانی میں تھوڑے ہی دن بعد یہ سب اعضا بیکار و معطل ہو جاتے ہیں ؛

حرص شریف آدمیوں کو اس طرح اپنی طرف مائل کرتی ہے جیسے حسین عورت۔ متقی و پاکباز مرد کو۔ اور سورج کی گرم شعاع نیلوفر کے نرم و نازک پھول کو ؛

آدمی کیسا ہی عقیل اور پہاڑ کی طرح بھاری بھرکم ہو حرص کے سامنے سوکھی گھانس کا تنکا بن جاتا ہے ؛

استقبالِ رسولؐ

(از نظام المشائخ ماہ مارچ ۱۹۱۱ء)

السلام علیک یا رسول اللہ۔ السلام علیک یا حبیب اللہ۔ السلام علیک یا شفیع المذنبین۔ السلام علیک یا رحمۃ للعلمین۔

غریبوں کا سلام لیجئے۔ گنہگاروں کا مجرا قبول فرمایئے۔ بے کس و لاچار امت کے خیر مقدم پر نظر توجہ ڈالئے ؛

آج اوراق نظام المشائخ کے پلیٹ فارم پر ہم سب آپ کا استقبال اور خیر مقدم کرنے

حاضر ہوئے ہیں۔ یہ ایک طرف آپ کی غریب امت کھڑی ہے۔ دوسری جانب عیسائی۔ ہندو۔ آریہ ہیں جو تہنیت کے گلدستے پیش کرنے چاہتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ لوگ اپنے حاکم کے سامنے استقبال کے وقت اپنی ضروریات ظاہر کیا کرتے ہیں۔ گزشتہ کارناموں کو سناتے ہیں۔ موجودہ حالت کا نقشہ پیش کرتے ہیں اور پھر اظہار رائے کے طلبگار ہوتے ہیں۔ دادرسی و مراعات و انعامات کا یہی موقع سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم بھی ہندوستان کے پردیس میں اپنے دین دنیا کے بادشاہ کا استقبال کرنے وقت رسم زمانہ کے موافق عرض حال کرنا ضروری سمجھتے ہیں ؛

سرکار والا تبار! جو زمین اس وقت ہم سب کے زیر قدم ہے۔ چھ سو برس تک ہمارے زیر نگیں رہ چکی ہے۔ یہاں ہمارا تاج تھا۔ یہاں ہمارا تخت تھا۔ سکہ بھی ہمارا تھا۔ شان و عزت بھی ہماری تھی۔ تلوار کے بل پر آئے تھے تلوار کے بل پر رہے تھے ؛

ہم نے اس ملک میں خدا کے بندوں پر محبت و انصاف سے حکومت کی۔ حضور کے ارشاد کے موافق رعایا کی خبرگیری و حفاظت میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔ آج تک ہمارا عہد خوشی راحت اور فارغ البالی کا عہد سمجھا جاتا ہے ؛

جہاں پناہ یہ سنکر کمال درجہ مسرور ہوں گے کہ یہ ملک علوم آلہیہ کے قبول کرنے اور ان میں جی لگاکر مصروف ہونے میں خاص صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں بھی اگلے زمانہ میں توحید کا چرچا رہ چکا ہے۔ اس خطہ میں بھی خدا تعالیٰ نے اپنے مقبول بندوں سری رامچندر جی۔ سری کرشن جی دہاتما بدھ کے ذریعہ کلام حق بھیجا تھا۔ جو تمادی ایام کے سبب اور نفس و شیطان کی شرارتوں کے باعث خلط ملط ہوگیا ؛

ظل سبحانی کی سمع اقدس میں یہ واقعہ پیش ہونا ضروری ہے کہ اس ملک کی آسمانی کتاب وید میں وحدت الٰہی کا یہ کلمہ ارشاد ہوا ہے **ایکو برہم دوتیو ناستی**۔ جس کا عربی مفہوم لا الہ الا اللہ ہے۔ اسی وید کے ایک حصہ اتھرون وید میں حضور عالی کی نسبت

Marfat.com

اسی طرح کی پیشین گوئیاں ہیں جیسی زبور۔ توراۃ۔ اور انجیل میں پائی جاتی ہیں ؂

جب ہم غلامان رسالت اس دیار میں وارد ہوئے اور حضور عالی کا پیام یہاں کے باشندوں کو سُنایا تو وہ جوق جوق آئے اور آپ کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا۔ چنانچہ اس وقت کڑوڑوں آدمی ایمان لانے والوں میں موجود ہیں ؂

اب ہم موجودہ دور کا فسانہ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ نہایت شرم کے ساتھ۔ نہایت ندامت و پشیمانی کے ساتھ یہ الفاظ ہمارے منہ سے نکلتے ہیں کہ ہمارا چہرہ صدی کا تاج لٹ گیا تخت الٹ گیا۔ ہمارے محل اور قلعے غیروں کے پاس چلے گئے۔ اب ہم رات کی روٹی کو محتاج ہیں ہماری رعیت ہم پر ہنستی ہے۔ ٹھوکریں مارتی ہے۔ ریشمین قباؤں کے بدلے ہم کو میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑے بھی میسر نہیں آتے ؂

ہماری حرارت برباد ہو گئی۔ ہماری غیرت تباہ ہو گئی۔ اب رسوائی و ذلت کی کوئی حد باقی نہیں رہی ؂

آج جہاں پناہ کے حضور میں ایک شکستہ حال امت کھڑی ہے۔ جو کل تاجدار تھی۔ باوقار تھی۔ آج وہ لوگ آپ کے سامنے پیش ہو رہے ہیں جو کشمکش کے میدان میں بے یار و مددگار ہیں۔ جن کا خدا کی ذات کے سوا کوئی سہارا نہیں ہے۔

قدرت نے انگریزی قوم کو ہمارا نگراں بنایا ہے جو چاہتی ہے کہ ہم زبونی و خرابی کے غار سے ہمت کر کے باہر نکلیں۔ مگر۔ زخموں کی تکلیف اور فاقوں کی ناتوانی کے سبب ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ لیکن ہم کو یقین ہے کہ اب گردش کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ اب ہم پھر اقبال و دولت کے سایہ میں پہونچنے والے ہیں۔ کیونکہ آپ کا دیدار۔ آپ کے اوصاف و اطوار کا دیدار۔ ہم سب کی ظاہری و باطنی مصیبتوں کو دور کرنے والا ہوگا ؂ آمین ؂

دربارِ رسولؐ

(از نظام المشائخ مارچ ۱۹۱۱ء)

(گستاخ نامہ یعنی سائنس ڈاکو کا خط دربارِ رسالت میں)

از کیمپ یورپ۔ بارگاہ شاہ ہفت اقلیم حضور سائنس بہادر۔ بخدمت جناب معلّی القاب

محمد بن عبد اللہ بانی مذہب اسلام

جناب من! مجھ کو پیشگاہ سرکار دولتمدار حضور بادشاہ ہفت اقلیم سائنس زمانہ گیرام اقبالہٗ کی جانب سے ہدایت ہوئی ہے کہ آپ کو ان کے دوستانہ خیالات سے آگاہ کروں۔ چونکہ ہمارے بادشاہ جم جاہ آپ کے خیالات میں بہت کچھ صلاحیت اور اپنے خیالات سے نزدیکی ملاحظہ فرماتے ہیں۔ اس لئے ان کی خواہش ہے کہ دوستانہ طریق سے چند امور آپ کے گوش گزار کریں۔

یہ اطلاع غالباً آپ کو مل گئی ہو گی کہ یورپ میں عیسائی مذہب کے مسمار کرنے میں اور اسکو اپنا محکوم بنانے میں ہمارے شاہ کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ آپ یہ سنکر بہت خوش ہوں گے کہ اس زمانہ میں عیسائی مذہب کا جو کچھ غل پڑ رہا ہے وہ محض لفافہ ہی لفافہ ہے۔ اندر کچھ بھی نہیں ہے شاہ سائنس نے تمام عیسائی قوموں کے دلوں پر تسلط پالیا ہے اور اب یورپ میں ایسا کوئی سرکش باقی نہیں ہے جو عیسوی مذہب کو بچانے یا اس کا اثر برقرار رکھنے کی شاہ سائنس کے مقابلے میں طاقت رکھتا ہو۔ بدھ مذہب کا جاپان میں خاتمہ کر دیا گیا۔ چین میں کچھ لوگ ہیں ان پر مہم بھیجی گئی ہے۔ یقین ہے وہ بھی عنقریب مفتوح ہو جائیں گے۔ ہندوستان میں پچاس برس سے معرکہ کارزار گرم ہے اور شاہ سائنس کو اکثر مقامات پر کامیابی حاصل ہو چکی ہے۔ شاہ سائنس کی خوش اقبالی سے ہندو مذہب کا

ایک بڑا گروہ دیانند راجہ کی سرکردگی میں ہندو مذہب پر چھاپے مار رہا ہے اور ہمارے بادشاہ کو اس کی پرزور اور پُراثر یورش سے امید ہے کہ ہندو مذہب پر بہت جلد ان کا قبضہ ہو جائیگا۔ زرتشتی دین کی نسبت تو آپ کو اچھی طرح واقفیت ہو گی کہ وہ ہمارے شاہ کے قدموں میں آن گرا۔ اور اب اس نے خانہ زاد خاص کا خطاب حاصل کیا ہے۔ مگر حضور ظل زمانی بہت افسوس کرتے ہیں کہ آپ کا مذہب اسلام جگہ جگہ ان کی فتوحات میں سدراہ ہوتا ہے اگرچہ حضور ظل زمانی آپ کے سپہ سالار جنرل اسلام کی قابلیتوں کے قایل اور بہت مداح ہیں لیکن وہ اسلام کی موجودہ روش کو پسند نہیں کرتے۔ اور چاہتے ہیں کہ آپ اپنے سپہ سالار کی حالت میں تبدیلی کا حکم دیں۔ شاہ سائنس کی حکمرانی نسل انسانی کے لئے راحت وشادمانی کا لازوال خزانہ ہے۔ شاہ سائنس نے اپنی سلطنت کے ایسے طریقے مقرر فرمائے ہیں جن سے ہر مذاق اور ہر خیال کا انسان مساوی درجہ میں خوشی اور آسایش حاصل کرتا ہے۔ اگر آپ ذرا غور فرمائیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ مذہب انسان کیلئے اور اس کی زندگی کیلئے بڑی خوفناک اور ضرر رساں چیز ہے۔ مذہب کے باعث ہر ملک ہر قوم یہاں تک کہ ہر گھر میں فساد اور خونریزیاں برپا رہتی ہیں۔ مذہب انسانی فطرت کے جذبات کو قدرتی طور پر ابھرنے نہیں دیتا اور دبا کر برباد کر ڈالتا ہے۔ مذہب تمیزداری اور شائستگی کا دشمن ہے مذہب بیدار مغزی اور معقولیت سے کوسوں دور ہے۔ مذہب نہیں چاہتا کہ انسان اپنے اختیارات اور اپنی طاقتیں کام میں لائے۔ مذہب آزادی و مساوات کا مخالف ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے دنیا پر تکلیفات کا جال پھیلا رکھا ہے۔ آپ ملاحظہ فرمایئے کہ یورپ کے اس زمانہ میں جب کہ وہاں مذہب کا دور دورہ تھا اہل یورپ کیسی ذلیل اور کمینی زندگی بسر کرتے تھے۔ پیشوایان مذہب انکو ٹھکراتے تھے۔ آگ میں جلاتے تھے۔ انکی عورتوں کی عزت وناموس کو خراب کرتے تھے اور بیچارے پیروان دین مسیح اُف نہ کر سکتے تھے۔ مگر آج جبکہ شاہ سائنس کا دور حکومت ہے۔ ہر شخص آزاد۔ ہر شخص بااختیار۔ خوش وخرم اور

Marfat.com

عزت دار بنا ہوا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اپنے سے ادنیٰ یا اعلیٰ کی آزادی و اختیارات میں دخل دے سکے۔ اہل یورپ ہمارے شاہ کی تاجداری پر دل سے فریفتہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ سب دنیا والے سائنس تاج کے زیر سایہ آجائیں۔ ایسی حالت میں آپ خود انصاف فرما سکتے ہیں کہ ہمارے شاہ کا تلوار کھینچنا اور مذہبی حکومت کو زیر و زبر کرنا کس قدر ضروری اور کیسا اچھا کام ہے۔ لہذا آپ فوراً اپنے اصول جہانداری کو بدل ڈالئے اور سائنس اور گورنمنٹ سائنس کے قوانین اپنے ہاں جاری کر دیجئے۔ تاکہ ہماری گورنمنٹ کے سامنے سے دشواریاں اور مشکلات دور ہو جائیں۔ اور زمین پر امن و امان کا آفتاب چمکنے لگے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ شاہ زمانہ گیر ان تدابیر کو عمل میں لائیں گے جن سے آپ کی گورنمنٹ کو سخت نقصان اٹھانا اور بربادی کا سامنا کرنا پڑے گا ؛

میں بیباکانہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ اگر اس آخری اطلاع پر جلدی توجہ نہ کی گئی تو افواج قاہرہ کو حرکت میں لایا جائیگا اور اسلامی قصر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائیگی ہماری گورنمنٹ کے آتش فشاں ہتھیاروں اور فنون حرب کی ترقیوں سے غالباً آپ بے خبر نہ ہوں گے اور صلح کو جنگ سے غنیمت تصور فرمائیں گے ؛

راقم

میں ہوں آپ کا ادنےٰ خدمتگار

دہریہ۔ وزیر محکمہ خارجہ گورنمنٹ۔ سائنس زمانہ گیر۔

مشورہ

سپہ سالار اسلام فرش خاک پر تلوار ٹیکے کھڑا تھا اور سامنے تمام عہدہ داران فوج دست بستہ ایستادہ تھے ہوا تیز چل رہی تھی۔ اور سپہ سالار کی تقریر صاف سنائی نہ دیتی تھی لیکن آخر میں سپہ سالار نے ایسے پر جوش جملے کہے کہ سب نے اچھی طرح ان کو سُنا

Marfat.com

یورپ کے مشہور قزاق سائنس کا ایک گستاخانہ مراسلہ دربار رسالت پناہی میں آیا ہے۔ جس میں اس نے لڑائی کی دھمکی دیکر ہماری سلطنت کے قوانین بدلوانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ بولو۔ اب تم کیا ارادہ رکھتے ہو؟

جنرل شریعت دار:۔ پہلے یہ فرمایئے کہ دربار قدسی کی جانب سے اس گستاخ کو کیا جواب دیا گیا؟

سپہ سالار:۔ وہ جواب تم عنقریب سن لوگے۔ میں تمہارا منشا معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر حالات کی صورت دگرگوں ہو تو تم کن طریقوں سے مدافعت کروگے اور تمہارے پاس کیا کیا ذرائع مقابلے کے ہیں؟

جنرل شریعت دار:۔ جس قسم کی ضرورت ہو۔ ہم ہر حیثیت سے تیار ہیں۔ اگر علمی مقابلہ ہو تو حدیث۔ تفسیر۔ فقہ۔ اصول فقہ۔ الغرض معقول۔ منقول جس قرینے کا معرکہ ہوگا۔ ہم مقابلہ کریں گے۔ جنگ کی نوبت آئے تو اس میں بھی ہم کو سب سے آگے ہاتھ مارتے پایئے گا؟

جنرل طریقت دار:۔ جناب عالی تردد نہ فرمائیں۔ میری کمان میں وہ بہادر ہیں جن کے نعرۂ حق سے آسمان زمین لرزتے ہیں۔ سائنس کی کیا ہستی ہے جو ہمارے شہنشاہ کے قوانین کو ٹیڑھی نگاہ سے دیکھ سکے۔ یہ دیکھئے حضور کے روبرو چشتی۔ قادری۔ نقشبندی سہروردی۔ رفاعی وغیرہ نامور افسر کھڑے ہیں۔ انہوں نے ہزاروں بار نفس امارہ کے لشکروں کو زیروزبر کیا ہے۔ حرص وہوا کی کائنات ان کے نام سے تھراتی ہے خود بینی وناحق شناسی کے سیکڑوں تاج وتخت ان کے نعرۂ ہُو سے خاک میں مل گئے۔ سائنس اپنے تمام ابلیسی لشکروں کو لیکر آجائے اور دیکھے کہ شہسواران طریقت کس شان سے میدان کارزار میں نکلتے ہیں اور کیونکر اس کے دھوئیں اڑاتے ہیں؟

جنرل طریقت دار کی تقریر سنکر سپہ سالار اسلام کا چہرہ بشاش ہوگیا۔ اور اس نے

Marfat.com

تبسم خیز انداز سے کہا۔ آفریں بہادرو! شاباش دلیرو!! تمہاری ہمت مردانہ سے مجھے یہی امید تھی۔ مگر جس دشمن کا مقابلہ درپیش ہے وہاں یہ ہتھیار کام نہیں دیں گے۔ اب نری جرأت سے کام نہیں چلتا۔ تم کو چاہیئے کہ اپنے حریف سائنس کے طریق حرب سیکھو۔ اور پھر مقابلہ کیلئے مورچہ باندھو۔ آؤ پہلے اس کی کوشش کریں کہ ہمارا لشکر سائنس کے قواعد سے خبردار ہوجائے۔ اس کے بعد دو ہاتھ کرنے کو آگے بڑھے۔

تخت رسالت کا فرمان

تمام امت محمدی کے صوبہ داروں اور ادنیٰ و اعلیٰ افراد ملت کو معلوم ہو کہ ما بدولت و اقبال تمدن جدید کی دنیا میں کلمۃ اللہ کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں۔ تم کو لازم ہے کہ دربار رسالت کے فرمان واجب الاذعان کی تعمیل کیلئے دل و جان سے کمر بستہ ہوجاؤ۔

وقت آگیا کہ یورپ و امریکہ۔ چین و جاپان اور ان تمام ممالک میں جہاں سائنس اور علوم جدیدہ کی اشاعت ہورہی ہے اسلامی صداقت کی روحانیت پھیلائی جائے۔ لہٰذا تم سب کیل کانٹے سے درست ہوجاؤ۔ پہلے اپنے حالات کی اصلاح کرو۔ اور اپنے وجود کو اسلامیت کا مجسم نمونہ بنالو۔ اور پھر نئے علوم سیکھنے شروع کرو تاکہ تخت کی منشاء کے موافق مذکورہ زمین پر امر حق رائج کرسکو۔

مسلم یونیورسٹی کے نام سے جو تحریک ہندوستان میں اٹھی ہے وہ تاج ملت کے ارادے کے موافق ہے۔ اسکو سرسبز بنانے میں اتفاق و یک جہتی سے کوشش کرو۔ یہ پہلا دروازہ ہے جو تمہارے لئے قدرت خداوندی نے کھولا ہے۔ اس کے اندر بے دھڑک گھس جاؤ۔

قرآن شریف میں سب سے پہلے آلم کا لفظ تم نے پڑھا ہوگا۔ اس میں اشارہ ہے کہ آل محمد اس کتاب (علم) کو جس میں کچھ شک نہیں عالمگیر کرنے کے لئے کھڑی ہوگی۔ چنانچہ پہلے سید احمد خاں نے جو محمدی آل سے تھا یہ کام شروع کیا۔ اور اب آغا

خان جو زمرۂ آل رسالت سے ہے اس کی مدد کرنی چاہتا ہے۔ تم سب کو مل کر اس کی اعانت کرنی چاہیئے۔ تاکہ ہدایت کا چشمہ ان قوموں کو سیراب کرے۔ جو روحانیت کی پیاسی ہیں۔ اسی آلمہ کے مہم میں اس نائب رسولؐ مہدیؑ کے ظہور کی خبر ہے۔ جو عنقریب ظاہر ہوگا۔ اور تمہارے منتشر اور پراگندہ کاموں کو سمیٹ کر یکجا کر دے گا۔ اور سارے جہان کو اسلام کے حقانی دائرہ میں لے آئیگا۔

ما جناب رسالت مآب کے تخت کی جانب سے اس غلط فہمی کی اصلاح ضروری ہے جو یورپ کی قوموں میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ لوگ ہمارے نائب مہدیؑ کے نام سے طرح طرح کے وہم کرتے ہیں۔ ان کو اطمینان رکھنا چاہیئے۔ ہمارا مہدیؑ ان کی مملکت میں ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ امن و امان کو برہم نہیں کرے گا۔ اس کا کام صرف یہ ہوگا کہ باطنی اور روحانی تسکین کے ذرایع دنیا میں شایع کرے۔ اور انسانوں کو ظاہری دولت مندی کے ساتھ باطنی تسلی کی دولت بھی بانٹے۔ اور لکھا جا چکا ہے کہ جس وقت وہ دنیا میں آئے گا سب قومیں اس کے طریق روحانیت کو قبول کرلیں گی۔ اور اس کی ہدایت پر عمل شروع کر دیں گی۔ بس اسی کا نام مہدی کی حکومت ہے۔ کہ اسلامی روحانیت کل جہان پر مسلط ہو جائے۔ یہ نہیں کہ لوگوں کے تاج و تخت چھینے۔ جس طرح جرمن و انگریز۔ روس و فرانس وغیرہ کی سلطنتیں اب قایم ہیں۔ مہدی کے وقت میں بھی برقرار رہیں گی۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ یہ سب ان اصول پر اپنی زندگی شروع کر دیں گی جو مہدی مقرر کرے۔ اس میں جھگڑا فساد اور خونریزی مطلق نہ ہوگی۔ لہذا سب لوگوں کو بے فکر رہنا چاہیئے۔ اور خوشی و خرمی سے ہمارے نائبؑ کے خیر مقدم کے لئے آگے بڑھنا چاہیئے ؛

دنیا میں اس اعلان کی خبر نے جو سائنس کی جانب سے دربار رسالت میں پہونچا ہے ہل چل ڈال دی مگر تخت نبوت تم سب کو تسلی دیتا ہے کہ معاملات کی صورت ایسی پیچیدہ

اور نازک نہیں ہے۔ سائنس کے خط کا جواب دیدیا گیا ہے۔ ہمارا سپہ سالار اسلام میان سے تلوار نکلے بغیر سب خرخشوں کو صاف کردے گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے اگرچہ سائنس کے وزیر خارجہ دہریہ کا لب ولہجہ سخت تھا۔ مگر ماجناب سختی کا جواب سختی سے نہیں دینا چاہتے ہماری سرکار کا ہمیشہ سے نرمی وملامت کا شیوہ رہا ہے۔ اور وہی اب بھی ملحوظ ہے۔ اور آئندہ بھی رہے گا کیونکہ ماجناب تمام عالم کے لئے رحمت ہیں۔

مرحمت نامہ

(یعنی سائنس کے گستاخ نامہ کا جواب دربار رسالت سے)

(از مملکت حجاز خیمہ رسالت۔ بنام سائنس مدعی زمانہ گیری)

تمہارا خط جس میں تخت رسالت پناہی کو اسلام کی موجودہ روش تبدیل کرنے کی جانب توجہ دلائی گئی ہے پہنچا۔ بارگاہ قدسی میں عرض کردیا گیا۔

حضور انور نے کمال الطاف ونوازش کے بشرہ سے اس کو سماعت فرمایا۔ تمہارے وزیر نے جس طریقہ سے اپنی کامیابیوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ اگرچہ پسندیدہ نہیں ہے لیکن دارین پناہ بوجہ خلق عظیم کے اس سے درگذر فرماتے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں کہ غرور وتکبر ہر کامیابی کیلئے سبب ناکامی ہے۔ اس سے احتیاط کرنی چاہئے۔

ارشاد ہوا ہے کہ مذہب کی مضرتوں کو تم نے بالکل غلط سمجھا۔ یورپ کے مذہبی زمانہ میں جس قدر خرابیاں تھیں وہ مذہب کے غلط استعمال کے سبب تھیں۔ مذہب کا اس میں کچھ قصور نہیں تھا۔ اور اب جن راحتوں کو پیش کیا جاتا ہے وہ بھی موہوم اور بے اصل ہیں۔ جن کو پائداری نصیب نہیں۔ ذرا لوگوں کے دل سے پوچھو کہ باوجود اس آزادی و دولتمندی کے ان کو اندرونی اطمینان اور قرار وسکون میسر ہے یا نہیں۔ ہر شخص یہی کہے گا کہ نہیں پھر اس نمائشی راحت سے کیا فائدہ۔ راحت وہ ہے جسکی جڑ آدمی کے دل میں جاگزیں ہو

نائب بارگاہ ایزدی تم کو مطلع فرماتے ہیں کہ ان کی امت عنقریب تمہاری ان مشکلات کو رفع کردے گی۔ جو درحقیقت سچی مشکلیں ہیں۔ نہ وہ جن کو تم مشکلات تصور کررہے ہو اس سے زیادہ کچھ اور فرمانا نہیں چاہتے۔ گوان کو قلم کے جواب کے علاوہ تیغ دمنا کی جواب دہی کی بھی ہر طرح قدرت حاصل ہے۔

امید ہے کہ تم ہماری رحیم وکریم سرکار کی مہربانی اور نوازش سے فائدہ اٹھاؤگے اور اچھا زمانہ حاصل کرنے کی کوشش کروگے۔

راقم

عبید۔ حلقہ بگوش تخت رسالت

محکمۂ تحریرات۔ بقلم حسن نظامی

فقیروں کی عید

از نظام المشائخ ستمبر ۱۹۱۰ء

قوموں کی زندگی اور ترقی جن ذرائع سے معلوم ہوتی ہے ان میں قومی تہواروں کی شان وشوکت کو بہت کچھ دخل ہے۔ اسلام نے ظاہر ہوکر عرب اور اکثر حصہ عالم کی مراسم قبیح وناز یبا رواجوں کو زیر وزبر کرڈالا۔ اور مٹادیا مگر جو رسمیں بشریت کی فطرت میں داخل تھیں ان کو باوجود اپنے بھاری بھرکم طرز عمل اور تقوے ومتانت کے جاری رکھا۔ بلکہ ان میں اور چار چاند لگائے۔

چنانچہ وہ کھیل جو جنگجو قوموں میں بطور مشق جاری تھے۔ اسلام نے انکو منع نہیں کیا۔ خود بانی اسلام علیہ التحیۃ والسلام بارہا ایسے کھیلوں میں شریک ہوئے ہیں۔ حالانکہ کھیل تماشہ اور لغو مشغلوں سے حضور نے ہمیشہ نفرت کا اظہار کیا اور لوگوں کو اس سے روکتے رہے۔

Marfat.com

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھیل جن سے قوم میں کوئی کارآمد بات پیدا ہو اسلام نے بند نہیں کئے۔ اور ان کو اپنی متانت و بردباری کے خلاف نہیں سمجھا۔ مثلاً حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیزہ بازی و تیر اندازی کے کھیلوں کا خود بھی تماشہ دیکھتے تھے اور اپنے عیال کو بھی دکھلاتے تھے۔ معتبر روایتوں سے یہاں تک ثابت ہے کہ حضورؐ اپنے گھر والوں کے ساتھ دوڑ کے کھیل میں شریک ہوتے تھے اور خود بنفس نفیس دوڑتے تھے اور فرماتے تھے دیکھیں کون آگے نکلے۔

بہادری اور مردانگی کے کھیلوں میں خود ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک ہونا دلیل ہے اس امر کی کہ ہر زمانہ میں جو کھیل دلیری و شجاعت کا جذبہ پیدا کرنے والے ہوں۔ ان میں ہر ثقہ اور متین مسلمان شامل ہو سکتا ہے۔ اور کوئی شخص اس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جو ذات سب سے زیادہ متین اور سب سے زیادہ بردبار تھی وہ بھی ایک مفید حد تک ان کھیلوں کو جائز رکھتی تھی۔

اسی پر ایام خوشی کو قیاس کرنا چاہئیے۔ کہ سال بھر میں ایک دن ایسا ہوتا ہے جس میں قوم کا ہر فرد اپنی حیثیت اور طبیعت کے موافق خوش ہو۔

اسواسطے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدالفطر اور عیدالضحیٰ دو دن مقرر فرمائے۔ یہ دونوں دن اسلام کے دو عظیم الشان فرائض کی تکمیل کی خوشی میں مقرر ہوئے۔ عیدالفطر مہینہ بھر کے روزے عطا کرنے کے بعد۔ اور عیدالضحیٰ حج کعبہ کے بعد۔ اس طریقے سے مسلمانوں کی خوشی کو اپنے معبود کی عبادت کے ساتھ جیسی کچھ وابستگی ہو گئی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے ہر شخص خود غور کر سکتا اور سمجھ سکتا ہے۔

حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے جلیل القدر صحابہؓ دلی کشادگی اور شادمانی سے ان تہواروں میں حصہ لیتے تھے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قومی تہوار ان کی شان کے موافق متانت اور بھاری بھرکم پن کے خلاف و منافی نہیں ہیں۔ دردیش

اور مشایخ بھی بشر ہیں اور انسانوں کے دل سینے میں رکھتے ہیں۔ اور حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی شان کچھ اعلیٰ و برگزیدہ نہیں ہے جو اپنے دینی و قومی تہوار کی خوشی کے اظہار میں شریک ہونا اپنے وقار اور متانت کے خلاف تصور کریں۔ خوشی اور رنج کا حس مٹ جانا دوسری چیز ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اپنے حواس آدمیت سے معطل ہو جائے۔ بلکہ وہ ایک مقام رضا و تسلیم ہے جس میں درویش رضائے الٰہی کی طلب میں ایسا بے خبر ہو جاتا ہے۔ کہ دنیا کی تکلیفات اور خوشیاں اسکی طلب میں مخل نہیں ہونے پاتیں۔ اور وہ ایک ہی دُھن میں مستغرق رہتا ہے پس عید جیسے قومی و دینی تہوار میں فقرا و مشایخ کا یاان کے اخبار و رسالہ کا شریک ہونا اور اس کی خوشی میں اپنے دیگر ہم مذہب بھائیوں کی مثل برابر کا حصہ لینا نامناسب و ناروا نہیں ہے بلکہ لازمی اور ضروری ہے +

عید میلاد الرسولؐ

(از نظام المشایخ۔ جنوری ۱۹۱۱ء)

ایک سو ایک ضرب الا اللہ کی سلامی دو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لاتے ہیں۔ آنکھیں مژگاں کی سناں اور ابرو کی تیغ سنبھالے۔ ادب سے پتلیاں جھکائے کھڑی رہیں۔ زبان درود کا بینڈ بجائے بدن کی سب رگوں کو حکم دو کہ صلواتی بینڈ میں یک جان ہو کر سر ملائیں۔ یہاں تک کہ ہر بن موئے نغمہ۔ اللہ ہو۔ اللہ ہو۔ نکلنے لگے۔ روزہ کی عید حج کی عید۔ دونوں دست بستہ آئیں اور عید میلاد کا خیر مقدم کریں +

دودھ۔ سویں۔ اور قورمہ چپاتی کو اس عید سے کچھ سروکار نہیں ہے جو کی روٹی کھاؤ۔ اور خوشی مناؤ +

Marfat.com

آج عید ولادت ہے۔ آج وہ پیدا ہوئے جن پر کائنات کی پیدائش کا حصر ہے۔ چاند کو رُخِ انور سے شرمانے والے۔ ظلمت کو گیسوؤں میں الجھانے والے شاہ گدانواز۔ رسول العرب والعجم۔ جن کی ولادت سے تاریکی باطل دور ہو گئی۔ حق کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی۔ خود سر بے سر ہوئے۔ بے تاج تاجور بنے۔ جنہوں نے ہونٹوں کو ہلا کر ساری زمین زلزلے میں ڈال دی ؂

غریبوں مظلوموں کے غمگسار، سرکشوں۔ ظالموں کے زیر کرنے والے۔ وہی جنکا نام لینے سے ہمارے خون میں حرارت اور دل میں جوش پیدا ہوتا ہے ؂

ایسے برگزیدہ و پاکیزہ وجود کے ظاہر ہونے کا وقت ہے کہ آسمان۔ زمین۔ شجر حجر۔ کیف میں ہیں پھر تم کیوں لے مسلمانوں یوم ولادت کو قومی تہوار نہیں بناتے۔

یہ وہ خوشی ہے جس میں ہر فرقہ اور عقیدہ کے مسلمانوں کو یکساں حصہ لینا چاہیئے۔ یہاں شیعہ۔ سنی۔ مقلد۔ غیر مقلد۔ صوفی۔ وہابی کی قید نہیں۔ سب یک دلی واتفاق سے میلاد کا تہوار مقرر کریں۔ اور دنیا کو دکھائیں کہ جس طرح رسول خدا کو اپنی امت سے محبت تھی۔ اسی طرح امت بھی ان کے نام پر قربان ہے۔ اور ان کی یادگار میں دل و جان سے حصہ لینا چاہتی ہے۔ دوسری قومیں فرضی اور خیالی تہوار مناتی ہیں تاکہ قوم میں زندگی کے جذبات پیدا ہوں۔ تمہارے سامنے ایک اصلی اور شاندار موقع موجود ہے اس سے کیوں نہیں فائدہ اٹھاتے ؂

اسلامی ممالک میں جہاں ہمارے خوش قسمت بھائی تخت و تاج کے مالک ہیں میلاد شریف کے موقع پر بڑے جوش و خروش کا اظہار کیا جاتا ہے ؂

ہم بدنصیب سہی۔ بے تاج سہی۔ ہیں تو حلقہ بگوشان رسولؐ۔ پھر کیوں اپنے تاجدار بھائیوں سے حب رسولؐ میں پیچھے رہیں۔ یہ وقت اس بات کے دیکھنے کا نہیں ہے۔ کہ از روئے فقہ میلاد جائز ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ سوچنے کا وقت ہے کہ میلاد کے جلسوں

Marfat.com

کو کس طریقہ پر بارونق اور شاندار بنایا جائے۔

یاد رکھو کہ سب کی دینی و دنیاوی زندگی اپنے رسولؐ کی الفت و یاد میں مخفی ہے اگر ہم دنیا میں اپنی عزت محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم کو آخرت میں سرخرو جانا ہے تو آقائے نامدار محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے میلاد پاک کی عیدین سے زیادہ خوشی منایا کریں۔ بلکہ میلاد الرسول کی ایک علیحدہ عید مقرر کریں جس میں دہوم دہام سے میلے ہوں۔ جلسے ہوں اور ہر عقیدہ کا مسلمان اپنے کلمہ کے شریک بھائیوں کے ساتھ عیدالرسولؐ منائے۔ اور کہے "آج اس کے نام کی عید ہے جس نے دنیا کے پردے کو شرک و کفر کے غم والم سے پاک و صاف کر کے وحدت کے جلوہ سے آراستہ کر دیا۔

نوٹ:۔ ۲۷ برس کے اس مضمون کو عید میلاد کی بنیاد کہنا چاہئے جس کے بعد تمام دنیا میں یہ تحریک مقبول ہو گئی من قطاتی

ایکو برہم دوتیو ناستی

(از صوفی۔ جولائی ۱۹۱۱ء)

یہ فقرہ جس کے سلیس معنی وحدہٗ لاشریک یا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہیں۔ ہندو مذہب کے اصول میں داخل ہے۔ اور غور سے دیکھا جائے تو ہر مذہب کی بنا توحید پر ہے۔ مگر انسان اپنے خیالات کی آمیزش کر کے اس متفق علیہ اصول کو خراب کر ڈالتا ہے اور وقتاً فوقتاً ضرورت لاحق ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کسی انسان کو بشری خیالات کی اصلاح کے لئے مقرر فرمائے چنانچہ ہر ملک اور ہر قوم میں ضرورت کے وقت مصلح ظاہر ہونے کا ثبوت تواریخ اور مذہبی کتب میں موجود ہے۔ قرآن شریف میں صاف طور پر ارشاد ہوا ہے کہ ہر ملک و ملت کے واسطے خدا ایک ہادی مقرر کرتا ہے۔ بعض رسولوں کے نام اور حالات کی تصریح فرما دی گئی ہے۔ بعض کی نسبت اشارے کنائے کر دئے ہیں اور پھر ایک کلیہ قاعدہ

Marfat.com

قایم کرکے حکم دیدیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو خدا کے تمام رسولوں اور تمام کتابوں پر ایمان لانا ضروری اور لازم ہے۔ مسلمان بھی زبان سے نہیں بلکہ دل سے یقین رکھتے ہیں کہ جن رسولوں کی اطلاع ان کو پہونچی اور جن کی نہیں پہونچی وہ سب برحق ہیں ؛

اتنا معلوم کرنے کے بعد سوچنا چاہئے کہ ملک ہندوستان جو دنیا میں ایک بڑا ملک کہلاتا ہے اس بات کا مستحق ہے یا نہیں کہ یہاں بھی خدا نے اپنے دستور کے موافق پیغامبر بھیجے۔ اور ان کو ہدایت کرنے کے واسطے کتابیں دیں۔ اگرچہ قرآن شریف میں اس ملک کے رسومات کی بابت کوئی تصریح نہیں پائی جاتی۔ مگر خدا کے اس کلیہ کے موافق کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوستان بھی ان متبرک آدمیوں سے محروم نہیں ہے جن کو خدائی اصطلاح میں نبی و رسول کہتے ہیں ؛

ہندوستان کے نامور بزرگوں سری رامچندر جی اور سری کرشن جی اور مہاتما بدھ کے حالات پڑھنے۔ ان کی طرز زندگی پر غور کرنے اور ان کی تعلیمات پر منصفانہ نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے وہی حالات تھے جو سیدنا حضرت ابراہیم و عیسےٰ و موسیٰ وغیرہ علیہم السلام کے پائے جاتے ہیں۔ اور وہی تعلیم تھی جس کا ذکر بار بار قرآن شریف میں آیا ہے ؛

اسلامی عقاید میں یہ مسلم امر ہے کہ انسان کے لئے فطرتی مذہب ہمیشہ سے ایک ہے جس قدر پیغمبر اور رسول بھیجے گئے وہ سب ایک ہی مذہب اور ایک ہی اصول کی تعلیم کرتے تھے۔ نئے اصول کی شریعت کسی پیغمبر نے قائم نہیں کی۔ یہاں تک کہ سب سے آخر اور سب سے اچھے رسولؐ نے بھی جن کی پیروی کا فخر ہم کو حاصل ہے وہی بتایا جو اگلے نبی بتلاتے آئے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تعلیم میں ہر ملک و قوم کی سمجھ اور طرز معاشرت کا لحاظ رکھا گیا ہے اور ایسے طریقے سے سمجھایا گیا ہے کہ ہر درجہ کی عقل میں آسکے آپ کو معلوم ہوگا کہ توراۃ و انجیل کا طریقہ تعلیم تشبیہ اور استعارات پر

Marfat.com

بنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخر زمانہ کے آدمی عقل و ذہنی تغیر کے سبب اس کے فہم سے قاصر ہو گئے۔ اور طرح طرح کی غلطیوں اور توہمات میں مبتلا ہونے لگے۔ وید مقدس اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں اور بزرگوں کے بیانات میں بھی اس قدر مشکل استعارات پائے جاتے ہیں۔ جن کا ٹھیک ٹھیک ذہن نشین کرنا دشوار ہے اگرچہ مثالیں ایسی دی ہیں کہ معمولی عقل والا بھی ذرا سی دیر میں سمجھ جائے۔ مگر افسوس ہے کہ اس ملک کے بعض لوگوں نے اصلی بات معلوم کرنے میں توجہ نہیں کی اور ظاہری الفاظ پر عمل کر کے اپنے پاکیزہ اصول کو خراب کر دیا۔

میں ایک مثال دنیا کی پیدائش کی نسبت پیش کرتا ہوں۔ قرآن شریف میں خدا فرماتا ہے کہ ہم نے حکم دیا۔ کُنْ فَیَکُوْنُ ہندو مذہب میں اول برہما پیدا ہوا۔ اس نے تمام عالم کو ظاہر کیا۔ غور کیجئے کہ ان دونوں بیانات میں کیا فرق ہے۔ کچھ بھی نہیں متحد البیان ہیں۔ قرآن میں خدا نے صفت خالقیت کو کُنْ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور وید میں برہما کے لفظ سے۔ برہما صفت ایجاد کا نام ہے۔ جب تک یہ صفت ظاہر نہیں ہوئی دنیا ناپید تھی۔ جس طرح کُنْ کے ظہور کے بعد یکون کا ظہور ہوا۔ اسی طرح برہما کے ظہور کے بعد سب کچھ ظاہر ہوا۔ یہی کیفیت تمام اصول مذہب کی ہے؛

عورتوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک جسم میں سینکڑوں ہاتھ اور متعدد سر ہیں اور ہر ہاتھ میں مختلف چیزیں ہیں۔ کسی میں تلوار ہے۔ کسی میں پھول ہے۔ کسی میں اناج کا خوشہ ہے۔ اور ہندو ان مورتوں کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ اس وقت آپکو نفرت آمیز ہنسی آئے گی کہ یہ کیسی مضحکہ انگیز صورت ہے اور یہ کیسے احمق ہیں کہ ان کے آگے سر جھکاتے ہیں؛

مگر حضرات ہندوستانی رہبروں نے یہاں کے باشندوں کو سمجھانے کے لئے صفات الٰہی کی حقیقت صاف طور پر ذہن نشین کرنے کے واسطے یہ مورتیں بنائی

Marfat.com

تھیں۔ تاکہ کم سمجھ لوگ آسانی سے سمجھ جائیں کہ خدا میں قہر کی شان بھی ہے۔ جس کا نمونہ تلوار ہے اور رحم بھی جس کا نشان پھول یا اس قسم کی کوئی اور چیز ہے۔ اُسی کے ہاتھ میں رزق ہے۔ اس لئے اناج کا خوشہ دکھلایا جاتا ہے۔ مگر ثابت یہ ہوا کہ انسان بہت ہی بے عقل ہے اور مثالوں کو ذریعہ کے بجائے نتیجہ سمجھ لیتا ہے۔ چنانچہ ان مثالی مورتوں کے سبب بت پرستی شروع ہو گئی۔ اور ہزاروں غلط فہمیاں واقع ہو گئیں یہ بات ہندوستان پر مخصوص نہیں ہے۔ دنیا میں اور بھی کئی ملک ایسے ہیں۔ جہاں صرف مثالی خرابی سے بُت پرستی کا رواج ہوا۔ روم۔ یونان و مصر میں اس کی کافی شہادتیں موجود ہیں۔

جب تمام دنیا میں عالمگیر غلط فہمیاں واقع ہو گئیں تو خدا تعالیٰ نے ایک ایسا آسان صاف اور سیدھا طریقہ تعلیم سکھا کر ہمارے حضرت صلعم کو بھیجا۔ جو تمام دنیا کی ہدایت کے لئے کافی ہو۔ اور تمام مذاہب عالم میں جس قدر خرابیاں بشری خیالات اور نفسانی جذبات کے سبب پڑ گئی تھیں وہ دور ہو جائیں۔ میں نہیں کہتا کہ میرا دعویٰ خواہ مخواہ تسلیم کر لیا جائے بلکہ تجربہ اور تحقیق سے غور کرنا چاہئے کہ اسلام نے قدیمی اصول کو جس پیرایہ میں بیان کیا ہے وہ اس قابل ہے یا نہیں کہ تمام دنیا کے مذہبوں کی خرابیاں آسانی سے رفع کر دے تجربہ مشاہدہ کرا دے گا کہ بے شک اسلام کا طریقہ تعلیم ایسا صاف سیدھا اور آسان ہے کہ قدیمی اصول مذہب عمدگی کے ساتھ ذہن نشین ہو سکتے ہیں۔

اب میں مجمل طور پر ہندوستان کے دو نامور بزرگوں سری رام چندر جی اور سری کرشن جی کے حالات پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ ان بزرگوں کی زندگی اور تعلیم ہمارے مسلمہ رسولوں کے کس قدر مشابہ تھی۔ میں رام کرشن جی کے بعض اقوال کو اپنے حضور صلعم کے ارشاد اور قرآن شریف کے بیان سے مطابق کر کے دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ واقعی ہندوستان کے رسول تھے اور ہمارے رسول گو سب کے بعد بھیجے گئے مگر وہی بیان کیا جو پہلے بیان ہو چکا تھا۔ کوئی نیا دین لیکر نہیں آئے تھے لہذا تمام دنیا خاصکر ہندوستان کو لازم ہے کہ

Marfat.com

پرانی تعلیم کو نئے طریقے سے سیکھے جو سب سے زیادہ آسان اور صاف ہے اور جس میں اکثر وہی باتیں ہیں جو ہندوستانی رسول فرما گئے تھے۔

رام جی اودھ کے راجہ دسرتھ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ہندوستان میں رام لیلا کا مشہور میلا انہیں کی یادگار میں منایا جاتا ہے۔ ان کی سولہ برس کی عمر بھی نہ ہوئی تھی کہ اپنے خاندانی پیشوا بشست جی کے ہمراہ سیاحت کو نکلے اور تمام مشہور اور متبرک مقامات اور اہل اللہ بزرگوں کی زیارتیں کیں۔ قدرتی نظارے دیکھے۔ دنیا کے نشیب و فراز ملاحظہ کئے۔ جب واپس آئے تو عجیب حال ہوگیا۔ ہر وقت سوچ اور فکر میں مستغرق رہتے نہ کھاتے نہ پیتے۔ اور دنیا کے تفریحی مشغلوں سے نفرت ہوگئی۔ اکثر خاموش رہتے۔ اور بولتے تو فرماتے یہ دنیا کیسی بری دنیا ہے۔ بالکل ہیچ و ناپائدار۔ اسی اثنا میں ایک ایسا موقع آیا کہ اُس زمانہ کے مشہور بزرگ بسوامتر جی راجہ دسرتھ کے پاس آئے اور رام جی کو کسی سرکش و بدکار کی ہلاکت کے لئے مانگا راجہ نے ان کی کمسنی اور ناتجربہ کاری کا عذر کیا۔ مگر بسوامتر جی کے اصرار سے رام جی دربار میں بلائے گئے۔ اور ایک ایسی عالمانہ و عارفانہ تقریر کی کہ راجہ اور تمام درباری خاصکر بشست اور بسوامتر جیسے عارف لوگ حیران رہ گئے کہ یہ کم سن بچہ کیسی باتیں کرتا ہے۔

رام جی نے اپنی تقریر میں انسانی ہستی کے تمام مدارج اور دنیا کے تغیرات کی نسبت بشست جی اور بسوامتر جی سے سوالات کئے۔ مگر ایسے پیرایہ میں جیسے کوئی شخص تجاہل عارفانہ کرتا ہے۔ خود ہی ایک امر کی نسبت شک و شبہ بیان کرتے اور خود ہی ایک لطیف کنایہ سے اس کا جواب دیتے۔ بسوامتر اور بشسٹ نے رام جی کے سوالات کا جواب دیا۔ مگر انصاف سے دیکھا جائے تو

صاحب عرفان سائل کے سوالات

کی شان کے موافق ان لوگوں کے جواب نہ تھے۔ یہ رام جی کا شروع حال ہے۔ اس کے

Marfat.com

بعد انہوں نے ایک خاص امتحان کے موقع پر بیسیوں راجوں کے مقابلہ میں ایک مشہور کمان توڑ کر امتحان پاس کیا۔ اور راجہ کی بیٹی سیتاجی کو جیت کر بیوی بنالیا پھر چند سال تک اپنی سوتیلی ماں کے حسد کے سبب صحرا کی زندگی بسر کرتے رہے۔ یہاں ان کے ہمراہ اُنکے بھائی لچھمن جی اور بیوی سیتاجی بھی تھیں۔ یہیں ان کو ایک سرکش و بدکار راجہ۔ جسکا نام راون تھا دھوکہ دیا۔ اور اُن کی بیوی سیتا کو چرا کر لیگیا۔ اور رام جی کو اس کے ملک لنکا پر حملہ کرنا پڑا۔ چنانچہ ہنومان نامی کوہستان کے راجہ کی مدد سے لنکا فتح کر کے راون کو مارا اور سیتاجی کو چھینا۔ اس کے بعد اپنے راج استھان دارالخلافہ اجودھیا پوری میں واپس آئے اور راج کرنے لگے۔ اسی راج کے زمانہ میں انہوں نے رسالت کے فرائض کو پورا کیا۔

ایک عجیب بات ہے جس کی بابت حدیثوں میں بھی اشارہ ہے کہ ہر بڑے رسول کو ایک بڑے دشمن سے سابقہ پڑتا ہے اور وہ دشمن اسی رسول کے ہاتھ سے ہلاک ہوتا ہے حضرت ابراہیمؑ کو نمرود اور حضرت موسیٰؑ کو فرعون اور ہمارے حضور صلعم کو ابوجہل سے سابقہ پڑا تھا۔ اسی طرح رام جی کو راون اور کرشن جی کو کنس جیسے خونخوار دشمن دیے گئے تھے جو مذکورہ بالا دشمنوں کی طرح ذلت و خواری سے ہلاک ہوئے۔ مگر اس ظاہری خصوصیت کے ساتھ میرے خیال میں ایک اور خصوصیت بھی ہے جس کو حضرت مولانا محی الدین ابن عربی نے بھی لکھا ہے کہ فرعون اور نمرود صفت قہاری کے ظہور تھے چونکہ خدا کی صفت رحیمی اور شان رحمت ظاہر کرنی مقصود تھی جو رسولوں کے ذریعہ سے ظاہر کی اسواسطے شان جلالت و جبروت کو بھی ہر رسولؑ کے زمانہ میں ظاہر کیا۔ رام جی کے زمانہ میں راون بھی شان قہر کا مظہر تھا۔ چونکہ شان قہر کے ظہور کے لئے مختلف صورتیں اور طریقے ہیں اس لئے راون کے بہت سے ہاتھ اور سر بیان کئے جاتے ہیں۔

اب رام جی کے چند اقوال جو ان کی تعلیم کا نمونہ ہیں یوگ بشسٹ اور رامائن سے انتخاب کر کے بیان کئے جاتے ہیں۔

Marfat.com

فرماتے ہیں کہ دنیا کی مثال چمکدار ریت کی ہے جو پیاس نہیں بجھا سکتی مگر پیاسے کو دہوکے میں ڈالتی ہے۔ اسلام بھی دُنیا کو سراب کی مثال سے یاد کرتا ہے۔ فرمایا جن کے پاس کتابیں ہیں اور سمجھتے نہیں وہ بوجھ اُٹھانے والے مزدور ہیں۔ قرآن شریف میں اس کی مثال بوجھ اٹھانے والے گدھے سے دی گئی ہے۔

فرمایا۔ دل کتا ہے۔ جہاں مردار دیکھتا ہے کھانے کو دوڑتا ہے۔ ہمارے حضور نے فرمایا۔ الدُّنْیَا جِیْفَۃٌ وَطَالِبُھَا کِلَابٌ دنیا مردار ہے اور اس کے طالب کتے۔

فرمایا۔ جو کچھ دریافت کرنا ہے اپنے آپ سے دریافت کر۔ کہ سب کچھ تجھ میں ہے۔ قرآن شریف میں بھی ایسا ہی ارشاد ہے کہ۔ وفی انفسکم افلا تبصرون اپنے آپکو کیوں نہیں دیکھتے اور حدیث میں ہے۔ من عرف نفسہٗ فقد عرف ربّہٗ

اور فرمایا۔ بارہا دیکھا گیا کہ ایک اکیلا مرد بڑے گروہ کو بھگا دیتا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے۔ کہ من فئۃٍ قلیلۃٍ غلبت فئۃً کثیرۃً - (ترجمہ) بعض دفعہ چھوٹا گروہ بڑے پر غالب آجاتا ہے۔

فرمایا۔ یہ عالم محسوس وہمخیال ہے۔ مگر تعجب ہے کہ جو نہیں ہے وہ دکھائی دیتا ہے اور جو ہے وہ نظر نہیں آتا۔ فرمایا۔ عمر کی مثال بجلی کی ہے کہ ایک دم چمکی اور نہ رہی۔

فرمایا۔ یہ کیسا بڑا گھر ہے جس کا دروازہ ہڈی کا اور دربان بند دیا ہے۔ بند دیا زبان کو فرمایا اس لئے کہ اس کو قرار نہیں رہتا۔ آہنکار یعنی ہاہمی آدمی کی دشمن ہے۔

فرمایا۔ دنیا میں رہنا اور اس میں مبتلا نہ ہونا ایسا ہے جیسا دریا میں کوئی ہو اور تر نہ ہو ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ۔۔۔ بازمیگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

اور فرماتے ہیں (۱) سنتوش پر مولا بہ (صبر میں سب سے بڑا فائدہ ہے (۲) ست سنگ برمم دہنم (اچھی صحبت بڑی دولت ہے) (۳) وچار پرم گیانم (سوچنا بڑی

عقلمندی ہے) (۴) اسم جپ پرم سکھم (سب کو ایک نگاہ دیکھنا بڑا سکھ ہے)۔

کیا اچھی تعلیم ہے مگر افسوس زیادہ بیان کرنے کی گنجایش نہیں۔ رام جی کے بعد تھوڑا حال سری کرشن جی کا بھی معلوم کر لینا چاہیئے۔ کرشن جی کے ساتھ بعینہ وہ قصہ پیش آیا ہے جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یعنی کرشن جی کے ماموں راجہ کنس کو جو متھرا پر حکومت کرتا تھا نجومیوں نے خبر دی تھی کہ تیری بہن دیوکی کا آٹھواں فرزند تیرا قاتل ہوگا۔ اس خبر نے کنس کو ایسا حواس باختہ کیا کہ اس نے اپنی بہن اور بہنوئی کو قید کر دیا اور جو بچہ ان کے ہاں ہوتا اسے مار ڈالتا جب آٹھویں کرشن جی پیدا ہوئے تو ماں باپ نے چپکے سے ایک گاؤں میں جس میں گائے چرانے والے رہتے تھے اس بچہ کو بھیج دیا۔ اور کنس سے بیٹی پیدا ہونے کا بہانہ کر دیا۔

کرشن جی نے گوکل میں جو گھوسیوں کا گاؤں تھا پرورش پائی۔ جب ہوشیار ہوئے تو ان سے عجیب و غریب باتیں ظاہر ہونے لگیں اس کی راجہ کنس کو خبر پہونچی اور وہ سمجھ گیا کہ یہ میرا بھانجا ہے۔ ان دنوں کرشن جی رسولوں کی سنت خاصکر حضرت موسیٰؑ کی سنت کے موافق گائیں چرایا کرتے تھے۔ ماموں نے حیلے سے بلایا اور قتل کرنا چاہا۔ مگر انہوں نے اسی کو ہلاک کر ڈالا۔ اور دنیا کو اس ظالم سے پاک کیا۔

ان ایام میں کرشن جی کا بانسلی بجانا اور گوپیوں سے اختلاط کرنا سب استعارے ہیں جن سے ان کی پاکبازی پر حرف نہیں آسکتا۔ کنس کے مرنے کے بعد ان کی زندگی میں نئے آثار شروع ہوئے۔ اور حکومت ظاہری کے ساتھ ہی انہوں نے روحانی حکومت کے اصول بیان کرنے شروع کئے۔ چنانچہ جب ہندوستان کی مشہور لڑائی مہابھارت ہوئی ہے تو اس میں کرشن جی نے اپنے چیلے ارجن کو اپدیش دئے۔ انہی لکچروں کے مجموعہ کا نام گیتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنے مغالطہ کی پیدا شدہ تکلیف سے نجات پا سکتا ہے اگر تین طریقے اختیار کرے۔

Marfat.com

(۱) قدرت کاملہ اور قدرتی اشیاء کا عشق (۲) فرائض معلوم کرنے کے لئے تحصیل علم (۳) فرائض کا ادا کرنا بلا خواہش نفسانی انہی تین اصول پر بحث کی ہے۔ اور ادھیائے سنیاس یوگ میں فرماتے ہیں۔ ذی علم اور خلیق برہمن۔ گائے۔ ہاتھی۔ کتے اور بدکار آدمی سب کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور فرمایا وہ یوگی سے بھی بڑھکر ہے جو بھلا چاہنے والوں دوستوں۔ دشمنوں۔ قابل نفرت لوگوں۔ نیکوں اور بدوں سب کو یکساں سمجھتا ہے گیتا ۱۳۔ ادھیائے۔

یہاں میں کرشن جی کے اقوال زیادہ تفصیل اور اسلامی مطابقت کے ساتھ جمع نہیں کرسکا۔ انشاء اللہ کسی دوسرے موقع پر پیش کئے جائیں گے۔ البتہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے ایک وظیفہ بیان کیا جاتا ہے۔ جو کرشن جی کے پیرو کسی سختی کے وقت پڑھتے ہیں۔ وظیفہ یہ ہے:۔

"کرشنا کرشن پرمہ آتما پہ پنڈ ہے بھنجنم ہیم توانگ شرنم یام مے بھے بھیتا پرتھک دیہیے" ؛

مگر افسوس ہے کہ کرشن جی کے اقوال کے لفظوں کی پوجا کرلی جاتی ہے جس کا نام گیتا کا پاٹ ہے اور بہت کم لوگ اس کے عجیب فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ؛

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی رسولوں کی پیشین گوئی لکھدی جائے جس میں ہماری حضور کی نسبت خبر دی گئی ہے۔ ہمارے سلسلۂ نظامیہ کے ایک بزرگ مولوی شاہ حکیم محمد حسن صاحب نظامی نے ایک ضخیم تفسیر لکھی ہے جس کا نام غایۃ البرہان ہے۔ اس تفسیر میں تمام دنیا کی مذہبی کتب سے حضرت صلعم کی خبریں لکھی گئی ہیں اور عجیب معلومات سے ان کو ثابت کیا ہے۔ چنانچہ وید کی پوری عبارتیں مع تشریح درج ہیں جن کا نقل کرنا مشکل ہے۔ جس کو شوق ہو مولوی شاہ فضل احمد صاحب نظامی سے امروہہ ضلع مراد آباد کے پتے پر یہ مطبوعہ تفسیر منگا کر دیکھ لے۔ میں صرف

Marfat.com

ایک حصہ کا اقتباس کرتا ہوں۔ جہاں کلنگی پورانوں کے حوالہ سے مولانا نے حضرت کی خبر لکھی ہے۔ لکھتے ہیں :۔

کل جگی اوتار کے باپ کا نام وشنو داس ہوگا۔ وشنو کے معنی اللہ اور داس کے معنی عبد یعنی عبداللہ نام ہوگا۔ ماں کا نام سومتی یعنی امانت دار ہوگا۔ سو حضور کی والدہ کا نام آمنہ تھا۔ پہلے پہاڑ کے غار میں عبادت کریں گے۔ سو حضرت نے غار حرا میں عبادت کی۔ پھر شمالی پہاڑوں میں ہجرت کریں گے۔ سو ہجرت بھی ہوئی۔ پہاڑ کی کھوہ میں پرشرام سے تعلیم پاویں گے۔ پرش کہتے ہیں روح کو اور رام خدا کو یعنی روح خدا۔ مراد جبرئیل فرشتے سے ہے۔ سو حضرت جبرئیلؑ سب سے پہلے وحی لے کر آئے۔ شنبل نگری میں پیدا ہوں گے۔ شنبل دیپ کی نسبت مولانا نے ایک زبردست بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ شنبل ملک عرب کو کہتے ہیں کل جگی اوتار کے چار بھائی ہوں گے۔ جن کے ذریعہ وہ فتحیاب ہوں گے وغیرہ وغیرہ ؛

اس بیان سے میری غرض یہ ہے کہ جس طرح سب پیغمبر ہمارے حضور کی تصدیق کرتے آئے ہیں۔ ہندوستانی رسولوں نے بھی تصدیق کی ہے۔ پس ہندوستانی رسولوں کی امت کو بھی حضورؐ کی تصدیق کرنی چاہئے۔ اور ہم کو بھی ہندوستان کے تمام رسولوں پر ایمان لانا چاہئے۔ اسی میں ہندوستان کی ظاہری و باطنی بہبودی ہے۔ اور یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہندو مسلمانوں میں دلی اتحاد پیدا ہو سکتا ہے اگرچہ ہندوؤں کا مسلمان اور مسلمانوں کا ہندو ہونا مشکل ہے۔ نہ اس بیان سے میری یہ غرض ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ان دونوں قوموں کی باہمی نفرت واجنبیت دور ہو۔ ہر ایک دوسرے کے پیشوا کی عزت کرے۔ اور گلے ملنے کے لئے پہلے مسلمانوں کا قدم آگے بڑھے۔ سلام علی المرسلین والحمد للہ رب العالمین ؛

Marfat.com

السَّلامُ علیکم

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

مسلمانوں کا ذریعہ خطاب ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ تم سلامت رہو۔
ہندوستان میں اس کی جگہ۔ آداب۔ تسلیمات کا رواج ہوگیا تہا۔ اور اب گڈ مارننگ
گڈ نائٹ اور گڈ بائی کے چرچے ہیں۔

یہ زمانہ کا اثر ہے۔ مگر مسلمان وہ ہے جو اپنے دل کو آثار وقت سے محفوظ رکھے۔
اور دینی امور کو اپنا شعار بنائے۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو خدا رسول کے مقرر کردہ سلام کی پیروی کرتے
ہیں اور ایک دوسرے سے جب ملتے ہیں تو سلامٌ علیکم وعلیکم السلام
کہکر ہمکلام ہوتے ہیں۔

ہمارے خیال میں جن لوگوں کو خط و کتابت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ وہ بڑے خوش
قسمت ہیں کہ ہر روز صبح اٹھتے ہی سلامتی کی دعائیں ان کو ملتی ہیں۔

ہم جس وقت توحید کے خطوط کھولتے ہیں تو سب سے پہلے جس چیز پر نگاہ پڑتی
ہے وہ سلامٌ علیکم ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ آج پچاس سلامتی نامے ہم کو ملے تو
خدا کا شکرانہ بھیجتے ہیں کہ اس نے ہم کو ایسے مذہب میں پیدا کیا ہے جس میں سلامٌ علیکم
جیسی پیاری اور مبارک چیز سے بات شروع ہوتی ہے۔

مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی خط میں سلامٌ علیکم نہیں ہے۔ یا اس کی جگہ کوئی
انگریزی لفظ ہے تو بے اختیار ہماری زبان سے افسوس نکلتا ہے۔ کاش وہ جانتے کہ
سلام نہ لکھنے سے انہوں نے اپنا اور ہمارا دونوں کا نقصان کیا۔ اگر وہ سلامٌ علیکم

Marfat.com

لکھتے تو ہم اُس کے جواب میں "علیکم السلام" کہتے۔ گویا اس طرح دونوں طرف سے دُعا ہو جاتی۔ اور دونوں پر خدا اپنی سلامتی نازل فرماتا۔

اجنبی ملکوں میں جہاں مسلمان ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے سب سے پہلی اور سب سے بڑی چیز یہی سلام علیکم ہے۔ جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے دینی بھائی سے مخاطب ہیں اور ہمارا مخاطب مسلمان ہے

لہذا اے مسلمانو! تم کو لازم ہے کہ جب آپس میں ملاقات کیا کرو یا کسی کو خط لکھو تو السلام علیکم ضرور استعمال کیا کرو۔ السّلام علیکم۔ خدا تم کو سلامت رکھے۔

مُرغ کی اذان

از اخبار توحید ۱۹۱۳ء

ہر سچا مسلمان جو رمضان شریف کی سحری کے لئے آج کل پچھلی رات کو بیدار رہتا ہے۔ مُرغ کی اذان سنتا ہوگا اس پر دار جانور کی آواز میں غور کرنے والے مومنین کے لئے ایک بڑی نصیحت ہے۔ مرغ کہتا ہے میری اذان نیچرل ہے مگر بے نتیجہ ہے۔ مسجد کے مؤذن کی اذان اَن نیچرل ہے لیکن بانتیجہ ہے پس جو مسلمان خدا اور رسول ؐ کے نام کو تقریروں میں اثر پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مگر احکام الٰہی پر عمل نہیں کرتے اُن کی مثال مُرغ کی اذان کی سی ہے۔ کہ دوسروں کو جگاتا ہے۔ اور خود عمل نہیں کرتا۔ اصل اذان مسجد کے مؤذن کی ہے جو نماز کے لئے بلاتا ہے اور خود بھی نماز پڑھتا ہے۔ مگر آج کل بعض اذان دینے والے مؤذن ایسے بھی ہیں جو اذان دیتے ہیں مگر خود نماز نہیں پڑھتے۔ دلی کی ایک مسجد میں ایسا مؤذن دیکھا تھا جس نے ۹ برس سے نماز نہیں پڑھی تھی حالانکہ روز اذان دیتا تھا

تیس راتوں کی شان

اندھیرا روشنی پر غالب ہے

از اخبار توحید ۱۹۱۳ء

گیارہ مہینے کے رات دن رمضان کی تیس راتوں کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے۔ لوگ کہتے ہیں روزہ کا دن ہے میں کہتا ہوں کہ آجکل دن دُنیا ہے اور رات دین ہے جس طرح دُنیا میں انسان اعمال کرتا ہے اور دین یعنی عالم آخرت میں اُس کا بدلہ پاتا ہے۔ اسی طرح رمضان میں دن کے وقت بھوک پیاس کے اعمال ہیں اور شام کو افطار کے بعد آخرت کی بہاریں ہیں۔

کیا خدا کی شان ہے۔ رمضان کی تیس راتیں سارے سال کے روشن دنوں پر بھاری ہیں۔ افطار کا لطف رات کے شروع میں تراویح کی کیفیت اسی شب تار میں سحری کی بہار اسی وقت تاریک میں اندھیرا جس قدر فخر کرے کم ہے۔ کہ خدا نے اس کی آبرو کو نور کے سامنے چار چاند لگا کر دوبالا کر دیا۔ رمضان کی راتیں وہ راتیں ہیں۔ جن میں قرآن شریف نازل ہوا۔ جن میں ایک رات ہزاروں راتوں سے بڑھکر ہے اور جو مسلمان قوم کے لئے تمام نعمتوں سے بڑی نعمت ہے ایسی نعمت جس کی تجلیات آفتاب و ماہتاب اور تمام برق صفات انوار سے اعلےٰ ہیں۔ لہذا ہر مسلمان عورت مرد کو اس کی قدر کرنی چاہیے۔

Marfat.com

نئی روشنی کی دوزخ جنت

(از صوفی جنوری ۱۹۱۵ء)

ایک چیز ہے جس کو نئی روشنی کہتے ہیں۔ وہ مٹی کے تیل یا گیس و برق کے لیمپ نہیں ہیں بلکہ نئے بدلے ہوئے زمانے کے حالات۔ خیالات اور جذبات ہیں پرانے وقت کے لوگ اس کو اندھیری روشنی کہیں تو زیبا ہے کہ حضرت ابن عربیؒ نے فرمایا نور کی اصلیت سیاہ فام ہے۔ لیکن نئی روشنی والوں کو آج تک نور کی حقیقت میں پس و پیش ہے سورج چاند اور زمین کی مصنوعی روشنیوں کے سوا انہوں نے کبھی کسی کا مشاہدہ نہیں کیا پس ثابت ہوا کہ نور ایک وہمی چیز ہے۔ اور نئی روشنی والوں کو اندھیری روشنی کہنا ایک توہم ہے۔ پرانے لوگ ہمیشہ توہمات کے پانی پر قلعے بنایا کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی پھر زندہ ہوتا ہے اور اس کو دوزخ جنت میں جانا پڑتا ہے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو چیز مرگئی فنا ہوگئی۔ اُس کی جگہ دوسری آگئی۔ نیچر بغیر ضرورت کے کوئی کام نہیں کرتی اور چونکہ دوبارہ زندہ ہونے کی کوئی عقلی ضرورت نہیں ہے لہذا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا غلط خزاں کے موسم میں درخت کے پتے سوکھکر گر پڑتے ہیں۔ بہار میں دوسرے پیدا ہوجاتے ہیں قدرت کا یہی قاعدہ ہے مردہ زندہ نہیں ہوسکتا اور سوکھے پتے دوبارہ ہرے نہیں ہوسکتے۔

جب قدرت اس پر قادر ہے کہ اور پتے پیدا کردے تو اس کو پرانے پتوں کے ہرا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ثابت ہوتا ہے کہ نہ ضرورت ہے۔ نہ اس میں طاقت ہے کیونکہ اُس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ پس یہ عقیدہ غلط ہے ۔

ہم نے جو اچھے بُرے کام کیے تھے ان کا بدلہ قانون حکومت سے پاچکے۔ اب دوبارہ

Marfat.com

حساب کتاب کی کیا ضرورت ہے۔ اور چونکہ کچھ ضرورت نہیں ہے۔ لہذا حشر کا ہونا اور میزان حساب میں نیکی بدی کا تولنا عبث ہے۔

جو گناہ ایسے ہوئے جن کی خبر قانون کو نہ ہوئی اُن پر ہمارے دل نے جس کو ضمیر بھی کہتے ہیں ملامت کر دی اور ہم کو تکلیف دہ پشیمانی بھی ہو گئی۔ بس یہی حساب اور جزا و سزا ہے۔ اور کچھ ضرورت نہیں کہ ایک عالم آخرت بھی ہو۔ لہذا یہ عقیدہ بھی وہم ہے۔

جنت میں جن چیزوں کے دیئے جانے کے وعدے ہوئے ہیں وہ بالکل خلاف انسانیت ہیں۔ ایک مرد کئی بیویاں رکھے گا۔ یہ تکلیف دہ کام ہے۔ حالانکہ جنت میں خوشی ہی خوشی بیان کی جاتی ہے۔

جنت میں سب جوان ہوں گے۔ یہ خلاف نیچر ہے۔ قدرت نے بوڑھے جوان کا فرق بڑی مصلحت سے رکھا ہے۔ سب ایک وضع کے ہوں گے تو لطف ہی کیا آئے گا۔ اور چونکہ یہ خلاف نیچر ہے۔ اسلئے غلط ہے۔ اور غلط ہے اس لئے وہم ہے۔ اور وہم ہے لہذا پُرانے لوگوں کی بات ہے۔

جنت میں شراب ایک ہی قسم کی دی جائے گی۔ جس کا نام طہور ہے۔ مگر انسان کی خواہش رنگارنگی چاہتی ہے۔ اس لئے اس نے طرح طرح کی شرابیں بنائی ہیں۔ پس چونکہ یہ بھی خلاف فطرت ہے لہذا غلط ہے۔

جنت میں خدمت گار صرف لڑکے ہوں گے۔ اور چونکہ جنت کے باشندوں کو جوان ہونا ضروری ہے لہذا ثابت ہوا کہ یہ لڑکے جنت سے باہر رہیں گے۔ پس وہ خدمت کیونکر کریں گے لہذا یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔

جنت میں مردوں کو زیور پہنائے جائیں گے۔ اور یہ خاصہ عورتوں کا ہے۔ لہذا خلاف فطرت ہے اور جو خلاف فطرت ہے وہ غلط ہے۔

جنت میں دودھ شہد کی نہریں ہوں گی لیکن شہد چھتے میں ہوتا ہے اور دودھ تھن

میں زمین میں اس کی نہر کا ہونا خلاف فطرت ہے لہذا غلط ہے ؛

جنت میں ایک موتی کا محل ہوگا۔ موتی اتنا بڑا ہوتا نہیں۔ اور یہ امر سراسر خلاف قدرت ہے لہذا غلط ہے ؛

دوزخ میں آگ ہی آگ بیان کی جاتی ہے اور اس میں سانپ بچھوؤں کا ہونا بھی ثابت کیا گیا ہے۔ اور چونکہ آگ میں سانپ بچھو زندہ نہیں رہ سکتے لہذا یہ خلاف نیچر ہے اور غلط ہے ؛

دوزخ میں عذاب کے فرشتے بھی ہوں گے اور فرشتے نوری ہیں اور نور کو نار کا عکس بیان کیا جاتا ہے پس ثابت ہوا کہ فرشتے آگ میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور ان کا وہاں ہونا خلاف فطرت ہے لہذا غلط ہے ؛

فطرت نے ہر چیز کا علاج پیدا کیا ہے۔ پس اگر بالفرض دوزخ میں یہ سب باتیں ہونگی تو ان کا علاج بھی ضرور پیدا کیا ہوگا۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ انسان کوئی آتش پروف آلہ ایجاد نہ کرے جس طرح کہ پانی سے بچنے کے لئے واٹر پروف کا آلہ نکلا ہے اور سانپ بچھوؤں سے بچنے کے واسطے اسی قسم کا آلہ نہ بنالے ؛

اس کے علاوہ دوزخ جنت ہوں گی کہاں۔ دُنیا کی زمین کا رقبہ انسان نے معلوم کرلیا ہے۔ اگر ابتدا سے سب آدمی زندہ ہو جائیں تو اس زمین میں اتنی گنجائش نہ ہوگی اور اس زمین کے علاوہ کسی دوسرے کرہ میں انسان کا زندہ رہنا محال ہے۔ کیونکہ وہ خاکی نژاد ہے اور جنس خاکی ہی میں زندہ رہ سکتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ دوزخ جنت کو زمین پر ہی ہونا چاہئے۔ اور زمین میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔ پس یہ خلاف نیچر ہے۔ لہذا غلط ہے ؛

نئی روشنی والوں کو جواب خود نئی روشنی یہ دیتی ہے۔

چونکہ نیچر و فطرت یکساں حالت پر کبھی نہیں رہتی۔ بدلتا رہنا اس کا خاصہ ہے اس

Marfat.com

واسطے ایک عرصۂ دراز کے بعد اس میں غیر معمولی اور خلاف دستور تبدیلی کا ہونا لازمی ہے اور وہ تبدیلی یہ ہے کہ نئے آدمی زندہ کرنے کی بجائے پرانے مردوں کو زندہ کرے اور چونکہ نیچیر خود ضرورت ہے۔ اس لئے وہ کسی ایسی ضرورت کے ماتحت نہیں ہوسکتی جسکو آدمی کی عقل ضرورت کہتی ہو ۔

قانون حکومت کے حق و ناحق فیصلہ کے لئے کونسی عدالت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ قانون نے غلطی کی اور فیصلہ ٹھیک نہ کیا۔ لہذا تقاضائے فطرت ہے کہ وہ جمع کرتے کرتے سب ایک دن جزا و سزا پر نظر ثانی کرے اور ٹھیک ٹھیک فیصلے کر دے ۔

بہت سے گناہ ہیں جن کو انسان کا ضمیر گناہ نہیں سمجھتا۔ اس لئے اس پر ملامت نہیں کرتا اس کا فیصلہ ہونا ضروری اور نیچرل ہے۔ لہذا ہونا چاہئے اور یوم آخرت کو ہوگا ۔

جنت میں سب کام جنتی کی خواہش پر ہوں گے۔ اس لئے کہ قرآن شریف میں وَفِيهِ مَا تَشْتَهُوْنَ آیا ہے یعنی جنت میں جس کی خواہش کروگے وہی ملیگی۔ پس اگر نئی روشنی والوں کو ایک ہی بیوی منظور ہوگی تو ایک ہی دی جائے گی۔ بلکہ وہ چاہینگے تو ایک ولایتی مس بھی مل جائے گی ۔

جنت میں سب جوان ہوں گے کیونکہ وہ نیکیوں کا کلب گھر ہے۔ جس طرح دنیا میں بوڑھوں کے کلب علیحدہ ہیں۔ جوانوں کے علیحدہ۔ مجردوں کے جدا۔ شادی شدہ لوگوں کے علیحدہ۔ اور یہ کلب کے ممبر آپس میں ہنسی خوشی سے رہتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ ہم میں ناجنس بھی آئے۔ بلکہ ناجنس ممبر سے گھبراتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ جنتی کلب میں سب کا جوان ہونا حسب فیشن و نیچر ہے ۔

جنت میں خدمتگار لڑکے ہوں گے اور آپ ان کو بوائے کہکر آواز دے سکیں گے ان کی حیثیت خدمتگار و نکی ہوگی۔ مالک مکان کی نہ ہوگی۔ اس واسطے ان کا داخل جنت

ہونا اس طرح ثابت ہے جس طرح کلب گھر کے بوائز (لڑکوں) کا۔

جنت میں ہر قسم کی شرابیں ہونگی۔ طہور کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی قسم ایک ہے بلکہ یہ کہ وہاں کی شراب پی کر آپ گندی موریوں میں اوندھے منہ نہیں گریں گے۔ وہ پاک نشہ ہوگا جس سے پاک جذبات و حالات ظاہر ہوں گے۔

جنت کے زیور مثالاً بیان کئے گئے ہیں۔ آپ کو صرف ایک انگوٹھی ملیگی جس میں سونا پیتل ملا ہوا ہوگا اور نکٹائی و کالر کا پن ملجائے گا۔ اپنی مرضی پر ہے۔

دودھ تھن ہی میں نہیں ہوتا۔ ٹین کے ڈبوں میں بھی ہوا کرتا ہے جس نیچر نے اس کو منجمد کر کے اس قابل بنا دیا۔ وہی اس کی نہر بھی بہا سکتا ہے۔ یہی حال شہد کا ہے۔ ایک موتی کا محل خلاف نیچر نہیں ہے۔ اپنی خوردبین لگا کر دیکھ لینا۔ جس جگہ نیچر سارے جہان کے سب مرے ہوئے آدمیوں کو رکھے گی وہاں کے سمندر بھی چھوٹے نہ ہوں گے اور ان کے موتی بھی دنیا کے سمندروں کی مانند نہ ہوں گے۔

دوزخ میں آگ کے اندر سانپ بچھوؤں کا زندہ رہنا عقل کے موافق ہے۔ آگ کے کیڑے دنیا میں پلے جاتے ہیں۔

دوزخ کے فرشتے بھی آتشی نور کی مخلوق ہیں۔ اس لئے وہ اس کے اندر زندہ رہ سکتے ہیں۔

بیشک فطرت نے ان کا علاج پیدا کیا ہے۔ اور بتا دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مر کر زندہ ہونے پر یقین رکھو۔ اور اس خبر کے بیان کرنے والوں کے حکموں کو مانو اور اُن پر عمل کرو۔

تم واٹر پروف کی جگہ اگر آتش پروف نکال بھی لو۔ تب بھی دوزخ کے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔ تمہارے لئے آگ نہ ہوگی۔ سانپ بچھو نہ ہوں گے۔

بلکہ بنک فیل ہونے کی خبریں ہوں گی۔ پیاری ممّوں کے انکاری خطوط ہوں گے۔

Marfat.com

حقارت کے آوازے ہوں گے۔ شیم شیم کے نعرے ہوں گے۔ تم کو ہر وقت بارش اور کہر کا سامنا ہوگا۔ تمہارے تجارتی جہاز آنکھوں کے سامنے غرق کئے جائیں گے تم کو ہر تالوں کی خبریں دی جائینگی۔ تم سے کہا جائیگا کہ تم آزاد نہیں ہو۔ تم کو سنایا جائے گا کہ سیلف گورنمنٹ تم کو نہیں مل سکتی۔ تمہارے خلاف اخباروں میں لمبے لمبے آرٹیکل چھاپے جائیں گے اور تم کو دکھائے جائیں گے ؞

تمہارے آگے تھیٹر اور بائیسکوپ کے تماشے ہوں گے اور ان میں تمہاری تحقیر و تضحیک کی جائے گی۔ تمکو ڈیم فول کہکر ٹھکرایا جائے گا۔ تم کو بغیر کالر و نکٹائی کے کپڑے پہنا کر بازار میں نکالا جائے گا۔ تم کو میلے اور ٹوٹے ہوئے بوٹ پہنکر مسوں کے کلب میں بھیجا جائیگا اور وہ تم پر قہقہہ لگائیں گی ؞

تم کو نہانے کو پانی نہ ملے گا۔ تم کو بٹھا کر پیشاب کرایا جائیگا۔ تم کو کہا جائیگا کہ اپنے ضمیر کے خلاف مضامین لکھو۔ اور تم کو چاروناچار لکھنے پڑیں گے ؞

دوزخ میں تمہاری عورتوں کو پردے میں بٹھایا جائیگا۔ اور ان کے ناک کان چھیدے جائیں گے۔ چونکہ یہ سب باتیں تمہارے فیشن تمہاری عادت تمہارے خیالات اور تمہاری خواہشات کے خلاف ہوں گی اس واسطے ان میں تم کو وہی تکلیفیں ہوں گی جو ایک سیدھے سادے آدمی کو آگ اور سانپ بچھو سے ہو سکتی ہیں۔ اور اسی کا نام دوزخ ہے۔ پس تمہاری دوزخ وہی ہوگی جس سے تم لوگ تکلیف ہوتی ہے ۔

رہا یہ کہ دوزخ ہوگی کہاں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسی خاکی زمین پر جس کو نیچر ربڑ کی طرح اتنا لمبا چوڑا بنا دے گی کہ ساری دنیا کے اگلے پچھلے مرنے والے اس میں بخوبی سما سکیں ؞

جبکہ فطرت آج کل کے معمولی زمانہ میں زمین کے طویل و مختصر کرنے کے سامان کہا رہی ہے تو اس زمانہ میں تو اس کے کارناموں کی کچھ حد نہ ہوگی۔ کیونکہ نیچر اس وقت ایک غیر معمولی

تبدیلی و انقلاب کی جانب ہو گی ۔

پس ثابت ہو گیا کہ میدان حشر جنت ۔ دوزخ سب اس زمین پر ہوں گے ۔ اور ان کا ہونا از روئے نیچر ثابت ہے ۔

نئی روشنی کی جنت دوزخ کے بحث مباحثہ کو سنکران کو دیکھو جو دعوے دار تصوف ہیں اور اپنی دوزخ جنت سارے جہان سے الگ بتاتے ہیں کیا مجذوبانہ بڑ مار رہے ہیں کچھ کچھ تو سمجھ میں آتا ہے ۔ ذرا کان لگا کر سُننا ۔

کس کی جنت ۔ کس کی دوزخ کسی نے بے چارے بندوں کو کُن کی انگلی پہ نچار کہا ہے ۔ کسی سے کہتے ہیں جنت دوں گا ۔ کسی کو کہتے ہیں دوزخ میں ڈال دونگا کہیں دیدار کا وعدہ کرتے ہیں ۔ کسی کے سامنے صاف کہہ جاتے ہیں کہ بھلا مجھ کو کون دیکھ سکتا ہے میں کہیں دیکھنے کی چیز ہوں ؟

مانا کہ تم خدا ہو ۔ تم قدرت والے ہو ۔ تم کو سب کچھ آتا ہے ۔ مگر ان اپنی بنائی ہوئی مورتوں کے ستانے میں کیا رکھا ہے ۔ اس میں آپ کو کیا مزا آتا ہے ۔ ہم تو جانیں جب کُن فیکُون کا عملدرآمد ہے ۔ ہر ہستی دوزخ میں ہے اور جب یہ دور ختم ہو جائیگا ہر وجود جنت میں چلا جائے گا ۔

شذرات

قہر خدا پناہ اخدا کا غضب بُری چیز ہے ۔ خبر آئی ہے کہ اٹلی کے ملک میں ہولناک زلزلہ آیا ۔ شہروں کی آبادیاں سرنگوں ہو گئیں ۔ لاکھوں آدمی مر گئے اور زخمی ہو گئے ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سینٹ پال کی مورت چھت سے گری اور پاش پاش ہو گئی ۔

Marfat.com

اٹلی کے دل میں خدا کا خوف نہ رہا تھا اس نے بے گناہ عربوں پر چڑھائی کی تھی اور طرابلس میں ہزاروں معصوم عورتوں اور بچوں کو بیوہ اور یتیم ہی نہیں کیا بلکہ اُن کو سنگینوں اور بندوقوں کا نشانہ بنایا تھا۔ اور سمجھتے تھے کہ ہم خود مختار ہیں۔ جو چاہیں کریں ہمارا کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔

لیکن آسمان کی سلطنت ان شرارتوں کو حساب کے رجسٹروں میں لکھ رہی تھی۔ آخر وقت آ گیا اور فرشتے زلزلہ کا عذاب لیکر نازل ہوئے۔ اور اہل اٹلی کو زیر و زبر کر دیا۔

اٹلی میں بت پرستی کا مرکز ہے۔ وہاں مسیح اور ان کے حواریوں کی پرستش ہوتی ہے گرجاؤں میں بُت رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قہر نے ان بتوں کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اب تو جناب پوپ کو ہوشیار ہو کر بت پرستی چھوڑنی چاہیئے۔

اس واقعہ سے مسلمانوں کو عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ وہ ہر وقت خدا کے غیظ سے ڈرتے رہیں اور گناہوں سے توبہ کریں۔ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔

اپنے دشمنوں کی تباہی سے خوش ہونا نامردی ہے یہ جو کچھ لکھا گیا اپنی قوم کی عزت اور نصیحت کی غرض سے لکھا گیا ہے کیونکہ میری قوم غفلت میں ہے۔

صاحب بہادر کا سلام

تم نے سُنا ہوگا کہ جب کسی شخص سے کوئی انگریزی افسر ملاقات کرنی چاہتے ہیں تو چپراسی سے کہتے ہیں کہ فلاں کو ہمارا سلام دو۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہماری ملاقات کے لئے بُلا لو۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب مومن بندہ کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو فرشتہ بھی آن کر یہی کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے تجھ کو سلام کہا ہے مومن کی روح یہ سُنکر خوشی خوشی جسم سے پرواز کر جاتی ہے۔

مسلمان اپنے سب سے بڑے "صاحب" پر قربان ہوں۔ کیا ہی مہربان صاحب ہے۔ اپنے ناچیز مگر ایماندار بندوں کو کیسی محبت سے یاد فرماتا ہے۔ پھر کیوں نہ اسکی چاہت

اور وفاداری کا دم بھر جائے۔

من کہ نازک بدن ہستم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب کا انتقال ہوا۔ تو آنحضرت ان کے دفنانے کے وقت فرماتے تھے۔ یہ نازک بدن لڑکی ہے مجھے ڈر تھا کہ قبر اس پر تنگی نہ کرے۔ مگر وہ اس پر فراخ ہو گئی۔

امت بھی اپنے رسولؐ کی نازک بدن لڑکی ہے۔ بلکہ اولاد سے بڑھکر پیاری ہے۔ اس واسطے اس کو قبر کی مشکل کے وقت ان کی شفاعت کا بھروسہ ہے۔ خدائے تعالیٰ ہر مسلمان کو اس کٹھن وقت میں اپنے رسولؐ کی شفاعت نصیب کرے۔ آمین۔

مرغ کی اذان

مرغیوں نے مرغ کی اذانوں سے دق ہو کر مسجد کے مؤذن سے فریاد کی۔ اس نے کہا کیا تم مرغ کی اذان سنتی ہو؟ میں تو پانچوں وقت محلہ میں چیخ چیخ کر اذان دیتا ہوں۔ مگر محلہ والوں کے کان میں آواز نہیں جاتی۔ ان سے تو تم اچھیں۔

مرغ کو خبر ہوئی تو وہ بھی آیا۔ اور بولا میں اپنی ہستی کا یقین دلانے کو اذان دیتا ہوں۔ اس لئے تم کو ناگوار ہے۔ اور مؤذن خدا کی ہستی کا اعلان کرتا ہے اسلئے گوش اغیار بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ مگر خدا پرست دوڑے ہوئے مسجد میں آتے ہیں۔

غفلت کی نیند

سونے میں تم انگریزوں کی ریس نہ کرو۔ کیونکہ وہ اپنا کام کر چکے ہیں۔ اب ان کو آرام کی نیند اور زیادہ سونا زیب دیتا ہے۔ تم امیروں کی نیند پر نظر نہ کرو۔ ان کو دولت نے بے فکر کر دیا ہے۔ تم اگر تندرست اور مضبوط ہو تو ڈاکٹروں کے قول پر نفرت کا ووٹ پاس کرو۔ اور خوب جاگو۔ ڈاکٹر تم سے کہتے ہیں کہ صحت سات گھنٹہ کی نیند مانگتی ہے۔ مگر بڑے بڑے کام کرنے والے کبھی چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے لہذا تم بھی زیادہ جاگا کرو۔

Marfat.com

حضرت علیؓ نے فرمایا ہے۔ مَنْ طَلَبَ الْعُلیٰ سَھِرَ اللَّیَالِیْ جو بڑا بننا چاہے اُسکو راتوں کو جاگنا چاہئے۔ نپولین زیادہ سونے کا دشمن تھا۔ اسی لئے قدرت نے بڑائی اور ناموری کو اس کا دوست بنایا۔

سردی کی راتیں بڑی ہوتی ہیں۔ تمہارا جو پیشہ ہو اس کو رات کی بیداری میں ترقی دو۔ اول شب سو جاؤ۔ پچھلی رات اٹھکر کام کرو۔ یہ دنیا کام کرنے کے لئے ہے۔ سونے کا دوسرا عالم ہے۔ عمر بھر سوتا رہیگا خاک کے سایہ تلے۔ مشہور قول ہے۔

اول اول شب بیداری سے تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن جب عادت ہو جائے تو خوشی و شادمانی کا ٹھکانا نہیں رہتا۔ ہر وقت انسان بشاش رہتا ہے۔ کیونکہ فرض کی ادائگی اور ترقی ہی بڑی شادمانی کا سبب ہے۔

قال کا بازار کہنے کو سب کہتے ہیں کہ کرنا کہنے سے بہتر ہے۔ مگر یہ بھی قول ہے فعل نہیں ہے۔ اس میں ہم کو انگریزوں سے سبق لینا چاہئے۔ جو کرتے پہلے ہیں اور کہتے بعد میں ہیں۔ ہندو کانگریس اور مسلم لیگ کے رزولیوشن میدان قال کے بڑے ہونہار جوان ہیں مگر حال کی صف میں آتے ہیں تو نابود ہو جاتے ہیں۔ اگر ان فیشن طراز جماعتوں کو ان قالیہ فوجوں پر فخر ہے تو خدا ان کے فخر کو زیادہ دن تک سلامتی نہ دے۔

ہمارا حال ماضی کی فراموشی اور استقبال کی خاموشی میں درخشاں ہونا چاہئے۔ اگر ہم بڑے تھے تو کیا ہوا۔ اگر ہم بڑے ہو جائیں گے تو کون جان سکتا ہے۔ ہم کو آج کی حالت دیکھنی چاہئے کہ نہ چھوٹے ہیں نہ بڑے ہیں۔ اور ضرورت ہم کو زندہ رہنے کی ہے خدا کرے ہم قال کو چھوڑیں اور مردان حال بنیں۔

حقہ کیلئے تمباکو ایک دوکان دار نے شکایت کی کہ ایک پیسہ کی بکری نہیں ہوتی۔ حقہ کا تمباکو بھی گھر سے لانا پڑتا ہے۔

اس سے کہنا چاہئے کہ گھر میں جو پونجی تمباکو منگاتی ہے۔ وہ بھی اس دوکان کی بدولت ہے۔ گھبراؤ نہیں یہ چیزوں کی تکلیف لڑائی تک ہے۔ اس کے بعد پھر خوش حالی ہوگی۔ انسان کو مصائب اور تکلیفات کے ایام میں صبر کو شیوہ بنانا چاہئے۔ کیونکہ صبر اگر نیت کرکے کیا جائے تو بڑا اجر دلواتا ہے۔ ورنہ بے نیت تو ہر شخص کو اسی طرح دل مسوسنا پڑتا ہے۔ جس طرح صابر کو۔ لہذا تم تکلیف کی حالت میں صبر کی نیت کیا کرو۔

ہم کو بڑا آدمی بننا چاہئے

اب بت شکنی کا زمانہ نہیں ہے۔ طبیعتوں کا میلان لیڈر شکنی کی جانب رجوع ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ خلقت جن کو لیڈر سمجھتی ہے اور ان کے زور کو توڑنا چاہتی ہے وہ بھی غلطی پر ہے۔ اور جو لوگ چند حاکموں سے میل جول اور ایک خطاب کو لیڈر شپ سمجھتے ہیں وہ بھی غلط راستہ پر ہیں۔ کیونکہ لیڈری اور بڑائی ایک دوسری چیز ہے جس کے ماتحت دلوں کی کُنجیاں ہوتی ہیں۔

تم خیال نہ کرو کہ اخباروں میں دھواں دھار مضمون لکھنے والے اور حکومت پر نکتہ چینی کرنے والے لیڈر اور بڑے آدمی ہیں۔ نہیں یہ بھی دھوکا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ بھی اپنی ذاتی اغراض کی خاطر بے اصول راستہ پر چلتے ہیں۔

ہم کو بڑا آدمی بننے کی ضرورت ہے۔ مگر اس کی تکمیل کیلئے محنت جفاکشی۔ ایثار درکار ہے۔ اپنا وجود کھو کر بڑائی حاصل ہوتی ہے۔ فطرت ہر انسان کی اس کی خواہشوں میں مدد گار ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ رات دن جوانی کے مزے لوٹو۔ اور خرافات میں مبتلا رہو تو فطرت تم کو طاقت اور دولت دینے کو تیار پائی جائے گی۔ اگر تم کو منظور ہو کہ دوسروں کی خوشامد کرکے عارضی بڑائی حاصل کرو تو فطرت تمہاری دماغی قوتوں کو بہترین طریقے تعلیم کرے گی اور اگر تم یہ چاہو کہ حاکم و محکوم کو فائدہ پہونچا کر بڑائی حاصل کرو تو اس کے راستہ بھی تم کو فطرت ہی کے ذریعے مل جائیں گے۔ پھر تم بہت ہی بدنصیب

Marfat.com

ہو گے اگر اپنی فطرتی طاقت سے نیک کام نہ لو۔

اگر دوسروں کی بھلائی کے لئے تم مشہور ہونے کی خواہش رکھتے ہو تو قدرت تم کو قرآن کی زبان میں آواز دے گی وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ اگر تم کو دوسروں کا بوجھ ہلکا کرنا منظور ہو تو وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ کا نعرہ سنو گے۔ تم چھوٹوں کا دل بڑھاؤ۔ خدا تم کو بڑا آدمی بنا دیگا۔ تم لیڈر بننے کی خواہش کرو اور مخلوق خدا کے کام آؤ۔ قدرت تمہاری مدد کرے گی اور تم بڑے آدمی بن جاؤ گے نمائش ضروری چیز ہے۔ مگر اس کو ذریعہ بناؤ۔ اصل مقصود نہ سمجھو۔ کیونکہ نمائش تمہاری بڑائی کا آلہ ہے۔

خلافت اور اخوت

اسلامی دنیا کے یہ دو مسئلے آج کل شد و مد سے اہل تدبیر کے زیر بحث ہیں۔ اخوت بھائی چارہ ایک رشتہ روحانی ہے۔ جو بطور نعمت الٰہی کے مسلمانوں کو عطا ہوا تھا قرآن شریف کے چوتھے پارے میں اس نعمت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ط

خدا کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر مبذول ہوئی جبکہ تم آپس میں دشمن بنے ہوئے تھے تو تمہارے دلوں میں باہمی الفت ڈال دی اس کے بعد تم اس نعمت خدا کے طفیل میں ایک دوسرے کے بھائی بن گئے

قومیت۔ رنگت وطینت وغیرہ کئی جذبے ایسے ہیں جو افراد انسانی کو باہمی اتحاد کیلئے کھینچتے ہیں مگر اس کشش میں وہ دوام و استحکام نہیں پایا جاتا۔ جو جذبہ مذہب میں نظر آتا ہے۔ خواہ کوئی مذہب بھی ہو اس کے پیرو اپنے عقاید سے ایک رشتہ قلبی رکھتے ہیں۔ وہ مذہب اچھا ہو یا برا۔ ماننے والے کو اس کی ہر بات اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اسلام میں بمقابلہ دیگر مذاہب کے ایک نمایاں خصوصیت باہمی ارتباط کی پائی جاتی ہے۔ اس خصوصیت کو اگر مادی اسباب کے معیار سے معلوم کرنا چاہیں تو ہمیں

Marfat.com

نہیں کہہ سکتا کیا کیا وجوہات ذہن رسا بتائے۔ مگر بادی النظر میں اس کا جواب آسان نہیں ہے۔ ہم اس زمانہ میں بے شمار مثالیں عیسائی اخوت کی دیکھ چکے ہیں۔ خود اپنے ملک میں ہندوؤں اور آریہ سماجیوں کی باہمی الفت کا اندازہ ہو چکا ہے اگرچہ عیسائیوں کی اخوت زیادہ تر سیاسی تحریکوں سے متاثر ہو کر عمل میں آتی تھی اور ترکی حکومت کی مسیحی رعایا میں بھی ہم اس کی مثالیں دیکھتے تھے۔ کیونکہ بیرونی عیسائی حکمراں اپنے ملکی مفاد کی بنا پر ان ترکی محکوموں کو بھڑکاتے تھے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عیسائیوں میں اخوت کا جذبہ ناپید نہیں ہے۔ وہ نہ ہوتا تو بیرونی تحریکیں کارگر کیسے ہوتیں۔

اسلامی اخوت باہر کی تحریکوں اور لیڈروں کی رہنمائیوں سے آزاد ہے۔ ایک گاؤں میں جاؤ جہاں کے باشندے جاہل محض اور تمام احساسات و علم سیاست سے نابلد ہوں۔ پھر ان سے کہو فلاں ملک میں مسلمان پر ظلم ہوا ہے۔ تو وہ ایسے بیقرار ہو جائیں گے گویا خود ان پر کوئی مصیبت آن پڑی ہے۔ ایسے ہی خوشی کی خبر سُنکر ان کا مسرور ہونا لازمی ہے۔

یہ کیا طاقت ہے؟ اس کے جواب کیلئے ہم جو مادی دلائل غور و خوض سے پیدا کرتے ہیں وہ سب کی سب دست مادیت سے چھٹی جاتی ہیں۔ اور مجبور کرتی ہیں کہ ہم ہر پھر کر اس آیت کی جانب رجوع کریں۔ اور کہیں کہ سارا طفیل عنایت رب کا ہے۔ اس کو منظور ہے کہ مسلمانوں میں اخوت کا جذبہ تمام قوموں سے ممتاز رہے۔ اس لئے ہمارے اندر اخوت کا جذبہ زیادہ ہے۔

اخوت کی مادی دلیلیں چند مذہبی مراسم ہیں جن میں حج اور نماز کو زیادہ خصوصیت ہے۔ مگر لاکھوں مسلمان نماز نہیں پڑھتے کروڑوں آج تک حج کو نہیں گئے لیکن ان میں جذبۂ اخوت کی کمی نہیں ہے۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ رشتہ کسی مخفی طاقت

کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ پوشیدہ قوت خدا ہے۔

جہاں مسلمانوں میں یہ زبردست طاقت اخوت کی ہے وہیں ان میں اختلاف بھی بکثرت ہے اور جو حسب روایات احادیث صحیحہ قیامت تک رہے گا اس اختلاف نے مسلمانوں کو ہمیشہ نقصان پہونچایا۔ ان کی بادشاہتیں خاک میں مل گئیں۔ وہ ذلیل ومحکوم بن گئے۔ لیکن ان حالات سے اخوت کی طاقت کو کوئی صدمہ نہیں پہونچا۔ وہ جوں کی توں موجود ہے۔ یہ اختلافات بظاہر ہم کو دھوکے میں ڈالتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہم میں سے اخوت سلب ہو گئی ہے۔ مگر یہ درست نہیں ہے کیونکہ اختلاف اور چیز ہے۔ اور اخوت اور چیز ہے۔ اخوت بنیاد اور جڑ ہے۔ اور موجودہ اختلاف شاخوں اور سطح پر ہے۔ جڑ سے اسے کچھ سروکار نہیں ہے۔

غازی پور کی تازہ تقریر میں سر جیمس میسٹن لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ نے اخوت اسلامی کا تحیر و تعجب سے اعتراف کیا ہے کہ یہ باوجود پیہم صدمات کے اب تک اپنی اصلی حالت پر برقرار ہے۔

کچھ تعجب کی بات نہیں ہے اسلامی اخوت کی ثابت قدمی ظاہری اعتبارات سے بالکل قرین عقل ہے۔ مسلمان نسل اور ملک کے ماتحت نہیں ہیں۔ ان کا اتحادی مرکز:۔

کلمۂ وحدت

ہے جو تمدنی۔ ملکی۔ سیاسی انقلابات سے قدرتاً متاثر نہیں ہوتا۔ لاٹ صاحب نے فرمایا ہے کہ کوئی دوسری قوم اگر ایسی اخوت قایم کرنی چاہے تو نہیں کرسکتی مگر میں کہتا ہوں فطرت الٰہی نے اپنا احسان مسلمانوں کے لئے مخصوص کیا ہے۔ جو قوم کلمۂ توحید کا اقرار کر کے دل وجان سے اس پر یقین کرے اس کی قومیت اخوت

Marfat.com

کی طاقت سے اس طرح مالا مال ہو جائے گی جس طرح مسلمان دیکھے جاتے ہیں ۔

حاصل مقصد

مسئلہ اخوت کی تحقیق کا یہ ہے کہ برٹش حکومت اس طاقت کو نظر انداز نہ کرے اور سمجھے کہ جرمن اسلامی اخوت سے کام لے رہے ہیں اور ہماری سرکار ابھی تک صرف علمی پہلو سے اس پر بحث کر لینا کافی سمجھتی ہے۔ حالانکہ وقت عمل کا ہے۔ میں یہ سوال سنجیدگی سے کرتا ہوں کہ جرمنوں نے فرضی طریق سے ہی قبولیت اسلام کا دعویٰ کر کے جو اثر اخوت کی لہر میں حاصل کر لیا ہے اس کا جواب ہماری گورنمنٹ نے کیا دیا؟ یا تو اس کی باضابطہ موثر طریقہ سے تردید ہو یا اور کوئی صورت نکالی جائے ورنہ ان چرچوں کا اسلامی اخوت پر جو اثر پڑ رہا ہے۔ وہ معمولی نظر سے دیکھنے کے قابل نہیں ہے ۔

خانۂ رسول ؐ کے راز و نیاز

محبت کے راز و نیاز کی معاملہ بندیاں شاعروں نے بہت سی لکھیں۔ زمین آسمان کے قلابے ملائے مگر خانہ لری کی الفتوں کا ان کو کیا مزا۔ جو درختوں اور جانوروں کی مثالوں میں جذبات عشق تلاش کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے سوسنے قمری کے دل کو جلایا لہذا پھل سے محروم رہا۔ کوئی بولا گل نے بلبل کو ستایا۔ اس لئے پژمردہ ہو کر کملایا۔ کسی نے شمع و پروانہ کے سوز و گداز پر آنسو بہائے۔ آؤ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خانگی راز و نیاز کو سنیں۔ اور اپنے گھروں میں اس محبت کا رواج دیں ۔

ذیل کا قصہ صحیح حدیث سے نقل کر کے لکھا جاتا ہے ۔

رسول خدا (حضرت عائشہ رضی سے مخاطب ہو کر) ہم جان لیتے ہیں کہ آج تم ہم سے خوش ہو یا ناراض ۔

Marfat.com

حضرت عائشہؓ:۔ کیونکر؟ میں قربان ہو جاؤں ذرا بتلایئے تو۔

رسول خدا:۔ جب تم ہم سے خوش ہوتی ہو تو یوں قسم کھاتی ہو۔ محمدؐ کے خدا کی قسم! اور جب ناخوش ہوتی ہو تو کہتی ہو۔ ابراہیمؑ کے خدا کی قسم۔

حضرت عائشہؓ:۔ (متبسم ہو کر) ہاں یارسول اللہ! خفگی میں آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں۔ نہ کہ آپ کو۔

اس راز و نیاز میں جو پاکبازانہ لطف ہے۔ وہ اہل محبت سے مخفی نہیں۔ کونسا گھر ہے جہاں رنجشیں پیدا نہیں ہوتیں مگر رنج ہو تو بس اتنا کہ فریقین اپنے جذبات اشاروں کنایوں میں ادا کر کے جی کی بھڑاس نکال لیں۔ نہ یہ کہ توڑ پھوڑ اور اکھاڑ پچھاڑ کر بیٹھیں۔

مقصود زندگی

ہر ایک کو ہے زمانے میں زندگی مقصود
کسے خبر ہے کہ مقصود زندگی کیا ہے (اکبر)

نئی روشنی نے تو اس کا جواب یہ دیا کہ اچھا کھانا۔ اچھا پہننا اور عزت کیساتھ بسر کر کے مرجانا ہر انسان کا مقصد زندگانی ہے۔

مگر کوئی پوچھے کہ یہ باتیں تو زندگی ہیں۔ یہ بتاؤ کہ ان باتوں کا حاصل مقصد کیا ہوا کیا اتنی بڑی دنیا۔ یہ عظیم الشان کائنات یہ عقل کا پتلا آدم زاد اس لئے پیدا ہوا کہ دو نوالے کھائے۔ دو کپڑے پہنے۔ چار سلام لے اور آنکھ بند کر کے موت کے حوالے ہو جائے۔

مذہب کہتا ہے۔ عبادت رب مقصود زندگی ہے۔ مگر فطرت کہتی ہے زندگی خود اپنا مقصود ہے۔ زندگی کی شناخت کے لئے زندگی ملی ہے۔ یہ مجہول کی مجہول تعریف نہیں ہے۔ غور کرو ہر ذرہ کی حیات اپنے وجود کے عرفان کے لئے ہے۔

اور انسان جو تمام موجودات کا خلاصہ ہے اپنی اور تمام کائنات کی زندگی

Marfat.com

کو پہچاننے اور اُس سے خالق کا عرفان حاصل کرنے کو پیدا ہوا ہے۔ جب شناخت ہوتی ہے۔ خودسروں کا سر جھکا کر سجدہ میں گر پڑتا ہے۔ اور کہنا پڑتا ہے کہ :-

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا

پھر عبادت وطاعت بھی شروع ہوتی ہے جو بیان مذہب کی رو سے مقصود زندگانی ہے۔ اور کھانے پینے رہنے سہنے کا بھی اصلی لطف آتا ہے جو نئی روشنی کے عقیدے میں مطلوب حیات ہے۔ واہ عرفان تیری کیا بات ہے۔ میری پہچان میں تجھ پر قربان۔ تو آجائے تو جینے کا مزا مل جائے۔

خاک کا ٹھکانا

جب جان خاک میں ملی۔ تو سب نے شادیانے بجائے ترانے گائے اور ہر ایک نے نورِ چشم لختِ جگر کہکر اس خاک آلود جان کو سینے سے لگایا۔ ماں نے گود میں اٹھایا۔ باپ نے آنکھوں پر بٹھایا۔ اور جب جان خاک سے آزاد ہوئی۔ مٹی کی آلودگاری سے نجات ملی تو آہ و بکا کے نلے بلند ہوئے۔ کسی نے کہا کہ ہائے میرا لال۔ کوئی بولا ارے میرے سرتاج۔ عورت۔ مرد بچے۔ بوڑھے یکساں رونے پیٹنے میں مصروف ہوئے۔

کیا خدا کی شان ہے۔ یہ انسان بھی کس قدر انجان ہے۔ ہنسنے کے وقت روتا ہے اور رونے کے موقع پر ہنستا ہے۔ کوئی اس کو بتائے۔ خاک اور جان کے رُتبوں کا فرق سمجھائے۔ جان جسم خاک میں اپنی خوشی سے نہیں آئی تھی۔ حکم حاکم سے مجبور تھی۔ حاکم کو خاک کا رتبہ بڑھانا تھا۔ ورنہ جان کا خاک نہیں کوئی اور ٹھکانا تھا۔

خاک نے درجہ پایا۔ کچھ دن امر اللہ کے سانسوں کو پیار کے سینے سے لگایا۔ آخر وقت مقصود نے اپنی جان کو رہائی دی۔ اور خاک کو اسکے ٹھکانے پہ بھیدیا۔

Marfat.com

خاک کا ٹھکانا خاک ہے۔ جان کا ٹھکانا شہ لولاک ہے۔ خاک اپنے ٹھکانے میں پہنچکر غمناک بن جاتی ہے اور جان کا جو حال ہوتا ہے اس کا اظہار الفاظ و معانی کی حد سے باہر ہے۔ پھر کون بتائے سوائے اس کے کہ جناب اکبر کا گیت گائے اور یہ شعر پڑھے ؎

جان جب خاک میں ملتی ہے تو ہوتی ہے خوشی
خاک جب خاک میں ملتی ہے تو سب روتے ہیں

اس کتاب کی غلطیاں

ناظرین کتاب سی پارۂ دل یعنے مجموعہ مضامین حسن نظامی کو معلوم ہو کہ یہ کتاب سالہا سال سے غلط چھپ رہی تھی۔ کیونکہ ہر ایڈیشن کی لکھائی اور چھپائی کے وقت دفتر کے ملازم اس کی صحت کرتے تھے مگر وہ ہمیشہ ہر ایڈیشن میں غلطیاں درست کرنے کی بجائے اور نئی غلطیاں بڑھا دیتے تھے کیونکہ وہ ادبی ذوق اور زبان کے محاوروں سے ناواقف ہوتے تھے۔

گذشتہ ایڈیشن کا کاغذ بھی بہت ہلکا اور خراب تھا جو میرے اصول کے خلاف ہے کیونکہ میں ہمیشہ اپنی کتابیں اچھے کاغذ پر چھپواتا ہوں۔

اس لئے میں نے اس ایڈیشن کو خود درست کیا۔ یعنی پوری کتاب کی کاپیاں پڑھیں اور ان کو درست کیا۔ ہر سطر میں کاتبوں نے شرمناک اور افسوسناک غلطیاں کی تھیں۔ اور دوسرے ایڈیشن کے لکھنے والے کاتب مکھی پر مکھی مارتے چلے جاتے تھے نہ کاتب غور کرتے تھے نہ صحت کرنے والے۔

میں نے پورے ایک سال کی محنت سے پوری کتاب کی کاپیاں درست کیں۔ اور اب یہ کتاب ایک حد تک درست ہو گئی ہے۔ اگرچہ اب بھی چھپائی کی غلطیاں رہ گئی ہوں گی کیونکہ میں نے چھاپہ خانہ میں جانے کے بعد پروف نہیں دیکھے۔ البتہ میرے کرم اور محسن منشی قربان علی صاحب بسمل ایڈیٹر اردوئے معلی دہلی نے اس کے پروف پڑھے ہیں اور انہی کے اہتمام سے یہ کتاب چھپی ہے اس لئے امید ہے کہ چھپائی کی غلطیاں بھی بہت کم ہوں گی۔

حسن نظامی دہلوی
اگست ۱۹۳۷ عیسوی

Marfat.com

پانچویں منزل

سیاست معاشرت تمدن

تاج اور کلاہِ درویشی

دربار کی یادگار

نظام المشائخ ۱۹۱۱ عیسوی

دہلی میں دربار ہے۔ شہنشاہ ہندوستان و انگلستان یہاں آئیں گے جنگل میں منگل ہوگا۔ ادنے اعلےٰ چھوٹا بڑا۔ ہندو مسلمان۔ عیسائی۔ موسائی خوش ہوگا۔ اور خوشی کا اظہار کرے گا۔

آؤ ہم بھی شاہ جارج کو مبارکباد دیں۔ مگر ساری دنیا انگریزی قوم اور انگریزی بادشاہ کو مبارکباد دیتی ہے۔ ہم صوفیوں کی طرف سے اس چیز کو مبارکباد دیں جو سب خوشیوں کا مرکز ہے۔ بیشمار امیدوں کا ملجا و ماوا ہے۔ یعنی:-

تاج

دراصل تاج ہی وہ چیز ہے جس پہ بادشاہی شہنشاہی کی مہر لگی ہوئی ہے بغیر تاج

Marfat.com

کے سب انسان برابر ہیں۔ وہی ہوا آکسیجن وہی ایک زبان۔ دل بھی ایک۔ قد بھی بہت اونچا نہیں۔ سانس بھی وہی۔ پیاس بجھانے کو پانی بھی۔ اور پیٹ بھرنے کو روٹی بھی یکساں۔ حضرت تاج سر پہ آ جاتے ہیں تو یہ انسانی دو گز کی مورت بادشاہ کہلانے لگتی ہے دیکھنا اس تاج کے اجزاء پر غور کرنا۔ یہ کس چیز کا بنا ہوا ہے کیوں کہ اس میں یہ عظمت یہ طاقت۔ یہ تاثیر آ گئی کہ جہاں یہ سر پر پہنچا کروڑوں سر اس کے سامنے جھکنے لگے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکو انسانوں نے بنایا ہے اور اسمیں وہی اجزاء ہیں جو ہر کس و ناکس کے استعمال میں آتے ہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ جب وہ اجزاء تاج کی شکل اختیار کریں تو انسان کو بادشاہ بنا دیں۔ اور گدا کی گدڑی میں سے جائیں تو حقارت و ذلت کا ہدف بنیں۔ ہو نہ ہو اسکی حقیقت میں اس کے معانی میں کوئی بھید ہے۔ ان سے کہو جو صوفی کہلاتے ہیں۔ جنکی دینی و دنیاوی زندگی حقیقت شناسی ہے۔ تاج کی حقیقت پر غور کریں کہ وہ اس شکل میں آ کر ایسا اثر دار کیوں ہو جاتا ہے۔

اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ والا معاملہ ہے۔ ایسے بادشاہ بھی گذرے ہیں جن کے تاج کی کچھ عزت نہ تھی۔ تلوار کے زور سے ملک لیا اور کچھ دن کے بعد فنا ہو گئے۔ اور ایسے شہنشاہوں کا ذکر بھی تاریخوں میں مذکور ہے جن کو مرنے کے بعد کفن بھی میسر نہ آیا۔

شاہ جارج کی تاجپوشی لندن میں ہو چکی۔ ہندوستان بھی ان کی حکومت کا ایک حصہ ہے۔ اس کے لئے دہلی میں خود تشریف لا کر اپنی تاج پوشی کا اعلان کریں گے۔ اعلان کرتے وقت ان کا دل خوش ہو گا۔ ان کی خوشی سے رعیت بھی شاد کام ہو گی۔ رعیت کے سب طبقے علیحدہ علیحدہ مبارکباد دیں گے۔ درویشوں اور صوفیوں کی طرف سے کلاہِ درویشی۔ صدائے قلندرانہ میں تہنیت گزار ہے۔

"جارج" بابا کی خیر کر بھلا۔ ہو بھلا۔ سانس کی قدر کر۔ آس والوں کی آس بر لا۔ گھوڑے

Marfat.com

والے۔ جوڑے والے۔ توپوں والے۔ توپوں والے یشادرہ۔ آبادرہ۔ تیرے جہازوں کی خیر۔ اور اس آزادی کا بول بالا جو جہاز کے جھنڈوں میں لہرا رہی ہے۔ فقیروں کیطرف بھی دیکھ۔ یہ وہ ہیں جو مغرور اور متکبر خود سر جفاکار بادشاہوں کو کھری کھری سُنا دیا کرتے تھے۔ تو تو نیک دل اور نرم مزاج ہے۔ تیری حکومت میں ہر بات سُننے کی صلاحیت ہے دیکھ یہ دنیا ایک تماشاگاہ ہے۔ دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اس کی شان وشوکت میں جی نہ لگا۔ اور اُسکی طرف متوجہ ہو جس نے تجھکو یہ شان وشوکت عطا فرمائی ہے۔

اس ہندوستان میں اُن ہندو مہاراجاؤں کی اولاد جو ایک زمانے میں اس ملک کے تاجور تھے کس مپرسی کے عالم میں گرفتار ہے۔ تغلق اور خلجی خاندان کے شہزادے اور شہزادیاں دہلی میں فاقے کرتے ہیں اور تغلق آباد کے عالیشان قلعے کی کوٹھریوں میں اپنی گزشتہ عظمت کو یاد کر رہے ہیں۔

تیموری جاہ وجلال کی افسردہ نشانیاں شہزادے اور شہزادیاں دہلی کے محلوں میں فاقہ کشی کر رہی ہیں۔ کیوں۔ اس واسطے کہ انہوں نے دنیاوی عیش وعشرت میں اپنے انجام کار کو بھلا دیا۔ گردش دوراں کو یاد نہ رکھا۔ تو نہ بھول۔ تیری یاد ہمیشہ قایم رہیگی غرور سے اکڑ کر نہ چل۔ تیرے تاج کو دائمی قرار نصیب ہوگا۔

خدا خوش نصیب ملکہ "میری" کے سُہاگ کو چار چاند لگائے۔ اور وہ دیکھیں کہ غریبوں کی دعاؤں کے کپڑے کا رچوبی چکدار کپڑوں سے لاکھ درجہ اچھے ہیں۔ انہیں کو ہمیشہ استعمال کریں۔

یہ درویشی کلاہ بھی اقلیم تصوف کی حکومت کا ایک تاج ہے دلوں پر حکمرانی کرتا ہے ایمان کا سکہ چلاتا ہے۔ خدائی توپوں اور فوجوں کو رکاب میں رکھتا ہے اے بادشاہ! اس کی دوستانہ مبارکباد قبول کر۔ اور سربلند ہو۔

ٹھکانا ایک بستر کا

(از اخبار زمیندار فروری ۱۹۱۲ء)

انگریزی سرکار! تجھ کو قرار۔ تیرے نرم گرم بستر کو قرار شاد رہ آباد رہ۔ مسلمان فقیر ہیں بے نوا ہیں۔ مگر تیرے اس بستر کو نظر لگانے والے فقیر نہیں ہیں جو مشرق و مغرب میں بچھا ہوا ہے۔ ان کو صرف ذراسی جگہ تیرے دل میں درکار ہے جس میں مسلم کی ہستی مختصر کے لئے ٹھکانا ایک بستر کا ہو جائے۔

اے ہندوسندھ میں پاؤں پھیلانے والی گورنمنٹ! نیند ہماری آنکھوں میں بھی آتی ہے ہم کو بھی گوشۂ عافیت دے۔ زیادہ نہیں فقط

ٹھکانا ایک بستر کا

کل کے دن ہم تاج والے تخت و بخت کے مالک تھے۔ آج کے دن ہم تیرے راج کے سائے تخت کو تختہ بنائے بخت و اقبال لٹائے بے یار و مددگار کھڑے ہیں ملک نہیں مانگتے۔ تاج و تخت طلب نہیں کرتے۔ ہمیں تو محض درکار ہے۔

ٹھکانا ایک بستر کا

دہلی بسانا مبارک۔ لیکن ہمارے نشیمن کو نہ اجاڑ۔ ہمارے ٹوٹے بوریے کو حجرہ سے نہ پھینک۔ دیکھ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ بس یہی باقی ہے۔

ٹھکانا ایک بستر کا

سنتے ہیں تجویز شدہ نئی دلی کی تعمیر میں وہ سب رقبہ آگیا ہے جس میں ہم

Marfat.com

اجڑنے والوں کی مسجدیں ہیں۔ خانقاہیں۔ مزارات ہیں۔ اور تاریخی چیزیں ہیں جن کو زمین سے اُبھرا ہوا دیکھ کر سانس آتا جاتا ہے۔ یہ مٹ جائیں گی تو ہمارا وہ سب کچھ مٹ جائے گا جس کو ہم کہا کرتے ہیں کہ ابھی باقی ہے۔

ٹھکانا ایک بستر کا

حلقۂ نظام المشائخ نے پنجاب گورنمنٹ کو درخواست بھیجی ہے کہ ان مقدس مقامات کی حفاظت کا خاص طور سے خیال رکھا جائے۔ اور حلقہ مجوزہ رقبہ کے اندر آئی ہوئی تمام مسجدوں خانقاہوں۔ مزارات وتاریخی مقامات کی فہرست بنا رہا ہے۔ امید (جبکہ وہ پیش ہو) نظر توجہ کی جائے تاکہ ہم سب گداگران دلفگار جارج سلطان کے ارمان کو خوشی وخرمی سے پورا ہوتے دیکھیں اور کہیں حل گیا ہمارا۔

ٹھکانا ایک بستر کا

عقل دور اندیش رکھنے والے انگریزو۔ ہمیں تم پر بھروسہ ہے۔ اعتماد ہے۔ کہ تم یقیناً ہماری اس شکستہ آواز پر کان دھروگے اور احتیاط کے ساتھ ان نشانیوں کو قایم رکھوگے جہاں ہے ہمارا۔

ٹھکانا ایک بستر کا

مسلم پریس کو اگر اس سوختہ طلبگاری میں بوئے ادب ووفاشعاری محسوس ہو اور کوئی مصلحت مانع نہ ہو تو اس سے بھی درخواست ہے کہ اس صدا میں سُر ملائے اور کہے ہاں۔ باقی رہے،،

ٹھکانا ایک بستر کا

Marfat.com

چمار زادہ سیّد کی گود میں

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

نیچ زاد چھوکرے۔ آمیری گود میں آجا۔ تو شودر ہے۔ کمین ہے۔ پلید ہے۔ گندہ ہے مگر میرے واحد خدا کا بندہ ہے۔ مجھ جیسا آدمی ہے۔ ناک کان۔ ہاتھ۔ پاؤں۔ آنکھ۔ زبان دل و دماغ رکھتا ہے۔ تجھ کو کس نے اچھوت اور ناپاک بنا دیا۔ نہیں۔ تو پاک۔ پوتر ہے۔ عزت دار بلند مرتبہ ہے۔ کون ہے جو تجھکو خدا کی درگاہ میں جھکنے سے روکتا ہے۔ مندر مسجد اور گرجا میں جانے سے منع کرتا ہے۔ کیا ہندو تجھ کو اس لئے مندر شوالے میں نہیں آنے دیتے کہ تو نے نیچ ذات کے گھر میں جنم پایا ہے۔ کیا عیسائی گورا اس واسطے اپنے بڑے درجہ کے گرجا میں تیرے گھسنے کا روادار نہیں کہ تو ناشایستہ جاہل اور کالا دیسی ہے۔ کیا مسلمان تیرے میلے میلے ہاتھ پاؤں دیکھکر گھن کھاتا ہے اور مسجد میں نہیں آنے دیتا۔

تو آ۔ سید فقیر۔ عربی رسولؐ کا فرزند۔ تیرے ہاتھ پاؤں دھوئے گا اور اپنے باپ کی بنائی ہوئی مسجد توحید میں ساتھ لے چلیگا۔

بابا۔ اپنی قدر پہچان۔ میں تجھ پر قربان۔ تو انسان ہے۔ بلند شان ہے۔ خلیفۃ المسلمین محمد خامس کا لخت جگر۔ خاقان الہند۔ جارج خامس کا نور نظر۔ اور تو اے غریب چمار کے پسر خدا کی درگاہ میں سب برابر ہو۔ آؤ عرب دیس کے مہاراجہ اونچی ذات اور نیچی ذات کو برابری کی نگاہ سے دیکھنے والے پتی کی سیوا اور ٹہل کریں۔ جس نے پریم پر چلا میں امیر غریب۔ ادنے اعلے چھوٹے بڑے پڑھے ان پڑھ کی کچھ تمیز اور قید نہیں رکھی۔ اور اُپدیش دیا۔ ذات پات نا پوچھے کوئے۔ ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے۔

تو آ۔ ہر کے نام کی بانسری بجائیں۔ ہر کو ڈھونڈھیں۔ ہر کو پائیں۔

Marfat.com

جیبی گھڑی کی سازش

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

غلطی یہ ہوئی کہ گھڑی کو بائیں طرف کی جیب میں رکھا۔ وہاں اس شریر چھوٹی کھوٹی فتنی نے میرے دل کو بہکا لیا۔ صحبت کا اثر مشہور ہے۔ دل آخر گوشت کا لوتھڑا تھا۔ گھڑی کے چلتے پرزوں سے کیونکر بچ سکتا۔

گھڑی نے جب کہ وہ جیب کے ہوٹل میں اُتری۔ پاس ایک دھڑکنے والی آواز سُنی اس کو معلوم ہوا کہ یہاں قریب میں کوئی بے قرار چیز ٹھہری ہوئی ہے۔ اسلئے اس نے کہا تم کون ہو۔ کیا تم بغیر انٹرڈیوس اور تعارف کے بات کر سکتے ہو۔

دل اس وقت ذکر خدا کر رہا تھا مرشد کا بتایا ہوا پاس انفاس اُسکے پاس تھا اسکو کسی غیر سے مخاطب ہونے کی اجازت نہ تھی۔ نہ یاد الٰہی کے سرور و لطف میں وہ کسی دوسری طرف متوجہ ہونا پسند کرتا تھا۔

مگر نئے مہمان کی خاطر سے اس نے اتنا کہا۔ میں دل ہوں۔ سینے کے حجرے میں مت سے رہتا ہوں۔ آپ کب تشریف لائے؟ میرے قابل کوئی خدمت ہو تو بتایئے۔ کیونکہ مجھ کو میرے رسولؐ نے حکم دیا ہے کہ اپنے پڑوسی کے کام آنا چاہئے۔ اپنے مہمان کی خاطر داری کرنی چاہئے۔ ولایتی گھڑی نے اس گوشہ نشین اللہ والے کی نرم اور مہربان آواز سنکر ناز دلربایانہ سے کہا۔

تھینکیو مائی ڈیر ہارٹ۔ شکریہ میرے پیارے دل۔ کیا آپ میرے پاس آ سکتے ہیں؟ میں آپ کی شرکت سے اپنی میز کا فخر بڑھانا چاہتی ہوں۔ آپ کا دم سینے کی اندھیری کوٹھری میں گھبرا گیا ہوگا۔ باہر نکلئے۔ میرے فنروار سارے کو دیکھئے۔ اور میرے یاقوت

Marfat.com

کے زیور ملاحظہ فرمایئے جن کو میں نے پہن رکھا ہے۔

زاہد خشک مزاج دل نے آہ سرد بھری۔ لیکن ایٹی کیٹ (آداب فیشن) کے خلاف) پر یزاد گھڑی کے پُر ارمان پیام کا جواب نہ دیا۔

فیشن ایبل گھڑی نے اس خاموشی کو اپنی انسلٹ (توہین) سمجھا اور تیوری پر بل ڈال کر اندر ہی اندر جز بز ہو کر رہ گئی۔

اب اس نے انتقام لینا چاہا۔ وہ خلوت نشین عابد کا تقوے توڑنے کے لئے تیار ہو گئی اور سوچنے لگی۔ کیونکر میں اس نیم وحشی مگر خوبصورت چیز کو اپنے قابو میں لا سکتی ہوں۔

اتنے میں بارہ بجے کی توپ چلی۔ گھڑی والے نے اس کو جیب سے نکالا۔ اور دست شوقین کی انگلیوں سے چٹکی بجاتے کوک بھر دی۔ یہ کوک گھڑی کی غذا تھی۔ جس نے اس کے دماغ میں کام کرنے اور دل کے خلاف غصہ نکالنے کیلئے ایک طاقت و پھرتی پیدا کر دی۔ اور گھڑی نے تازہ دم ہو کر کام شروع کیا۔

پہلے گھڑی نے اپنا کھٹکا دل کے کھٹکے سے ملا دیا۔ اور اس طرح گویا اس نے دل کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ دل نے جب گھڑی کی صدائے وحدت سُنی تو بہت خوش ہوا۔ اور اپنی مشغولی حق سے یکسو ہو کر گھڑی سے یوں خطاب کیا۔ تمہارا کھٹکا بہت مضطرب اور جلد باز انہ ہے۔ ذرا آہستہ آہستہ سانس روک کر ذکر کرو۔ ورنہ عمر جلدی تمام ہو جائیگی میرے مرشد نے حبس دم کی اس واسطے تلقین فرمائی ہے کہ سانس کے اضطراب کو قرار ہے۔ اور سکون و طمانیت سے سب کام پورے ہوں۔

گھڑی بولی۔ میں بے تہذیب دیسی سے ہمکلام ہونا نہیں چاہتی۔ تو ولایت کے آداب سے واقف نہیں ہے۔ تو نے ابھی سوسائٹی کے اعلےٰ رکن عورت ذات کی توہین کی ہے کیوں اس کی مُنہ مانگی مراد کو پورا نہ کیا۔

دل نے جواب دیا میں نامحرم کے پہلو میں ایسے وقت جبکہ مسٹر اوہاں کوئی نہ تھا کیونکر

Marfat.com

آسکتا تھا۔ یہ میرے مذہب کے خلاف تھا۔ کیونکہ وہ غیر عورت کے پاس تخلیہ میں بیٹھنا کجا صورت دیکھنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔

کواری گھڑتی نے دل کی بات سن کر ایک بجلی بھرا تبسم کیا اور کہا معاف کیجئے۔ میں آپ کے مذہب کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ یہ تہذیب و شائستگی نیز قانون حکومت کے خلاف ہے۔ کہ کسی کے مذہبی عقیدے میں دخل دیا جائے مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ زندگی کے مزے سے محروم ہو گئے ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ عورت اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ وہ مجلسوں اور محفلوں کی کیفیت اور زیب و زینت کو بڑھائے اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کی عصمت ایک شخص کی جائز ملکیت ہونی چاہئے مگر یہ بالکل ظلم ہے کہ وہ اجنبی مردوں کو اپنے ہنس مکھ چہرے اور اپنی میٹھی باتوں سے محروم کردے ہماری ولایت کا دستور بہت اچھا کہ غیر شخص دوسرے کی بیوی سے تخلیہ کی ملاقات کر سکتا ہے۔ ہوا خوری کو ساتھ لیجا سکتا ہے اور اس کے خاوند کے سامنے بیوی کے حسن و جمال کی تعریف کر سکتا ہے۔ تم دیسی لوگ بڑے وحشی ہو۔ اگر کسی کے سامنے اس کی بیوی کی تعریف کردی جائے تو وہ یقیناً چھری مارنے پر آمادہ ہو جائیگا۔

دل گھڑی کی جادو بھری تقریر سے موم ہو گیا۔ اُس نے اپنا مقدس ہاتھ ڈرتے ڈرتے اٹھایا اور گھڑی کے ہاتھ کو پکڑ کر چومنا چاہا۔ مگر یکایک اس کو خدا کے ڈر نے اس گناہ سے روکا اور اس نے کانپ کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ دل کی اس حرکت سے گھڑی کھل کھلا کر ہنسی اور بلیک فول (بے وقوف کالا) کہکر عشق کے کوچہ سے ناآشنا غریب دل کو پریشان کر دیا۔

آخر دل سے نہ رہا گیا اور اس نے کہا تم میں ایسی کیا خوبی ہے جو سو روپیہ خرچ کر کے تمکو خریدا گیا۔ تم جن چیزوں کو ہیرے یاقوت کے زیور کہتی ہو وہ معمولی پتھر کے ریزے ہیں۔ تمہارے اندر چند پیتل کے پرزوں کے سوا رکھا کیا ہے۔ ہندوستانی درحقیقت کالے

Marfat.com

بے وقوف ہیں جن کو وقت کی پابندی کا تو کچھ خیال نہیں مگر یورپ کی تقلید میں پیتل کے چند ٹکڑوں کو چاندی کے سکے دیکر خرید لیتے ہیں۔ ہندوستان میں صرف یہ بیکار پیتلی ٹکڑے رہ جاتے ہیں اور ولایت میں چاندی پہنچ جاتی ہے۔

میرا بس ہو تو سارے ہندوستان میں ڈھنڈورہ پیٹ دوں کہ گھڑی وہی رکھے جو وقت کی قدر جانتا ہو۔ ظاہری نمائش کے لئے کوئی اپنی دولت غیر ملک میں نہ بھیجے۔ بلکہ میں تو یہی کہوں گا کہ جب تک اپنے ملک میں گھڑی کے کارخانے قایم نہ ہولیں اور یہاں گھڑیاں نہ بننے لگیں کوئی ہندوستانی گھڑی نہ خریدے۔

دل کی اس باغیانہ تقریر سے گھڑی کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اُس نے اپنے خانساماں کو بلایا اور اس درویش صفت مگر سرکش وجود کو دھکے دیکر نکلوادیا۔

جناب دل نکل تو آئے مگر اب اُن پر گھڑی کے عشق کا جنون سوار ہے۔ گھڑی کی طلائی زنجیر کے خیال کو اپنے پاؤں کی بیڑی بنا رکھا ہے۔

میں کیونکر کہوں کہ گھڑی کی سازش نے میرے دل کو کہیں کا نہ رکھا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا رہا

٭

چھڑکاؤ کی گاڑی

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

گرد آباد سڑک پر دیکھا ہوگا۔ چھڑکاؤ کرنے والی گاڑی کیونکر تپتی ہوئی زمین کو سیراب کرتی ہے راستہ چلنے والے مسافروں کو تکلیف دینے والی خاک کا منہ بند کرنے کیلئے

Marfat.com

اپنا سارا سرمایہ مٹی میں ملا دیتی ہے۔

تمہارے لئے اس میں عبرت و نصیحت ہے۔ اگر تم ذرا غور و فکر کی عادت ڈال لو تو دُنیا کی ہر چیز تمکو راستہ بتائے گی مگر تم تو زندگی کی کش مکش میں آنکھہ بند کر کے پڑا رہنا چاہتے ہو کہیں اس طرح زندگی بسر ہوا کرتی ہے۔

ظاہر میں چھڑکاؤ کی گاڑی بڑی فضول خرچ معلوم ہوتی ہے۔ اپنا پانی بے تحاشا بہاتی ہے۔ چنانچہ ایک گنوار کا قصہ مشہور ہے کہ جب وہ کسی شہر میں گیا اور وہاں چھڑکاؤ کی گاڑی کو دیکھا تو کہنے لگا یہ گاڑی والا بھی بڑا بے وقوف ہے۔ پانی بہ رہا ہے اور اسکو خبر نہیں۔ گھر پہنچتے پہنچتے تو ایک بوند بھی باقی نہ رہے گی۔

مگر تم گنوار کی طرح انجان اور ناسمجھہ نہ بنو۔ چھڑکاؤ کی گاڑی پر فضول خرچی کا الزام نہ لگاؤ۔ بلکہ خود اپنی دولت دوسروں کی فائدہ رسانی میں خرچ کرنی سیکھو۔

اب تم اپنے عیش و آرام کے لئے، اپنے نام و نمود کے واسطے شادی میں غمی میں ہزاروں روپے خرچ کر ڈالتے ہو۔ مگر خدا اور اُسکے بندوں کا کوئی کام درپیش ہوتا ہے تو ہاتھہ سمیٹ لیتے ہو۔ فضول خرچی کا سہم چڑھ جاتا ہے۔

فضول خرچی بہت بُری چیز ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے۔ ولا تبذر تبذیرا ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین۔ اسراف نہ کر۔ اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا۔ کلوا واشربوا ولا تسرفوا کھاؤ پیو۔ مگر اسراف نہ کرو۔

اگر چار آنے گز کے کپڑے میں تمہاری تن پوشی ہوسکتی ہے۔ اگر دو روپے کی دیسی جوتی تمہاری برہنہ پائی کو دور کرسکتی ہے۔ اگر ایک طرح کے دال سالن سے تمہاری روٹی چل سکتی ہے۔ تو تین چار روپے گز کے کپڑے پہنکر اپنے جسم کی عادت نہ بگاڑو۔ دس روپے کا ولایتی بوٹ اور پانچ روپے کی کامدار جوتی نہ پہنو۔ دس دس طرح کے کھانے

دسترِخوان پر نہ لگاؤ۔ تم ایک غریب ملک کے باشندے ہو۔ تم ایک مفلس قوم کے فرد ہو۔ دوسرے بھائیوں کا بھی خیال رکھو کہ وہ کس حال میں ہیں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کے حال میں لکھا ہے کہ سردی کے موسم میں جب ان کو گرم کپڑا پہنایا جاتا تو وہ آنکھوں میں آنسو لاکر فرماتے پہلے مسجدوں اور بازاروں کے گوشوں میں غریبوں کو دیکھ آؤ۔ انمیں کوئی ننگا تو نہیں ہے۔ اگر ہے تو پہلے اسکو دو۔ وہ حق دار ہے۔

چھڑکاؤ کی گاڑی تم کو یہ ہی نصیحت کرتی ہے کہ اسکا سب کچھ دوسروں کیلئے ہے اپنے واسطے وہ ایک بوند بھی گھر لیکر نہیں جاتی۔

پسینہ

(از اخبار توحید میرٹھ ۱۹۱۳ء)

گرمی کے موسم میں تمہارا جی گھبراتا ہے۔ دھوپ میں باہر نکلو تو دماغ پکنے لگتا ہے گھر میں بیٹھو تو پسینہ چلا آتا ہے۔ جس سے کپڑے تر ہو جاتے ہیں اور ان میں بساندی بساندی بو آنے لگتی ہے۔

جانتے بھی ہو۔ پسینہ کیا چیز ہے۔ یہ تمہارے بدن کی زکوٰۃ ہے۔ اللہ میاں گرمی کا موسم بھیجکر آدمی کے بدن کا وہ میل کچیل جو مسامات اور کھال کے نظر نہ آنے والے چھوٹے سوراخوں میں ہوتا ہے پسینے کے پانی سے دھو دیتے ہیں۔ پسینہ ایک طرح کی بھاپ ہے۔ جو گرمی کے اثر سے بدن کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اور پسینہ بنکر بہ جاتی ہے۔

پہاڑوں اور بعض ملکوں میں گرمی کا موسم نہیں آتا تو وہاں کے رہنے والے حمام میں جاکر بناوٹی گرمی سے پسینہ نکلواتے ہیں۔ کیونکہ پسینہ آدمی کی تندرستی کیلئے بہت

Marfat.com

ضروری چیز ہے۔

پسینہ اللہ میاں کی بڑی نعمت ہے۔ غریب لوگ گرمی کے موسم میں دن بھر جنگلوں اور بازاروں میں محنت اور مزدوری کرتے ہیں اور ہر وقت پسینے میں شور بور ہونے رہتے ہیں۔ مگر جب شام کو اپنے گھر جاتے ہیں تو ان کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ محنت اور پسینہ سے ان کے بدن کی ساری بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ امیر لوگ خس کی ٹٹیا لگاتے ہیں۔ پنکھے چلواتے ہیں۔ اور ہر وقت ہائے گرمی ہائے گرمی پکارتے رہتے ہیں جب شام ہوتی ہے تو ان کے چہرے پر اداسی اور پریشانی چھائی ہوتی ہے۔ کیونکہ پسینہ نہ آنے اور بیکار پڑے رہنے سے ان کے بدن کا میل بدن کے اندر رہتا ہے۔ اسواسطے یہ بیچارے ہمیشہ حکیموں اور ڈاکٹروں کے دروازے پر پڑے رہتے ہیں اور رات کو اس چین سے پاؤں پھیلا کر نہیں سو سکتے جیسے ٹکے کا آدمی غریب مزدور سوتا ہے۔

اور ہاں یہ بھی یاد رکھو کہ جس طرح موسم کی گرمی پسینے کے ذریعہ بدن کے میل کو دور کرتی ہے اُسی طرح انسان کی روح پر چھایا ہوا میل نماز روزہ زکوٰۃ سے دور ہو جاتا ہے قاعدہ ہے کہ جب پسینہ آتا ہے تو آدمی کا جی بہت گھبراتا ہے۔ ایسے ہی نماز کی محنت۔ روضے کی مشقت اور زکوٰۃ کے خرچ سے پہلے پہل تو انسان کو ذرا تکلیف ہوتی ہے مگر جب روح کا میل صاف ہو جاتا ہے تو ایسی خوش ہوتی ہے جسکی کوئی حد نہیں

لہذا اے اخبار توحید کے پڑھنے والو! آنے والے موسم گرما کو خدا کی نعمت سمجھو جو غریبوں کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اور پسینہ کی قدر کرو۔ اور روح کا میل کچیل دور کرنے کے لئے نمازیں پڑھو۔ روزے رکھو۔ زکوٰۃ دو۔ تاکہ خدا کے گھر جا کر آرام سے رہو

کانا باتی } ایک کتاب کا نام ہے جو کتاب سی پارۂ دل کا دوسرا حصہ ہے اور جس میں حضرت خواجہ حسن نظامی کے وہ مضامین ہیں جو دلی ریڈیو میں نشر ہوئے تھے اور جن میں ہر قوم اور ہر فرقہ کے فائدہ کے مضامین ہیں۔ قیمت ایک روپیہ پتہ:- دفتر چمن اردو بک ڈپو دہلی

Marfat.com

پاؤں کا جیل خانہ

ازاخبار توحید ۱۳ ۱۹ ۱۳ء

لوگو! میں ایک آزاد جنٹلمین کا پاؤں ہوں۔ مجھکو صرف صبح کے وقت غسل دیا جاتا ہے اس کے بعد سوتی۔ یا اونی یا ریشمی قبا پہنائی جاتی ہے۔ جس کو جراب کہتے ہیں۔ اسوقت میں خوش ہوتا ہوں کہ ایک امیر اور خوشحال آدمی کا پاؤں بنا۔ جو یہ لباس میسر آیا غریب کا پاؤں ہوتا تو کیچڑ میں۔ کانٹوں میں۔ دھوپ کی تپتی جھلستی زمین پر چلنا پڑتا۔

لیکن جب مجھکو بوٹ کے جیل خانے میں ڈالا جاتا ہے تو بہت پریشان ہوتا ہوں۔ اپنی عارضی خوشی پر نفریں کرتا ہوں۔ مگر جنٹلمین نہایت بے پروائی سے مجھکو قفس چرمی میں بند کر دیتا ہے اور مجھ پر زور دیکر کھڑا ہوتا ہے تو لیکچر دیتا ہے کہ اے لوگو! آزادی حاصل کرو۔ آزادی بڑی نعمت ہے۔ اُسوقت بے اختیار میرا جی چاہتا ہے کہ زبان ہو تو کہوں کہ تیری آزادی کا دعوےٰ جھوٹا ہے تو نے ٹھنڈے اور گورے ملکوں کی تقلید میں جہاں بوٹ پہننا ضروری ہے ہندوستان میں رہ کر خواہ مخواہ اس کو پہنا۔ اور اپنے جسم کے ضروری حصے کو قید کر کے "پابند" ہوگیا۔ اب آزادی کیسی؟ آزادی جب تھی کہ دیسی جوتا پہنتا۔ پانچوں وقت کی نماز کے وقت پاؤں کو دہوتا۔ اور ہندوستانی شریفوں کی محفلوں۔ مسجدوں میں بے روک ٹوک جاتا۔ اب بوٹ اتارنے کی مشکل کے سبب سب سے محروم ہے۔

سوئی کی لن ترانی

(ازاخبار توحید ۱۳ ۱۹ ۱۳ء)

کالے برقع میں چھپی ہوئی کاغذ کی سیاہ پڑیہ میں بند سوئی نے اپنا نوکدار منہ باہر

Marfat.com

نکالا اور کہا۔ کون کہتا ہے انگریز ہندوستان کے بادشاہ ہیں۔ یہ ملک میرا ہے اسکے رہنے والے میری رعایا ہیں۔ آیندہ کوئی شخص میرے سوا کسی کو یہاں کا تاجدار نہ کہے نہ سمجھے نہ مانے ورنہ سزا دی جائے گی۔

انگریزوں کا اور میرا صرف اتنا تعلق ہے کہ جہاں میں پیدا ہوئی ہوں۔ وہیں یہ پیدا ہوئے ہیں۔ تو اس کیلئے اتنا ہو سکتا ہے کہ میں ان کو اپنی دوسری ہندوستانی رعایا کے مقابلہ میں کچھ امتیاز دیدوں لیکن ناممکن ہے کہ ان کے دعوائے ہمسری کو برداشت کیا جائے۔

سب لوگ میرے محتاج ہیں۔ میں نہ ہوں تو گورے کالے ننگے پھریں۔ یا درخت کے پتوں سے اپنا بدن چھپائیں۔ میرا ہمجنس لوہا سوت کاتتا ہے۔ کپڑا بنتا ہے اور میں اس کو سیتی ہوں۔ عزت مجھ سے ہے۔ حرمت مجھ سے ہے۔ اور راحت مجھ سے ہے۔

جب میں پہلے پہل اس ملک پر حملہ آور ہوئی تو دیسی سوئیوں نے جو کچی تھیں میرا سامنا کیا۔ مگر میں نے ان کو زک دی اور ناپید کر دیا۔

آج میری وہ شان ہے کہ اگر انگریزوں کو اور سب یورپ والوں کو بلکہ سب انسانوں کو نیچا دکھانا چاہوں تو دکھا سکتی ہوں۔ اور ننگا دھڑنگا پھرا سکتی ہوں۔

دیسی کالے بائیکاٹ کا نام لیں تو میں ان کا بائیکاٹ کر کے حیران پریشان کر سکتی ہوں۔ جب وہ جوش کے مارے آپے سے باہر ہوں اور میں ذرا کے ذرا اپنا منہ چھپا لوں تو نشہ ہرن ہو جائے اور "ہائے سوئی" ہائے سوئی "کا غل مچنے لگے۔ ہندوستان سوئی سوئی کا محتاج ہے آواز آنے لگے۔

لہذا میں اعلان کرتی ہوں کہ کوئی آدمی دم نہ مارے اور چپ چاپ کام کرتا رہے کیونکہ تاج میرا۔ کاج میرا۔ راج میرا۔

Marfat.com

فٹ بال

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

بیچاری گیند میدان فٹ بال میں کھیلنے والوں کی کس طرح ٹھوکریں کھارہی ہے۔ بڑا ترس آتا ہے۔ چمڑے کا بوٹ چمڑے کی گیند کو ٹھکراتا ہے۔ وہ بھاگتی ہے تو یہ پیچھے دوڑتا ہے۔ ایک طرف سے بچتی ہے تو دوسرا حریف سر پہ آتا ہے۔

اس گیند کے اندر ہوا بھری ہوئی ہے۔ اگر ٹھوس ہوتی تو کس کی مجال تھی جو یوں سر بازار ٹھوکریں مار سکتا۔

آدمی کو دیکھو جس کا باطن ایمان حق سے بھرا ہوا ہو اُس کو کسی کا خوف نہیں رہتا مگر کھوکھلے ضمیر والے ہمیشہ گردش ایام کے بوٹوں سے ٹھکرائے جاتے ہیں۔

فٹ بال بڑا اچھا کھیل ہے۔ گرمی کے موسم میں شام کے وقت دیکھا ہوگا۔ نوجوان اس سے جی بہلایا کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی ورزش ہے جس سے ہاتھ پاؤں اور بدن میں چستی اور پھرتی پیدا ہوتی ہے۔

اگلے زمانے میں کبڈی کا کھیل تھا۔ جس میں سانس روک کر دوسرے فریق کے پالے میں کبڈی کبڈی کہتے ہوئے جاتے تھے۔ اب کبڈی کا رواج کم ہوتا جاتا ہے۔ حالانکہ کبڈی میں فٹ بال سے بڑھکر فائدے تھے۔ اول تو یہ کہ سانس کے روکنے اور دوڑنے سے پھیپھڑہ مضبوط ہوجاتا تھا۔ دوسرے گیند خریدنی نہ پڑتی تھی۔ تیسرے فٹ بال کی وردی اور ایک خاص قسم کا جوتا نہ لینا ہوتا تھا۔ اب یہ عالم ہے کہ دسویں پندرہویں دن گیند خراب ہوجاتی ہے۔ جوتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور غریب ہندوستانی ولایت والوں کی جیب میں چاندی کے سکے ڈالکر چمڑے کے چند ٹکڑے دوبارہ خریدنے

Marfat.com

پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بھائی ایسے کھیل کو دور سے سلام جس سے ملک کی دولت برباد ہوتی ہو گھر پھونک تماشا اچھا نہیں ہوتا۔

ہاتھ کی بغاوت

سالن کی آزادی

(از اخبار توحید ۱۹۱۲ء)

میرا ہاتھ سالن کی پیالی میں جانا نہیں چاہتا۔ کہتا ہے پیالی کی اونچی اونچی دیوار سے دم گھٹتا ہے۔ شوربے اور بوٹی اور قتلوں کے قید خانے میں نہیں جاؤں گا۔ مجھ کو انگریزی پلیٹ چاہئے۔ جہاں سالن کو آزادی ہے۔ بوٹی الگ نظر آتی ہے۔ قتلہ جدا معلوم ہوتا ہے۔ شوربا اپنی شان علیحدہ دکھاتا ہے۔ ہاتھ کو اختیار ہے۔ پلیٹ کے کھلے میدان میں جس طرف چاہے جائے۔ پیالی میں انگلیوں کو غوطے مار مار کر بوٹیاں نکالنی پڑتی ہیں قتلہ کو ڈھونڈنا پڑتا ہے پلیٹ میں ہر چیز سامنے دکھائی دیتی ہے۔

الٰہی خیر ہاتھ ہی باغی ہو گیا تو پیٹ بھوکا مر جائیگا۔ اسکو سمجھاؤ اور کہو۔ دیوانے غریبوں میں پیدا ہوا ہے غریبوں کی سی باتیں کر۔ ہمارے ہاں بھی پلاؤ زردہ کھلی قاب اور میدانی رکابی میں ہوتا ہے۔ مگر دال اور غریبانہ سالن پیالی کی دیواروں کے پردہ میں اچھا۔ پردہ سے باہر آنا آبرو میں بٹہ لگائیگا۔ انگریز ملک کے بادشاہ ہیں دولت حشمت ان کی غلام ہے۔ وہ تر بتر کھانے کھاتے ہیں۔ اس لئے کھلی رکابیاں ان کو زیبا ہیں تو مفلس کنگال اُبالی دال کھانے والا۔ تجھ کو یہ فضول خرچیاں مناسب نہیں میاں جب تک پلاؤ زردہ میسر نہ آئے صبر شکر سے پیالی پر گزارہ کر۔ آج تو بغاوت کرتا ہے۔ کل عورتیں سرکشی اختیار کرینگی کہ ہم کو بھی پردہ سے نکالو۔ اس وقت کیا ہوگا۔ اب تو پردہ میں پھٹے پرانے

Marfat.com

پیوند لگے کپڑے چھپے ہوئے ہیں۔ پردہ نہ رہا تو ملک کا سارا بھرم کھل جائے گا۔ اور غریب شوہر اچھے کپڑے بناتے بناتے پاگل بن جائیں گے۔ نادان بات کو سمجھ اور دوسروں کی ریس چھوڑ۔

پیاسے گلے پر چھری

حاملہ کا قتل

(از اخبار توحید میرٹھ ۱۹۱۳ء)

مسلمان کہتے ہیں۔ بلغاریوں اور سرویوں نے ترکی عورتوں کو ان کے بچوں کے سامنے قتل کیا۔ انگریز کہتے ہیں کہ غدر میں ہندوستانیوں نے ان کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ فقیر کہتا ہے کہ اس بے زبان جانور کو بھی کسی نے دیکھا جس کا نام بکری ہے۔ جو شہروں کے قتل خانوں میں ہزاروں بھوکی پیاسی بے دردی کی چھری سے ذبح ہو جاتی ہیں تم اپنی بیوی بچوں کو لیکر خوشی خوشی آراستہ دسترخوان پر کھانا کھاتے ہو۔ تمہارے سامنے۔ قلیہ۔ قورمہ۔ کوفتے۔ پسندے۔ کی قابیں ہوتی ہیں۔ ہاتھ بڑھاتے ہو مظلوم بوٹیوں کو دانتوں سے بھنبوڑتے ہو۔ مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ یہ گوشت کہاں سے آیا اور کیونکر آیا! اور کتنے جانور تمہاری قابوں کے لئے جان سے گئے۔

کسی دور کے گاؤں سے بکریوں کا ریوڑ چلا۔ مئی کی دھوپ ان کے سر پر تھی۔ بیچاریاں دن بھر کی منزلیں طے کر کے شام کو شہر میں پہنچیں۔ جلادوں نے ایک تنگ مکان میں بند کر دیا۔ اور وہ ہستیاں جن کو دیہات کے کھلے میدانوں میں رہنے کی عادت تھی شہر کے تیرہ و تاریک جیل خانہ میں بھوکی پیاسی مقید رہیں۔ صبح کو مقتل کی بلاؤ ہوئی دیسی ڈاکٹر کی نظر طماع نے ایک سرسری معائنہ کیا۔ لین دین کے خفیہ اشارے

Marfat.com

ہوئے۔ اور ناتوان مظلوم قیدی جن کی زبانیں پیاس کی شدت سے نکلی پڑتی تہیں جو حسرت اور مایوسی سے اپنے جلادوں کو دیکھکر رحم کی درخواست کرتے تھے ڈنڈوں اور لاتوں کے زور سے کان اور دُم کھینچ کھینچ کر قتل گاہ میں پہنچائے گئے جہاں جلاد چھری تیز کئے اور بے پروائی سے آستینیں چڑہائے کھڑا تہا۔ ان میں ایک بکری حاملہ تھی اسکو دو قدم چلنا دوبھر تھا۔ وہ ظالموں کی لاتوں سے حواس باختہ تھی۔ دم چڑہا جاتا تہا۔ مُڑ مُڑ کر دیکھتی تھی کہ کوئی خدا کا بندہ ترس کھائے اور پیٹ میں بچہ رکھنے والی کو موت سے بچائے۔ وہاں کون سنتا تہا سب کے کلیجے پتھر کے تھے کسی نے رحم نہ کیا یہانتک کہ سب کے ساتھ وہ بھی مقتل کی زمین پر پچھاڑی گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے پیاس کے مارے حلق سوکھ گیا تہا۔ وہ چیخنا چاہتی تہی مگر آواز نہ نکلتی تھی۔ اُس نے چھری کو دیکھا اور سمجھی کہ اب اس کی دہار پانی پلائے گی۔ آخر یہی ہوا جلاد نے گلے کی کھال پر چھُری رکھدی۔ حاملہ بکری نے کانپ کر اور لرز کر ایک دفعہ چیخ ماری۔ چھری نے اُسکے بالوں کو کاٹا۔ کھال کو کاٹا۔ رگوں کو کاٹا۔ اور ہڈی کے پاس جا کر دم لیا۔ خون کے فوارے اُبلے۔ ہاتھ پاؤں سے دم کھینچنا شروع ہوا بے جان لاش چند منٹ تڑپی اور ٹھنڈی ہوگئی۔ اس کے بعد کھال کھینچی گئی۔ پیٹ چاک کیا گیا اور وہ بچے نکالے گئے جو مرنے والی کے پیٹ میں تھے۔ اس وقت سفاک جلاد نے اتنا کہا۔ اوہو یہ گیابھن تھی۔ بچوں کو جلدی سے چھپانے کی کوشش کی گئی۔ کیونکہ اب قانون کی گرفت کا ڈر تہا۔ اس گوشت کے ٹکڑے پارچے ہوئے۔ کوئی حصہ قلیئے کے کام آیا۔ کوئی قورمے میں بُھنا۔ کسی کا قیمہ بنا۔ پسندے کوٹے گئے۔ کسی کو کوفتے کی کوفت اٹھانی پڑی۔

یہ ہے تمہارے دسترخوان کی بہار جس کو فخر اور گھمنڈ سے کھا رہے ہو۔ کھا چکوگے تو اخباروں میں بلقانی سفاکیوں پر مضمون لکھوگے۔ اور خیال کروگے کہ تم نے قوم کا ایک بڑا فرض ادا کیا ہے۔ ہاں بے شک تم نے فرض ادا کیا ہے تمہاری تعریف کرنی چاہئے

Marfat.com

لیکن یہ فرض خود غرضی کا فرض تہا۔ ورنہ تم ان بے زبان ہستیوں کا بھی خیال کرتے ٭ کیا یہ ممکن نہ تہا کہ تم ذبح خانوں کی نگرانی پر زور دیتے۔ اور پبلک سے کہتے کہ وہ بے زبان جانوروں کی خبر گیری کا انتظام کریں۔ اس میں تم پر بغاوت کا الزام نہ لگتا۔ اگر لکہتے کہ جن پر چھری چلائی جائے ان کو پانی پلا دینا چاہئے۔ ان کو حبس بے جا میں نہ رکہا جائے۔ گیابھن اور حاملہ کی تحقیق خاص طور پر ہو اور جو لوگ اس کے خلاف کوئی حرکت کریں ان کو عبرتناک سزائیں دی جائیں مگر تم سب (جنہیں راقم فقیر بھی شامل ہے) دوسروں کو کہتے ہو اپنی خبر نہیں لیتے۔ کل قیامت کے دن احکم الحاکمین تم سب سے اسکا جواب طلب کرے گا۔

میں جانتا ہوں کہ جانور تمہارے لئے حلال کئے گئے ہیں بیشک تم ان کا گوشت کھا سکتے ہو۔ مگر ان سفاکیوں کی کسی مذہب نے اجازت نہیں دی۔ خصوصاً اسلام نے ان ناروا ظلموں کو نہایت سختی کے ساتھ روکا ہے۔

حضرت خواجہ اجمیری کے غلاموں کو چاہئے کہ وہ اپنی صوفیانہ نرم دلی کو کام میں لائیں اور ہر شہر میں ایسی انجمنیں قائم کریں۔ جن کے ممبر روزانہ صبح کے وقت ذبح خانوں میں جا کر۔ حاملہ۔ بیمار۔ کمزور۔ کم سن۔ بھوکے پیاسے جانوروں کو ذبح ہونیسے بچائیں۔ اور اس کا خیال رکھیں کہ ایک جانور دوسرے کے سامنے ذبح نہ ہو۔ چھریاں تیز کر لی جائیں تاکہ ذبح کے وقت زیادہ تکلیف نہ ہو۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو مظلوم اور غریب نواز خواجہؒ اور حضرت رب العالمین کی خوشنودی حاصل کریں گے ٭

دوسرا حصہ } سی پارۂ دل کا دوسرا حصہ "کانا باتی" کے نام سے شائع ہوگیا ہے جس کی قیمت ایک روپیہ ہے

دفتر چمن اردو بک ڈپو دہلی سے منگا لیجیے

Marfat.com

تخت گاہ کے ایک تختہ کا پیام

ویسرائے کے نام

(از زمیندار جنوری ۱۹۱۳ء)

مائی لارڈ ہارڈنگ! ۱۹۱۲ء جاتا ہے اور تم آتے ہو۔ بارہ مہینے پہلے ان ہی دنوں میں تم اور یہ ۱۹۱۲ء ایک گاڑی میں سوار ہو کر خبر دینے آئے تھے کہ دہلی برٹش راج کا پایۂ تخت بن گئی۔

اب تم دسمبر میں بحیثیت نائب السلطان مستقل سکونت کے ارادے سے دہلی میں داخل ہوتے ہو اور تمہارے ساتھ ساتھ ۱۹۱۲ء کے بدلے ۱۹۱۳ء پہلو میں بیٹھا نظر آتا ہے۔

گورے ملک کے وہمی ۱۳ کے عدد سے بدشگونیاں لیتے ہیں۔ مگر ہم کالوں کے خیال میں یہ خام خیالیاں ہیں۔ تمہارا اور تمہاری حکومت کا بول بالا ہو گا۔ اور تیرہ کا عدد منحوس نہ رہے گا۔

لاٹ صاحب! لوگ کہتے ہیں کہ دنیا بدل رہی ہے۔ ہر وجود تغیر و انقلاب کے میدان میں دوڑا چلا آتا ہے۔ زمانہ نے تمام کائنات کی چھوٹی بڑی اشیاء میں حرکت پیدا کر کے ان کی کایا پلٹنے کا سامان کیا ہے۔

مگر فقیر نہیں جانتا کہ خلقت کا یہ کہنا سچ ہے یا جھوٹ۔ جھوٹ اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ تم نے اور تمہاری حکومت کے اکثر بڑے بڑے آدمیوں نے بارہا یہ بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں ایک زبردست انقلاب برپا ہے اور حالات و کیفیات میں تبدیلی ہو رہی ہے۔ ہر قدیمی ہستی جدت کا جامہ پہن رہی ہے۔

Marfat.com

مگر میں اسکو یوں نہیں مان سکتا کہ تم سب کی یہ باتیں نیچرل مشاہدہ کے خلاف ہیں۔ یاد ہوگا کہ گذشتہ دسمبر میں بھی سردی تھی۔ آسمان کا رنگ نیلا۔ رات کالی۔ دن اُجلا۔ اور ہوا ٹھنڈی تھی۔ اور آجکل بھی وہی سماں ہے۔ تارے نکلتے ہیں۔ چاند گھٹتا بڑھتا ہے سورج طلوع وغروب کے دور میں پھنسا ہوا ہے۔ اس زمانے میں بھی انسان رات بھر سوتے اور دن بھر جاگتے تھے۔ کانوں کا کام سُننا۔ آنکھوں کا دیکھنا۔ ناک کا سونگھنا۔ اور زبان کا بولنا تہا۔ غذا چبا کر کھائی جاتی تھی۔ اور ہاں غذا کی جتنی مقدار سے پہلے پیٹ بھرتا تہا اب بھی اتنے ہی نوالے درکار ہیں۔ اس میں ذرہ بھر فرق وتفاوت نہیں ہوا۔ پھر تغیر وتبدیلی کس چیز کا نام ہے۔

یہ تو نہیں کہ اگلے وقتوں میں پانی۔ مٹی۔ لکڑی اور تانبے کے پیالوں میں پیا جاتا تہا اب شیشے کے گلاس چل گئے ہیں۔ اس وقت زمین پر بیٹھکر روٹی کہائی جاتی تھی اب میز کرسی کا رواج ہے۔ اُن دنوں اونٹ بیل گھوڑے کی سواریاں تہیں آجکل ریل موٹر کار ٹرام کا دور ہے۔ اگر اس کا نام زمانہ کی تبدیلی ہے تو میں انکو نہیں مانتا کیونکہ میرے نزدیک تبدیلی جب ہوتی کہ بغیر پانی کے پیاس بجھ جاتی۔ کھانے کی خواہش جاتی رہتی۔ نقل وحرکت کے واسطے ریل اور موٹر کار کا محتاج نہ رہنا پڑتا۔

میرے پیارے جارج سلطان کے قایم مقام تم پر سلام۔ ذرا سُننا اُس دہلی کے درودیوار کیا پیام دیتے ہیں جسمیں قدم رکہتے ہو وہ کہتے ہیں۔

ہارڈنگ بابا کی خیر۔ تخت گاہ کے ایک تختہ کی دعا لیتا جا۔ بھلا ہوگا۔ شادرہ آباد رہ تیری امیدوں کا چمن پھلے پھولے۔ تیرے ارمانوں کا تختہ سرسبز وشاداب ہو۔

دنیائے فانی میں جی نہ لگا۔ اس خاک پر ہزاروں دفعہ کرنوں اور شعاعوں کے ہجوم میں جہومتے جہامتے سورج کے جلوس نکلتے تھے مگر شام کو ان کی روشنی ہمیشہ ناپید ہوجاتی تھی۔ اپنے فرض کو پہچان۔ جس طرح سورج خلقت کی فائدہ رسانی کے خیال میں اپنی

آن بان اور شکل وصورت کو نہیں دیکھتا اور دن بھر خدا کے بندوں اور اسکی تمام مخلوقات پر نعمتوں کا مینہ برساتا رہتا ہے تو بھی اے اُس بادشاہ کے نائب جس کے ملک میں سورج غروب نہیں ہوتا ان ظاہری کھیل تماشوں میں مشغول نہ ہو۔ اور رحم وانصاف کی طرف توجہ کر۔ تاکہ آسمان و الا تجھ پر رحم کرے۔

ان ہاتھیوں سے جن پر تو سوار ہے تیری ذمہ داریاں زیادہ بوجھل ہیں۔ توقع نہ رکھ کہ رعیت تیرے آگے جھکتی ہے یا نہیں۔ تیرے احسان کا بوجھ ان کی گردن کو جھکائے تیری انصاف کاریاں سب کے سروں کو خم کرائیں تو بات ہے۔

آج وہ دن ہے کہ دہلی ظاہری اور نمائشی شان وشوکت کے بدلے باطنی اندرونی دبدبہ وتمکنت کی خواستگاری کرتی ہے۔ پایہ تخت کی خشتی و سنگی عمارات کے ساتھ باشندوں کے دلوں میں محبت والفت کی بنیاد بھی رکھ۔ تاکہ انگریزی تاج کے ہیروں کو اصلی درخشانی نصیب ہو۔ اور دکھائے کہ تو اس خدا کا سچا اور نیک بندہ ہے جسکی۔ مندر۔ مسجد اور گرجا میں عبادت کی جاتی ہے۔ مسجد وگرجا کی نماز میں شریک نہ ہو۔ مندر کے ناقوس اور شوالے کے گھنٹے سے ہمنوائی نہ کر۔ مگر اے خدا پرست ہندوستان کے مجازی بادشاہ اپنے دل کو ہر وقت شہنشاہ حقیقی کی بازپرس سے خبردار کرتا رہ۔ بھول مت یاد رکھ تاکہ تیری اور انگریزی قوم کی یاد ہمیشہ نیکی سے برقرار رہے۔ (جس دن یہ مضمون شائع ہوا۔ وائسرائے پر بم پھینکا گیا اور خواجہ صاحب بھی شبہ میں گرفتار ہوئے تھے۔ (ایڈیٹر منادی)

درکار ہیں مستانے چند

از خطیب ۲۰ اپریل ۱۹۱۵ء

ہوش سے بیگانے چند۔ دین کے دیوانے چند۔ درکار ہیں مستانے چند۔ ترک خانہ کریں۔ میخانہ میں رہیں۔ جام کو نظر لگائیں۔ ہاتھ اور منہ کو بچائیں۔ زخموں کے کھرنڈ

Marfat.com

نوچیں۔ اور مرہم والوں کو دکہائیں۔

بھوک جن کی دائی ہو پیاس جنکی مائی ہو۔ بے سروسامانی جن کی ماں جائی ہو۔ وہی درکار ہیں۔ وہی اس میدان کے شہسوار ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ یکتائی اور توحید کی آواز آندہی کے شور میں دنیا تک پہنچاؤ۔ مجھے وہ چاہیئے جو کہے کہ پیاری گھٹا کی بوندوں میں اس لیلی کا محل بناؤ۔ جرس بجاؤ۔ گھر گھر پہنچاؤ۔ سوکھی زمین سوندہی خوشبو سے مہک اٹھے۔ گھر والے مستی میں آئیں۔ جہولے ڈالیں گائیں بجائیں۔ آندہی ہوگی تو کواڑ بند کئے جائیں گے۔ آنکھہ ناک۔ کان کو ڈہکا جائیگا۔ پھر کیا خاک توحید بتلانے کا مزا آئیگا۔

انگریز کا لندن ہو یا ہند کا نندن۔ برما کا رنگون ہو یا نجد کا مجنوں۔ سب کو پریم نگر لے جانا ہے۔ وحدت کی سیج پر سلانا ہے۔ مگر یہ لڑنے جھگڑنے کی سند نہیں۔ تو تکار چیخ پکار سے حاصل نہیں۔ جو لوگ مناظرہ کی تلوار سے لڑتے ہیں اور اس پر ہادی مہدی بنتے ہیں انہوں نے کتنے کافر مسلمان کئے ان کے آگے کس قدر منکر گردنیں خم ہوئیں۔ تجربہ کہتا ہے ایک بھی نہیں۔ بلکہ انکار بڑہا ضد زیادہ ہوئی۔ بگاڑ کی دیواریں اونچی ہوگئیں۔ نہ عیسائی نے مانا نہ موسائی نے نہ ہندو نے تسلیم کیا۔ نہ آریہ نے۔ نہ سکھہ مائل ہوئے نہ پارسی گھائل ہوئے ہاں چرچے بہت رہے۔ روپے جیبوں سے نکلکر ادہر سے اُدہر اور اُدہر سے ادہر آتے جاتے رہے۔ دسترخوان پر کہانے بھی رنگ برنگ کے آئے۔ نوالے بھی نرم گرم چکنے چپڑے دانتوں پر چڑہے اور معدے میں اترے لیکن ذرا کان کو میرے پاس لاتو کہوں۔ دل وجان توحید کا ارمان نہ نکلا۔ نہ اسکو کسی نے دیکہا نہ وہ کسی کو دیکہہ سکی۔ ہر سکھی کھڑی تکتی رہی کہ پیا کا اشارہ پاؤں تو الیلی کو مسند پر لاؤں۔

جب ہی تو کہتا ہوں۔ ارے دیوانوں کو بلاؤ۔ مستانوں کو پکارو۔ جو انجمن طلبگار اسلام کے نوکر ہوں۔ جو اپنے مطلوب کی چشم پوشی رضا کو تنخواہ بنائیں۔ کفنی پہنیں۔

Marfat.com

ہر ہر جپیں۔ شام کی مرلی بجائیں۔ گھر گھر دہائی مچائیں۔ روتوں کو ہنسائیں ہنستوں کو رُلائیں۔ اور ساجن سیاں بہاری مراری کے گیت گائیں۔

پوچھو ان کا ذکر کس اخبار میں چھپے ہوں جریدۂ سکوت میں۔ دریافت کرو انکا خیر مقدم کیونکر ہو۔ جواب دوں کس منہ سے نہ کوئی ان کو جانے۔ نہ وہ کسی کو جانیں۔ بس ایک جاناں کی دید ہو۔ اسی کی گفت ہو۔ اسی کی شنید ہو۔ تب دیکھنا ہر گھر میں ہولی دوالی ہر گھر میں عید ہو۔

اسلام غیر نہیں ہر آدم زاد کے لئے خیر ہے۔ اس کو زہر نہ بناؤ۔ خود شکر بنو اسلامی شیر میں گھل کر فنا ہو جاؤ۔ تب مزے لیکر لوگ پئیں گے۔ کیا لیکچروں اور مباحثوں کے قم سے مردے جئیں گے؟

تم مسیحا بنتے ہو مگر خود بینائی کے محتاج ہو۔ اندھوں کو نہ بلاؤ پہلے خود اپنی آنکھیں بنواؤ۔

سُننا مجھے کس نے پکارا۔ رنگون میں آؤ۔ اور برما کو مسلمان بناؤ۔ ذرا لکھدینا کلمہ یاد کر رہا ہوں۔ اور کلمے والے کا دل شاد کر رہا ہوں۔

ابھی خود مجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اس اونچے لا کو کیوں کر عبور کروں اس پہاڑ سے اتر لوں تو دامنوں کو سمیٹ کر الا اللہ کا نعرہ بلند کروں گا۔

مگر ہاں میں نہیں تو کیا اور بھی نہیں۔ بہتیرے مستانے دیوانے موجود ہیں۔ گدگدانے کی دیر ہے۔ کلھلانے والے نکل ہی آئیں گے۔

تو ہاں انہیں کیا کرنا چاہئے۔ یہ کہ جو گھر بار سے آزاد ہوں۔ وہی میدان میں آئیں برما چلیں جنگل میں منگل رچائیں۔ درختوں کے سایہ میں بسیرا جمائیں۔ ملے تو کھائیں نہیں تو مگن ہو کر سو جائیں۔ عبادت سب ان کا شعار ہو۔ پھر چھوٹا بڑا ادنے اعلےٰ ان کا یار ہو۔ برمی زبان آتی ہو تو واہ ہے۔ ورنہ نظر عشق کی زبان سب سمجھتے ہیں۔ اسی میں

Marfat.com

بات چیت ہو۔ کوئی دس بولے تو وہ ایک اشارہ ابرو سے سب کا جواب دیں۔ پانچ وقت کی نماز، حلقۂ ذکر و شغل وماسوا کی ضرورتوں سے بیخبری اور ذات الٰہی پر توکل کوئی بیمار ہو تو اسکی خدمت کریں۔ اپنے دکھ کی جگہ اس کا دکھ سمجھیں۔ دو جسم ایک جان بن جائیں۔ کسی کے کانٹا لگے تو اپنی پلکوں سے نکالیں۔ کوئی ترشی سے پیش آئے تو یہ اپنے اخلاق کی مٹھائی اسے کھلائیں۔ بات میں سچ ہو گھات میں سچ ہو۔ غرض جو چیز ہو صداقت و راستی کی تصویر ہو۔ پھر دیکھو۔ کہ کیوں نہ ہر ہر می کا دل زلف اسلام میں اسیر ہو۔

وہ جو کہتے ہیں کہ ہم روپے دیا کرتے تھے اب بھی دینگے۔ ذرا در کو آئیں میں ان کا منہ چوم لوں۔ اور ہو سکے تو ان کے خیال کو بھی بوسہ دوں کہ کار خیر کے لئے روپے جیسی دلنشین چیز کو اپنے سے جدا کرنا چاہتے ہیں۔

مگر دلدار من۔ یہ کوچہ دوسرا ہے۔ یہاں روپئے کی ضرورت نہیں۔ نہ انجمن سازی کی نہ غل شور کی۔ نہ ہماہمی کی۔ یہاں تو بس پھٹے پرانے کپڑے پہننے والے یا چاک گریباں متوالے کام کر سکتے ہیں۔ ان کو ڈھونڈو اور پہلے اپنے رنگون کے مسلمانوں کو مسلمان بناؤ۔ میں بھولا۔ ان کو یہ بتاؤ کہ وہ مسلمان ہیں اور ایک شرمیلے سجیلے سلطان کے تابع فرمان ہیں۔ وہ جو کھجوروں کے جھنڈ میں اپنی پیاری بکریوں کو جنگل کے پتے کھلاتے تھے اور دیکھنا لمبے لمبے بال شانوں پر ڈالے سورج سے آنکھ لڑاتے تھے۔ لکڑی پر سہارا دیکر کھڑے ہوتے اور کہتے۔ کھاؤ میری بکریوں۔ کھاؤ میری پیاریوں۔ میں تمہاری چوکسی میں کھڑا ہوں۔ کوئی دشمن تمہارے پاس نہ آنے پائے گا۔

اور ہاں وہ جو حرا نامی غار میں جاگتے تھے۔ اور امت کے سونے کا سامان کرتے تھے اور وہ جو راتوں کو کھڑے ہو کر نمازیں پڑھتے اور رخساروں پر آنسو بہاتے اور فرماتے تھے الٰہی میری امت کو ہنستا رکھیو اور وہ جو آج بھی آٹھویں دن تمہاری رپورٹ سنتے ہیں

Marfat.com

اور جب کوئی برائی پاتے ہیں تو اس کو چھپاتے ہیں اور دل ہی دل میں فرماتے ہیں کاش میرے پیارے تو ایسا نہ کرتا۔ ارے میری اُمّت کہلا کر تو نے جھوٹ بولا۔ دیکھ فرشتے مجھ پر ہنسیں گے۔ ارے مجھ سے منسوب ہو کر شراب پیتا ہے۔ زنا کرتا ہے۔ جوا کھیلتا ہے۔ دل جان میرا کہنا مان۔ ان سب کو چھوڑ۔ میرا بن۔ میرا بن۔ دیکھ تیرے سبب مجھکو شرمانا پڑتا ہے۔ فرشتوں کے سامنے نظریں نیچی ہوتی ہیں۔ تو میرا ہو کر میری آبرو نہیں بچاتا۔ بچا بچا اپنے آپ کو نفس و شیطان سے بچا۔

یہ سُنیں گے تو رنگون کے مسلمان اصلی مسلمان بنیں گے۔ اور جب اسلام اپنی اصلی حقیقی شکل میں نمودار ہوگا تو ہر وجود غیر مسلم اس کا شیدا و طلبگار ہوگا۔

مگر کہنے کو سب یہی کہتے ہیں جو میں نے کہا ضرورت کرنے کی ہے جو عمل کی بولتی ہوئی تصویر ہو۔ اور عمل کی تکمیل بغیر ترک تعلقات ماسوا اور جنون مخصوص کے محال ہے اسی واسطے تو اس مضمون کے دروازہ میں میں نے پہلی صدا یہ لگائی تھی۔

درکار ہیں منانے چند

غریبوں کا بھی کوئی آسرا

ہوتا

تو کیا ہوتا

از اخبار خطیب ۱۴ر مئی ۱۹۱۵ء

اگر ہوتا تو خدا ہوتا۔ جس نے سورج کی روشنی۔ دریا کا پانی۔ ہوا۔ آگ۔ مٹی سب کو برابر دی تھی۔ امیر غریب۔ چھوٹے بڑے کا امتیاز نہ رکھا تھا۔ مگر اس نے اپنے وجود کو مخفی کر لیا۔ ہر مخلوق کا سہارا اور آسرا بنا۔ مگر پردہ کے پیچھے رہ کر نظروں سے پوشیدہ ہو کر۔

اور انسان بنا تہا ویدباز۔ ظاہری ذریعہ پر مٹنے والا۔

اس لئے کشمکش ہونے لگی۔ کوئی بڑا بن گیا کوئی چھوٹا رہ گیا۔ کسی نے اتنی دولت پائی جس کی تہاہ نظر نہ آئی۔ کوئی رات کی روٹی کو ترسا۔ اگرچہ رزق کا مینھ گھم گھمر برسا۔

میں نے اپنے ملک پر نگاہ دوڑائی تو ایک عالمگیر بے قراری سامنے آئی۔ کوئی نائی کہلاتا تھا۔ پاؤں دباتا تہا۔ خوان سر پر اٹھاتا تہا۔ حجامت بناتا۔ کمین کہلاتا کوئی قصائی تہا۔ صورت آدمی کی رکھتا تہا مگر ذات میں ہیٹا مشہور تہا۔ کوئی چمار تھا۔ چوڑا تہا۔ کھٹ بنا تہا۔ غرض بڑے کم اور چھوٹوں کی بھیڑ تھی۔

پوچھا۔ بھئی انسانوں میں یہ فرق کیسا؟ جواب ملا۔ قدرت کا یہی دستور ہے۔ کسی کو سنوارتی ہے۔ کسی کو بگاڑتی ہے۔ خدا نے پکارا۔ نہیں۔ تمہاری تکلیفیں خود تمہارے ہاتھوں سے ہیں۔ محنت کرو تو بڑے بنجاؤگے۔ میرے دربار میں کسب اور کرم کی پوچھ ہے۔ جو متقی ہے وہی سب سے بڑا ہے

نائی نے کہا۔ اے خدا! آج عربی میں یہ حکم سناتا ہے اور کل سنسکرت میں منوجی کی زبانی یہ حکم بھجوایا تہا۔ کہ برہمن میرا سر ہیں۔ اس لئے علم وعقل کا کام وہ کریں۔ چھتری میرے بازو ہیں۔ جنگ اور حکمرانیاں ان کے حصے کی۔ ویش میرا شکم ہیں۔ لین دین کاربار۔ انکے ذمہ۔ شودر میرے پاؤں ہیں۔ خدمت۔ چاکری ان کا کام۔ تو ہی ذات پات کی قید لگاتا ہے۔ پھر نئے نئے حکم تبدیلی کے سناتا ہے۔

خدا نے اپنے عربی بندے سے کہوایا۔ نہیں تمہاری سمجھ کا پھیر تہا۔ میں نے کام بانٹے تھے۔ ذات تقسیم نہیں کی تھی تم سب ایک ہو۔ بشرطیکہ نیک ہو۔ بد میرے ملک میں سب سے چھوٹا اور سب سے برا ہوتا ہے۔

یہ باتیں سنا۔ ایک خاکروب گرمی میں جھاڑو دیتے دیتے ذرا سید ہا کھڑا ہوا پسینہ

میں غرق۔ آنکھوں کو آسمان کی جانب اٹھایا۔ اور کہا یہ تو بتا۔ ہمارا آسرا کون ہے۔ صبح سے دوپہر ہو گئی۔ غلاظت اٹھائی۔ جھاڑو دی۔ کیٹی کے جمعدار کے ڈنڈے کھائے گالیاں سنیں۔ اب گھر جاتا ہوں۔ میلی کوٹھری میں پڑنا ہوگا۔ چھوٹے ٹکڑے۔ سڑی بسی دال کھانے کو ملیگی۔ گرم پانی پینے میں آئے گا۔

ادھر دیکھ۔ یہ امیر ہیں۔ رات بھر بجلی کے پنکھوں میں سوئے۔ آٹھ بجے جاگے۔ انگڑائی لی۔ آنکھیں ملیں۔ نوکروں کو صلواتیں سنائیں۔ ناشتہ کیا۔ بیت الخلا گئے نہلائے پھر آراستہ کمرے میں آئے۔ شطرنج کا دور ہوا۔ کھانا کھایا۔ گانا سُنا۔ سو گئے شام کو ہوا خوری کے لئے موٹر آئی۔ لینڈو منگائی۔ غرض کوئی گھڑی محنت و تکلیف کی نہ پائی۔ جس اعلیٰ اور قیمتی چیز کی طرف آنکھ اُٹھائی وہ دست بستہ دوڑی ہوئی سامنے چلی آئی۔ ایک وہ ایک میں دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میرا دل اس خلجان کے دریا میں غرق ہے خاکروب کا شکوہ ختم نہ ہوا تھا کہ سامنے بیگاری چمار آیا۔ سر پر بوجھ۔ دھوپ میں ننگے پاؤں۔ ساتھ میں سپاہی۔ جلدی چلنے کا تقاضہ۔ اس نے دیکھا کہ خاکروب اور خدا میں گفتگو درپیش ہے تو اس نے بھی آہ کی صدا میں آمین پکاری۔ اور کہا۔ ہے میرے باری۔ ہے میری باری۔ دو وقت سے بچے بھوکے ہیں۔ اندھی ماں بخار میں ہلہلا رہی ہے۔ گھر سے روزی کی تلاش میں چلا تھا کہ اِس فرشتے کے ہاتھ میں پڑا۔ اس نے طمانچے بھی مارے بُرا بھلا بھی کہا اور جانور کی طرح ہانک کر خبر نہیں کہاں لے چلا۔

اتنے میں ایک برقعے والی پاس سے گزری۔ دامنوں میں سیکڑوں پیوند ٹوٹی ہوئی جوتی۔ بغل میں ٹوپیوں کی بقچی۔ بازار گئی تھی۔ بیپاری نے خریدنے سے انکار کیا اور کہا مندا ہے۔ لڑائیوں کے موسم میں کسی چیز کی نکاسی نہیں۔ حیران پریشان گھر چلی ہے۔ یتیم بچوں کی بھوک۔ اپنی بیکسی کا خیال کرتی ہے۔ آنکھوں میں آنسو

Marfat.com

اُبلے چلے آتے ہیں! وراندر سے کون کہتا ہے کہ خود کیونکر جیئوں اور بچوں کو کیوں کر پالوں۔

دو فریادیوں کو دیکھکر وہ بھی پروردگار کی دوہائی دینے کھڑی ہوگئی۔

تین عرضیاں گزریں تو عدالت آسمانی نے بغیر سمن جاری کئے دروازہ کھولا۔ اور کہا میرے بندو! مایوس نہ ہو۔ ہر تکلیف کے بعد راحت ہے۔ میرے دفتر میں امیروں کے عیش بھی لکھے جاتے ہیں۔ اور غریبوں کے مصائب بھی۔ ذرہ ذرہ اور نکتہ نکتہ پر بحث ہوتی ہے۔ اس دنیا میں بھی عوض ملتا ہے اور آخرت کے واسطے بھی معاوضہ کی فراہمی ہوتی ہے۔ بے انصافی نہ ہوگی۔ جس کو یہاں نہیں اس کو وہاں ملیگا۔ اور جو یہاں پاچکا اس کو وہاں کچھ نہیں۔

فریادیوں نے کہا ہمیں محنت اور مفلسی کی شکایت نہیں۔ شکوہ اس کا ہے کہ امیر ہم کو حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں۔ پاس نہیں بٹھاتے۔ بات نہیں کرتے۔ آدمی نہیں سمجھتے ستاتے ہیں۔ ٹھکراتے ہیں۔ اور بعضے ہمارے سایہ تک سے کتراتے ہیں۔

یہ سنکر آسمان لرزنے لگا۔ ہوا سہم کر دم بخود ہوئی۔ فرشتوں نے کچھ اشارے پائے دوزخ کے انگارے اٹھائے۔ دوزخ بھی چیں بہ جبیں ہوئی۔ سانپ بچھوؤں کو یورش پر آمادہ کیا۔ جنت نے دروازے بند کئے ایسے امیروں پر حرام کے بورڈ لگائے آسمان چہارم پر جناب مسیحؑ نے سُنا۔ غیرت خداوندی کو جوش میں دیکھا۔ تو وہ بھی تھرائے مگر خیر ہوئی کہ ان کی امت کی مکتی فوج ولاسہ کو دور کھڑی نظر آئی جس نے ہزاروں غریبوں کو سہارا دیا تھا۔ تاہم وہ دوڑے کہیں آج ہی یہ سوال نہ ہو جائے کہ کیوں جی تم نے ان سے کہا تھا کہ مجھ کو خدا کا بیٹا کہنا اس وقت کیا جواب دوں گا شرم کے مارے گردن جھک جائے گی۔ غریب پروری کی۔ مگر خدا کے راستہ سے بھٹکا دیا۔ تو خدا کو کیا جواب دوں گا۔

زمیں پر جب غضب الٰہی کی شعاعیں نمودار ہوئیں بصیرت والے گھبرا گئے

Marfat.com

امیروں اور خودسروں مغروروں پر دانت پیسنے لگے۔ کلیجے پر ہاتھ رکھکر غریبوں کی تکلیف محسوس کرنے لگے۔

یکایک حجاز سے برقابی خبر آئی۔ ایک بڑے سلطان نے ہمت بندھائی۔ لکھا تھا ان غریبوں کا آسرا میں ہوں۔ لاچاروں بے سہاروں کا سہارا میں ہوں۔ ایک غریب عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھی روٹی کھاتی تھی۔ خدا نے بادشاہ بنایا۔ مگر میں نے رعیت کی طرح وقت گزارا مسکینوں میں رہا مسکین بنا۔ اور مسکینوں میں حشر کی ٹھانی۔

آؤ تم میرے ہو۔ تم چمار ہو یا بھنگی۔ نائی ہو یا قصائی۔ کنجڑے ہو یا جلاہے۔ پھٹے حال ہو۔ مفلس کنگال ہو۔ مگر میرے دل کی ٹھنڈک اور فرزند نونہال ہو۔ تم کو گلے لگاؤں پیار کروں۔ نہلاؤں۔ پاؤں دباؤں۔ پنکھا جھلوں۔ آپ پیچھے کھاؤں۔ پہلے تمہیں کھلاؤں۔ اور تم کو ہر ذلت وحقارت سے بچا لوں۔

اے خدا کو ایک مانو۔ اس کی مرضی پر چلو۔ پھر تم میرے راج دلارے ہو۔ آنکھوں کے تارے ہو۔ روپیہ پیسہ کیا چیز ہے۔ مجھکو ایمان عزیز ہے۔ ایمان عزیز ہے۔ کہنا حسن نظامی سے کہنا۔ ہر دعویدار غلامی سے ذات پات کی قید اٹھاؤ۔ مغل سید۔ پٹھان کا نام مٹاؤ۔ کمینوں کو اچھوتوں کو پاس بلاؤ برابر بٹھاؤ۔ ساتھ کھلاؤ۔ ان کا آسرا ہو گے تو خدا کو پاؤ گے۔ ورنہ ہاتھ ملتے قبر میں جاؤ گے۔

حسن نظامی نے گردن جھکائی۔ اپنے مالک اپنے داتا کی مرضی سر آنکھوں پر اٹھائی پہلے خاکروب کے قدم لئے۔ اسکی کوٹھری میں خرقہ پہنایا۔ اور ساتھ بیٹھکر جھوٹی روٹی اور باسی دال کا نوالہ کھایا۔ میرا بھائی۔ میرا بھائی کہکر جی بڑھایا۔ پھر بیگاری چمار کے گھر پہنچا اپنا کھانا اسکے بچوں کو بانٹا۔ اسکی نابینا ماں کو دوا پلائی۔ اور جب تک اس کا لال بیگار سے الٹا نہ پھرا۔ اسکا جی بیمار چماری کو پنکھا جھلنے اور پاؤں دبانے سے نہ بھرا۔

برقعے والی عورت کا گھر یاد تھا۔ لوگوں سے کہا۔ اس کی ٹوپیاں خریدو۔ شریف ہے

Marfat.com

خیرات نہ سے گی۔ اس کا دل نہ ٹوٹے ایسی مدد کرو۔

جہاں پناہ۔ ہز مجسٹی۔ امپرر دو جہاں۔ خاقان الانس والجان۔ سلطان العرب والعجم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گورنمنٹ ناظر غیب تھی۔ اس نیت کی کارگزاری سے مسرور ہوئی۔ سبز نشان انعام میں بھجوایا۔ اور فرمایا۔ اس کو کھڑا کرو۔ اور غریبوں سے کہو۔ یہ ہے تمہارا آسرا۔ یہ ہے تمہارا سہارا۔ یہ ہے تمہارا ٹھکانا۔ اس کے نیچے آؤ۔ پھر کوئی تم کو حقیر ذلیل نہ کہہ سکیگا۔ کسی کو پاس بٹھانے ساتھ کھلانے سے عار نہ ہوگا۔

یہ جھنڈا وحدت کا ہے یہاں دوئی نہیں
سوائے یہاں کے اور کہیں یکسوئی نہیں

ہے کوئی بندۂ خدا جو حسن نظامی کی طرح اس حکم پر ایمان لائے۔ اور بھنگی چماروں کیساتھ کھانا کھانے پر آمادہ ہو جائے۔ جس کو انکار ہوگا قہر خدا کا سزاوار ہوگا۔ زمین اس کو نگل جائے گی۔ دولت اسکی چھن جائے گی۔ عزت اس کی مٹ جائے گی۔ در بدر رسوا ہوگا۔ پھر بعد کے پچتانے سے کیا ہوگا۔

کہہ دو انسان کا جسم گندہ نہیں۔ اگر ظاہری ناپاکی نہ ہو تو ہر ولد آدم پاک ہے شاہ وگدا مساوی بحکم شہ لولاک ہے۔ غریب کے آگے جھکو۔ متکبر امیر کے سامنے اکڑو۔ ٹوٹے دل کو جوڑو۔ سنگین دل کو توڑو۔

جب غریبوں کا یہ آسرا پیدا ہو جائے گا۔ پھر دیکھنا مسلمانوں کے تمدن۔ سیاست وغیرہ میں انقلابی مزہ آئے گا۔ اور اس وقت اس سوال کا جواب سمجھ میں آجائے گا کہ غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا؟ جب علم سبز کے نیچے کا ہر بہادر بتائے گا کہ یہ ہوتا۔ یہ ہوتا۔ یہ ہوتا۔

یہ مضمون تمام ہندوستان کے اخباروں نے چھاپا تھا اور اس کی بہت تعریف ہوئی تھی

Marfat.com

شذرات

ہماری بُری نیکیاں

یہ طرز احسان کرنیکا تمہیں کو زیب دیتا ہے
مرض میں مبتلا کرکے مریضوں کو دوا دینا

ہندوستانی بڑے مخیر ہیں۔ خیر خیرات کرنے میں انکا درجہ بڑی بڑی دولت مند قوموں سے بڑھ گیا ہے۔ مگر ان کی یہ نیکیاں بعض اوقات برائیوں سے بڑھ جاتی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ہندو لوگ چڑیماروں کو دام دیکر پرندوں کو آزادی دلایا کرتے ہیں۔ ظاہر میں یہ بڑا نیک کام ہے کہ بے زبان جانور ظالم صیاد کے پنجے سے رہائی پاتے ہیں۔ لیکن درحقیقت جانوروں پر ظلم کرانے کا اور چڑیماروں کو جانوروں کی گرفتار کرنیکا اس سے زیادہ کوئی رغبت دلانے والا سبب نہیں ہوسکتا۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ ہماری ستمگاری کی "نقد داد" ملتی ہے تو وہ اور زیادہ محنت وجستجو سے اپنی سفاکیوں کا سلسلہ دراز کرتے ہیں۔ اور بچارے پرندے زیادہ گرفتار ہونے لگتے ہیں۔

اسی طرح موٹے مسٹنڈے بھیک منگوں کو خیرات دینا ان کو بے کار بنانا ہے ملک میں گداگروں کی تعداد بڑہانے کے ذمہ دار زیادہ تر یہی نیک لوگ ہیں جو پہلے لوگوں کو بیمار کرتے ہیں پھر دوا تقسیم کرنے کھڑے ہوتے ہیں۔

ایسی بری نیکیوں کا انسداد لیڈران ملک کو سیلف گورنمنٹ کے حصول سے زیادہ ضروری ہے مگر ہم کو لیڈروں کے بھروسہ پر نہ رہنا چاہیئے۔ جس ملک میں فرض ادا کرنے والے لیڈر نہ ہوں اس کا ہر باشندہ اپنے ذاتی فرائض کا ذمہ دار ہے۔ لہذا ہندوستانیوں

کو اس خیرات ناجائز کی رسم پر نظر ثانی اور زبان و قلم کو حرکت میں لا کر حق العباد کے بارے سبکدوش ہونا چاہیے۔

صبا نے کلیوں کو جگایا

کل صبح باغ میں سوتی کلیوں کو صبا جگاتی تھی۔ شانہ ہلاتی تھی۔ یہاں تک کہ گدگدیاں کر کر کے ہنساتی تھی۔ یہ جگانے کا نرالا انداز دیکھ کر میں نے اس سے کہا تو بڑی ملنسار ہے۔ برگ گل کے رخسار پر سر رکھ کے بولی۔ تم سیکھو کہ بچوں کو یوں پرورش کیا کرتے ہیں۔ یہ برتاؤ ہوگا تو ہر طفل غنچے کی طرح کھلے گا۔

میں اپنی نیند خراب کر کے پہلے بیدار ہوئی۔ جنگلوں۔ پہاڑوں کی تازگی چنتی دامنوں میں بھرتی۔ یہاں آئی۔ تب ان کلیوں کی خدمت بجا لائی۔ تم خود سورج نکلنے کے بعد تک سوتے رہتے ہو۔ تو بچوں کی تروتازگی کہاں سے آئے گی۔

شمع کا مرقد زیبا

حضرت اکبر کی میز پر مومی شمع گورے سنتری کی طرح تنی کھڑی تھی۔ اس کا قدِ زیبا سر سے پاؤں تک سڈول بناجی کو بھا گیا۔ چکنی چپڑی صورت پر دل آ گیا چاہتا تھا کہ اس مس خاموش کو گویا کروں اور اپنی محبت کے پھندے میں پھنساؤں کہ کسی نے اس کے سر پر شعلے کا تاج رکھ دیا۔ آہا ہا۔ عالم ہی بدل گیا۔ کلاہ نور میں شمع پیاری کی شکل کیسی دلفریب بن گئی۔ پروانے باغ کی ڈالیوں سے اڑ اڑ کر کمرے میں آنے لگے۔ میرا لطفِ دید ختم نہ ہوا تھا کہ جناب اکبر کا شعر کان کی راہ آنکھوں میں سما گیا ؎

زینت مقدمہ ہے مصیبت کا دہر میں
سب شمع کو جلاتے ہیں سانچے میں ڈھال کے

Marfat.com

صورت شعر کی حالت القائی نے شمع کو بھی رُلا دیا۔ آنسو بہا کر بولی دنیا کی زینت چاہنے والے میرے جلاپے کی مصیبت کو دیکھیں۔ قدر عنا زیبائش کے ہاتھوں مٹا جاتا ہے نہ ظاہری ٹیپ ٹاپ ہوتی نہ یہ دقت پیش آتا۔

تغیرِ فطرت کا سبب

فطرت ہر وقت تبدیلی و تغیر میں مصروف رہتی ہے۔ انسان کے ذرات جسم و حواس کو دیکھو وہ بھی سکنڈ سکنڈ میں بدلتے رہتے ہیں۔ پوچھا اس کا سبب؟ ہوش نے جواب دیا ہستی مطلق کے گوش تک رسائی پانے کیلئے رنگا رنگ طریقے بدلے جاتے ہیں۔ مگر وہاں ایسے پر حجاب پردے پڑے ہوئے ہیں کہ اس طرح پہنچ نہیں ہوتی۔ بقول اکبر ؎

نہیں پاتی نہیں پاتی رسائی گوش جاناں تک
بدلتی ہے طریقہ سو طرح میری خبر اپنا

دُنیا میں دکھ سُکھ کی تبدیلیاں بھی اسی اصول کی ماتحت ہیں۔ جو ان تغیرات سے دل برداشتہ نہیں ہوتے اور عبادت رب میں مصروف رہتے ہیں ان کی خبر گوش جاناں تک بلا تردد پہنچ جاتی ہے۔

جرمنی کا فلسفہ کائنات

ڈاکٹر ہیگل جرمنی کا مشہور فلاسفر ہے جس کی فلاسفی جرمنی درسگاہوں میں رائج ہے۔ اہل جرمن اسکو افلاطون سے بڑھکر سمجھتے ہیں۔ اور بقول ڈاکٹر اقبال باعتبار تخیل کے ہیگل افلاطون سے یقیناً بڑا ہے۔

ہیگل موجودات عالم کی ہستی محدود کی زندگانی اصول متناقص میں مضمر تا ہے اور کہتا ہے کہ کائنات کے تمام محدود وجود آپس میں کٹتے مرتے اور ایک دوسرے سے

دست و گریباں ہوتے ہوئے ایک دن ہستی مطلق میں مل جاتے ہیں۔ جب تک ہستی میں کیب تناقض موجود ہے کش مکش لازمی ہے۔

اہل جرمنی ہیگل کے اس فلسفہ کو ناز سے لکھتے ہیں۔ جو ضخیم کتابوں میں قلمبند کیا گیا ہے مگر ہندوستان میں اس کو بچہ بچہ جانتا ہے۔ ذوق مرحوم نے ایک شعر میں اسی کے قریب ایک مضمون لکھا تھا کہ اس جہان کو اختلاف سے زیب ہے مگر حضرت اکبر الہ آبادی نے تو ہیگل کے سارے سمندر کو اس طرح اس شعر میں بند کیا ہے جیسے انگریزی بیڑے نے جرمنی بیڑے کو نہر کیل میں کیل رکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے، عقل، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

جرمن والوں کو معلوم ہو کہ ہند میں ہمارا فلسفہ مفتوح ہو چکا ہے تو ان کی حرص فتاحی شکست ہو جائے۔ حضرت اکبر کو تو شاید معلوم بھی نہ ہوگا کہ جو شعر ان کے قلم سے بیساختہ نکلتا ہے اس پر جرمنی کی تمام ساخت پرداخت منحصر ہے انہوں نے اس شعر میں روح و مادہ اور ان کے تمام توازنات کو کس آسانی سے ادا کر دیا ہے۔

ہندوؤں کی مہابھارت کے وقت سری کرشن جی نے جو فلسفیانہ لکچر ارجن کو سنایا تھا اور جو اب گیتا کے نام سے ہندوؤں کی پوجا پاٹ میں شامل ہے۔ ہیگل کے اس فلسفہ سے کہیں زیادہ لطیف و پر معانی ہے۔

مسلمانوں کے فلسفہ تصوف کو دیکھا جائے تو اس کے جزئیات میں ہیگل کے کلیے بکھرے ہوئے ملیں گے۔ تشبیہ و تنزیہہ کے اشارات میں محدود پیکروں کو وجود مطلق کے جلوے علانیہ نظر آجائیں گے۔

اس میں شک نہیں محدود ہستیوں کی باہمی کش مکش فطرت و نیچر کے حکم سے ہے جہاں زہر پیدا ہوتا ہے وہیں تریاق بھی پیدا کیا جاتا ہے۔ گرمی و سردی۔ خشکی و تری۔

Marfat.com

نیکی و بدی۔ نور وظلمت اجزواں پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ قدرت نے دنیا کو دار الامتحان بنایا ہے جہاں سلیم الفطرت انسانوں کو آزمایش کے بعد منتخب کیا جاتا ہے۔ پس ہستی مطلق کے دربار میں مقبولیت ان ہی کی ہے جو نیچر کی مقررہ حد توازن سے آگے نہیں بڑھتے اور اس توازن کو تقدیر الٰہی سمجھکر مصائب پر صبر اور تعیش پر شکر کرتے ہیں۔ ان کا قدم ظلم وزیادتی کی جانب جنبش نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ ہستی مطلق کے آداب وسامان کا عرفان رکھتے ہیں۔

آرام کہاں ہے؟

نئی روشنی اور پرانی روشنی بحث کر رہی ہے کہ انسان کی آسایش وراحت خودی میں ہے یا بیخودی میں؟ ایک فریق کہتا ہے۔ خودی مٹانے کا عقیدہ عیش زندگانی کا دشمن ہے۔ دوسرا بیان کرتا ہے زندگی کی حقیقی کامرانی خودی میں میسر نہیں آسکتی۔

یہ کیسی مشکل بات ہے یہ لوگ تو آپس میں علم کے ہتھیاروں سے لڑتے ہیں۔ اور بے علم جینے کے مزے کو کھڑے ترستے ہیں۔ ان کے لئے حضرت اکبر الہ آبادی نے کیا خوب مثال ارشاد فرمائی کہ نیند دن بھر کی محنت کے بعد ذریعۂ آرام ہے۔ مگر اس آرام میں آدمی کی خودی باقی نہیں رہتی جب بے خود ہوتا ہے تو آرام پاتا ہے۔

روح واجل کے دامن

موت وحیات دیکھنے اور کہنے میں دو اور حقیقت میں ایک ذات ہیں۔ کیونکہ ذات واحد کی فرستادہ ہیں۔ جو لوگ موت سے ڈرتے ہیں اور حیات پر مرتے ہیں ان پر اجل خنگل مارتی اور حیات ان سے دامن بچاتی ہے۔ اور جن کو خدا سے سروکار ہے جو خالق لیل ونہار ہے ان کے لئے اجل کے دامنوں میں حیات بستر بچھاتی ہے۔ اور جب وقت موعود آتا ہے روح رواں بستر اٹھاکر روانہ ہو جاتی ہے۔ اور اجل اپنے خالی دامن کو جھاڑتی چلی جاتی

Marfat.com

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کو مرنے میں اذیت نہیں ہوتی۔ اور وہ اجل کے ضرر یورش سے محفوظ منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ (اکبر)

برباد کیا اجل نے ہم کو کیا یہ کہئے ۔ روح رواں نے اپنے دامن کو جہاڑ ڈالا

موج پر کائی نہیں جمتی

بند پانی اور بہتے دریا کی جنس ایک ہے شکل ایک نہ ہے۔ ظاہر ایک ہے۔ باطن ایک ہے۔ مگر آب مقید پر کائی چہاجاتی ہے۔ اور موج رواں ہمیشہ سورج سے آنکھ لڑاتی ہے اسی طرح جو آدمی کچھ کام نہیں کرتے تو ان کی لیاقتیں مل کے دل ہی میں ارمانوں کو مسوس کر مرجاتی ہیں اور جو دین دنیا کے مشاغل میں رواں دواں رہتے ہیں وہ اوج فلک پر سورج بنکر چمکتے ہیں۔

میں نہیں ڈوبا

طوفان کشتیوں اور جہازوں کو ڈبوتا ڈبوتا مجھ تک آیا۔ میں ایک بلبلا تہا۔ اور پانی میں تیر رہا تہا۔ اُس نے چاہا مجھ پر حملہ کرے۔ اور وہ کف منہ میں لیکر میری جانب بڑہا۔ مگر میں اطمینان سے اس کو دیکھتا رہا۔ وہ مجھ تک پہنچا بھی نہ تہا کہ پانی نے میری خودی کی ہوا کو شکست دی۔ ہوا فرار ہوئی اور میں پانی ہوگیا۔ طوفان سر پر آیا تو مجھکو نہ پایا۔ بہت گھبرایا۔ آخر کسی نے سُنایا خودی کے متوالے ڈوبتے ہیں۔ حباب بے خود ہوگیا۔ اب تو اس کو کہاں پاسکتا ہے۔

دنیا کے رہنے والے اس مثال کو سنکر اپنے حریفوں سے مطمئن ہوئے۔ اور انہوں نے بھی اپنے اندر کی ہوائے نفسانی کو نکالنا شروع کردیا۔ اُس وقت میں سمجھا کہ میں ابہار کے دریا میں غرق نہیں ہوا۔ لوگوں کو ڈوبنے سے بچایا۔

Marfat.com

کچی نیند کی آنکھیں

ان کی عمر جوانی کی تھی۔ یہ بیداری میں خام تھے۔ نیند کی غفلت میں پختگی کے سوا ان کی ہر ادا کچی تھی۔ سوتے میں انہوں نے کیا پی لیا ہے۔ آنکھیں کھل گئی ہیں۔ مگر نشہ سے بند ہوئی جاتی ہیں۔ دیکھنا ڈیلوں کی سفیدی میں سُرخی کیسی نشیلی ہے اور پلکیں کیسی بے قابو ہو ہو کر لڑکھڑا رہی ہیں۔ پتلی کی بے قراری پردہ کے اندر کی چھپی باتوں کو رُک رُک کہنا چاہتی ہے۔ مگر زبان یاری نہیں دیتی۔

ذرا پوچھنا۔ تم کو عورتوں کی تعلیم و بے پردگی کی بھی کچھ خبر ہے۔ ہندوستان میں عورتوں کو آزاد و بے باک بنانے کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔ لیکن کچی نیند کی آنکھیں خود صورت مثال اور زبان حال ہیں ہر دمکمل ہو جاتے۔ گویا نیند پوری ہو جاتی۔ اس وقت عورتوں کو جگایا جاتا۔ وہ بے چاریاں پہلے ہی کچی ذات ہیں۔ کچی نیند میں اٹھائی جائیں گی تو خود بھی گرینگی دوسروں کو بھی گرائیں گی۔

عالم اسباب

یہ دنیا عالم اسباب مشہور ہے۔ اس میں ہر چیز دوسری چیز کی ماتحت و محتاج بنائی گئی ہے:

صرف انسانوں پر نظر کی جائے تو ہر فرد دوسرے کا دست نگر معلوم ہوگا۔ جس طرح ایک مفلس و غریب آدمی دولتمندوں کا محتاج ہے۔ اسی طرح دولت والے غریبوں کی امداد کے ضرورت مند ہیں۔ خواہ کیسا ہی بڑا فلک خود مختار شہنشاہ ہو اپنے نوکروں اور ماتحتوں کی مدد بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ اور اسکی عزت ادنا مورسی گمناموں کے عمل پر منحصر ہے۔

اس سلسلۂ ضروریات کی باہم وابستگی اور ایک دوسرے کی احتیاط و قدرت کا بہت

Marfat.com

بڑا راز ہے۔ یہ نہ ہو تو مخلوق میں خالق کی ہمسری و خودی پیدا ہو جائے۔ جب مغرور ہستیاں عالم اسباب کی مجبوریوں سے کمتر ہستیوں کے آگے ہاتھ پھیلاتی ہیں تو خودی و نخوت کے نشے ہرن ہو جاتے ہیں۔

مذہبی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو شرک بہت ناپسند ہے۔ آثار نیچر میں بھی نظر آتا ہے کہ انسان و حیوان شرکت غیر سے گھبراتے ہیں۔ اس واسطے قدرت نے نہایت لطافت و باریکی سے ہر وجود کا سلسلہ دوسرے وجود کے ساتھ اس ترکیب سے ملایا ہے کہ ضروریات کی تکمیل کے بعد ہر ہستی اپنے کام میں آزاد ہو جائے اور شرک کی تکلیف میں مبتلا نہ رہے۔ پس اگرچہ کائنات میں اشیاء باہم ایک دوسرے کی محتاج ہیں لیکن ادائے حقوق کے بعد ان کو آزادی ملنی لازمی ہے۔ ❊

ایڈورڈ ڈائری

سنہ ۱۹۳۷ء کی خاص کتاب تمام قوموں کے فلسفے حضرت خواجہ حسن نظامی کی شاہکار کتاب

قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ

دفتر ہفتہ وار باتصویر اخبار منادی دھلی

آخری دستخط

میرے مضامین کا پہلا حصہ پورا ہو گیا اور مجھ سے آخری دستخط مانگے جاتے ہیں اور میں یہ سطریں لکھکر دستخط کرتا ہوں۔

چار برس سے زیادہ کا ذکر ہے میرے مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا تہا۔ یہ مجموعہ ایک جسم معطل تہا، اس کے سر پیر نہ تھے۔ آنکھیں کانوں کی جگہ اور کان ناک کے مقام پر، اور ناک زبان کے موقعہ پر چسپاں تھی، نہ کوئی ترتیب تھی، نہ موزوں قرینہ تہا کیونکہ اس مجموعہ کا مرتب کرنیوالا میں خود اور چند احباب تھے۔ کچھ ہماری ناقابلیت۔ کچھ مضامین کا ایک وقت میں نہ ملنا۔ اس خرابی کی وجہ سمجھی چاہئے۔ دوستوں کو جہاں کہیں کوئی مضمون ملا انہوں نے کاپی نویس کو دیدیا۔ تقدیم۔ تاخیر۔ موزوں۔ غیر موزوں کا خیال نہ کیا۔ اس پر بھی صدہا مضامین رہ گئے اور وہ اخبار و رسائل نہ مل سکے جن میں یہ مضامین شائع ہوئے تھے، خود میرے ہاں ایک بوری ایسے اخبارات و رسائل کی غلطی سے ردی میں چلی گئی جن میں میرے مضامین تھے اور ان کو ترتیب مجموعہ کے خیال سے جمع کیا گیا تہا۔

باوجود ایسی بے ترتیبی و بے سلیقگی کے یہ مجموعہ لوگوں نے پسند کیا اور دو برس کے اندر (غالباً) دو ہزار جلدیں فروخت ہو گئیں اور مانگ باقی رہی لیکن اس طلب کا جواب موجود نہ رہا اب وہ وقت تہا کہ اخبار توحید کی ضبطی نے ہندوستان میں میرے مضامین کا شوق بڑھا دیا تہا، کیونکہ میں نے اخبارات و رسائل میں لکھنا چھوڑ دیا تہا۔ خلقت کے مضطربانہ اشتیاق کو دیکھکر اخبار توحید کے مالک شیخ محمد احسان الحق قادری میرٹھی نے توحید کے پرچوں سے میرے مضامین اخذ کئے اور ان کا ایک مجموعہ چھاپ دیا۔ یہ مجموعہ صرف توحیدی مضامین کا تہا، تاہم ہاتہوں ہاتھ لیا گیا اور اس کی ترتیب پبلک کو بہت پسند آئی۔ حقیقت میں

انتخاب توحید کی ترتیب تھی بھی ایسی باقاعدہ کہ خواہ مخواہ اچھی معلوم ہوتی تھی اس تجربے سے بہیا احسان کو جرارت ہوئی اور انہوں نے اسی وقت سے تمام اخبارات و رسائل سے میرے مضامین جمع کرنے شروع کئے اور ان کی ترتیب سے ابواب مقرر کردئے اسی اثنار میں ملک دکن کے محکمہ تعلیم نے اسکول کے بچوں کے واسطے میرا پہلا مجموعہ منظور کیا اور اسکی خریداری کی باضابطہ اطلاع مجھکو دی لیکن میں اسکی تعمیل کیونکر کرسکتا میرے پاس تو ایک کتاب سے زیادہ دوسری نہ تھی یہ معلوم کرکے بہیا احسان نے جلدی جلدی مجموعہ مضامین کا پہلا حصہ مرتب کرکے محمد انوار ہاشمی کے عصر جدید پریس میرٹھ میں چھپوادیا اور مُلّا محمد الواحدی کے درویش پریس میں اسکا ٹائٹل چھپواکر کتاب پوری کردی۔

اس مجموعہ میں انتخاب توحید اور سابقہ مجموعہ سے اقتباس کیا گیا۔ جو مضامین موجودہ جنگ کے سبب خلاف مصلحت تھے ان کو حذف کردیا اسکے بعد اخباروں اور رسالونکے جدید مضامین بھی لئے۔ برادرم شیخ محمد احسان الحق صاحب نے اسکی ترتیب اور عزیز قلبی محمد انوار ہاشمی نے لکھائی چھپائی اور تصحیح میں بہت محنت کی ہے اور محض اخلاص و محبت کی بنا پر مہینوں کی دردسری اٹھائی ہے اسکا میں شکریہ تو کیا ادا کروں، محبت کے کوچہ میں یہ رسم منع ہے۔ اپنی خوشی کا اظہار کرتا ہوں اور خدا تعالےٰ کا شکر کرتا ہوں جس نے مجھ کو ایسے بے غرض مخلص دئے۔

عزیزم مُلّا محمد الواحدی اڈیٹر رسالہ نظام المشائخ و اخبار خطیب دہلی نے اس مجموعہ پر جو دیباچہ لکھا ہے وہ نئی طرز کا ریویو ہے، امید ہے کہ اس دیباچہ کو دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔ میں واحدی صاحب کا بھی احسانمند نہیں ہوں، انہوں نے بھی حق تعلق ادا کیا۔

دوسرا دیباچہ ملک کے شہرۂ آفاق انشا پرداز اور اردو ادب کے عملی خدمتگزار جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے۔ سکرٹری انجمن ترقی اردو و افسر ماتحت محکمۂ تعلیمات دکن کا ہے مولانا نے علم دوستی اور اردو زبان کے ذوق سلیم کی بنا پر ان مضامین کی داد دی ہے خدا ان کو داد دیگا کہ انہوں نے ترقی اردو کے مقاصد کو ملحوظ رکھکر میری حوصلہ افزائی میں مبالغہ کیا ہے

Marfat.com

برادر طریقت مولوی سید غلام بہیک صاحب نقیر اللہ شاہ نظامی بی۔اے۔ وکیل انبالہ جو میر نیرنگ کے تخلص سے ادیبوں میں شہرت عام رکھتے ہیں سابقہ مجموعہ پر انہوں نے ایک دیباچہ لکھا تھا وہ بھی بھیا احسان نے اس مجموعہ میں داخل کر دیا ہے۔

اپنی رائے

دیباچہ نویسوں نے توان مضامین پر رائے زنی کردی اب میں خود اپنی رائے کے دو لفظ لکھکر آخری دستخط کرتا ہوں۔

دلی میں رہنے والے کا یہ کچھ کمال نہیں ہے کہ اس نے اردو زبان میں اپنے خیالات کو صفائی سے ادا کر دیا۔ اسواسطے میں ان مضامین کی زبان پر تعریفی الفاظ لکھنے نہیں چاہتا۔ البتہ اپنے ذہن اور تصور کی ستائش کرتا ہوں جس نے میرے قلم سے ان تخیلات کو کاغذ پر نمایاں کرادیا۔ اور یہ ستائش خودی کے ذہن اور تصور کی نہیں ہے بلکہ خالق ذہن و تصور کی تعریف ہے، وہ نہ ہوتا تو میں بھی نہ ہوتا اور میرا ذہن و تصور بھی نہ ہوتا۔ وہ تھا ہے۔ رہیگا۔ میرا وجود بھی ہوا اور اس نے جذبات کو مجسم کر کے دکھا دیا۔

میں ذکر کرتا ہوں، خدا نے مجھے بڑی نعمت دی ہے اور نعمت کا ظاہر کرنا مجھپر لازم گردانا ہے۔ ان مضامین میں بعض اشارے وہ ہیں جن کو نہ خود میں سمجھا نہ امید ہے کہ آجکل کوئی سمجھ سکیگا۔ لیکن قلم نے کسی طاقت سے متاثر ہو کر ان کو لکھا ہے لہذا وقت آئیگا کہ انکے سمجھنے والے پیدا ہوں وہ سمجھ لینگے تو میری اپنی اس رائے کی قدر کرینگے اور ان آخری دستخطوں کا مطلب جان جائیں گے جو میں نے خاص اپنی روش تحریر دکھانے کو اپنے قلم سے لکھے ہیں۔

حسن نظامی دہلی

Marfat.com

اکسٹھ (۶۱) برس کی عمر میں

یہ مجموعہ مضامین جس کو سی پارۂ دل بھی کہتے ہیں ایم اے اور بی اے کے نصاب تعلیم میں داخل ہے۔ اور ہر جگہہ اس کی مانگ ہے۔ گزشتہ ایڈیشن بہت ہلکے کاغذ پر طبع ہوا تھا اور مجھے اس سے بہت تکلیف ہوئی تھی کہ میری اولاد کو سردی کے موسم میں تن زیب اور ململ کے کپڑے پہنادئے اس کے علاوہ یہ ختم بھی ہوگیا تھا۔ آخر کاتب نے پھر لکھا۔ کاپیاں ۱۹۳۶ء میں تیار ہوگئی تھیں اور اب جبکہ اگست ۱۹۳۷ء کا آخر ہے یعنے ۱۹۳۷ء کے بھی ۸ مہینے گزر چکے ہیں یہ کتاب مطبع میں جاتی ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ میری کتابیں دفتر کے ملازمین چھپواتے ہیں۔ اور مقررہ آدمی کاپیاں پڑھتے اور کتابت کی غلطیاں درست کرتے ہیں۔ مگر میری کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں کتابت کی اور طباعت کی بے شمار غلطیاں نہوں اس لئے میں نے چاہا کہ سی پارۂ دل کی اصلاح میں خود کروں۔ چنانچہ میں نے یہ کام شروع کیا۔ اور پورے ایک سال میں یہ کام ختم ہوا۔ اگر اتنے عرصہ میں کوئی اور کام نہ ہوتا اور میں نئے مضامین لکھتا تو شاید اس مجموعہ سے پانچ حصے زیادہ نئے مضامین لکھہ لیتا۔ مگر کام کی کثرت اور اکسٹھ برس کی عمر ہوجانے کے سبب اب مجھہ سے زیادہ کام بھی نہیں ہوسکتا۔ منشی قربان علی صاحب بسمل ایڈیٹر اردوئے معلی دہلی جو میری کتابوں کی طباعت اور اشاعت کے منتظم ہیں وہ ایک سال سے روزانہ تقاضے کرتے رہتے ہیں مگر مجھے فرصت نہیں ملتی آخر ایک برس کے بعد آج ۲۰ راگست یوم جمعہ وقت ۲ بجے شب کو یہ سب کاپیاں نظر ثانی سے فارغ ہوئیں اور میں نے ہر غلطی کو درست کردیا اور بعض مقامات پر عبارتیں بدل دیں جو مجھے ناموزوں معلوم ہوئیں تھیں۔

حسن نظامی

۲۰ راگست ۱۹۳۷ء۔ یوم جمعہ دھلی

Marfat.com

Marfat.com

سی پارۂ دل کا دوسرا حصہ

کانا باتی

حضرت خواجہ حسن نظامی کی

ریڈیو تقریریں

قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:- دفتر ہفتہ وار اخبار منادی - دہلی

مطبوعہ مرچنٹ پریس دہلی

سی پارۂ دل حصہ دوم

کانا باتی

خواجہ حسن نظامی کی ریڈیو تقریریں

Marfat.com

Marfat.com

کتاب کانا باقی

سی پارۂ دل کا دوسرا حصہ

مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کی وہ تقریریں جو دلی ریڈیو کے ذریعہ تمام دنیا کے کانوں نے سنیں

میں انسان۔ اللہ کی قدرت پر قربان۔ جس نے مجھے علم دیا اور عقل دی۔ اور میں نے اپنی عقل اور علم کے زور سے ریڈیو بنایا۔ اور ریڈیو کے کان میں (میکرفون میں) جو بات کہی وہ ساری دنیا نے سُن لی۔

جب میں دلی ریڈیو اسٹیشن کے ایک اکیلے کمرہ کے اندر کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں تو میرے منہ کے سامنے ہاتھ کی ہتھیلی کی برابر ایک جالی دار چیز لگا دیتے ہیں جس کے اندر میری آواز جاتی ہے۔ اور پھر تاروں کے ذریعہ اُس بجلی گھر میں پہنچتی ہے جہاں بجلی کی کلیں لگی ہوئی ہیں وہ کلیں بجلی کی لہروں کے پروں پر میری آواز کو بٹھا کر ساری دنیا میں پھیلا دیتی ہیں پہاڑوں میں۔ جنگلوں میں۔ دریاؤں میں۔ شہروں میں۔ ہر جگہ میری آواز جاتی ہے۔ میری آواز سورج کی دھوپ اور چاند کی چاندنی اور ہوا کی طرح ہر جگہ پہنچ جاتی ہے۔ بلکہ سورج کی دھوپ وہاں نہیں جاتی جہاں آڑ ہو۔ اور چاندنی بھی وہاں نہیں جاتی جہاں چاند سے حجاب ہو۔ اور ہوا بھی وہاں نہیں پہنچ سکتی جہاں روک ہو۔ مگر میری آواز کو کوئی پہاڑ کوئی دیوار اور کوئی ٹھوس چیز نہیں روک سکتی۔ اور میں عاجز بندہ حیران ہو کر کہتا ہوں کہ مجھے اپنے خالق خدا کی نسبت شک و شبہ ہوتا تھا کہ وہ ہر جگہ کیونکر ہو سکتا ہے کیونکہ وہ تو ایک ذات ہے اور جہاں وہ

Marfat.com

ذات ہے بس وہیں ہوتی ہوگی۔ ہر جگہ کیسے ہو سکتی ہے۔ مگر اپنی آواز کو ہر جگہ پہنچتا دیکھ کر مجھے مانا پڑتا ہے کہ خدا بھی ہر جگہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب اُس کے پیدا کئے ہوئے آدمی کی آواز اُس کی عقل اور حکمت کے زور سے ہر جگہ پہنچ سکتی ہے۔ تو خدا تو پھر آخر خدا ہے۔

مگر شرط یہ ہے کہ سُننے والوں کے پاس کان بھی ہوں۔ میں اگر نئی عقل والوں سے کہتا ہوں کہ "خدا کو ہر جگہ دیکھ سکتے ہو اگر تمہارے آنکھیں بھی ہوں۔ اور تم خدا کی آواز ہر جگہ سُن سکتے ہو اگر تمہارے پاس کان بھی ہوں" تو وہ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہمارے تو کان بھی ہیں۔ اور آنکھیں بھی ہیں۔ مگر خدا نہ دکھائی دیتا ہے۔ نہ اُس کی آواز سنائی دیتی ہے

میں بھی آج یہ کہہ سکتا ہوں کہ جس کے پاس ریڈیو مشین نہ ہو وہ میری آواز نہیں سُن سکتا۔ حالانکہ میری آواز ہر جگہ جاتی ہے۔ پس تمہاری آنکھ اور تمہارے کان جو خدا کو دیکھ سکیں اور خدا کی آواز سُن سکیں دل کی مشین کی صورت میں درکار ہیں۔ اپنے دل کو خدا کی طرف لگاؤ تو خدا کو دیکھ سکو گے۔ اور خدا کی آواز سُن سکو گے۔

میں نے دلی ریڈیو میں بہت سی تقریریں کی تھیں۔ اور اُن کو ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے لاکھوں آدمیوں نے سُنا تھا۔ یہاں تک کہ جب میں نے پہلی تقریر ریڈیو میں کی تو مجھے بخار چڑھا ہوا تھا۔ اِس تقریر کو سُن کر حیدرآباد سے ایک خط آیا کہ آپ کی آواز سے محسوس ہوتا تھا کہ شاید آپ کو بخار تھا۔

حیدرآباد دلی سے ایک ہزار میل دور ہے۔ تو گویا ایک ہزار میل کے فاصلہ پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے میری آواز کی نبض سے میرا بخار پہچان لیا۔ تو کیا میں دس بیس کروڑ میل دور بیٹھے ہوئے خدا کی مخفی مشینوں اور مرضیوں کو نہیں سمجھ سکتا؟

آج میں ریڈیو دہلی میں کی ہوئی اپنی تقریروں کو اِس کتاب میں جمع کرکے شائع کرتا ہوں جو غالباً سب نہیں ہیں۔ کیونکہ بعض تحریروں کو محفوظ نہ رکھا جا سکا تھا۔ تاہم جو تقریریں دستیاب ہو سکیں اُن کو دلی ریڈیو اسٹیشن کی اجازت سے شائع کیا جاتا ہے۔ چونکہ ان تقریروں کا معاوضہ

Marfat.com

ریڈیو اسٹیشن سے مجھے ملا تھا۔ اس واسطے اِن تقریروں کا پہلا حق دلی ریڈیو کا تھا۔ مگر قانوناً اِن تقریروں کا اصلی مالک میں ہی ہوں۔ کیونکہ جو معاوضہ مجھے دیا گیا اُس کی مقدار اتنی قلیل تھی۔ کہ اُس کو ریڈیو میں صرف ایک بار سنا دینے کا معاوضہ کہا جا سکتا ہے۔ تاہم میں نے شروع میں ہر تقریر کی اشاعت کی اجازت ریڈیو اسٹیشن سے حاصل کی تھی۔

یہ تقریریں اردو زبان کے ایک مخصوص طرزِ تحریر اور طرزِ تقریر کا نمونہ ہیں۔ قدرت نے میری آواز بھی ریڈیو کے لئے موزوں بنائی ہے۔ اور میرے بولنے کا طریقہ بھی قدرتاً ایسا ہے جو ناپسند نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ میں نے کبھی ریڈیو میں تقریر کرنے کے فن کو سیکھا نہ تھا۔ نہ کبھی کسی تقریر کی ریڈیو میں سنانے سے پہلے مشق کی تھی۔ بلکہ اتفاقاً اور قدرتاً میرا طرزِ تقریر ریڈیو کی شعاعوں کو پسند آگیا۔ اور سننے والے بھی پسند کرنے لگے۔ یہاں تک کہ بعض بولنے والوں نے جو ریڈیو میں تقریریں کیا کرتے ہیں۔ میرے طرزِ تقریر کی تقلید شروع کر دی۔

میں ایک پکا غیر مقلد ہوں۔ یعنی کبھی کسی تحریر اور تقریر میں کسی محرر اور کسی مقرر کی تقلید نہیں کیا کرتا۔ اور ریڈیو کی تقریروں میں بھی میں نے کسی کے لہجہ اور کسی کے طرز کی تقلید نہیں کی بلکہ ہمیشہ یہ کوشش کی کہ کسی دوسرے بولنے والے سے میرے طرزِ تقریر کی شباہت نہ ہونے پائے۔

البتہ مولانا آزاد دہلوی میرے معنوی اُستاد تھے۔ یعنی اُن کی تحریروں کو دیکھ دیکھ کر میں نے لکھنا سیکھا تھا۔ تو ریڈیو میں مولانا آزاد کے پوتے آغا محمد اشرف صاحب ایم۔ اے میرے معنوی ماسٹر کہے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ جب وہ ریڈیو میں اناؤنسر تھے تو اُن کا لہجہ اور طرز مجھے بہت پسند تھا۔ اِس لئے شاید اُن کے طرز نے مجھ پر کچھ اثر کیا ہو۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ میں نے تقلید اُن کی بھی نہیں کی۔

کانا باقی نام } میں مضامین کے عنوان اور کتابوں کے نام رکھنے میں کمال رکھتا ہوں۔ اگرچہ میرے بعض عنوان اور کتابوں کے نام چھچھورے کہے جاتے ہیں اور بھاری بھرکم اور باوقار لوگ ان کو وقعت سے نہیں دیکھتے۔ مگر میں اُن کی وقعت کرنے کا محتاج ہونا نہیں چاہتا وہ تجت

کریں یا نہ کریں۔ میں جس آنے والے زمانہ کے لئے یہ جدتیں کرتا ہوں وہ ان ہی چیزوں کی وقعت کرے گا۔ اور موٹے موٹے عربی فارسی کے لغت اُس کو پسند نہیں آئیں گے۔

پس میں نے اِس کتاب کا نام کانا باتی رکھ دیا۔ کیونکہ یہ تقریریں درحقیقت لاکھوں کانوں نے سُنی ہیں۔ اور لاکھوں کانوں کو سُنانے کے لئے ریڈیو والوں نے مجھ کو اپنے ہاں بُلا کر یہ تقریریں کرائی تھیں۔ اِس لئے ان کو **کانا باتی** کہا جا سکتا ہے۔

میرے مضامین کا ایک مجموعہ بیس سال پہلے **سی پارۂ دِل** کے نام سے شائع ہوا تھا جو اَب بعض یونی ورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ اب یہ مجموعہ "سی پارۂ دل" کے دوسرے حصہ کی صورت میں شائع کیا جاتا ہے۔

میں نے ریڈیو سب سے پہلے مولوی میر محبوب علی صاحب خلف نواب اعظم یار جنگ بہادر کے ہاں دیکھا تھا۔ جس کو پندرہ سال کا عرصہ ہوا۔ پھر جب حیدر آباد میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو مولوی میر محبوب علی صاحب اُس کے منتظم مقرر ہوئے۔ اور میں نے اپنی زندگی میں پہلی دو تقریریں اِسی حیدر آبادی اسٹیشن میں کی تھیں۔ اُس وقت دہلی میں اسٹیشن قائم بھی نہیں ہوا تھا۔ اِس کے بعد جب دہلی میں اسٹیشن بن گیا تو یہاں پہلی تقریر گل بانو کی کہانی ہوئی تھی۔ یہ ظاہر کر دینے کے بعد یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ میں نے اِن تقریروں کی ترتیب میں مقدم و مؤخر کا خیال نہیں کیا۔ کیونکہ پڑھنے والوں کو مضمون درکار ہوتے ہیں۔ وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ پہلی تقریر کون سی ہوئی۔ اور اُس کے بعد کون کون سی ہوئیں۔

اس کے علاوہ یہ تقریریں جن اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئی تھیں وہ مسلسل نہیں ملے تھے۔ اِس لئے ترتیب نہ ہو سکی۔ آئندہ ایڈیشن میں مرتب کر دی جائیں گی۔

حسن نظامی دہلوی

جون ۱۹۳۷ء

Marfat.com

گُل بانو کی کہانی کی تمہید

۲ دسمبر ۱۹۳۵ء کی شام کو میں نے دہلی ریڈیو میں دنیا کو دہلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ کی پوتی گُل بانو کا قصہ سُنانے کا وعدہ کیا تھا۔ اِس شام مجھے ایک سو تین ڈگری بخار تھا۔ مگر وعدہ کی پابندی کے خیال سے میں گھر سے چلا۔ اور دس میل کا سفر کر کے ریڈیو اسٹیشن میں پہنچا۔ اور تقریر کی۔ بعد میں معلوم ہوا۔ کہ ریڈیو مشین خراب ہو جانے کے سبب کہانی پوری نہیں سُنی گئی۔ اِس لئے آج لکھ کر سُنانے آیا ہوں۔

پہلی رات جب میں یہاں آیا۔ تو بخار کے سبب راستہ میں ایسا معلوم ہوا۔ کہ دُنیا کے اونچے اونچے پہاڑ اور بڑے بڑے سمندر اور آسمان پر پانچویں رات کا چاند میری کہانی سُننے کے مشتاق ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ انسان تو گانے اور باجے کا شوق رکھتے ہیں۔ مصیبت کی کہانیوں کو وہ نہیں ہم سُننا چاہتے ہیں۔

پہاڑوں نے کہا "ہم بہت اونچے ہیں۔ اور ہم نے سُنا تھا کہ چنگیز اور تیمور کی اولاد بھی اونچا ہونے کا دعویٰ کرتی تھی۔ آج اس دعوے کا انجام سُننا ہے۔ تاکہ ہم بھی اونچا ہونے کا گھمنڈ ترک کر دیں۔ اگر یہ معلوم ہو کہ چنگیزی اور تیموری پست اور نیست ہو گئے۔"

سمندروں نے کہا "ہم بہت بڑے ہیں۔ زمین سے بھی زیادہ۔ لیکن سُنا تھا۔ کہ مغلوں کی شان بھی بہت بڑی تھی۔ اگرچہ اُن کا جہاز ڈوب گیا۔ مگر ہم نے اُس کا ڈوبنا نہ دیکھا کیونکہ اُن کا سفینہ کنارہ پر ڈوبا تھا۔ آج معلوم کرنا ہے۔ کہ کیا بڑے بول کا سر نیچا ہوتا ہے۔"

چاند نے کہا "مجھے بھی شاہجہاں اور محمد شاہ رنگیلے کی پوتی کا قصہ سُننا ہے۔ کیونکہ لال قلعہ میں شاہجہاں اور محمد شاہ نے مہتابی جشن بہت خوب کئے تھے۔ اور میری

Marfat.com

چاندنی نے کبھی ایسی بہار نہ دیکھی تھی۔ آج سُنوں گا کہ اِن جشن منانے والوں کا چراغ کیونکر بُجھا اور گُل ہوا ہے تاکہ میں بھی اپنی چمک دمک کا غرور نہ کروں۔ اور چار دِن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات' پر غور کیا کروں۔

جب میری موٹر لال قلعہ کے پاس سے گزری تو اُس کی زبان حال بھی میرے کان میں آئی اور اُس نے کہا " کہ تم وائرلیس میں کہانی کہو گے۔ میرے اندر بھی چار کھمبے وائرلیس کے ہیں۔ گُل بانو میرے ہی اندر پیدا ہوئی۔ پلی اور بڑی ہوئی تھی۔ اب وہ کہاں ہے ہمیہ معلوم کرتے آنا۔

جب میں کہانی کہہ کر گھر میں آیا تو سُنا۔ کہ آدمی کہانی سُنی تھی کہ نئی دہلی کی بجلی آہ اور اُف کہہ کر آف ہو گئی۔ اور گُل بانو کے غم میں بجھ گئی۔ میں نے کہا: ماجرا ہی ایسا تھا۔ کہ ریڈیو مشین اور دہلی کا برقی کرنٹ اُس کو برداشت نہ کر سکے۔ مگر دیکھو اِس آدمی کو کہ سب کچھ برداشت کر لیتا ہے اور دوبارہ سُننا چاہتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ کہ حسن نظامی کو دوبارہ بلاؤ۔

آج پھر آیا ہوں۔ اور پھر اِس دردبھرے قصہ کو دُہراتا ہوں۔ سُننے والے دل لگا کر سُنیں۔

گُل بانو کی داستان

شہزادہ مرزا دارا بخت بہادر شاہ کے پہلے ولی عہد تھے۔ جو ۱۸۴۹ء میں غدر ۱۸۵۷ء سے آٹھ برس پہلے مر گئے تھے۔ اُن کی ایک لڑکی گُل بانو تھی جو ڈومنی کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ اور بہت خوبصورت تھی۔ یہ قصہ اُسی گُل بانو کا ہے۔ جو غدر ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں سے برباد ہو کر اپنے باپ کی قبر پر چلی گئی جو درگاہ چراغ دہلی رضؒ میں تھی یہ درگاہ نئی دہلی سے جنوب میں تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور اسی درگاہ میں نمونیہ کی

Marfat.com

بیماری سے مرگئی - اور وہیں دفن ہوئی - اب اُس کا قصہ سنیئے جو بالکل سچا واقعہ ہے -

گُل بانو خدا رکھے پندرہ برس کی ہوئیں - جوانی کی راتوں نے گود میں لینا شروع کیا - مرادوں کے دن پہلو میں گدگدیاں کرنے لگے - یہ مرزا دارا بخت بہادر ولی عہد اول بہادر شاہ کی نورِ چشم ہیں - باپ نے اِن کو بڑے چاؤ اور چوچلے سے پالا ہے - اور جس دن سے وہ دنیا کو چھوڑ کر قبر میں گئے محل میں گُل بانو کی ناز برداریاں پہلے سے بھی زیادہ ہونے لگیں - اماں کہتیں نگوڑی کے ننھے سے دِل کو باپ کے مرنے کا بہت صدمہ پہنچا ہے - باپ کا ٹہر کا نہ کرے - اِس کی ایسی دل داری کرو کہ اُن کی محبتوں کو بھول جائے -

اُدھر دادا یعنی بہادر شاہ بادشاہ کا یہ عالم تھا - کہ پوتی کے لاڈ پیار میں کسی بات کی کمی نہیں ہونے دیتے تھے - جو مانگتی تھی دیتے تھے - جو چاہتی تھی فوراً پورا کراتے تھے - اور شاہی محلوں میں گُل بانو کی دھوم تھی - کہ جہاں پناہ سب سے زیادہ گُل بانو کو چاہتے ہیں - اور اُس کے سامنے اپنی محبوب ملکہ زینت محل کے لڑکے جواں بخت بہادر کی اُلفت کو بھی بھول گئے ہیں -

پس ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ گُل بانو کس شان اور کس شوکت اور کیسے آرام اور کتنے عیش سے زندگی بسر کرتی ہوں گی - اور اُن کو ساری دنیا اپنی لونڈی معلوم ہوتی ہوگی -

اگرچہ مرزا دارا بخت مرحوم کے اور بھی کئی بچے تھے - مگر گُل بانو اور اُس کی والدہ سے تو اُن کو عشق تھا - گُل بانو کی ماں ایک ڈومنی تھی - مگر مرزا اُس کو تمام بیگمات سے زیادہ چاہتے تھے -

جب مرزا دارا بخت کا انتقال ہوا تو گُل بانو ۱۲ سال کی تھی - اور ہر مہینہ کی نوچندی جمعرات کو اپنی ماں کے ساتھ درگاہ حضرت چراغ دہلی میں اپنے باپ کی قبر پر جایا

کرتی تھی - وہاں باتی تو باپ کی قبر کو لپٹ جاتی اور خوب رُوتی - اور کہتی - ابّا حضرت آپ کہاں چلے گئے؟ ہم کو بھی اپنے پاس بلا لیجئے - ہم بھی آپ کے پاس لیٹیں گے - ہم آپ کو روز یاد کرتے ہیں - اور ہمارا دل آپ کے بغیر گھر میں نہیں لگتا - ماں کہتی - بیٹی! دور پار - دشمن مدعی - ایسی بات نہیں کہا کرتے - نوج - خدا کرے جو تم ابّا کے پاس جاؤ - ابھی تم نے دُنیا کا دیکھا ہی کیا ہے - میرے اندھیرے گھر کا بس تم ہی ایک چراغ ہو - ایسی بد فالی کی باتیں زبان سے نہ نکالو - میرا دل ہلا جاتا ہے - خدا تمہارے سہرے کی گھڑی دکھائے - پھلو - پھولو - شاد رہو - آباد رہو - ابّا حضرت بہشت میں ہیں - اور بہشت کی کھڑکی سے تمہیں دیکھ رہے ہیں - تم جی ہلکا نہ کرو - وہ بھی تم کو بھولے نہیں ہیں - اور ہمیشہ تم کو یاد کرتے ہیں - جنت کے اندر تمہارے لال قلعہ اور اُس کے باغ سے بھی اچھے محل اور باغ ہیں -

گل بانو کہتی - تو اچھا بولتے کیوں نہیں؟ ہم سے بات کیوں نہیں کرتے؟ کیا انہوں نے قبر کے اندر کسی اور کو بیٹی بنا لیا ہے؟ یا جنت کی کسی حور کی لڑکی اُن کی بیٹی بن گئی ہے؟

جوانی اور محبت گل بانو نے پندرھویں سال میں قدم رکھا - تو شباب نے بچپن کی ضد اور شرارتیں تو رخصت کر دیں - مگر دل ربائی کی شوخیاں اس قدر بڑھا دیں - کہ محل کا بچہ بچہ گل بانو سے پناہ مانگتا تھا -

گل بانو سنہری چھپر کھٹ میں دوشالہ تانے سویا کرتی تھیں - شام کو چراغ جلے اور بانو کو نیند آئی - اور سیدھی چھپر کھٹ میں پہنچیں - ماں کہتی "چراغ میں بتی پڑی - لاڈو پلنگ چڑھی" تو گل بانو مسکراتی - اور جمائی لے کر سر کے بکھرے ہوئے بالوں کو ماتھے سے سمیٹ کر کہتی - اچھا بی تم کو کیا؟ سوتے ہیں وقت کھوتے ہیں - تمہارا کیا بیتے ہیں تم ناحق کونوں پر لوٹی جاتی ہو -

ماں کہتی "نابو - میں جلتی نہیں - شوق سے آرام کرو - خدا تم کو ہمیشہ سُکھ کی نیند

Marfat.com

سُلا مارکھے - میرا مطلب تو یہ تھا - کہ زیادہ سُونا آدمی کو بیمار کر دیتا ہے تم شام کو جلدی سُو جاتی ہو تو صبح ذرا جلدی اٹھا کرو - مگر تمہارا تو یہ حال ہے کہ دس بج جاتے ہیں گھر میں دھوپ پھیل جاتی ہے - لونڈیاں ڈر کے مارے بات تک نہیں کر سکتیں کہ بانو کی آنکھ کھل جائے گی - ایسا بھی کیا سُونا - آدمی کو کچھ گھر کا کام بھی دیکھنا چاہیے - اب ماشاءاللہ تم جوان ہو گئیں - پرائے گھر جانا ہے - اگر یہی عادت رہی تو وہاں کیونکر گزارہ ہو گا؟

گُل بانو! ماں کی یہ باتیں سُن کر بگڑتی - اور کہتی " تم کو ان باتوں کے سوا کچھ اور بھی کہنا آتا ہے - ہم سے نہ بولا کرو - تمہیں ہم دوبھر ہو گئے ہیں تو صاف صاف کہدو - ہم اپنے دادا حضرت (بہادر شاہ) کے پاس جا رہیں گے - اُن کو ہم دوبھر نہیں ہیں - وہ تو ہم کو اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتے ہیں - اور ہم کو ہاتھوں چھاؤں رکھتے ہیں - اتنا پیار تو وہ کسی سے بھی نہیں کرتے - کل چچا جواں بخت کو ہٹا کر مجھے پاس بٹھا لیا تھا -

ماں کہتی - بیٹی ناحق بگڑتی ہو - تمہارے ہی بھلے کی بات کہی تھی - بے شک تمہارے دادا حضرت تم کو بہت چاہتے ہیں - مگر میں بھی تمہاری ماں ہوں - مجھ سے زیادہ تمہارا چاہنے والا کوئی نہیں ہو سکتا -

محبت } اُسی زمانہ کا ذکر ہے کہ مرزا داور شکوہ شہزادہ خضر سلطان کے بیٹے گُل بانو کے پاس آنے جانے لگے - لال قلعہ دہلی کے شاہی خاندان میں باہمی پردہ کا دستور نہ تھا یعنی شاہی خاندان کے آدمی آپس میں پردہ نہ کرتے تھے - اِس واسطے مرزا داور بے روک ٹوک گُل بانو کے گھر میں آتے جاتے تھے - اور گُل بانو اُن سے پردہ نہ کرتی تھیں -

پہلے تو گُل بانو اُن کی بہن اور مرزا داور اُن کے چچا زاد بھائی تھے - اور چچا تایا کے دو بچے سمجھے جاتے تھے - لیکن بعد میں عشق نے ایک اور رشتہ پیدا کیا - مرزا داور گُل بانو کو کچھ اور سمجھتے تھے - اور گُل بانو داور کو اِس قرابت کے سوا کسی اور رشتہ کی نظر سے دیکھتی تھیں -

Marfat.com

ایک دن کا ذکر ہے۔ صبح کے وقت مرزا داور گُل بانو کے پاس آئے تو دیکھا کہ بانو کالا دوشالہ اوڑھے سنہری چھپر کھٹ میں سفید پھولوں کی سیج پر پاؤں پھیلائے بے خبر پڑی سوتی ہیں۔ منہ کھلا ہوا ہے۔ اپنے ہی بازو پر سر رکھا ہوا ہے۔ تکیہ الگ پڑا ہے۔ دو لونڈیاں پاس کھڑی مکھیاں اڑا رہی ہیں۔

داور شکوہ گُل بانو کی ماں یعنی اپنی چچی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ مگر کن انکھیوں سے گُل بانو کا یہ عالم مخموری و بے خودی دیکھتے جاتے تھے۔ آخر نہ رہا گیا۔ اور بولے: کیوں چچی حضرت! بانو اتنے دن چڑھے تک سوتی رہتی ہیں۔ دھوپ قریب آگئی۔ اب تو ان کو جگا دینا چاہیے۔

چچی نے جواب دیا: بیٹا کیا بتاؤں تم بانو کے مزاج کو جانتے ہو۔ کس کی شامت آئی ہے جو اُن کو جگائے۔ آفت برپا ہو جائے گی۔ ہر ماما اصیل کوڑے کھائے گی۔

مرزا داور نے کہا: دیکھیے میں جگاتا ہوں۔ دیکھوں کیا کرتی ہیں؟ چچی ہنس کر کہنے لگیں: جگا دو۔ تم سے کیا کہیں گی۔ تمہارا تو بہت لحاظ کرتی ہیں۔ داور نے گُل بانو کے چھپر کھٹ کے پاس جا کر گُل بانو کے تلوے میں گدگدیاں کیں۔ بانو نے انگڑائی لے کر پاؤں سمیٹ لیا۔ اور بے اختیار آنکھیں کھول کر نگاہِ طیش سے پائنتی کی طرف دیکھا۔ اُن کو خیال تھا۔ کہ ان کی کسی لونڈی نے یہ شرارت کی ہے۔ اس کو گستاخی کی سزا دینی چاہیے۔

مگر جب اُنھوں نے ایسے شخص کو سامنے کھڑا دیکھا جس سے خود بخود اُن کا دل محبت کرتا تھا تو شرم سے اُنھوں نے دوشالہ کا آنچل اپنے چہرہ پر ڈال لیا۔ اور گھبرا کر اُٹھ بیٹھیں۔

داور نے اس ہوش ربا منظر کو دل تھام کر دیکھا اور بے اختیار ہو کر کہنے لگے۔ لو چچی حضرت میں نے بانو کو اٹھا بٹھایا۔

Marfat.com

آخر محبت نے اتنی ترقی کی کہ قلعہ میں چرچے ہونے لگے تو گل بانو کی ماں نے مرزا داور شکوہ کا اپنے گھر آنا بند کرا دیا۔ اور اس روک ٹوک کے سبب ان دونوں کے جذبات محبت بہت بڑھ گئے۔

غدر کے نو مہینے بعد | گل بانو اور مرزا داور کے ہجر و فراق کا زمانہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ مرزا خضر سلطان اور ان کے بیٹے مرزا داور اور بادشاہ وغیرہ لال قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرہ میں چلے گئے۔ بادشاہ وہاں سے لال قلعہ میں لائے گئے۔ اور مرزا خضر سلطان اور ان کے بھائی بیٹے دہلی کے موجودہ جیل خانہ کے سامنے باغی فوج کی سرداری کے جرم میں قتل کئے گئے۔ اور گل بانو کی ماں دہلی فتح ہونے سے پہلے ہیضہ کر کے مر گئیں اور گل بانو جنگلوں میں ماری ماری پھرتی رہیں۔ آخر بے کسی اور بے وارثی کی حالت میں درگاہ حضرت چراغ دہلیؒ میں آئیں جہاں ان کے باپ مرزا دارابخت کی قبر تھی۔

درگاہ حضرت چراغ دہلیؒ کے ایک کونہ میں ایک قبول صورت عورت پھٹا ہوا کمبل اوڑھے رات کے وقت خاک کے بستر پر پڑی ہوئی ہائے ہائے کر رہی تھی۔ سردی کے موسم کی بارش زور شور سے ہو رہی تھی۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے بارش کی بوچھاڑ اس جگہ کو تر کر رہی تھی جہاں یہ عورت نمونیہ کے سخت بخار میں بے ہوش لیٹی تھی۔

پسلی کا درد۔ بخار اور سردی اور گرم لباس کا نہ ہونا۔ اور گیلی زمین پر بغیر کسی بچھونے کے لیٹنا اس عورت کے لئے قیامت سے کم نہ تھا۔ آخر بخار کی بے ہوشی میں اس عورت نے آواز دی۔ گل بدن۔ اری او گل بدن۔ مردار مر گئی۔ جلدی آ۔ مجھے دوشالہ اوڑھا دے۔ دیکھ بوچھاڑ اندر آتی ہے پردہ چھوڑ دے۔ نہیں آتی۔ گل بدن نہیں آتی۔

پھر بولی۔ روشنک تو ہی آ۔ گل بدن تو کہیں غارت ہو گئی۔ میرے پاس کوئلوں کی انگیٹھی لا۔ پسلی پر تیل مل۔ ارے درد سے میرا سانس رکا جاتا ہے۔ جب کوئی بھی یہ آواز سن کر عورت کے پاس نہ آیا تو اس نے کمبل چہرہ سے ہٹایا اور چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرے دالان میں خاک کے بچھونے پر اکیلی پڑی تھی چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا مینہ سناٹے سے برس رہا تھا۔ بجلی چمکتی تھی

Marfat.com

تو ایک سفید قبر کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ جو اُس کے باپ کی قبر تھی۔ یہ حالت دیکھ کر اُس عورت نے ایک آہ کا نعرہ مارا۔ اور کہا۔ بابا میں تمہاری گُل بانو ہوں۔ دیکھو اکیلی ہوں۔ اٹھو مجھے بخار ہے۔ ہائے میری پسلی میں درد بھی ہے۔ اور مجھے سردی بھی لگ رہی ہے۔ اور میرے پاس سوائے اِس بوسیدہ کمبل کے اوڑھنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ میری امّاں کہاں ہیں؟ وہ بھی قبر میں جا سوئیں۔ میں شاہی محلوں سے جلاوطن ہو گئی۔ بابا۔ بابا۔ آج میں پھر کہتی ہوں کہ اپنی قبر میں مجھے بلالو۔ آج امّاں نہیں ہیں جو مجھے بدشگونی کی بات سے روکیں گی۔ ابا۔ مجھے اِس اندھیرے میں بادل کی کڑک اور بجلی کی چمک سے ڈر لگتا ہے۔ کفن سے منہ نکالو اور مجھے دیکھو۔ میں نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا۔ میرے بدن میں اس گیلی زمین کے کنکر چبھتے ہیں۔ میں اینٹ پر سر رکھے لیٹی ہوں۔ میرا چھپر کھٹ کیا ہوا؟ میرا دوشالہ کہاں گیا؟ میری پھولوں کی سیج کہاں چلی گئی؟ ابّا ابّا۔ اُٹھو جی۔ کب تک سوؤ گے تم بھی چلے گئے۔ اماں بھی چلی گئیں۔ دادا بھی قید ہو گئے۔ شاہی کا چراغ بھی گُل ہو گیا۔ نہ محل رہے۔ نہ شال دوشالے رہے نہ لونڈی غلام رہے۔ کون سُنے میرا یہ حال؟ کون دیکھے میرا یہ انقلاب؟ کس کو یقین آئے گا کہ شہنشاہ ہندوستان کی پوتی یوں گیلی خاک پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مری ہو گی۔ کون مانے گا کہ اِس دنیا کے عیش و آرام کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کس سے کہوں۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ کہ یہ دُنیا جی لگانے اور گھمنڈ اور غرور کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ آج جو بچے ماں باپ کی محبت اور لاڈ سے خوش ہیں۔ اور ذاتی لیاقت پیدا کرنے سے غافل ہیں وہ ذرا میرا حال دیکھیں کہ میں اپنی ماں کی نصیحت سے بگڑتی تھی۔ اور یہ وقت میرے خواب و خیال میں بھی نہ آتا تھا۔ آہ آہ

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

یہ کہتے کہتے بے چاری گُل بانو مر گئی۔ اور صبح درگاہ والوں نے اُس کو اُس کے باپ کے پہلو میں دفن کر دیا۔ (یہ کہانی گراموفون ریکارڈ میں بھی بھری گئی ہے۔ حسن نظامی)

آسمان کی آوازیں

ریڈیو کے ذریعہ بیربل سے بات چیت

(جنوری ۱۹۳۶ء میں نشر ہوئی۔)

جب گراموفون اور سینما کے موجد مسٹر ایڈیسن کی روح آسمان پر گئی اور دنیا کی زندگی موت کے فرشتہ نے مسٹر ایڈیسن سے چھین لی۔ اور روح کو خدا کے سامنے پیش کیا گیا تو مسٹر ایڈیسن کی روح نے خدا سے کہا۔ اے خدا میں نے تیری مخلوق کو خوش کرنے کے لئے دنیا میں بہت سی ایجادیں کی تھیں۔ جن سے تیری مخلوق فرحت اور عیش کی زندگی بسر کر رہی ہے پس آج مجھے اس جرم میں کہ روپیہ جمع کرنے کے لئے ایجادیں کرتا تھا تنہائی کی قید میں نہ ڈال اور میری خدمت خلق کے سبب مجھ کو ارواح کی سوسائٹی سے ملنے کی اجازت مرحمت فرما۔

عرش اعظم کے عرض بیگی فرشتہ نے خدا کے حکم سے مسٹر ایڈیسن کی روح کو یہ جواب دیا" اے ایڈیسن تیری عرض داشت الٰہی سرکار نے سُنی۔ اور وہ تجھ پر رحم کر کے حکم دیتی ہے۔ کہ جا۔ اے گورے بندہ تجھ کو سب روحوں سے ملنے کی اجازت ہے۔

ایڈیسن نے خوش ہو کر کہا۔ تھینکیو مائی ڈیر گاڈ۔ میں تیرا بہت ہی شکر گزار ہوں۔ اے خدا اگر میری چیک بک یہاں ہوتی تو میں ایک چیک تیرے غریب بندوں کی مدد کے لئے ابھی اس شکرانہ میں لکھ دیتا۔" پھر کہا" اے خدا مجھے اس کی بھی اجازت دے کہ تیری دی ہوئی قوت سائنس سے یہاں بھی کام لوں۔ اور یہاں کی رہنے والی ارواح کی دنیا کے رہنے والوں سے باتیں کراؤں۔

عرض بیگی فرشتہ نے جواب دیا۔ تجھ کو کامل آزادی نہیں مل سکتی۔ کیونکہ ابھی تو اس قابل نہیں ہے۔ صرف پندرہ منٹ کی اجازت دی جاتی ہے کہ تو راجہ بیربل سے حسن نظامی کی بات کرا دے۔ اس حکم کے بموجب مسٹر ایڈیسن نے راجہ بیربل کی روح کا

حسن نظامی کے گوشِ تصور سے ملان کردیا۔ اور حسن نظامی دہلوی نے سناکر راجہ بیربل کی روح کہہ رہی ہے۔

میں ہوں راجہ بیربل شہنشاہ اکبر کا مصاحب خاص۔ آسمان کے عالم ارواح سے بول رہا ہوں۔ کیا تم حسن نظامی ہو؟

حسن نظامی نے جواب دیا۔

ہاں راجہ جی میں حسن نظامی ہوں۔ تمہارا کیا حال ہے؟ اور تمہارے بادشاہ اکبر کیسے ہیں؟

راجہ بیربل نے جواب دیا۔

میں اچھا ہوں۔ مجھے سرحدی پہاڑوں کے وحشیوں نے قتل کردیا تھا۔ اس وقت سے یہاں ہوں شہنشاہ اکبر بھی یہاں ہیں اور اچھے ہیں۔ اور ابوالفضل اور فیضی بھی اُن کے پاس ہیں۔ نواب خان خاناں بھی۔ اور بدایوں سے ملا عبدالقادر مورخ بھی یہاں آگئے ہیں

حسن نظامی نے پوچھا۔

آسمان کے عالم ارواح میں تم لوگ کیا کرتے ہو۔

راجہ بیربل نے جواب دیا۔

ہمارے بادشاہ کو خدمتِ خلق کے سبب اچھی جگہ مل گئی ہے۔ اور ہم بھی اُنہی کے پاس رہتے ہیں۔ ملا عبدالقادر بادشاہ کو تاریخ سناتے ہیں۔ کئی روز سے مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب دربار اکبری' پڑھی جارہی ہے۔ اور ظل جہاں پناہ اس کی لاجواب عبارت کی بہت قدر کرتے ہیں۔

حسن نظامی نے دریافت کیا۔

تم وہاں کیا کھاتے ہو؟ اور کیا پہنتے ہو۔ اور کہاں رہتے ہو؟

راجہ بیربل نے جواب دیا۔

Marfat.com

نئی دہلی کے امپیریل ہوٹل سے کھانا آجاتا ہے۔ گاندھی بھنڈار دہلی سے کھدر کے کپڑے آجاتے ہیں۔ مگر ملا عبدالقادر نہ وہ کھانا کھاتے ہیں نہ کپڑے پہنتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ ہوٹل کا کھانا حرام ہے۔ اور کھدر کے کپڑے بھی نہیں پہنتے۔ اُن کو ستر حوریں ملی ہیں۔ وہ اُن کے لئے جاپانی ریشم کے کپڑے سی دیتی ہیں۔

راجہ بیربل نے پوچھا۔

وقت کم ہے۔ فرشتہ پاس کھڑا ہے۔ پندرہ منٹ سے زیادہ بولنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس واسطے اِس سوال کا جلدی جواب دینا۔ کہ میری نسبت اور میرے بادشاہ کی بابت ہندوستان کی عام رائے کیا ہے؟

حسن نظامی نے جواب دیا۔

تمہارے لطیفے گھر گھر مشہور ہیں۔ اور تم کو ہندو مسلمان دونوں جانتے ہیں۔ اور تمہارے بادشاہ اکبر کی بھی ہر شخص تعریف کرتا ہے۔ تم ملا عبدالقادر صاحب سے کچھ ناراض معلوم ہوتے ہو۔ مگر انہوں نے تم سب کے کارنامے تاریخ لکھ کر زندہ کر دیئے ہیں۔ اور ابوالفضل کی آئین اکبری اور مولانا آزاد کی دربار اکبری نے اکبری حکومت کو آئینہ میں دکھا دیا ہے۔ اور ہم سب زندہ آدمی تم سب مرنے والوں کو بہت لائق اور بہت عقلمند سمجھتے ہیں اور تمہارے طرز حکومت سے سبق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر تم زمین پر زندہ ہوتے تو ہم تم کو اسمبلی کا ممبر بناتے۔ اور تمہارے الکشن کے لئے خوب کوشش کرتے۔

راجہ بیربل نے پوچھا۔

اسمبلی کیا چیز ہے؟ اور الکشن کیا ہوتا ہے؟ اور ممبری کس کو کہتے ہیں؟

حسن نظامی نے جواب دیا۔

ہندوستانی قوموں کی طرف سے کچھ آدمی منتخب ہو کر ایک مکان میں جمع ہوتے ہیں۔ اور حکومت کرنے کے طریقوں اور رعایا کی ضرورتوں پر مشورے کرتے ہیں۔ اور اُن کے لئے

Marfat.com

قانون بناتے ہیں۔ اِس کو اسمبلی کہتے ہیں۔ اور طریقہ انتخاب کا نام الکشن ہے۔ اور منتخب ہونے والے کو ممبر کہا جاتا ہے۔

اگر تم الکشن کے لئے کھڑے ہوتے تو ہم تمہارے واسطے ووٹ حاصل کرنے کے لئے رعایا سے کہتے "کہ یہ راجہ بیربل ہیں۔ شہنشاہ اکبر کے مصاحب خاص۔ اِن کو ووٹ دو" تو بے تمیز نوجوان جواب دیتے "اِن میں لیاقت کتنی ہے؟ بادشاہ کا مصاحب ہونا کوئی چیز نہیں ہے؟ ہمارے فائدہ کے لئے یہ کیا کام کر سکتے ہیں؟ وہ بتاؤ۔ یہ بات سُنکر راجہ بیربل نے کہا۔

تو کیا ہندوستان کے نوجوان اتنے خود سر اور بے باک ہو گئے ہیں۔ کہ ملک کے بڑے آدمیوں کی نسبت ایسی گستاخانہ باتیں کرتے ہیں؟

حسن نظامی نے جواب دیا۔

یہ گستاخی نہیں رائے کی آزادی ہے۔ جب حکومت خلقت کے فائدہ کے لئے ہوتی ہے تو خلقت کو اپنے نفع نقصان پر غور کرنے اور اظہار خیال کرنے کی اجازت ملنی ضروری ہے۔

راجہ بیربل نے کہا۔

کچھ دنوں سے ہوائی جہاز ہمارے گھر کے پاس سے گزرا کرتے ہیں۔ مگر اُن کے اندر والے ہم کو دیکھ نہیں سکتے۔ ایڈیسن صاحب کہتے تھے۔ کہ میں بجلی کے زور سے اپنے مکانوں کے پردے ہٹا دوں گا۔ اور ہوائی جہاز والے ہم کو دیکھ سکیں گے۔ جیسے کہ ہم اُن کو دیکھ سکتے ہیں جب یہ انتظام ہو جائے تو تم لالہ سری رام کے گھر سے کچھ پوریاں، کچھ اچار اور تھوڑا سا سونٹھ پانی بھیجدینا۔ کیونکہ بہت دن ہوئے کہ دیسی کھانا ہم نے نہیں کھایا۔ اور ملا عبدالقادر کے لئے پلاؤ، زردہ اور قورمہ شیرمال بھی بھیجدینا۔ کیونکہ وہ آج کل امپیریل ہوٹل دہلی کا کھانا نہ کھانے کے سبب جنت سے ایک پیالہ دودھ کا اور ایک پیالہ شہد کا منگا کر استعمال کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس غذا سے جی اُکتا گیا ہے۔

Marfat.com

حسن نظامی نے کہا۔

بہشت میں بھی پلاؤ زردہ کا انتظام ہو سکتا ہے۔ حوریں پکا دیں گی۔ مگر اِس کا جواب راجہ جی نے یہ دیا۔ کہ پندرہ منٹ ہو چکے ہیں۔ فرشتہ کہتا ہے کہ بات ختم کرو۔ اِس لئے اب میں جاتا ہوں۔

نوٹ:- یہ کہانی دراصل الکشن کی خرابیوں کے خلاف تھی۔ جس کو ریڈیو کے محکمہ نے منظور نہیں کیا تھا۔ اور میں نے الکشن والہ قصہ اس تقریر سے خارج کر دیا تھا۔ مگر میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر رسالہ ہمایوں لاہور نے اِس تقریر کو مکمل اپنے رسالہ ہمایوں میں نہایت اہتمام سے چھاپا تھا۔ اہتمام سے مراد یہ ہے کہ میاں صاحب نے اِس مضمون کو باتصویر بنا دیا تھا۔ اور میرے ہر خیال اور بیان کی تصویریں بھی بنوا کر مضمون کے ساتھ شائع کی تھیں۔ اور اس کا انگریزی ترجمہ کسی شخص نے سر فرینک نائس ممبر انڈسٹری اور سر ہنری کریک ہوم ممبر گورنمنٹ ہند کو بھیجا تھا۔ اور اُن دونوں نے اس تقریر کو بہت پسند کیا تھا۔ یہاں تک کہ اِن دونوں نے ایک پارٹی میں مجھ سے خواہش کی تھی۔ کہ میں اردو میں اُن کو اپنی زبان سے وہ تقریر سناؤں۔ چنانچہ میں نے اُن کو زبانی یہ تقریر سنائی تھی۔

اِس کتاب کے آخر میں رسالہ ہمایوں سے وہ تقریر نقل کر کے درج کر دی جائے گی تاکہ ناظرین اُس سے لطف حاصل کر سکیں۔ مگر رسالہ ہمایوں میں شائع ہونے کے بعد میں نے اس تقریر میں اور بھی بہت سے اضافے کئے ہیں اور یہ تقریر مجھے حفظ ہو گئی ہے جو میں نے ہندوستان کے بہت سے شہروں میں بڑے بڑے علمی حلقوں میں زبانی سنائی اور ہر شخص نے اس کو بہت پسند کیا جس سے ظاہر ہوا کہ سارا ملک الکشن کی موجودہ خرابیوں اور کش مکش سے بے زار ہے۔

ناظرین کتاب ہذا ہمایوں والہ مضمون کو ذرا توجہ سے پڑھیں اور اس کے بعد اُس مضمون کو بھی دیکھیں جو ہمایوں میں شائع ہونے کے بعد چند اضافوں کے ساتھ میں نے تیار کیا تھا۔ حسن نظامی

Marfat.com

ہمزاد اور روح

یہ تقریر یکم مئی ۱۹۳۶ء کی شام کو ساڑھے آٹھ بجے دہلی ریڈیو میں نشر کی گئی

۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء کی شام کو پانچ قصے جنات اور بھوتوں کے میں نے سنائے تھے۔ ان کو سنکر عجیب و غریب خط میرے پاس آئے۔ ایک صاحب نے لکھا۔ میں تو جنات کا قائل نہ تھا۔ آپ کہتے ہیں تو مجبوراً مان لوں گا۔ ورنہ کجا یہ روشن زمانہ۔ اور کجا عقل کے خلاف یہ باتیں؟

لہذا آج کے قصے سنانے سے پہلے مجھے شک اور انکار کرنے والوں سے یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنات اور بھوتوں کا انکار اس واسطے کرتے ہیں کہ آنکھوں دیکھی دلیل ان کے پاس نہیں ہے۔ میں ان کے جواب میں کہتا ہوں کہ اگر وہ تعلیم یافتہ نہ ہوتے اور کسی ایسے گاؤں میں پیدا ہوتے جہاں ٹیلی فون اور گراموفون اور ریڈیو کا حال کسی کو معلوم نہ ہوتا اور پھر تعلیم یافتہ شہری اس گاؤں میں ان تینوں کے قصے سناتا تو ان تینوں کا یقین کرنا اور شہری کو یقین دلانا کس قدر مشکل ہو جاتا۔ شہری کہتا۔ گراموفون کے ریکارڈ میں آواز بند ہو کر ہمیشہ آتی رہتی ہے۔ ٹیلی فون سے ہزاروں کوس دور کے آدمی بات کر سکتے ہیں۔ ریڈیو کے ذریعہ سب کی آواز لاکھوں کوس جا سکتی ہے" تو وہ ٹیلی فون ریڈیو اور گراموفون کو مان لیتے یا نہیں۔

پس میں اگر فرشتوں کو اور جنات کو اور ارواح کو آسمانی کتابوں اور پیغمبروں کے بیان کی بموجب اور ذاتی مشاہدات کی بنیاد پر مانتا ہوں تو میں ایک تعلیم یافتہ شہری ہوں۔ اور انکار کرنے والے گاؤں کے چودھری صاحب کی طرح ہیں۔ کہ چوپال میں بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ اور اپنی عقل اور علم سے باہر دنیا کی ہر چیز کا انکار کئے جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگر ٹیلی فون یا گراموفون یا ریڈیو میں آوازیں آتی ہیں تو کوئی جن یا بھوت بولتا ہوگا

یا چڑیل باتیں کرتی ہو گی۔

بے عقل میں بھی نہیں ہوں۔ توہمات اور خام خیالی کا قبضہ مجھ پر بھی نہیں ہے آنکھوں سے جنات کو اُن کی اصلی شکل میں میں نے بھی نہیں دیکھا۔ اُن کے ماننے یا اُن سے ڈرنے کے نقصان کو میں بھی جانتا ہوں۔ پھر بھی مجھے یقین ہے۔ کہ جن بھی ہیں۔ اور بھوت بھی ہیں ارواح بھی ہیں۔ مؤکل بھی ہیں۔ اور ہمزاد بھی واقعی ایک چیز ہے۔ اور ہمزاد تو میں نے تابع بھی کیا تھا۔ اور ہمزاد کو اپنی شکل میں دیکھا تھا۔ جس کا قصہ سُناتا ہوں۔

میرے ہمزاد کا قصہ } لانا ذرا عقل کا کانٹا لانا۔ تولہ ماشہ رتی بھی لیتے آنا تاکہ میرے اس قصہ کو تول تول کر وزن کر لیا جائے۔ کہ عقل کی بموجب یہ کیا چیز تھی جو میں نے دیکھی۔ سُنیے۔ قصہ یوں ہے۔ کہ میری عمر ۲۰ سال کی ہو گی۔ سنور ریاست پٹیالہ کے ایک بزرگ عامل نے مجھے ہمزاد کا عمل سکھایا اور کہا یہ عمل الٹی بسم اللہ کا ہے۔ عمل یہ ہے مِیحَرَّ لَانُ مِیحَرْ لَاہ لَاُ مِسَبْ اِس کو انیس ہزار انیس بار کھڑے ہو کر روزانہ رات کے وقت پڑھا جاتا تھا چراغ پیٹھ کے پیچھے رکھا جاتا تھا۔ اور میں اپنے سایہ کو دیکھ کر عمل پڑھتا تھا۔ عمل شروع کرنے سے پہلے چھری سے ایک کنڈل اپنے چاروں طرف بنا لیتا تھا۔ اور چھری کنڈل کے اندر رکھ لیتا تھا۔ استاد کا کہنا تھا کہ کنڈل کے باہر جو تماشا دیکھو اُس سے نہ ڈرنا۔ کنڈل کے اندر کوئی چیز آجائے تو چھری مارنا۔ یہ عمل ۶ گھنٹے میں پورا ہوتا تھا۔ اور میں کھڑے کھڑے اس قدر تھک جاتا تھا۔ کہ چکر آنے لگتے تھے۔ آٹھویں دن مجھے اپنا سایہ ہلتا دکھائی دیا۔ نویں دن وہ سایہ قلابازیاں کھانے لگا۔ دسویں دن غائب ہو گیا۔ یعنی میرا سایہ مجھے دکھائی نہ دیا۔ اور انیسویں دن تک غائب رہا۔ میں روز عمل پڑھتا تھا۔ روشنی پشت پر ہوتی تھی۔ مگر مجھے اپنے قد کا سایہ حجرہ کے اندر دکھائی نہ دیتا تھا۔

اس حجرہ میں میری پشت پر ایک روشن دان تھا۔ جس کے کواڑ بند کر کے میں کنڈی لگا لیا کرتا تھا۔ انیسویں رات میں کھڑا میحرلان میحرلاہ لامسب پڑھ رہا تھا۔ کوئی دو بجے

رات کا عمل ہو گا یکایک مجھے روشن دان سے کسی جانور کے اڑنے کی اور اندر آنے کی آواز آئی۔ سامنے روشنی میں دیکھا کہ ہو بہو میری شکل صورت اور میرے لباس کا سا ایک آدمی میرے سامنے دروازہ کی طرف پیٹھ کئے بیٹھ گیا۔ مگر کنڈل سے باہر ہے۔ وہ آدمی مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو مجھے اپنی صورت کا آدمی دیکھ کر حیرت ہوئی اور کچھ دیر کے بعد میں ڈرا۔ اور مجھ پر خوف طاری ہوا۔ عمل پڑھتا تھا تو پڑھا نہ جاتا تھا۔ زبان سوکھ گئی تھی۔ حلق خشک ہو گیا تھا۔ اور عمل کے فقرے زبان سے ادا کرنے دشوار معلوم ہوتے تھے۔ آخر میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ تب بھی وہ شکل آنکھوں سے دور نہ ہوئی۔ اور بند آنکھوں کو بھی نظر آتی رہی تو میں نے آنکھ کھول دی یکایک پھر کسی جانور کے اڑنے کی اور روشن دان کے اندر آنے کی آواز آئی اور ایک دوسرا آدمی میری شکل کا پہلے آدمی کی برابر آکر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں چپ تھے اور مجھے گھور گھور کر غصہ کی آنکھوں سے دیکھتے جاتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر کسی جانور کے اڑنے کی اور اندر آنے کی آواز آئی۔ اور تیسرا آدمی میری صورت کا اور آگیا۔ اور یہ بھی مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ میرا عجب حال تھا۔ تمام جسم کانپ رہا تھا۔ عمل کے فقرے زبان سے ادا ہونے بند ہو گئے تھے۔ تسبیح ہاتھ سے گر پڑی تھی۔ جس سے عمل کا شمار کیا کرتا تھا یکایک میں نے سنا کہ پہلے آنے والے نے میری سی آواز میں بعد کے دونوں آنے والوں سے کہا۔ میاں کچھ پکاتے نہیں؟ دوسرے نے کہا کیا پکائیں؟ تیسرے نے کہا۔ کڑھائی کرو۔ یہ کہتے ہی پہلا آدمی اُچکا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ اُڑ کر میرے سر کے اوپر سے روشن دان میں گھس گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ آدمی پھر اندر آیا۔ اور اُس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک چولہا تھا اور لکڑیاں تھیں۔ یہ آگیا تو دوسرا آدمی اڑ کر گیا۔ اور کچھ دیر کے بعد آیا تو ایک کڑھائی اور تیل کا ایک کنستر لایا۔ کنستر پر جیکٹ لگا ہوا تھا۔ انھوں نے کڑھائی چولھے پر رکھدی۔ اور تیل کڑھائی میں بھر دیا۔ اور لکڑیاں چولھے میں بھر دیں۔ تیسرے آدمی نے لکڑیوں میں ایک پھونک ماری۔ لکڑیاں خود بخود جلنے لگیں۔ اور تیل میں جوش آنے لگا۔ اس کے بعد تینوں

Marfat.com

آپس میں کہنے لگے۔ اب اس کڑھائی کے تیل میں کیا تلیں۔ پہلے آنے والے نے کہا۔ اِس آدمی کو تیل میں ڈال دو۔ جو سامنے کھڑا ہے۔ یہ سُنکر میری بُری حالت ہوگئی۔ اور غش آتا معلوم ہوا۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ اور سارا بدن تھرتھرا رہا تھا۔ اور پسینہ آرہا تھا۔ آخر میں جُھکا اور میں نے کانپتے ہاتھ سے چھری زمین سے اٹھالی اور چھری کو دونوں ہاتھوں میں اس خیال سے پکڑ لیا کہ اگر یہ لوگ میری طرف مجھے پکڑنے کو بڑھیں تو میں اُستاد کی ہدایت کی موافق ان کے چھری ماروں۔ ایکاایکی کیا دیکھتا ہوں کہ چولھے کی بھڑکتی ہوئی آگ کے اندر ایک زندہ چوہا پھر رہا ہے۔ میرے خوف میں ذرا کمی ہوئی اور میں چوہے کو دیکھنے لگا کہ یہ جلتا نہیں۔ آگ میں پھر رہا ہے۔ ان تینوں آدمیوں میں سے کسی آدمی نے جس کا مجھے خیال نہیں رہا کہ پہلا تھا یا دوسرا تھا، چولھے کے اندر ہاتھ ڈالا اور چوہے کی دم پکڑی اور چوہے کو آگ سے باہر لے آیا اور چوہے کو کڑھائی کے جوش کھاتے ہوئے تیل میں ڈالدیا۔ میں نے دیکھا چوہا اُبلتے ہوئے تیل میں کبھی اوپر آتا ہے اور کبھی تیل کے اندر چھپ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چوہے نے اپنا منہ تیل کے باہر نکالا۔ اور اُس کی ناک کے اندر سے خون کا فوارہ نکلنے لگا۔ اور اتنا نکلا کہ کڑھائی میں تیل نہ رہا۔ خون ہی خون دکھائی دینے لگا۔ اور خون بھی تیل کی طرح کھول رہا تھا۔ اِس خون کے اندر سے کالے آدمی کا ایک سر نکلا جس کے بال جھینٹوں کے سے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور پھٹی ہوئی اور۔ لال لال چہرہ کالا۔ ناک چپٹی۔ دانت زرد اور بے حد خوفناک۔ اِس چہرہ نے بھی مجھے گھورنا شروع کیا۔ اور اُس کے اندر سے بلی کے غرانے کی سی آواز آنی شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ وہ آواز بڑھی اور شیر کی سی گرج اِس آواز میں پیدا ہوئی۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ کالا حبشی چہرہ اُبلتے اور جوش مارتے خون کی کڑھائی سے میری طرف نراتا ہوا بڑھا۔ وہ اپنے زرد زرد لمبے دانت نکالے ہوئے خوفناک آنکھوں سے مجھے دیکھتا ہوا میری طرف بڑھتا نظر آیا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ چہرہ کڑھائی سے نکل کر اُس کُنڈل (حصار) کے اندر آگیا ہے جس کے اندر میں کھڑا تھا۔ میرا ڈر

Marfat.com

کے مارے بُرا حال تھا۔ اور قریب تھا کہ میں چیخ مار کر گر پڑوں کہ مجھے اُستاد کی بات یاد آئی۔ کہ کوئی چیز کنڈل کے اندر آجائے تو اُس کے چھری مارنا۔ میں نے چھری کا دستہ دونوں لرزتے ہاتھوں سے پکڑا اور بہت زور سے وہ چھری اُس حبشی کے تالو پر ماری۔ چھری کا مارنا تھا کہ ایسا معلوم ہوا۔ گویا میں نے وہ چھری اپنے دل میں ماری۔ اور میں غش کھا کر گر پڑا۔

میں ساری رات بے ہوش پڑا رہا۔ صبح ہوئی سورج نکلا تو ہوش آیا۔ میں نے دیکھا۔ وہاں نہ کڑھائی ہے نہ چولھا ہے نہ لکڑیاں ہیں نہ آگ کا نشان ہے نہ ان تینوں آدمیوں کا پتہ ہے۔ نہ اُن کے بیٹھنے کی جگہ کوئی علامت ہے۔ اور چھری کنڈل کے باہر زمین میں گڑی ہوئی ہے۔ باوجود خوف اور ڈر کے میں نے چھری اس زور سے ماری تھی کہ وہ زمین کے اندر آدھی گھس گئی تھی۔ میرا یہ حال تھا گویا برسوں سے بیمار ہوں۔ بہت مشکل سے اُٹھا اور حجرہ کے کواڑ کھولے۔ ہاتھ پاؤں میں دم نہ تھا۔ اور سر چکرا رہا تھا۔ اِس واقعہ کے بعد بھی چھ مہینے بیمار رہا۔ اور میرے ہمزاد کا عمل خراب ہو گیا۔ اُستاد کہتے تھے۔ اگر تم صبر کرتے اور حبشی کے سر میں چھری نہ مارتے تو عمل پورا ہو جاتا اور ہمزاد تمہارے کام کرنے لگتا۔ اور تمہاری صورت کا ایک آدمی ہمیشہ تمہاری پشت کی طرف کان کے پاس آکر کھڑا ہو جایا کرتا۔ اور تمہارے کان میں باتیں کیا کرتا۔ اور یہ فوراً آجایا کرتا۔ جب تم اپنے دل میں خیال کرتے کہ ہمزاد آجائے۔ اور ہزاروں کام ایسے کیا کرتا جو کسی آدمی سے نہ ہو سکتے۔

میں نے اُستاد سے پوچھا کہ ہمزاد کیا باتیں کرتا ہے۔ اُستاد نے کہا وہ خبریں سُناتا ہے۔ کہ فلاں جگہ ایسا ہوا۔ فلاں آدمی جو تمہارے سامنے آیا ہے فلاں جگہ کا رہنے والا ہے اس کا نام یہ ہے اور اُس کا تم سے یہ کام ہے۔ اُستاد نے یہ بھی کہا کہ ہمزاد سے جو کچھ منگاتا ہو قیمت دید و فوراً بازار سے وہ چیز سامنے آجائے گی۔ ہمزاد یہ بھی بتا دیتا ہے کہ فلاں شخص نے فلاں کے ہاں چوری کی ہے اور چوری کا مال فلاں جگہ رکھا ہے۔ بس یہ تھا میرے ہمزاد کا قصہ جو تو مجھے پیش آیا تھا۔ اب عقلمند سُننے والے بتائیں کہ میرے اس ذاتی مشاہدہ کی نسبت اُن کی کیا رائے

Marfat.com

ہے ؟ میں نے اُس وقت یہ رائے قائم کی تھی۔ کہ انیس دن کی محنت اور چھ گھنٹے کھڑے رہنے اور اپنے سایہ کو برابر دیکھنے سے میرے اپنے تخیل نے یہ سب تصویریں بنائی تھیں۔ ورنہ حقیقت میں یہ کچھ بھی نہ تھا۔ اور جو کچھ ہے وہ سب آدمی کے اندر ہے۔ باہر کچھ بھی نہیں ہے۔ شیطان بھی ہمارے اندر ہے فرشتے بھی ہمارے اندر ہیں۔ اور جنات بھی اور بھوت بھی۔ اور نئی سائنس والے اگر ان غیبی چیزوں کی تحقیقات کرنی چاہیں تو اُن کو بہت عجیب عجیب باتیں معلوم ہو جلئیں اور پھر نئی عقل والے لوگ کم از کم اِن باتوں کا انکار نہ کریں۔

ایک روح کی کہانی }۱۹۰۴ء کا ذکر ہے ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی درگاہ کے قریب کوئی کنواں نہیں ہے۔ باؤلی کا پانی کھاری ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں درگاہ کے شرقی دروازہ پر کنواں بنوا دوں۔ میں نے جواب دیا۔ ہاں صاحب یہاں میٹھے پانی کی بہت تکلیف ہے۔ شاید کنوئیں کا پانی میٹھا نکل آئے۔ ان صاحب نے کہا۔ مگر یہاں قبریں بہت زیادہ ہیں۔ کنواں کھودا جائے گا تو قبروں کو توڑنا پڑے گا۔ میں نے کہا قبروں کی ہڈیاں دوسری جگہ احتیاط سے دفن کر دینا۔ کیونکہ پانی کی ضرورت بہت زیادہ ہے۔ یہ کہہ کر میں تو الہ آباد چلا گیا۔ اور اُن صاحب نے کنواں کھدوانا شروع کیا۔ قبروں سے ہڈیاں نکلتی تھیں تو وہ دوسری جگہ ادب و احترام سے دفن کرا دیتے تھے۔ یہانتک کہ جب پانی کے قریب پہنچے تو وہاں کسی آدمی کا پورا ڈھانچ نظر آیا۔ سب کو حیرت ہوئی کہ اوپر کی قبروں کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ کسی کی کھوپڑی تھی کسی کی پاؤں کی ہڈیاں تھیں۔ مگر اتنی گہری جگہ میں یہ پورے آدمی کا ڈھانچ کیونکہ باقی رہا۔ اور اتنی گہری قبر کس نے بنائی ؟

بہرحال اِس ڈھانچ کو دیکھ کر مزدور ڈر گئے اور انہوں نے اِن ہڈیوں کو ہاتھ لگانے سے انکار کیا۔ تو کنواں کھدوانے والے صاحب خود لاؤ کے رستے میں ٹوکرہ باندھ کر کنوئیں کے اندر اُترے۔ اور انہوں نے کدال ہاتھ میں لے کر ڈھانچ کے گھٹنہ پر ماری تاکہ ہڈیاں توڑ کر اوپر لے جائیں۔ اور کسی جگہ دفن کر دیں۔ کدال کے مارتے ہی اُن کا گورا رنگ کالا ہو گیا۔ اور

یہ دیوانوں کی سی باتیں کرنے لگے جو مزدوران کے ساتھ کنوئیں میں گیا تھا اس نے ان کو ٹوکرہ میں باندھ دیا اور بہت مشکل سے ان کو کنوئیں کے باہر لایا۔ کنوئیں کے پاس بہت سی خلقت جمع ہو گئی سب حیران تھے کہ ابھی تو ان کا رنگ گورا تھا اب یہ ایسے کالے کیونکر ہو گئے؟ یہ شخص بار بار کہتے تھے میرے بھانجہ کا پاؤں توڑ ڈالا۔ میرے بھانجہ کا پاؤں توڑ ڈالا۔ آخر ان کو ان کے گھر میں لے گئے اور بڑے بڑے عامل بلائے گئے مگر ان کو کوئی اچھا نہ کر سکا آخر تیسرے دن اس کنوئیں کو بند کر دیا گیا سب مٹی اور ہڈیاں اس کنوئیں کے اندر بھر دی گئیں۔ اور کنواں زمین کے برابر ہو گیا۔ تب ان صاحب کا رنگ بھی گورا ہو گیا اور دماغ کی خرابی بھی درست ہو گئی۔ اور وہ اب تک درگاہ میں موجود ہیں۔

میں الہ آباد کے سفر سے واپس آیا تو میری مرحومہ بیوی نے سارا قصہ مجھے سُنایا۔ میں اپنے پیدائشی گھر میں پلنگ پر چت لیٹا ہوا تھا۔ لیمپ سرہانے رکھا تھا۔ اور میں لیٹا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔ پلنگ کے نیچے دری پر میری مرحومہ بیوی اور ان کی والدہ بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں اور مجھے قصہ سُنا رہی تھیں۔ میں پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور میں نے اپنی مرحومہ بیوی سے کہا کہ تم سمجھیں کہ وہ کیوں کالے ہو گئے۔ اور دیوانے کیوں ہو گئے۔ بیوی نے کہا کسی بزرگ کا مزار تھا انہوں نے بے ادبی کی مزار والوں کی روح نے اُن کو قبر توڑنے کی سزا دی اور وہ کالے ہو گئے۔ اور دیوانے ہو گئے۔ مگر جب اُن کے وارثوں نے قبر بند کرا دی اور کنواں بھی بند کرا دیا تو روح نے تین دن بعد ان کی خطا معاف کر دی اور وہ اچھے ہو گئے۔

میں نے بیوی سے کہا۔ نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ یہ بات ہے کہ مردہ کی ہڈیاں صدیوں سے مٹی کے اندر دبی ہوئی تھیں اور ہڈیوں کے اندر فاسفورس ہوتا ہے فاسفورس زہر ملا ہو گیا تھا جب انہوں نے ڈباہج کے کدال ماری ہڈی ٹوٹ گئی اور اس کے اندر سے وہ فاسفورس اُڑا اور اُن کی ناک میں سانس کے ساتھ گھس گیا اور بدن کے خون میں جذب ہو گیا۔ اور اپنے زہر سے خون کو کالا کر دیا۔ خون کالا ہوا تو ان کا چہرہ بھی کالا ہو گیا۔ اور وہ

Marfat.com

دیوانے بھی اس وجہ سے ہوئے کہ ان کے دماغ پر زہریلے فاسفورس نے بُرا اثر کیا ہوگا۔ اگر روح کچھ کر سکتی تو مجھے سزا دیتی کیونکہ میں نے ان کو کنواں کھودنے اور قبریں توڑنے کا فتویٰ دیا تھا اور اگر روح میں کچھ طاقت ہے تو آئے مجھے اپنی طاقت دکھائے۔ اور مجھے سزا دے تم عورتیں کم زور عقیدہ کی ہوتی ہو میں روحوں کے ایسے اثر کو نہیں مانتا۔

بیوی نے جواب دیا توبہ کرو کیسی باتیں کرتے ہو کیا تم وہابی اور نیچری ہو گئے ہو۔ میں نے کہا کم از کم میری عقل تمہاری طرح بودی نہیں ہے۔ بیوی نے کہا جانے دو۔ یہ باتیں چھوڑ دو۔ اپنا اخبار پڑھو۔ میں ایسی منکرانہ باتیں سُننا نہیں چاہتی۔ میں ہنسا اور اخبار پڑھنے لگا ان باتوں کو پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے اور میں چت لیٹا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا کہ کسی نے میرے پاؤں کے تلوؤں میں بجلی کی بیٹری لگائی۔ اور وہ بجلی سن سن کرتی میرے تمام بدن میں پھیل گئی۔ جس سے مجھے ایسی تکلیف ہوئی جس کو الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے میری رگ رگ میں چھریاں چلتی معلوم ہوتی تھیں۔ میں بے تاب ہو کر چیخنے لگا میں نے اپنی چیخوں کی آواز خود سُنی مگر میری بیوی اور میری ساس آپس میں باتیں کرتی رہیں اور چھالیہ کترتی رہیں انھوں نے میرے چیخنے پر توجہ نہ کی۔ تو میں نے بیوی کا نام لے کر چیخنا شروع کیا کہ حبیب بالو اے بی مجھے دیکھو میرا کیا حال ہو گیا۔ مجھے قبر والی روح نے دبا لیا۔ میں توبہ کرتا ہوں پھر کبھی کسی بزرگ کی روح کی بے ادبی نہیں کروں گا۔ مگر میری بیوی نے میری طرف توجہ نہیں کی اور اپنی ماں سے باتیں کرتی رہیں۔ میں ان کی اُن باتوں کو سُن رہا تھا جو وہ کر رہی تھیں اور میرے اچھا ہونے کے بعد بیوی اور ساس سے کہا کہ تم دونوں نے یہ یہ باتیں کیں تو ان دونوں نے کہا ہاں ٹھیک ہے ہم نے یہ باتیں کیں تھیں۔ مگر تم تو سو گئے تھے۔ تم نے کوئی آواز ہم کو نہیں دی۔

میں نے اسی حال میں خیال کیا کہ شاید میرا دل دب گیا ہے اور اس کی وجہ سے یہ تکلیف ہے اس لئے آہستہ سے بائیں رُخ کروٹ لی۔ مگر پھر بھی تکلیف میں کمی نہ ہوئی۔ تب میں نے

توبہ کرنی شروع کی اور عہد کیا کہ کبھی روحوں کی بے ادبی نہ کروں گا۔ اور خدا کی پیدا کی ہوئی غیبی قوتوں اور قدرتوں کا انکار نہ کروں گا۔ یہ کہتے ہی وہ تکلیف جو سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی تھی پیروں کی طرف جاتی معلوم ہوئی۔ یہاں تک تھوڑی دیر میں بالکل جاتی رہی اور میں نے پھر اپنی بیوی کو پکارا تو انہوں نے فوراً جواب دیا۔ میں نے ان سے کہا ابھی پانچ منٹ تک میں ایسی سخت تکلیف میں مبتلا رہا اور تم کو آوازیں دیں مگر تم نہ بولیں بیوی نے کہا۔ تم تو سو گئے تھے اور اخبار تمہارے ہاتھ سے گر پڑا تھا۔ میں نے کہا کیا تم دونوں فلاں فلاں باتیں نہ کر رہی تھیں؟ انھوں نے کہا ہاں یہ باتیں ہم نے کی تھیں۔ میں نے کہا اگر میں سو گیا تھا۔ تو میں نے تمہاری یہ باتیں کیونکر سُنیں؟ اس سوال کا جواب میری بیوی نہ دے سکیں۔ اور آج تیئیس برس کے بعد میں ریڈیو کے سننے والوں سے خاص کر اُن سے جو ان غیبی چیزوں کا اعتقاد نہیں رکھتے۔ پوچھتا ہوں کہ یہ کیا بات تھی جو مجھے پیش آئی اور ان کی عقلیں اس واقعہ کی نسبت کیا فیصلہ کرتی ہیں۔ اور اسی سوال پر میں آج کی بات چیت ختم کرتا ہوں آئندہ میں اپنے بھی قصے سناؤں گا اور دوسروں کو جو قصے جنات اور بھوتوں وغیرہ کے پیش آتے وہ بھی سُناؤں گا۔ اُمید ہے۔ کہ سائنس جاننے والے اصحاب ان غیبی چیزوں کی عقلی تحقیقات ضرور کریں گے۔ اور اس تحقیقات کے وقت مصر کی قدیم قبریں کھودنے والوں پر جو مصیبتیں پڑیں ان کو بھی ذہن میں رکھیں گے تاکہ صحیح فیصلہ کر سکیں۔

ایک جن کی نعت

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے ایک جن کے عربی قصیدہ کا اُردو ترجمہ شائع کیا ہے قیمت تین آنے چوبیں صفحے کا رسالہ ہے اور پڑھنے کے قابل ہے

ملنے کا پتہ:۔ دفتر اخبار منادی دہلی

Marfat.com

دیو جن پری اور

بھوتوں کے قصّے

یہ تقریر ۱۰/ اپریل ۱۹۳۶ء کو دلی ریڈیو میں نشر ہوئی

آج کی باتیں آدمیوں کو سنا رہا ہوں۔ جو جنات اور پریوں اور بھوتوں کو مانتے بھی ہیں اور بہت سے نہیں بھی مانتے۔ اور جب سے انگریزی تعلیم جاری ہوئی ہے بھوتوں اور پریوں کی ماننا بہت کم ہوگئی ہے مگر میں خود جنات کو مانتا ہوں۔ کیونکہ خدا کے کلام قرآن مجید اور انجیل اور توریت وغیرہ نے بھی جنات کا ہونا مانا ہے۔ اور سب پیغمبروں نے بھی ان کا وجود تسلیم کیا ہے۔ اور باوجود نئی روشنی کا معتقد ہونے کے میرا عقیدہ ہے کہ یہ سب چیزیں موجود ہیں۔ اور ان سے انکار کرنا خدا کی عجیب مخلوق سے انکار کرنا ہے۔ پس اگر آج کی باتوں کو سننے والوں میں کوئی جن یا پری یا دیو یا بھوت یا چڑیل یا ماموں اللہ بخش یا شیخ سدو یا میراں یا نرسو بھی شریک ہوں تو میں قصے سنانے سے پہلے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ وہ میری باتوں سے خفا نہ ہوں اور چپ کر رہنا چھوڑ دیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں داخل ہوں اپنے بچوں کو پڑھائیں تاکہ جنگلوں اور ویرانوں میں رہنے کی عادت دور ہو اور سب کے ساتھ مل کر رہنے کا مزہ آئے۔ اور زندگی کی بہار حاصل کر سکیں۔ اور انکار کرنے والے بھی ان کا ہونا مان لیں۔

اب میں جنات اور بھوتوں کے قصے شروع کرتا ہوں۔ سننے والے اگر ان قصوں کو پسند کریں تو دہلی براڈکاسٹنگ کو اطلاع دیدیں۔ تاکہ ان کے بعد کے قصے بھی سنائے جائیں ورنہ بس یہی کہانیاں سنا کر داستان کو ختم کر دیا جائے گا۔

پہلا قصہ) میں پہلے اپنا قصہ سناتا ہوں۔ کہ جوانی کے شروع میں مجھے جنات اور بھوتوں اور ہمزادوں اور ستاروں کو تابع کرنے کا شوق تھا۔ اور میں دو برس تک اس شوق میں مبتلا رہا۔ اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ کسی نے مجھ سے کہا۔ کہ پیلی بھیت میں ایک بزرگ رہتے ہیں جن کا

Marfat.com

نام میاں محمد شبیر صاحبؒ ہے۔اور وہ ایسا عمل جانتے ہیں جس سے جنات اور پریاں اور بھوت اور ہمزاد وغیرہ آدمی کے تابع ہو جاتے ہیں۔یہ سُن کر میں پیلی بھیت گیا۔اور حضرت میاں محمد شبیر صاحب سے ملا۔مگر اُن کی بزرگانہ اور فقیرانہ ہیبت کے سبب میری اتنی جرأت نہوئی جو اپنا مقصد اُن سے کہتا۔چپ چاپ اُن کی محفل میں کچھ دیر بیٹھا رہا۔یکایک وہ خود میری طرف مخاطب ہوئے اور یہ کہنا شروع کیا۔

ارے میاں دِلّی والے سُنو! جب ہم تمہاری عمر میں تھے تو ہمیں جنات تابع کرنے کا شوق ہوا۔اور ہم کو ایک آدمی نے جنات مسخر کرنے کا عمل بتایا۔اور ہم نے مسجد میں بیٹھ کر جنات کو تابع دار بنانے کا عمل شروع کیا۔ہم مسجد کی لمبی جانماز پر بیٹھ گئے۔جس پر بہت سے نمازی صف بندی کر کے نماز پڑھا کرتے ہیں۔جوں ہی ہم نے عمل پڑھنا شروع کیا وہ جانماز خود بخود بغیر کسی لپیٹنے والے کے لپٹنی شروع ہوئی اور ہم بھی اس جانماز کے اندر لپٹ گئے۔اور کسی نے ہم کو جانماز کے ساتھ لپیٹ کر مسجد کے کونہ میں کھڑا کر دیا۔کچھ دیر تو ہم جانماز میں لپٹے ہوئے کھڑے رہے آخر ہم نے بہت مشکل سے اس جانماز کو کھولا۔اور اُس کے اندر سے نکلے۔اور جانماز کو پھر اُس کی جگہ بچھایا۔اور جانماز پر بیٹھ کر جنات کا عمل پڑھنا شروع کیا۔مگر ہمارا دل ڈر رہا تھا۔اور حیرت بھی تھی کہ کس نے ہمیں جانماز میں لپیٹ دیا۔دوسری دفعہ بھی یہی ہوا۔یعنی پھر کسی نے جانماز میں ہم کو لپیٹ کر کھڑا کر دیا۔اور ہمارا دل دھڑکنے لگا۔اور ہم بہت ڈرے۔آخر ڈرتے ڈرتے جانماز کو کھولا۔اور باہر نکلے اور جانماز کو بچھایا۔اور عمل شروع کیا۔تیسری دفعہ بھی ہم کو کسی نے لپیٹ دیا۔اور ہم نے پھر کوشش کر کے اپنے آپ کو اِس قید سے نکالا۔اور باہر نکلے تو ایک آدمی ہمارے سامنے آیا۔اور اُس نے غصہ اور خفگی کے لہجہ میں کہا" تو یہ عمل کیوں پڑھتا ہے؟ اور ہم کو کیوں پریشان کرتا ہے؟

ہم نے کہا۔کہ جنات کو تابع دار بنانے کے لئے۔اُس آدمی نے جواب دیا "دیکھ میں جن ہوں۔آدمی کی صورت میں آیا ہوں۔تو ہم کو مسخر کرنے کی محنت نہ کر۔ہم آسانی سے کسی کے

قابو میں نہیں آئیں گے۔ اس نے تو خدا کا مسخر ہو جا پھر ہم سب تیرے مسخر ہو جائیں گے۔ یہ قصہ سنا کر حضرت میاں محمد شبیر صاحب نے فرمایا۔ میاں اُس دن سے ہم نے تو جنات تابع کرنے کا شوق چھوڑ دیا۔ اور خدا کی تابعداری کرنے لگے۔ اور ہم نے دیکھا کہ **جو آدمی خدا کا تابعدار ہو جاتا ہے تو دنیا کی ہر چیز اُس کی تابعدار بن جاتی ہے۔**

دوسرا قصہ } اماں میرے دادا کا قصہ بیان کرتی تھیں۔ کہ وہ درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ میں سوتے تھے۔ گرمی کا موسم تھا۔ یکایک انھوں نے دیکھا کہ ایک کتا حضرت کے مزار کے سامنے کھڑا ہے۔ دادا نے اُس کتے کے لکڑی ماری جس سے کتے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اور وہ لنگڑاتا ہوا بھاگا۔ دادا دروازہ پر گئے تاکہ کواڑ بند کر دیں کیونکہ انھیں خیال تھا کہ دروازہ کھلا رہ گیا ہے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ بہت سے آدمی کھڑے ہیں۔ اور ایک آدمی پالکی میں لیٹا ہے اور کئی آدمی اُس کی ٹانگ پر پٹی باندھ رہے ہیں۔ دادا نے پوچھا "آپ کون صاحب ہیں؟ اور یہ ٹانگ میں کیا تکلیف ہے؟" زخمی آدمی نے جواب دیا "آپ ہی نے تو میری ٹانگ توڑی ہے۔ اگر آپ پیرزادے اور سید نہ ہوتے تو میں آپ کو نقش زمیں بنا دیتا۔ یعنی مار ڈالتا۔ میں جنات کا بادشاہ ہوں اور عاجزی کے خیال سے کتے کی شکل میں مزار کی زیارت کرنے آیا تھا۔ دادا نے کہا۔ آپ نے بُرا کیا جو کتے کی صورت میں آئے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ آپ جن ہیں۔ جنات کے بادشاہ نے کہا۔ ہاں غلطی میری ہے۔ آپ بے قصور ہیں۔

تیسرا قصہ } اماں کہتی تھیں۔ کہ اُن کے والد یعنی میرے نانا بہادر شاہ بادشاہ کے بھائی مرزا جہانگیر سے ملنے الہ آباد گئے۔ جہاں اُن کو انگریز کمپنی نے نظر بند کر رکھا تھا۔ مرزا جہانگیر نے نانا کو ایک بڑے مکان میں ٹھہرایا۔ نانا حقہ پیتے تھے۔ اس واسطے نوکر نے اُپلے کی آگ اور حقہ اور تمباکو پاس رکھدیا۔ اور فانوس میں شمع روشن کر دی اور گندھک لگی دیا سلائیاں بھی قریب رکھدیں۔ اس زمانہ میں گندک لگی دیا سلائیوں کو آگ سے روشن کرتے تھے۔ اور پھر دیا سلائی سے چراغ جلاتے تھے۔ نانا عشا کی نماز پڑھ کر پلنگ پر لیٹ گئے سامنے شمع روشن

Marfat.com

تھی۔ وہ لیٹے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ یکایک اُن کا پلنگ ہلا۔ اور کسی نے پلنگ کو اوپر اٹھا لیا۔ اور پلنگ زمین سے دو گز اونچا ہو گیا۔ نانا گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ اور انھوں نے پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ کہ کس نے میرا پلنگ اٹھایا۔ مگر کوئی چیز دکھائی نہ دی۔ جس دالان میں اُن کا پلنگ تھا اُس میں تین در تھے اور پلنگ بیچ کے در میں بچھا ہوا تھا۔ کسی نے اُس پلنگ کو اونچا کر کے بیچ کے در سے اٹھایا اور آخری تیسرے در میں لے جا کر بچھا دیا۔ جب پلنگ زمین پر بچھ گیا تو نانا پلنگ سے اُترے اور انھوں نے پلنگ کو گھسیٹا اور پھر بیچ کے در میں بچھا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر پلنگ اٹھا اور وہ خود بخود تیسرے در میں چلا گیا۔ نانا پلنگ کو گھسیٹ کر پھر بیچ کے در میں لے آئے۔ یہاں تک کہ تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا۔ اور تیسری دفعہ بھی نانا پلنگ گھسیٹ کر بیچ کے در میں لے آئے۔ اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ تب ایک سایہ سا نمودار ہوا جو فانوس کے پاس گیا اور شمع خود بخود گل ہو گئی۔ نانا اٹھے اور انھوں نے گندھک لگی دیا سلائی آگ پر رکھی اور اُس کو روشن کر کے شمع دوبارہ جلا دی۔ پھر وہ سایہ آیا اور اُس نے شمع گل کر دی۔ غرض تین دفعہ یہی ہوا کہ وہ سایہ شمع گل کرتا تھا اور نانا اُس کو روشن کر دیتے تھے۔ جب تیسری دفعہ نانا نے شمع روشن کی تو ایک آدمی چھت کے اوپر سے سیڑھیاں اترتا ہوا آیا۔ اور اُس نے میرے نانا کا نام لے کر کہا۔ سنو میاں غلام حسین میں جن ہوں۔ اور شمع کی روشنی سے مجھے تکلیف ہوتی ہے تم شمع گل کر دو۔ اور جہاں تم نے پلنگ بچھایا ہے وہاں میں رات کو نماز پڑھا کرتا ہوں۔ لہذا تم اپنا پلنگ بھی یہاں سے ہٹا لو۔ میں جانتا ہوں کہ تم ضدی آدمی ہو۔ کیونکہ میں دلی میں تمہاری درگاہ کی زیارت کے لئے کئی دفعہ جا چکا ہوں۔ مگر تم یاد رکھو کہ اس مکان میں رات کے وقت جو آدمی رہتا ہے میں اُس کو مار ڈالتا ہوں۔ تمہاری خیر اِسی میں ہے کہ تم پلنگ یہاں سے ہٹا لو اور شمع گل کر دو۔ ورنہ میں تم کو مار ڈالوں گا۔ نانا نے کہا۔ بھائی جب تم جانتے ہو کہ میں ضدی آدمی ہوں تو سمجھ لو کہ جب تک جیتا ہوں نہ شمع گل کروں گا۔ نہ پلنگ ہٹاؤں گا۔ آج کی رات تو تم کسی اور جگہ نماز پڑھ لو۔

Marfat.com

کل میں اس مکان میں نہ رہوں گا۔ یہ مرزا جہانگیر کے نوکروں نے بڑی شرارت کی کہ مجھے ایسی جگہ ٹھہرایا جہاں تم رہتے ہو۔ یہ بات سُن کر وہ جن ہنسا اور اُس نے کہا۔ اچھا میاں آج کی رات میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔ مگر کل یہاں نہ رہنا۔ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔ اور دوسرے دن میرے نانا مرزا جہانگیر سے ملے اور اُن کو بہت برا بھلا کہا۔ کہ تم نے مجھے جنات کے مکان میں کیوں ٹھہرایا۔ اور اُسی دن الہ آباد سے دلی چلے آئے۔

چوتھا قصہ } میرے ماموں کہتے تھے کہ ہماری بستی میں ایک حلال خور رہتا تھا۔ جس کے بھوت تابع تھے۔ ہمارے چچا کو بھی بھوت تابع کرنے کا شوق ہوا اور اُس حلال خور کے پاس گئے حلال خور نے کہا۔ کسی حلال خور کو مرنے دو جب تم کو بھوت تابع کرنے کا عمل سکھاؤں گا۔ چند مہینے کے بعد کوئی حلال خور مرا (ہمارے ہاں حلال خور دفن کئے جاتے ہیں) وہ بھی دفن کر دیا گیا۔ رات کو وہ بھوتوں کا عمل جاننے والا حلال خور میرے ماموں کے چچا کے پاس آیا۔ اور اُس نے کہا۔ لو چلو۔ آج میں تمہیں بھوتوں کو تابع کرنے کا عمل سکھاؤں۔ وہ اُس کے ساتھ حلال خوروں کے قبرستان میں گئے۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ اور خوب اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ حلال خور نے تازہ قبر کی مٹی ہٹائی اور تختہ کو کھولا۔ مرنے والے کی لاش کفن میں لپٹی ہوئی رکھی تھی۔ زندہ حلال خور نے ماموں کے چچا سے کہا۔ کہ تم اس لاش کے پیروں میں بیٹھ جاؤ اور میں سرہانے بیٹھتا ہوں۔ یہ پہلے تو بہت ڈرے۔ مگر بھوت تابع کرنے کا بھوت سر پر سوار تھا۔ ہمت کر کے لاش کے پیروں میں بیٹھ گئے۔ اور وہ حلال خور سرہانے بیٹھ گیا اور اُس نے کفن کھول کر مردہ کے دونوں ہاتھ نکالے اور ان دونوں ہاتھوں میں دو چھریاں دیدیں۔ اور اس کے بعد منتر پڑھنے لگا۔ اور کالے اڑد اس لاش پر ڈالنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لاش ہلی۔ لاش کو ہلتا ہوا دیکھ کر ماموں کے چچا ڈرے۔ لاش کے سرہانے بیٹھے ہوئے حلال خور نے ہاتھ کے اشارہ سے اُن کو ہمت دلائی۔ اور اشارہ کیا کہ بیٹھے رہو۔ ڈرو مت۔ مگر جب لاش اپنی دونوں کہنیوں کو ٹیک کر

اٹھتی ہوئی معلوم ہوئی تو ماموں کے چچا ڈر کے مارے کھڑے ہو گئے اور اُچھل کر قبر کے باہر آگئے۔ ان کا باہر آنا تھا کہ وہ مردہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی چھریاں اس جگہ ماریں جہاں ماموں کے چچا بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر جب وہاں کوئی نہ ملا تو مردہ نے پیچھے مڑ کر اپنے سرہانے حلال خور کے وہ دونوں چھریاں ماریں اور حلال خور چھریوں سے زخمی ہو کر چیخا۔ اور ماموں کے چچا یہ تماشہ دیکھ کر بھاگے۔ اور ان کا ڈر کے مارے بُرا حال ہو گیا تھوڑی دیر بھاگتے رہے۔ اس کے بعد ذرا رکے۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ وہ مردہ کفن پہنے اور دونوں چھریاں ہاتھ میں اٹھائے دوڑا ہوا چلا آتا ہے۔ اور یہ بھی کہتا جاتا ہے کہ میں نے اپنی بھینٹ لے لی اور اس آدمی کو مار ڈالا۔ اب میں تمہارا تابع دار ہوں۔ اب تمہارا جو کام ہوگا وہ میں کرونگا۔ تم ذرا ٹھہرو تو سہی۔ ڈرو مت۔ میں تمہارا تابع دار ہوں۔ میرے ماموں کے چچا نے بھاگتے بھاگتے جواب دیا۔ خدا کے لئے تو الٹا جا۔ مجھ کو تجھے تابعدار بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر وہ مردہ برابر پیچھے دوڑتا رہا۔ درگاہ کے دروازہ کے پاس ایک حجرہ تھا۔ اور اس میں شاہجہاں پور کے ایک درویش رہتے تھے۔ ماموں کے چچا نے ان کو آواز دی۔ انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ اور جب یہ اندر آگئے تو دروازہ بند کر لیا۔ اس مردہ نے دروازہ کے باہر کھڑے ہو کر کہنا شروع کیا۔ دروازہ کھولو۔ میں تمہارا تابع دار ہوں تم جس کام کو کہو گے وہ کام کروں گا۔

شاہجہاں پوری شاہ صاحب نے کہا۔ ہم تیری تابعداری سے بہت خوش ہوئے۔ اور تجھ کو حکم دیتے ہیں کہ یہاں سے جا۔ اور اپنی قبر میں لیٹ کر سو جا۔ اور کبھی نہ آ۔ جب تک کہ ہم تجھ کو نہ بلائیں۔ یہ سُنکر مردہ چلا گیا۔ مگر ماموں کے چچا کو تھوڑی دیر بعد غش آگیا۔ اور وہ دس بارہ گھنٹے بے ہوش رہے۔ اور ہوش میں آئے تو کئی مہینے بیمار رہے۔ اور پھر انھوں نے بھوتوں کو تابع کرنے کا شوق ترک کر دیا۔ اور ساری عمر قبر کے بھوت سے ان پر خوف طاری رہا۔

Marfat.com

پانچواں قصہ } درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے جنوب میں ایک چھوٹا سا قلعہ بنا ہوا ہے جس کو کوٹ کہتے ہیں۔ چھ سو برس پہلے ملک تلنگانہ دکن کے ایک ہندو دلی میں آئے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید ہوئے۔ اور حضرت نے اُن کا نام احمد ایاز رکھا۔ اور حضرت کی سفارش سے بادشاہ کے ہاں نوکر ہوتے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ہندستان کی بادشاہی کے وزیراعظم ہو گئے۔ اور انھوں نے یہ کوٹ بنوایا۔ اور اسی کوٹ کے اندر اپنا مقبرہ بھی تیار کرایا۔ جس کے اندر مرنے کے بعد دفن ہوئے۔ اِس کوٹ کی فصیل میں جگہ جگہ کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں۔ اور ان کوٹھریوں کے آگے میرے خاندان کے لوگوں نے مکانات بنوائے ہیں۔ اِس فصیل کے غربی حصہ میں دو تین کوٹھریوں سے ملے ہوئے میرے نانا سید حضور بخش صاحب مرحوم کے مکانات ہیں۔ اور ایک کوٹھری کی چھت پر ایک دوچھتی بنی ہوئی ہے۔ جس کی دوسری چھت اتنی نیچی ہے کہ آدمی کھڑا ہو کر اندر نہیں جا سکتا۔ بلکہ بیٹھ کر اندر جاتا ہے یہ دوچھتی اندر سے بہت بڑی ہے۔

آج کل حسن نظامی کی عمر ساٹھ برس کی ہے۔ میری پیدائش کے زمانہ میں یعنی آج سے ساٹھ برس پہلے اِس دوچھتی میں ایک جن عورت رہتی تھی جس کو **نانی سبیا** کہتے تھے۔ یہ عورت کسی کو دکھائی نہ دیتی تھی۔ مگر اس کی آواز سب سنتے تھے۔ وہ ناک میں بولتی تھی یعنی اُس کی آواز ایسی آتی تھی جیسے کوئی خُنخُنا آدمی بولتا ہے۔ کوٹ کی عورتیں اس جن عورت سے ڈرتی نہیں۔ بلکہ سب اس سے مانوس تھیں۔ کیونکہ وہ جن عورت سب عورتوں سے باتیں کیا کرتی تھی۔ سب عورتیں اس کو نانی سبیا کہتی تھیں۔ اور نانی سبیا بچوں کے نانی کہنے سے بہت خوش ہوتی تھیں۔

میری اماں کہتی تھیں۔ کہ اُن کی والدہ یعنی میری نانی اس عورت کو نانی نہ کہتی تھیں۔ بلکہ بوا سبیا کہا کرتی تھیں۔ اور یہ جن عورت اُن سے بہت زیادہ باتیں کیا کرتی تھی سارے کوٹ کے گھروں اور کوٹ کے باہر کے گھروں میں نانی سبیا کی دھوم تھی۔ نانی

ستبیا کی کوٹھری میں آٹا پیسنے کی چکی اور سوت کاتنے کا چرخہ رکھدیا گیا تھا۔ کوٹ کی عورتیں آتیں اور کہتیں "نانی ہمارا سوت کات دو" تو نانی ستبیا جواب دیتیں۔ اچھا بیٹی روئی چرخہ کے پاس رکھدو۔ عورتیں روئی رکھدیتیں اور چرخہ خود بخود چلنے لگتا۔ اور سوت کتنے لگتا۔ اور تھوڑی دیر میں تیار ہو جاتا۔ بعض عورتیں گیہوں لاتیں اور کہتیں "نانی ہمارا آٹا پیس دو۔ نانی ستبیا جواب دیتیں۔ اچھا بیٹی گیہوں چکی کے پاس رکھدو۔ تھوڑی دیر میں چکی خود بخود چلنی شروع ہوتی۔ کوئی چلانے والا دکھائی نہ دیتا۔ اور آٹا پسنے لگتا یہاں تک کہ سب گیہوں پس جاتے اور عورتیں اپنا کتا ہوا سوت اور پسا ہوا آٹا لے جاتیں۔

اماں کہتیں تھیں تو (یعنی حسن نظامی) چھ مہینے کا تھا۔ کہ میں تجھ کو لے کر اپنی اماں کے گھر میں آئی۔ گرمی کا موسم تھا۔ ہم سب نے چارپائیاں مکان کے صحن میں بچھالیں۔ اس زمانہ میں ہم سب تجھ کو پیار سے بچنی (حسنی) کہتے تھے۔ یکایک نانی ستبیا کی آواز آئی اور انہوں نے تیری نانی سے کہا۔ کہ بوا اپنے نواسے بچنی کو باہر نہ سلانا کیونکہ آج میرے ہاں فہیدوں کی نیاز ہے۔ اور نیاز میں بہت سے مہمان آنے والے ہیں۔ ایسا نہ ہو کسی مہمان کی نظر تمہارے بچہ پر ہو جائے۔ نانی نے جواب دیا۔ بوا ستبیا یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ گرمی کا موسم ہے۔ چھوٹا بچہ ہے۔ اس کو اندر گرمی میں کیونکر سلاؤں۔ وہ تو باہر ہی سوئے گا۔ نانی ستبیا نے جواب دیا۔ اچھا بوا تم بچہ کو باہر سلاؤ۔ میں خیال رکھوں گی کہ کوئی مہمان بچہ کی طرف نہ جائے۔

اماں کہتی تھیں۔ ہم سب سو گئے۔ تو میرے پاس چارپائی پر سوتا تھا۔ رات کے دو بجے کا عمل ہوگا۔ کہ تیرے رونے کی آواز آئی۔ میں گھبرا کر اٹھی تو کیا دیکھتی ہوں کہ تو میری چارپائی پر نہیں ہے اور ایک دوسری چارپائی پر جو پاس ہی خالی پڑی تھی پڑا ہوا رو رہا ہے۔ میں اٹھی اور تجھ کو گود میں اٹھالیا۔ اور اپنے کلیجہ سے لگالیا۔ پھر تیری نانی کو جگایا اور اُن سے کہا۔ کہ بچنی کو خبر نہیں کس نے دوسری چارپائی پر ڈال دیا تھا۔ نانی نے اُسی وقت نانی ستبیا کو آواز دی کہ بوا ستبیا دیکھو وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میرے بچہ کو کسی نے ماں کے

Marfat.com

پاس سے اٹھاکر دوسری چارپائی پر ڈال دیا۔ نانی سبیا نے جواب دیا۔ گھبراؤ نہیں میری بہن کو بچی پر پیار آگیا تھا۔ اور اس نے اٹھاکر پیار کیا تھا۔ بچہ رونے لگا تو میری بہن نے جلدی میں دوسری چارپائی پر لٹا دیا۔

بہرحال نانی سبیا کے ایسے ہی بے شمار قصے مشہور تھے۔ مگر جب میں نے ہوش سنبھالا تو نانی سبیا کی آواز نہ آتی تھی۔ اور لوگ کہتے تھے کہ نانی سبیا مرگئیں۔ میں نے نانی سبیا کے کئی قصے اپنی لائف حسن جیون میں بھی لکھے ہیں۔

غالب کا روزنامچہ غدر

یہ کتاب غدر دہلی کا ساتواں حصہ ہے۔ جس میں نواب اسداللہ خاں غالب کی وہ تحریریں ہیں جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ غدر سے تعلق رکھتی ہیں ناظرین کتاب کانا باقی کو یہ کتاب منگاکر پڑھنی چاہیئے۔ قیمت بارہ آنے ۱۲ آنہ

ملنے کا پتہ:۔ دفتر اخبار منادی دہلی

بھگت کبیرؒ

یہ تقریر خواجہ حسن نظامی صاحب نے ۸ر مارچ ۱۹۳۶ء کو براڈکاسٹ کی۔

آج کی بات: کون سنے گا؟ حسن نظامی دلی میں کہہ رہا ہے۔ کہ آج کی بات بس اس کو سننی چاہیئے۔ جس کو ہندوستان کی بھلائی درکار ہے اور جس کے اندر دوسری قوموں اور دوسرے مذہب والوں کے خلاف غصہ نہیں ہے۔ اور جس کو کھری بات اور سچی بات کہنے کا شوق ہے۔ اور جو دوسروں کی کھری بات سُننے کی برداشت بھی رکھتا ہے۔

میں آج ہندوستان کے سچے پریمی بھگت کبیر کا قصہ سنانے آیا ہوں۔ جن کو ہندوستان کے ایک کروڑ آدمی اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ اور کبیر پنتھی کہلاتے ہیں۔

میں بچپن سے درگاہوں کی قوالی میں بھگت کبیر کا کلام سنتا تھا۔ اور ان کی سچی اور کھری باتوں کا میرے دل پر اثر ہوتا تھا۔ اور جب دہلی براڈکاسٹنگ کا پروگرام بنانے والوں نے مجھ سے ان کا قصہ سُنانے کی درخواست کی تو میں نے بھگت کبیر کے حالات ڈھونڈھنے شروع کئے۔ اور چند روز میں پانچ کتابیں ملیں۔ ایک کبیر بیجک دوسری جیون چرتر کبیر داس تیسری کبیر کسوٹی چوتھی کبیر داس پانچویں کبیر جنم ساکھی۔

کبیر بیجک ناگری میں ہے۔ اور لکھنؤ کے مطبع نولکشور میں چھپی ہے۔ اور کبیر پنتھی اسی کو ٹھیک سمجھتے ہیں۔ اگرچہ اس میں بہت سی خلاف عقل باتیں بھی ہیں۔ جیون چرتر کبیر داس سوہن لال صاحب کایستھ نے ۱۹۰۳ء میں لکھی تھی۔ اور یہ بھی کشوری مطبع لکھنؤ میں چھپی ہے۔ اس کتاب میں بے سر و پا قصوں کے علاوہ کبیر کو ہندو ثابت کرنے کی اس طرح کوشش کی گئی ہے جو مسلمانوں کو ناگوار ہوتی ہے۔ کبیر کسوٹی ۱۸۸۵ء میں پنج کبیر پنتھیوں نے مل کر لکھی تھی جو بمبئی کے ایک مطبع نے چھاپی ہے۔

Marfat.com

اس میں بھی خوش اعتقادی کے جوش نے اصل حقیقت ظاہر نہیں ہونے دی۔ تاہم یہ غنیمت ہے کہ حالات اور کلام کا ذخیرہ اس میں زیادہ ہے۔

کبیر داس کتاب لالہ تیرتھ رام صاحب فیروز پوری نے اردو میں لکھی ہے اور لاہور میں چھپی ہے۔ لالہ تیرتھ رام صاحب انگریزی ناولوں کے مشہور اور کامیاب مترجم ہیں مگر یہ کتاب انھوں نے آریہ سماجی خیالات سامنے رکھ کر لکھی ہے۔ کتاب کا کاغذ بھی خراب ہے۔ اور چھپائی ایسی ہے کہ اس کے مضامین کا سمجھنا ناممکن ہے۔

کبیر جنم ساکھی ایک مسلمان منشی محمد خلیل صاحب انصاری نے اردو میں لکھی ہے اور منشی قربان علی صاحب ایڈیٹر اردو ئے معلی دہلی نے اس کو خوش خط اور اچھے کاغذ پر چھاپا ہے۔ اس کتاب میں سرکاری گزیٹروں کے اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں۔ اور ہندو مسلمانوں کے خیالات کو بھی ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ اور کلام بھی ایسا شائع کیا ہے جو سمجھ میں آتا ہے۔ اور ہندی کلام کا اردو ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے۔ مگر اس کتاب میں بھی قومی اور مذہبی کشش موجود ہے۔ یعنی کبیر کو مسلمان ثابت کرنے کوشش کی گئی ہے۔ ان سب کتابوں کو پڑھنے اور سب کے بیانات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ کہ بھگت کبیر کی ماں مسلمان تھیں اور باپ برہمن تھے۔ اور ان کو برہمن اور اعلیٰ ذات کے ہندو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ ان کی ماں جولاہہ قوم کی مسلمان عورت تھیں۔ اور ہندوؤں کی پرانی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھوت ذاتیں اسی طرح پیدا ہوئی ہیں۔ کہ جب برہمن یا چھتری یا ویش اونچی ذات کے کسی مرد کا کمین ذات کی کسی عورت سے تعلق ہو جاتا تھا تو جو اولاد ان سے ہوتی تھی وہ اچھوت اور کمین بھی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کبیر کے بھگتوں اور ماننے والوں نے یہ تو لکھا ہے کہ کبیر نیلوفر کے پھول سے پیدا ہوئے تھے۔ اور اونچی ذات کے ہندوؤں نے یہ لکھا ہے کہ ایک بچہ پڑا ہوا مل گیا تھا۔ جس کو ایک ہندو سادھو نے پال لیا۔ اور بعض ہندوؤں نے

یہ بھی لکھا ہے کہ کبیر مسلمان گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ اور مسلمانوں میں ان کی شادی ہوئی تھی۔ اُن کی بیوی کا نام لوئی تھا۔ اور اُن کے بیٹے کا نام کمال تھا۔ اور اُن کی بیٹی کا نام کمالی تھا۔ لالہ تیرتھ رام فیروز پوری نے اُن کے مسلمان رشتہ داروں کے نام بھی لکھے ہیں۔

بھگت کبیر کی زندگی میں بھی ہندو مسلمان قومیں اپنی اپنی جگہ ان کو اپنا خیال کرتی تھیں۔ یعنی ہندو کہتے تھے کہ کبیر ہندو ہیں۔ اور مسلمان کہتے تھے کہ کبیر مسلمان ہیں۔ اور جب کبیر کا انتقال ہوا تو دونوں قوموں میں کبیر کی میت جلانے اور دفن کرنے کے مسئلہ میں جھگڑا پڑا۔ اور نوبت خوں ریزی کی آگئی۔ آخر ایک غیبی آواز سُنکر لوگوں نے بھگت کبیر کے مردہ جسم کا کپڑا اٹھایا تو وہاں لاش موجود نہ تھی بلکہ پھولوں کا ایک ڈھیر تھا۔ ان پھولوں کو ہندو مسلمانوں نے آدھا آدھا بانٹ لیا۔ ہندوؤں نے وہ پھول جلادیئے اور مسلمانوں نے دفن کر دیئے۔

کبیر پنتھی لوگوں کا بیان ہے کہ کبیر ۱۲۹۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اور ۱۴۱۸ء میں وفات پائی۔ گویا وہ کبیر کی عمر ایک سو بیس برس کی مانتے ہیں۔

ضلع بنارس کے سرکاری گزیٹر میں لکھا ہے کہ کبیر ضلع اعظم گڈھ کے گاؤں بلہرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے کبیر پنتھی ہونا لکھوایا ہے اُن کی تعداد علاوہ پنجاب کے آٹھ لاکھ تینتالیس ہزار ایک سو اکھتر تھی۔ اور پنجاب میں کبیر پنتھی سب صوبوں سے زیادہ ہیں۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ یہ تعداد درست نہیں ہے۔ کیونکہ کبیر کے ماننے والے ہندوستان میں کروڑوں آدمی ہیں۔ جن میں چمار۔ اور دھوبی اور کولی اور جولاہے بہت زیادہ ہیں۔ اور ان سب کی تعداد ایک کروڑ سے کم نہ ہوگی۔

بھگت کبیر مسلمان درویش تھے۔ مگر وہ کسی خاص قوم یا خاص فرقہ کے پابند نہیں تھے۔ اُن کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جہاں ہندوؤں کے مراسم اور ہندوؤں

کے عقائد پر نکتہ چینی کرتے ہیں ویں مسلمانوں بعض عقائد اور مراسم پر بھی طعن کرتے ہیں۔ انھوں نے فرقہ بندی کے اختلاف کے خلاف ساری عمر کام کیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی ایسے فقرے بھی کہہ گئے جس سے اُن کی صلح پسندی ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً انھوں نے ایک مرتبہ کہا

مندر اندر بامن پوجے مکہ اندر شیخا　　　　کہیں کبیر سنو بھی سادھو ہر جیسے کو تیسا

یعنی انھوں نے ہندو مسلمانوں کی خدا پرستی کے اختلاف کا یہ کہہ کر فیصلہ کر دیا کہ خدا کو کسی طریقہ سے بھی پوجو خدا اُسی طریقہ سے بندہ کی پوجا قبول کر لیتا ہے۔

ذات پات } کبیر کے حالات پر فلسفیانہ نظر سے غور کیا جائے تو معلوم ہو گا چونکہ اونچی ذاتوں کے ہندو کبیر کو اور اُن جیسے سب لوگوں کو حقیر سمجھتے تھے۔ اس لئے کبیر نے ذات پات کا بندھن توڑنے کے لئے بہت زیادہ کوشش کی تھی۔ اور اچھوت قوموں میں اُن کی ہر دل عزیزی کا راز یہی تھا کہ کبیر وہ بات کہتے تھے جو اچھوت قوموں کے دلوں میں چھپی ہوئی تھی۔

اچھوتوں کی آزادی اور ترقی کا کبیر کو بہت زیادہ خیال تھا۔ اگر کبیر کے بعد اُن کی تحریک کو چلانے والے اس تحریک کو مذہبی نہ بنا دیتے تو ہندوستان میں اچھوتوں کی حالت بہت کچھ سنبھل جاتی۔

سکھ مذہب کی بنیاد } بھگت کبیر کے حالات کی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ گرو نانک صاحب کبیر کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے۔ اور انھوں نے سکھ مذہب کی بنیاد رکھتے وقت بھگت کبیر کے خیالات سے بہت زیادہ کام لیا تھا۔ گرنتھ صاحب میں بھی کبیر کے اشعار بکثرت موجود ہیں۔ اور ذات پات کے بندھن کے خلاف گرو نانک صاحب نے سب کچھ کبیر کے خیالات کی تائید میں کام کیا ہے۔ پس اگر سکھوں کو بھی کبیر کا ماننے والا کہا جائے تو غلط دعویٰ نہ ہو گا۔

Marfat.com

بنارس کے سرکاری گزیٹر سے معلوم ہوتا ہے کہ بھگت کبیر سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں موجود تھے۔ ۱۴۸۸ء میں سلطان سکندر لودی ہندوستان میں حکومت کرتا تھا اور گرونانک صاحب لودی حکومت کے خاتمہ کے بعد شہنشاہ بابر کے زمانہ میں ہوئے ہیں۔

بھگت کبیر کا کلام بت پرستی کی نسبت کہتے ہیں۔

پتھر پوجے ہرملے تو ہم پوجیں پہاڑ   اس سے تو چکی بھلی کر پیس کھائے سنسار

یعنی اگر پتھر پوجنے سے خدا مل جاتا۔ تو کبیر کہتے ہیں کہ" میں پتھر کا چھوٹا سا بت نہ پوجتا۔ بلکہ پتھر کے بڑے پہاڑ کو پوجتا۔ پھر کہتے ہیں کہ بت کے پتھر سے تو چکی کا پتھر اچھا۔ کہ اُس سے ساری دنیا آٹا پیس کر کھاتی ہے۔ پتھر کے بت سے تو اتنا فائدہ بھی آدمیوں کو نہیں ہوتا۔

دنیا کی تمام اشیاء کو مٹتے اور فنا ہوتے دیکھ کر کبیر کے غور کرنے والے دل پر جو اثر ہوا اُس کو اس شعر میں ادا کیا ہے۔

چلتی چاکی دیکھ کر دیا کبیرا روئے   دو پاٹن کے بیچ میں ثابت بچا نہ کوئے

یعنی جب میں نے چکی کے دونوں پاٹوں کو چلتا ہوا اور آٹا پیستا ہوا دیکھا تو مجھے رونا آگیا کہ ان دونوں پاٹوں کے بیچ میں دانہ ثابت باقی نہ رہا۔ اور فنا ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان اور زمین چکی کے دو پاٹ ہیں۔ اور دونوں چل رہے ہیں۔ اور دونوں کے بیچ میں فنا کا بازار گرم ہے۔

اسی طرح بھگت کبیر نے مرکز پر قائم رہنے کے فائدہ کو جیسی عمدگی سے بیان کیا ہے، وہ سننے اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہتے ہیں۔

چاکی چاکی سب کہیں مانی کہے نہ کوئے   مانی سے جو لگ رہا بال نہ بیکا ہوئے

یعنی آٹا پیسنے کی چکی کو دیکھ کر سب یہی کہتے ہیں کہ چکی ہے۔ مگر یہ بات کوئی نہیں کہتا کہ چکی مانی کے سہارے چل رہی ہے اس لئے اُس کو مانی کہنا چاہئے۔ (چکی کے بیچ کے

Marfat.com

پاٹ میں ایک کیل لگی رہتی ہے۔ اور اس کیل کے سہارے اوپر کا پاٹ چلتا ہے۔ اس کیل کو ہندی میں مانی کہتے ہیں۔ کبیر نے چکی کا چلنا بہت غور سے دیکھا ہوگا۔ جو دانے مانی کے پاس آجاتے ہیں ان کو چکی کے پاٹ نہیں پیس سکتے۔ اور وہ قائم رہتے ہیں کبیر نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ جو آدمی خدا کو اپنا مرکز بنا لیتا ہے۔ یا دنیا میں کوئی مرکز مقرر کر لیتا ہے اور اُس کے سایہ میں آجاتا ہے تو دنیا کے چکر کی تکلیفوں سے بچ جاتا ہے۔ جیسے کہ چکی کے دونوں پاٹوں کے چلنے سے غلہ کا وہ دانہ نہیں پستا جو مانی کی آڑ میں پناہ لے لیتا ہے۔

ایک جگہ فانی چیزوں کے پوجنے اور خدا کی باقی رہنے والی ذات کی پوجا کے فرق کی نسبت یہ خیال ظاہر کرتے ہیں۔

ٹھاکر پتھر مالا لکڑ تیرتھ ہیں سب پانی ‏ ‏ راما کرشنا مر گئے دیکھے چاروں وید کہانی
راما مر گئے کرشنا مر گئے۔ مر گئی لکھو بانی ‏ ‏ اُس کی سادھو کیوں نہ پوجو جس کو موت نہ آنی

یعنی بت اور پوجنے کے پتھر اور تسبیح اور پیپل اور گنگا اور جمنا سب کو فنا ہے۔ چاروں وید بھی دیکھ لئے وہ بھی ایک کہانی ہیں۔ رامچندر جی اور کرشن جی اور لکھو بانی کو بھی موت آگئی۔ پھر اے فقیرو اُس کو کیوں نہیں پوجتے جس کو موت نہیں آتی۔

جو پیدائشی برا ہو اس کو نیک بنانے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی گڑ سے نیم کی جڑ میں گڑ اور گھی یہ سمجھ کر ڈالے کہ اُن سے نیم کی کڑواہٹ جاتی رہے گی اس کو کہتے ہیں

جاکی جیسی بھاؤ جائے نہ جی سے ‏ ‏ نیم نہ میٹھا ہوئے سینچے گڑ گھی سے

دوسری جگہ اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ عقل خدا جس کو چاہتا ہے اُس کو دیتا ہے اور جب خدا چاہتا ہے تو عقلمندوں کی سمجھ کو چھین لیتا ہے۔ کہتے ہیں۔

جیسی کرنی دیو کی ویسی اُپجت بدھ ‏ ‏ ہونہار ہردے بسے بسر جات سب سدھ

ایک جگہ انسانی جسم کے چاروں عناصر سے بالا ہو کر خدا کا دھیان کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ فرمایا ہے۔

Marfat.com

چہ تتے کھنڈ چڑھ کرے جو باسا ؛ مرن جیون کا رہے نہ سانسا ؛

یعنی جو شخص آگ پانی اور ہوا، خاک کے جسمانی عناصر سے اونچا ہو کر خدا کو یاد کرے تو پھر اُس کو مرنے جینے کا خوف نہیں رہتا۔

دنیا کی زندگی میں سب آدمی اپنی اپنی حد کے اندر رہتے ہیں۔ اور حد کے باہر آج تک کوئی نہیں گیا۔ مگر کبیر کہتے ہیں کہ میں دنیا کی مقررہ سرحد سے بھی آگے بڑھا۔ اور اَن حد کے میدان میں جا کر سو گیا۔ فرمایا ہے۔

حد حد کرتے سب گئے اور اَن حد گیا نہ کوئے

اَن حد کے میدان میں رہا کبیرا سوئے

کبیر کے زمانہ میں ہندو مسلمان دونوں خدا پرستی کا دعویٰ کرتے تھے۔ اور کبیر سے پہلے بھی دنیا کے سب آدمی اپنی اپنی زبان میں خدا کا نام لیتے تھے۔ اور ایک دوسرے سے اس بات پر لڑتے تھے کہ وہ بھی خدا کا اِسی زبان میں نام لیں کہ جس زبان میں وہ خدا کا نام لیتے ہیں۔ بھگت کبیر نے آپس کے یہ جھگڑے دیکھے تو انھوں نے بہت مزہ دار ڈھنگ سے اِس بُرائی کو ظاہر کیا۔ کہتے ہیں۔

کبیر بھلا ہوا ہر بسرے سر سے ٹلی بلا ؛ ہر ہمارا ہمیں جپے ہماری جپے بلا

یعنی اے کبیر بہت اچھا ہوا کہ میں خدا کو بھول گیا۔ اور میرے سر سے ہر کو یعنی خدا کو یاد کرنے کی ذمہ داری کی بلا ٹل گئی۔ خدا تو خود اپنی مخلوق کا نام جپتا ہے ہمیں کیا پڑی جو ہم اُس کا نام جپنے کی فکر کریں۔

جو لوگ تصوف اور یوگ کے مقامات سے واقف ہیں وہ کبیر کے اس کلام کا مزہ اٹھائیں گے۔ کیونکہ اگرچہ بظاہر یہ کلام گستاخانہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبیر خدا کا نام لینے سے منکر ہو گئے ہیں۔ مگر درحقیقت اس شعر میں کبیر نے تصوف کے اُس مقام کو بیان کیا ہے جہاں بندہ اپنے وجود اور خودی سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور اُس کے

Marfat.com

احساسِ ذاتی میں اُس کی خودی باقی نہیں رہتی۔ اِس شعر میں بڑی لطافت اور ادبی خوبوں کے ساتھ ایک بہت بڑے مسئلہ کو کبیر نے بیان کیا ہے۔ میں اپنے ہاں قوالی کی مجلسوں میں کبیر کا یہ کلام بار بار سنتا ہوں۔ اور صوفیوں کو اس پر وجد و حال آتا ہے۔

بھگت کبیر نے بھی گوتم بدھ کی طرح اِس دنیا کو دُکھ سے بھرا ہوا سمجھا تھا۔ کہتے ہیں۔

تن شکھیا وہ ہر شکھیا کوئی نہ دیکھا جو دیکھا سو دُکھیا رے

ڈگر چلتی سب گھٹ دُکھیا کیا گرہی اور بیراگی رے ؛؛

اونچے چڑھ چڑھ دیکھا تماشہ گھر گھر ایک ہی لیکھا رے

چاند دکھت ہے۔ سورج دُکھیا نس دن مت پھر جائے رے

یعنی دنیا کے کسی جسم والے کو سُکھ اور خوشی میں نہ دیکھا سب دُکھ میں مبتلا ہیں۔ زندگی کے راستہ پر چلنے والے سب دکھیا ہیں۔ چاہے گھر دار ہوں چاہے تارک دنیا ہوں۔ ذرا اونچے پر چڑھ کر دنیا کے سب گھروں کا تماشہ دیکھو۔ صاف نظر آجائے گا کہ سب کے سب ایک ہی حال میں مبتلا ہیں۔ یہاں تک کہ آسمان کے چاند سورج بھی دُکھ میں پھنسے ہوئے ہیں۔

ذات پات کے اختلاف کی نسبت اُن کے بہت سے اشعار ہیں۔ مگر ایک شعر ایسا ہے جو حضرت جامی کے اِس فارسی شعر کی طرح مشہور ہے اور ہر ہندو مسلمان کی زبان پر ہے۔ جامی کہتے ہیں سہ

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

یعنی اے جامی اگر تو خدا کی محبت کا حلقہ بگوش ہو گیا ہے تو اپنے نسب اور جنم کی بڑائی کے خیال کو چھوڑ دے کہ محبت کے راستہ میں یہ بات کہ فلاں آدمی فلاں کا بیٹا ہے کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ کبیر اس مضمون کی نسبت کہتے ہیں۔

ذات پات پوچھے ناکوئے ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے ؛؛

یعنی خدا کا وہی بندہ مقبول ہوتا ہے جو خدا کو یاد کرتا ہے۔ اِس معاملہ میں ذات پات کو کوئی نہیں دیکھتا

Marfat.com

اور کوئی نہیں پوچھتا۔ کہ فلاں سید ہے۔ فلاں برہمن ہے اس لئے وہ خدا کا پیارا ہے۔ کبیر کہتے ہیں نہیں۔ خدا کا پیارا وہی ہے۔ جو خدا کو یاد کرے۔ چاہے وہ کیسی ہی ادنیٰ ذات کا ہو۔

خلاصہ کہ اس بات چیت کا خلاصہ مطلب یہ ہے۔ کہ بھگت کبیر ہندو مسلمانوں کے جھگڑوں سے پاک تھے۔ اور ہندو مسلمان بھی ان کو غیر اور پرایا خیال نہ کرتے تھے۔ اور وہ ہندوستان کی اس بات کے خلاف تھے۔ کہ یہاں ذات پات کا بندھن حد سے بڑھ گیا ہے۔ وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ اور مسلمان تھے۔ اور مسلمانوں میں اُن کی شادی ہوئی تھی۔ اور اُن کی اولاد بھی مسلمان تھی لیکن اُن کو ہندو قوم کے اچھوتوں کی ترقی اور اصلاح کا اتنا زیادہ خیال تھا کہ لوگ اُن کو ہندو سمجھنے لگے تھے۔ اور یہ بیان درست نہیں ہے کہ وہ سوامی رامانند کے چیلے ہو گئے تھے۔ البتہ یہ سچ ہے کہ وہ ہندو مسلمان درویشوں کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ اور امیروں کے مقابلہ میں غریبوں کے ساتھ اُن کو زیادہ محبت تھی۔ اُن کے دل میں مخلوق کا درد بھی بہت تھا۔ اور وہ ہمیشہ دنیا والوں کے دُکھ درد پر غور کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے غریبوں کو خوش حال زندگی بسر کرنے کے بہت آسان سبق دئے ہیں۔ اور اچھوت ذاتوں کا دل بڑھانے اور اُن کو آدمی کا درجہ دینے کے لئے تو بھگت کبیر ساری عمر کام کرتے رہے پس آج کل جو لوگ اچھوت سدھار کا کام کرنا چاہتے ہیں وہ بھگت کبیر کے حالات پر غور کریں۔ اُن کو اچھوتوں کی اصلی خواہشوں کا حال بھی معلوم ہو جائے گا۔ اور وہ کبیر کے اصول بیان سے اچھوت سدھار کا کام بھی ایسا کر سکیں گے جو اچھوتوں کو سچ مچ فائدہ پہنچے۔

کبیر کا یہ مضمون ختم کرنے سے پہلے مجھ حسن نظامی کو یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بڑے ہندوستانی کے حالات بیان کرنے کے لئے تو کئی برس کا وقت درکار ہے۔ پندرہ منٹ میں اتنا ہی کہا جا سکتا ہے جتنا کہا گیا۔

خلاصہ تعلیم تصوف
مسلمان صوفیوں کی سینہ بسینہ تعلیم کے اسرار قیمت ۶ ریال:۔ دفتر اخبار منادی دلی

غالب کا حلیہ

جو ۱۶ فروری ۱۹۳۶ء کی شام کو خواجہ صاحب نے دلی ریڈیو کے ذریعہ تمام دنیا کو سنایا۔

نواب اسداللہ خاں غالب کی قبر میرے گھر سے سو قدم کے فاصلہ پر جانب شرق واقع ہے۔ اور میں نے جس مکتب میں تعلیم پائی تھی وہ تو اس قبر کے سامنے ہے۔ مرزا غالب کے سرہانے پچاس برس پہلے جب میری عمر ۹ سال کی تھی گوندنی کا ایک درخت تھا۔ مکتب سے چھٹی ملتی تو میں اس درخت کی گوندنیاں قبر کے پاس بیٹھ کر کھایا کرتا تھا۔ اگر شاعری کی شریعت میں اس کو شاگردی کہہ سکتے ہوں تو میں اس طرح غالب کا شاگرد بھی ہوں۔

یکم فروری ۱۹۳۶ء کو دہلی براڈ کاسٹنگ کی فرمائش پر غالب کا حلیہ لکھنا چاہا تو سورج نکلنے سے ایک گھنٹہ پہلے مزار غالب پر گیا۔ خاصہ اندھیرا تھا۔ سردی ایسی کہ دانت سے دانت بجتے تھے۔ مزار غالب کے پائین کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہ کتنے بڑے ہندوستانی شاعر کی قبر ہے۔ جو ہر ہندوستانی کو پیارا ہے۔ اور ہر قوم اس کو چاہتی ہے۔ مگر میں نے اس کو دیکھا نہ تھا۔ اس کا حلیہ کیونکر لکھوں؟ یکایک تصور کے کان میں ایسی آواز آئی کہ کوئی مجھے پکارتا ہے۔ دل نے کہا ہو نہ ہو استاد غالب پکار رہے ہیں۔ گوش ہوش سے سنوں کیا کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوا گویا کہتے ہیں۔

ارے بھائی اس سردی میں تو کہاں آگیا؟ کیا یہ وقت ان ویرانوں میں آنے کا ہے؟ میری طرف سے کسی نے جواب دیا۔ استاد تمہارا حلیہ لکھنا ہے۔ صورت کا۔ سیرت کا۔ بیٹھنے کا۔ رہنے سہنے کا۔ تصور اور خیال کے کان میں آواز آئی

صاحبزادہ! تم کو تو اس دن سے جانتا ہوں جب گوندنیاں کھانے آیا کرتے تھے۔ اور جب پنجاب کے اقبال و نیرنگ کو لے کر آئے تھے۔ اور ولایت خاں قوال نے میرے پہلو میں بیٹھ کر میری یہ غزل سنی تھی۔ کہ

Marfat.com

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں؟ اُٹھیئے کہ بس اب لذتِ خوابِ سحر گئی

اور جب تم غالب کا روزنامچہ' کتاب لکھ رہے تھے تب بھی میری روح تمہارے قریب بیٹھی مسکرایا کرتی تھی۔ اور مزارِ خسروؒ کے قریب تو بارہا میری روح نے تم کو دیکھا ہے۔

تم چاہتے ہو کہ میرا حلیہ اور میری دُکھ بھری زندگی کی تصویر نثر میں دکھاؤ تو لو میں اپنی بول چال میں اور خاص اپنے ہی الفاظ میں تمہاری تحریر کے اندر آکر بولنے لگتا ہوں۔ تاکہ سب پڑھنے والوں اور سننے والوں کے سامنے میری بولتی چالتی شکل آجائے۔

پہلے میرا زندگی نامہ میری زبان سے یوں سُنانا۔ اور کہہ دینا کس نے کہا تھا۔ کہ غالب مرگیا۔ قبر میں گڑ گیا۔ بھائی میں تو زندہ ہوں اور ہندوستان کے ہر گھر میں موجود ہوں۔ میرا حلیہ تم کیا لکھو گے۔ میرے ہی لکھے ہوئے الفاظ لکھ دو۔

سُنو! میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراءالنہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا۔ سلطنت ضعیف ہوگئی تھی صرف پچاس گھوڑے نقارہ دار نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالہ کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اُس کے جو طوائف الملوکی کا بازار گرم تھا۔ وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جاکر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصر اللہ بیگ خاں میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا۔ اُس نے مجھے پالا ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا۔ صوبہ داری کمشنری ہوگئی۔ اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سواروں کا برگیڈیر مقرر ہوا۔ ایک ہزار روپیہ ذات کا۔ اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے سال کی جاگیر حین حیات علاوہ سال بھر مرزبانی کے تھی کہ بمرگ ناگہاں مرگیا۔ رسالہ برطرف ہوگیا۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہوگئی۔ وہ اب

Marfat.com

تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا۔ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گیا۔ نواب گورنر جنرل سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی۔ یعنی گورنر جنرل سے ملاقات ہوئی۔ سات پارچے اور جیغہ سرپیچ۔ مالائے مروارید یہ تین رقم کا خلعت ملا۔ زاں بعد جب دلی میں دربار ہوا مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہوگئے۔ میری بریت کی درخواست گزری تحقیقات ہوتی رہی۔ تین برس بعد پنڈ چھٹا۔ خلعت معمولی ملا۔ باشد۔ بدگمانی تو دور ہوئی۔ خیال تو حاکموں کا صاف ہوا۔ یہ تو میرا زندگی نامہ اور اُس کی مختصر سرگزشت تھی۔ اب حلیہ چاہتے ہو تو سنو! وہ بھی مجھ ہی سے سنو!

غالب کا حلیہ } جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا۔ اور دیدہ ور لوگ اس کی ستایش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو اپنا وہ رنگ یاد آجاتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ کیونکہ اس بھونڈے شہر دلی میں ایک وردی ہے عام۔ ملا۔ حافظ۔ بساطی۔ نیچہ بند دھوبی۔ سقے۔ بھٹیارے۔ جلاہے۔ کنجڑے۔ منہ پر ڈاڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اُسی دن سر منڈایا۔

اب تم میرے بیان کی جو میرے وجود کا مجمل خاکہ ہے۔ تفصیل لکھنی چاہو تو لکھ دو کہ میں خوب گورا سرخ و سفید جوانی میں تھا قمری کے محبوب سرو سے قد ملتا جلتا تھا چہرہ ترکانہ پیشانی چوڑی اور بلند۔ آنکھیں بڑی بڑی بھی طرح دار بھی۔ چمکیلی اور مخمور بھی۔ ناک اونچی۔ سیدھی۔ رخسار بچپن میں اور جوانی میں دانۂ انار بڑھاپا آیا تو سفید اور زار و نزار۔ سینہ چوڑا جس کے پہلو میں درد سے بھرپور دل۔ بڑا بھی۔ سوز و گداز سے لبریز بھی۔ اور سلطنت اُجڑ جانے۔ بڑوں کا نام و نشان مٹ جانے اور نظربازوں کی نشانہ بازی سے پاش پاش۔ زخمی اور نڈھال بھی۔ سر

میں ایک دماغ۔ دماغ میں ایک چراغ۔ رات دن روشن رہتا تھا۔ ہزاروں دماغوں کے چراغ اس ٹمٹماتے چراغ سے روشن ہوتے تھے۔ دانت موتی تھے۔ وقت کے رواج سے ان پر مسی ملتا تھا۔ کہ اجالے میں ہلکا سا ابر بھی رہے۔ اور مسی کے سہارے دانتوں کی چمک اچھی معلوم ہو۔

مذہب } نہ ہندو نہ مسلمان۔ عیسائی نہ موسائی۔ شیعہ نہ سنی۔ بڑے تلوار کو پوجتے تھے۔ میں نے قلم کو بھی بت خانہ میں بٹھایا ہے۔ ایک کو مانتا ہوں۔ ایک کو دیکھتا ہوں۔ ایک کو پاتا ہوں ایک ہی سے دل لگانے میں مزہ آتا ہے۔ سپاہی زادہ کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ قلم سے جی لگایا تو علی اسداللہ کی ادا جی کو بھاگئی۔ وہ یداللہ تھے۔ باب العلوم تھے۔ مالکِ سیف و قلم تھے۔ اُن کو مولیٰ بنالینے سے ایک کا ہو گیا۔ ایک کا بن گیا۔ یہ تو عقیدت کا ایک ٹھکانا بنایا ہے۔ ورنہ میرا دین و ایمان تو انسان کی ذات اور اس کی خدمت و محبت ہے۔ آدمی ہوں تو آدمی کو چاہوں گا اور آدمیت سے باہر جو کچھ ہو اس سے سو سو کوس دور رہوں گا۔ (یہ حسن نظامی کے فقرے تھے)

طبیعت } علم و ہنر سے عاری ہوں۔ لیکن پچپن برس سے محو سخن گزاری ہوں۔ مبدأ فیاض کا مجھ پر احسانِ عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی اور سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہل پارس کے منطق کا مزہ بھی ابدی لایا ہوں۔ مناسبت خداداد۔ تربیت استاد حسن و قبح ترکیب پہچاننے فارسی کے غوامض جاننے لگا۔

کلام } میرا کلام۔ کیا نظم، کیا نثر۔ کیا اردو۔ کیا فارسی کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا۔ کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو اُن کے لاکھوں روپے کے گھر لٹ گئے جن میں ہزاروں روپے کے کتب خانے بھی گئے اس میں یہ مجموعہ ہائے پریشاں بھی غارت ہوئے۔

غدر کی تاریخ } میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی ۱۵ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے۔ اور اس کا التزام کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی عربی لفظ نہ آئے۔ جو نظم اس نثر میں درج ہے

وہ بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے۔ اس کا نام دستنبو رکھا ہے۔

غالب نظامی تھے} میاں نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم صاحبؒ کی۔ اور وہ خلیفہ تھے مولوی فخرالدین صاحبؒ کے۔ اور مولوی فخرالدین صاحب تھے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے سلسلۂ نظامیہ کے۔ اور میں مرید ہوں اس چشتیہ نظامیہ خاندان کا۔

شرکت مشاعرہ} مشاعرہ یہاں شہر دہلی میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعہ میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں کبھی نہیں جاتا۔ اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے اب کے ہو اب کے نہ ہو۔

دلی شہر} میرے حال میں میرے شہر دلی کا حال بھی لکھنا چاہو کہ میرے آخری وقت میں اس کا کیا حال تھا تو میری یہ عبارت نقل کر دو۔

کہتے ہیں دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ مگر اب یہ وہ دلی نہیں ہے۔ بلکہ ایک کیمپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ۔ یا حکام کے شاگرد پیشہ۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں اور جوان کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا۔ سو روپے کا پنشن دار۔ سو روپے مہینہ کا روزینہ دار بن کر نامراد بن گیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ۔ نانا کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے بیمار پڑا۔ نہ دوا نہ غذا۔ انجام کار مر گیا۔ ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آ گیا ہے۔ اس کے پاس ایک پیسا نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھئے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر نوش جاں کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدین کی پانسو روپے کی املاک واگزاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ۔ خراب پھر لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ۔ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں

Marfat.com

شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی کیوں پایا جاتے؟

مسلمان امیروں میں تین آدمی حسن علی خاں۔ نواب حامد علی خاں۔ حکیم احسن اللہ خاں سو اُن کا یہ حال ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں اور کپڑا ہے تو روٹی نہیں۔

پرسوں فرخ مرزا آیا۔ اُس کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا۔ پوچھا کیوں صاحب میں تمہارا کون ہوں؟ اور تم میرے کون ہو؟ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ حضرت آپ میرے دادا اور میں آپ کا پوتا ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ تمہاری تنخواہ آئی؟ کہا۔ جناب عالی آغا جان کی تنخواہ آگئی ہے میری نہیں آئی۔ میں نے کہا۔ لوہارو جاتے تو تنخواہ پاتے۔ کہا۔ حضرت میں تو آغا جان سے روز کہتا ہوں۔ لہارو چلو۔ اپنی حکومت چھوڑ کر دلی کی رعیت میں کیوں مل گئے؟

سبحان اللہ۔ بالشت بھر کا لڑکا۔ اور یہ فہم درست۔ اور یہ طبع سلیم۔ میں اُس کی خوبی خو اور فرخی سیرت پر نظر کر کے اُس کو فرخ سیر کہتا ہوں۔ (حسن نظامی کہتا ہے۔ فرخ مرزا ہز ہائی نس نواب سر امیر الدین احمد خاں کا نام ہے۔ جو اسی سال انتقال کر گئے اور ریاست لہارو میں دفن ہوئے)

دلّی کا حلیہ } ارے میاں سنتے ہو یا سو گئے؟ تم مجھ سے دلی کا حال سن رہے تھے فرخ مرزا کا ذکر تو یوں ہی بیچ میں آ گیا تھا۔ ہاں تو سنو! کل پنجشنبہ ۲۵ مئی ۱۸۵۸ء کو اول روز پہلے بڑے زور کی آندھی آئی۔ پھر خوب مینہ برسا۔ وہ جاڑا پڑا کہ تمام شہر کرہ زمہریر ہو گیا۔ بڑے دریبہ کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچہ کا بقیہ مٹایا گیا۔ فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو گلدستے ہیں جن کو عوام گمزی کہتے ہیں ان کو ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنا دُھا دی۔ اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

ریگستان کے ملک سے ایک سردار زادہ۔ کثیر العیال عسیر الحال عربی، فارسی، انگریزی تین زبانوں کا عالم دلی میں وارد ہوا ہے۔ بلی ماروں کے محلہ میں ٹھہرا ہے۔ بحسب ضرورت حکام شہر سے مل لیا ہے۔ باقی گھر کا دروازہ بند کئے بیٹھا رہتا ہے۔ گاہ گاہ نہ ہر شام و پگاہ غالب علی **شاہ** کے تکیہ پر آ جاتا ہے۔

Marfat.com

حکام کا شبہ مجھ پر انگریز حکام کو بڑا شبہ تھا۔ کہ بہادر شاہ کا اس نے سکہ کہا ہو مصاحب بنا۔ پنشن بند۔ دربار بند۔ گورنر جنرل نے صاف کہدیا کہ تم سے ملنا منظور نہیں۔ مگر میں نے رفع شک کی کوشش جاری رکھی۔ آخر میرا پنشن کھلا۔ چڑھا ہوا روپیہ دام دام ملا۔ آئندہ کو بدستور بے کم و کاست جاری ہوا۔ نواب لفٹننٹ گورنر بہادر نے یاد کیا۔ حاضر ہوا۔ تصور میں کیا بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی وہ حاصل ہوئی۔ یعنی عنایت سے عنایت۔ اخلاق سے اخلاق وقت رخصت خلعت دیا۔ اور فرمایا کہ ہم تجھ کو اپنی طرف سے ازراہ محبت دیتے ہیں۔ اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ گورنر جنرل کے دربار میں تیرا نمبر اور خلعت کھل گیا۔ انبالہ دربار میں شریک ہونا خلعت لینا۔

مہجور کی یاد بھئی واہ کیا آدمی ہو۔ میری باتیں لکھے چلے جاتے ہو۔ میرے شہر دلی کے اُن مقتولوں کا حال نہیں لکھتے جن کی یاد اور ہجر و فراق نے کلیجہ پر ناسور ڈال دئے ہیں۔

مظفر الدولہ۔ میر ناصر الدین۔ مرزا عاشور بیگ میرا بھانجہ۔ اُس کا بیٹا۔ احمد مرزا انیس برس کا بچہ۔ مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ۔ اُس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں قاضی فیض اللہ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کی برابر نہیں جانتا تھا۔ اے لو بھول گیا حکیم رضی الدین خاں میر احمد حسین میکش۔ اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں سب مارے گئے۔ غم فراق حسین مرزا میر مہدی۔ میر سرفراز حسین۔ میرن صاحب کہ جیتے ہیں خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے۔ گھر اُن کے بے چراغ۔ وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے۔ مگر میں علیؑ کو گواہ کر کے کہتا ہوں۔ کہ ان اموات کے غم و اندوہ کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

بھائی ضیاء الدین عرب سرا میں رہتے ہیں۔ پرسوں سے آئے ہوئے ہیں۔ دوڑتے پھرتے ہیں۔ عرضیاں دیتے پھرتے ہیں۔ شہر میں آمد و رفت پر ٹکٹ تھا۔ وہ اب موقوف ہو گیا۔ ہاں فقیر اندر نہ آتے اور کوئی ہتھیار بیکر نہ آتے۔ باقی ہندو مسلمان، عورت۔ مرد۔ سوار پیادہ جو چاہے چلا آئے۔ چلا جائے۔

غالب کی کتابیں } میری کتابوں کا حال کیا پوچھتے ہو۔ پنج آہنگ کے دو چھاپے ہیں۔ ایک بادشاہی چھاپہ خانہ کا۔ اور ایک منشی نور الدین کے چھاپہ خانہ کا۔ پہلا ناقص ہے۔ دوسرا سراسر غلط ہے۔ ضیاء الدین خاں جاگیر دار لہارو میرے بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں۔ جو نظم و نثر میں نے لکھا وہ انھوں نے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ کلیات نظم فارسی چون پچپن جزو اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز اور دیوان ریختہ سب مل کر سو سوا سو جزو مطلا و مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ کوئی ڈیڑھ دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب ایک جا ہے۔ پھر ایک شاہزادہ نے اس مجموعۂ نظم و نثر کی نقل لی۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور یہ شہر لٹے۔ وہ دونوں جگہ کا کتب خانہ خوان لغیما ہو گیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے۔ کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی وہ سب قلمی ہیں۔

دن بھر لفافے بناتا ہوں } اللہ اللہ یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ کہ مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا کہ جن کو لکھتا تھا وہ پھانسی پر لٹک گئے تو لفافے بنا بنا کر جی بہلاؤں گا۔ اس پر ان کا پتہ لکھتا جن کے گولی لگی۔ یہ ان کے نام بھیجتا جن کو پھانسی ہوئی۔ اس لفافہ پر ان کا نام لکھدیتا اگر جانتا کہ وہ کہاں ہیں۔ اور ہیں بھی یا مر گئے۔ جنگل میں کسی درندہ نے ختم کر دیا۔ مرنے والوں کا بھی تو ٹھکانا معلوم نہیں کہاں ڈال دیا۔ کہاں داب دیا۔ ورنہ انہی کو لکھتا۔ یہاں کا حال۔ زمیں سخت ہے آسماں دور ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے تو نگر مزور سے مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے۔ مجھے آبکاری کے بندوبست جدید نے مارا۔ عرق کے نہ کھنچنے کی قید شدید نے مارا۔ ادھر انسداد دروازۂ آبکاری ہے۔ اُدھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔

حسن نظامی بس کر لکھ چکا غالب کی لکھی ہوئی عبارتیں نقل کر چکا۔ اپنی حاشیہ نویسی کا زور بھی دکھا دیا۔ جہاں سنسار ہے وہاں کی پابندی کو بھی جانتا ہے۔ کہ یہاں ایک ایک منٹ اور ایک ایک سکنڈ کا حساب لکھا جاتا ہے۔ یہ سرکاری کارخانہ ہے کیا تو نے اس کو بھی

Marfat.com

دبکی اور ٹپّی اور زردوزی اور زرکوبی کا کارخانہ سمجھا ہے کہ بولنے بیٹھا تو بولے چلا جاتا ہے اور کارخانہ والے ہیں کہ جھوم رہے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں۔ کہ اچھا پھر کیا ہوا۔ اور کہو بات بیچ میں کیوں چھوڑے دیتے ہو۔ تمہاری بول چال میں تو بڑا مزہ آتا ہے۔

لو استاد غالب میں تمہاری داستان ختم کرتا ہوں۔ جو آسمانی لہروں کے ذریعہ دنیا کے ہر سن سکنے والے باشندہ نے سن لی۔ کسی نے آہ کی۔ کسی نے واہ۔ اور جب مولانا آداب عرض نے کہا۔ خواجہ حسن نظامی کی تقریر آپ نے سنی۔ تو سننے والے چونکے۔ کہ ایلو وہ تو کہہ چکے یہ تو وہ بولنے لگے جو کہا کرتے ہیں اچھا اب آداب عرض کرتا ہوں۔

جگ بیتی کہانیاں

یہ کتاب ۸۰ صفحے کی ہے اس میں حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کی لکھی ہوئی نہایت دلچسپ کہانیاں درج ہیں جو عورتوں اور بچوں میں بھی بہت مقبول ہیں۔ قیمت صرف آٹھ آنے (۸/) -

ملنے کا پتہ

دفتر اخبار منادی دہلی

Marfat.com

میاں کیا چاہتا ہے؟

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کی تقریر جو ۲۶ فروری ۱۹۳۷ء کو دہلی ریڈیو کے ذریعہ تمام ہندوستان نے سنی۔ اور ہر جگہ سے اظہار پسندیدگی ہوا

ایک میاں بھائی پوچھتے ہیں۔ کیوں میاں جی یہ تو بتاؤ کہ میاں کیا چاہتا ہے؟ میاں جی جواب دیتے ہیں۔ آپ کے اس سوال کا کیا مطلب ہے؟ میں کیا جانوں کہ بیوی کیا چاہتی ہے اور میاں کیا چاہتا ہے؟ کہتے نہیں۔ کہ جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ اور قاضی جی دبلے کیوں؟ قاضی جی بولے "شہر کے اندیشہ سے" تمہیں کیا پڑی کہ بیوی کیا نہیں چاہتی؟ اور میاں کیا نہیں چاہتا؟ اور بیوی کیا چاہتی ہے۔ اور میاں کیا چاہتا ہے؟

میں تو بس اتنا جانتا ہوں۔ کہ بیوی چاہتی ہے میاں۔ اور میاں چاہتا ہے بیوی۔ قرآن مجید نے کہا تھا۔ پاک میاں کے لئے پاک بیوی اور پاک بیوی کے لئے پاک میاں۔ اور برے میاں کے لئے بری بیوی۔ اور بری بیوی کے لئے برا میاں۔ بس یہی اس دنیا میں ہوتا رہتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ مگر دنیا والوں کا حال آج کل کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ سب دوسروں کے فکر میں گھلے جاتے ہیں۔ اپنا فکر کوئی نہیں کرتا۔ میاں کہتے ہیں "قلندر علی کی بیوی بہت بری" بیوی کہتی ہیں کہ "سکینہ خانم کے میاں بہت خراب" کوئی پوچھے کہ میاں کو قلندر علی کی بیوی کی نیکی بدی سے کیا سروکار۔ اور بیوی کو سکینہ خانم کے میاں کی اچھائی برائی سے کیا واسطہ؟ مگر وہ تو اخبار پڑھ پڑھ کر عادت بگڑ گئی ہے۔ ایک آنہ خرچ کر کے اخبار خریدا۔ اور لگے باہر کے ملکوں کی خبروں پر رائے زنی کرنے۔ کبھی کہا۔ دیکھو تو اس مسولینی کو خواہ مخواہ حبش پر چڑھ دوڑا۔ اور ذرا حبش کو بھی دیکھنا۔ کیا پدی کیا پدی کا شوربہ۔ اٹلی سے لڑنے کو خم ٹھوک کر کھڑا ہو گیا۔ اور یہ نہ سمجھا کہ بھائی تیرے پاس توپیں نہیں۔ ہوائی جہاز نہیں۔ زہریلی

Marfat.com

گیس نہیں۔ بم نہیں۔ اور جھوٹ بولنے والے اخبارات نہیں۔ تو کیا اٹلی سے لڑے گا؟

اب اخبار ہے اور یہ اخبار پڑھنے والے ہیں۔ اپنے سب کام چھوڑ کر اٹلی اور حبشن ہی کے مسئلہ پر دماغ آدھا کئے ڈالتے ہیں

یہی صورت اِس وقت مجھے درپیش ہے۔ کہ پوچھتے ہیں۔ بتاؤ میاں کیا چاہتا ہے؟ لو سنو! بتاتا ہوں کہ میاں یہ چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا اُس کی بیوی کے معاملہ میں دخل نہ دے وہ جانے اور اُس کی بیوی۔ دوسروں کو کیا حق ہے کہ اُس کی مرضی اور خواہش کو معلوم کرنے کے لئے دخل در معقولات کریں۔

میاں اگر شاردا ایکٹ جاری ہونے سے پہلے میاں ہوگیا تھا تو اُس وقت اِس کی عمر پرانے رواج کی بموجب دس سال کی ہے۔ کیونکہ شادی کے وقت وہ سات برس کا تھا۔ اور اُس کی بیوی چودہ برس کی تھی۔ اب بیوی سترہ سال کی ہے اور وہ اپنے میاں کا دھیان کر کے پیارے صاحب کا گیت ریکارڈ بجا کر سنتی ہے۔

سیّاں مورا بالا ہے ری!

اور میاں باجہ کی مشین بچوں کی طرح غور سے سُن رہا ہے۔ بیوی گیت سُن سُن کر میاں کو حسرت سے دیکھ رہی ہے۔ اور میاں بیوی کی نظروں سے بے خبر باجہ اور گانے میں محو ہے اور بیوی سے بس یہ چاہتا ہے کہ وہ تیری میری جورو والا ریکارڈ اور بجادے اور بیوی سے ٹھنک ٹھنک کر کہہ رہا ہے کہ ہم تو جورو کا گیت اور سنیں گے۔ اور بیوی مسکرا کر کہتی ہے۔ اچھا ضد نہ کرو جورو کا گیت بھی سنادوں گی۔

ایک میاں عمر ساٹھ سال اپنی دس سالہ بیوی سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہندو دھرم شاستر کے حکم اور ہندوستان کے رواج کی موافق پتی برتا کا برتاؤ کرے اور ایک انگریزی پڑھی بیوی کی طرح آزاد خیال نہ بن جائے۔

اور اگر میاں کوئی مولوی صاحب ہیں جو چار بیویاں کرنی فرض جانتے ہیں۔ تو وہ سب بی

Marfat.com

بیوی سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ کسی سوکن پر مہربان ہونے کا میاں کو طعنہ نہ دے۔ اور یہ نہ کہے کہ تم باہر لوگوں کو تو یہ وعظ سناتے ہو کہ مسلمان کو بیوی کے ساتھ انصاف کرنا چاہئے۔ اگر کسی کے کئی بیویاں ہوں تو وہ سب کو ایک سا کھانا اور ایک سا کپڑہ دیا کرے یہاں تک کہ اگر ایک بیوی کو لال گیہوں کی روٹی دے تو دوسری کو بھی لال کی دے۔ سفید کی نہ دے ورنہ بے انصافی ہو جائے گی۔ مگر تم اپنے گھر میں اِس انصاف کو بھول جاتے ہو۔ انوری کو چمپا کلی بنوا دی دلدار بیگم کو شال لا دی۔ شرفا کے لئے بازار سے امرتیاں لائے۔ اور مجھے آج تک تانبہ کے تار کا ایک چھلہ تک نہ لا کر دیا۔ چار برس سے لحاف تک نہ بنوایا۔ بیس دن ہوئے میں نے گھر میں گوشت کی صورت تک نہ دیکھی۔

اور اگر میاں بی۔ اے پاس ہیں تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ بیوی دن میں چار دفعہ نہائے اور سات دفعہ کپڑے بدلے۔ چہرہ پر پوڈر لگائے۔ ہونٹوں پر لالی ملے اور میاں کے ساتھ سینما دیکھنے جائے۔ دعوتوں اور پارٹیوں میں شریک ہو۔ گھر میں کوئی مہمان آجائے تو اُس کے سامنے آکر مسکرائے۔ اور گردن کو ہلا کر دانت دکھائے۔ اور ہلو کہہ کر مصافحہ کے لئے لپکے۔ اور چائے بنانے بیٹھے تو مہمان سے پلیز کہہ کر پوچھے شوگر کتنا مانگتا ہے اور مِلک کتنا؟ اسٹرانگ ٹی یا ہلکا والا؟

اور جب میاں کوئی چیز بیوی کے لئے گھر میں لائے تو بیوی بیوٹی فل کہہ کر اُس کو چومے اور بیوٹی فل بیوٹی فل کم از کم چالیس یا اکتالیس دفعہ کہے۔

بی اے پاس میاں ہرگز نہیں چاہتا کہ جب میاں گھر میں آئے تو بیوی صورت دیکھتے ہی دور سے کاٹ کھانے کو دوڑے۔ اور کہے۔ گھر میں نہ تیل ہے کہ چراغ جلاؤں نہ آٹا ہے کہ روٹی پکاؤں۔ نہ لکڑیاں جن سے چولھا گرم ہو۔ باہر میاں ہفت ہزاری۔ گھر میں جورو فاقوں کی ماری۔ میری تو قسمت پھوٹ گئی جو اس دلدر گھر میں اماں باوا نے جھونک دیا۔ خدا غارت کرے بی سلامت کو جنھوں نے مجھے کٹنی بن کر اِس دوزخ میں ڈلوا دیا کسی دن

Marfat.com

بھی دو گھڑی کا سکھ اس گھر میں نصیب نہ ہوا۔ آدھی آدھی رات کو گھر میں آتے ہیں۔ یہ موا بائسکوپ خبر نہیں کس موذی نے نکالا ہے جب سنو یہی سنو کہ آج پھر وائے بائیسکوپ میں گئے ہیں۔ آج مچھلی والوں کے بائیسکوپ کے سامنے کھڑے ٹہل رہے تھے۔ کل پیواڑہ کے بائیسکوپ کے چکر کاٹ رہے تھے۔ دنیا مری چلی جا رہی ہے مگر جو کم بخت سے موت بھی کترا کر چلی جاتی ہے۔ میں تو کچھ کھا کر سو جاؤں جب اس دوزخ سے چھٹکارا ملے گا۔

اور ایسے میاں بھی اس ملک میں ہوتے ہیں جو بیوی سے یہ چاہتے ہیں کہ بیوی میری دولت سے عیش و آرام کرے۔ وہ باورچن نہیں ہے جو ہر وقت باورچی خانہ میں گھسی رہے۔ درزن نہیں ہے جو رات دن بیٹھی کپڑے سیا کرے۔ ماما نہیں ہے جو بچوں کو پالا کرے۔

جوان میاں چاہتا ہے کہ بیوی کے بچے نہ ہوں۔ اور ادھیڑ عمر والا میاں چاہتا ہے کہ بیوی سال میں چار بچے جنا کرے۔ اور بڑھا میاں چاہتا ہے کہ جب میں گھر میں آؤں اور کوئی ہمسائی بیوی کے پاس بیٹھی ہوں تو بیوی جلدی سے کہے۔ ذرا باہر ہی ٹھہرنا اندر ہمسائی بیٹھی ہیں۔ اور جب نکاح کے بعد میں اپنی سسرال میں جاؤں تو عورتیں کہیں۔ بوا ذرا پردہ کر لینا لڑکا آتا ہے۔ جب عورتیں مجھے لڑکا کہیں تو مجھے اپنا بچپن یاد آجائے۔ اور میرے اندر چلوؤں خون بڑھ جائے۔ کیونکہ سوائے آج کے دن کے اور سوائے سسرال کے اور کہیں اس بڑھاپے میں مجھے لڑکا کہنے والا میسر نہ آئے گا۔

خیر یہ تو ہنسی کی باتیں تھیں۔ اب پوچھنے والے کو میں وہ جواب دیتا ہوں جس کی اس کو تلاش ہے۔

میاں یہ چاہتا ہے کہ بیوی ہم خیال ہو عقل والی ہو۔ لکھنا پڑھنا جانتی ہو۔ خانہ داری کے حساب سے واقف ہو۔ کھانا پکانا اور پکوانا آتا ہو۔ صاف رہنے کی عادت ہو۔ اپنے لباس اور گھر کے سامان کو صاف رکھے۔ سر جھاڑ منہ پہاڑ نہ ہو۔ صبح اٹھ کر کنگھی کر لیا کرے۔ پان کھاتی ہو تو پیکدان میں پیک تھوکے۔ گھر کے فرش اور دیواروں کو اگال دان نہ بنائے۔ میاں

Marfat.com

چاہتا ہے کہ بیوی فضول اور بے کار قیمتی کپڑے اور قیمتی زیور جمع نہ کرے۔ بلکہ شادی مہمانی اور عید بقرعید کے خاص خاص موقعوں کے لئے دو چار چیزیں سلیقہ سے گھر میں رکھ چھوڑے۔ اور اُن کو ہر موسم میں دھوپ دے۔ اور کپڑوں کو داغ دھبہ سے بچائے۔ اور زیور جڑاؤ نہ ہو۔ بلکہ سونے کا ہو۔ اور پُرانی طرز کا ہو۔ کیونکہ نئے فیشن کے زیور میں لاگت آئے سو روپے کی۔ اور مال ہو پچیس روپے کا۔ پرانے زمانہ کے زیور سو روپے کے خرید و تو ننانوے روپے کے ہمیشہ جب چاہو بیچ ڈالو۔ اور سونے کا بھاؤ بڑھ جائے تو سو کے ڈیڑھ سو بن جائیں۔

میاں چاہتا ہے۔ بیوی ایسی ہو جس کو نوکروں سے کام لینا آتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ خود کچھ کام نہ کرے سارا کام نوکروں پر ڈال دے کیونکہ ہندوستان کا کوئی نوکر ہمدردی سے کام نہیں کرتا۔ جب تک کہ گھر کے مالک اُن کے سر پر کوچوان کی طرح چابک لئے نہ بیٹھے رہیں۔ اور اُن سے کام نہ لیں۔ میاں چاہتا ہے۔ بیوی آمدنی سے خرچ کو نہ بڑھائے۔ پچاس کی آمدنی ہو تو ۴۵ خرچ کرے۔ کپڑے درزیوں سے نہ سلوائے۔ خود سیئے یا ایسی نگرانی رکھے کہ درزی کپڑا نہ چرا سکے

میاں چاہتا ہے۔ بیوی باورچی خانہ کی نگرانی کر سکتی ہو۔ اور کرتی ہو۔ ماما اور پکانے والوں پر سارا کام نہ چھوڑ دے۔ میاں چاہتا ہے کہ بیوی کے پاس گھر کے تمام اسباب کی فہرست موجود ہو۔ اور وہ بے ضرورت چیزیں نہ خریدے۔ میاں چاہتا ہے۔ بیوی پردہ کی پابندی کے ساتھ خود بازار جا کر گھر کی ضرورت کا سامان خریدے۔ اور جب ضرورت پڑے تو بازار جائے بازار میں جا کر نئی نئی ضرورتیں پیدا نہ کرے۔ میاں چاہتا ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے قرابت داروں اور دوستوں کا ایسا ہی خیال رکھے۔ جیسے میاں رکھتا ہے۔ اور اُن کے درجوں کا فرق اچھی طرح سمجھے۔ اور اُن کی خاطر مدارات کا خیال رکھے۔ لیکن فقط شیریں کلامی اور اچھے برتاؤ تک محدود رہے۔ کھلانے پلانے اور دینے لینے کے خرچ نہ بڑھائے۔

میاں چاہتا ہے۔ بیوی ایسی ہو کہ گھر کی ضرورتوں کا سامان خریدنے سے پہلے یہ سوچ لیا کرے۔ کہ چیز اچھی ہو اور زیادہ قیمتی نہ ہو۔ اور یہ بھی کہ گھر میں اُس چیز کے رکھنے کی جگہ بھی ہو۔

Marfat.com

مثلاً کسی کا گھر بہت چھوٹا ہے اور بیوی نے چار پلنگ اور چھ کرسیاں اور دو میزیں خرید لیں اور یہ نہ سوچا کہ اِن کو رکھوں گی کہاں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ چیزیں بارش اور دھوپ میں باہر پڑی رہیں گی۔ اور خراب ہو جائیں گی۔

میاں چاہتا ہے۔ بیوی سویرے اٹھ کر اپنے گھر کی ہر چیز کو دیکھ لیا کرے۔ تاکہ اگر کوئی چیز بے سلیقہ رکھی ہو اور خراب ہو رہی ہو تو وہ ٹھیک ہو جائے۔

میاں چاہتا ہے۔ بیوی اپنے شوہر کی کتابوں۔ کپڑوں اور ضرورت کے سامان کو ایسے سلیقہ سے رکھے۔ کہ ہر چیز قرینہ سے اور صاف ستھری رہے۔ اور جب میاں کوئی چیز مانگے تو تلاش کرنے کا غل شور برپا نہ ہو۔ اور میاں یہ بھی چاہتا ہے کہ بیوی ہر کام کا ایک وقت مقرر کرلے۔ نہ ہر وقت باورچی خانہ میں گھسی رہے۔ نہ ہر وقت کپڑے سیا کرے۔ نہ ہر وقت بچوں میں مصروف رہے۔ بلکہ جب میاں گھر میں آئے تو بیوی اُس کے پاس بیٹھے۔ اُس سے بات چیت کرے۔ ہنسے بولے اور گھر کی ضرورتوں سے اُس کو آگاہ کرے۔ اور اُس سے باہر کے حالات پوچھے۔ اور میاں اپنے حالات سُنائے تو بیوی اُس کو اچھے مشورے دے سکے۔ اور پریشانی کے وقت میاں کی ہمت بڑھائے۔ اور کہے کہ گھبرانے کی کچھ بات نہیں۔ دنیا اور زندگی اسی کا نام ہے۔ یہاں مشکلیں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ مردانگی سے کام لو۔ ہر مشکل کو خدا آسان کر دیتا ہے اگر آدمی مشکلات کا مقابلہ سمجھ اور دور اندیشی سے آخر تک کرتا رہے۔

میاں چاہتا ہے۔ بیوی قرض نہ لیا کرے نہ دیا کرے۔ میاں چاہتا ہے۔ بیوی اپنے میکہ والوں کی دعوتیں زیادہ نہ کیا کرے۔ اور گھڑی گھڑی میکہ جانے کے خیال میں نہ رہے۔

میاں چاہتا ہے کہ بیوی اپنے شوہر کی محرم راز ہو۔ میاں کی ہر بات کی پردہ پوشی کرے اور میاں کی عزت کو اپنی عزت اور میاں کی خوشی کو اپنی خوشی اور میاں کے آرام کو اپنا آرام خیال کرے

جس بیوی میں اتنی خوبیاں موجود ہوں پھر بھی اُس کا شوہر اُس کی قدر نہ کرے تو بیوی جانتی ہے کہ ایسے شوہر پر خدا کی مار ہو۔ اور وہ جتنی جلدی دنیا سے رخصت ہو اتنا ہی اچھا ہے۔

Marfat.com

جو میاں یہ چاہتا ہے کہ بیوی رزن بنی رہے۔ باورچن بنی رہے۔ اور ہر وقت ہر کام میں میاں کی اطاعت کرتی رہے۔ اور میاں اپنی بیوی کی عزت خوشی آرام کی کچھ پروانہ کرے۔ اور یہ سمجھے کہ میں آقا ہوں اور بیوی لونڈی ہے۔ میں بادشاہ ہوں اور بیوی رعیت ہے۔ میں لاٹ صاحب ہوں اور بیوی چپراسن ہے۔ تو ایسا میاں خدا رسول کے حکم کو نہیں مانتا۔ اور خوش باش زندگی کو نہیں جانتا۔ اور اُس پر خدا کی لعنت برستی رہتی ہے۔ کیونکہ خدا ہر بندہ سے یہ چاہتا ہے۔ کہ وہ دوسروں کا حق ٹھیک اور انصاف کے ساتھ ادا کرے۔

خلاصہ یہ ہے۔ کہ میاں چاہتا ہے۔ کہ بیوی اُس کی شریک زندگی ہو۔ رفیق ہو مونس ہو۔ اور ایسا نہ ہو کہ بیوی میاں کے سر پر آسیب بن کر سوار رہے۔ اور بھوتنی چڑیل کی طرح میاں کی زندگی کو دوزخ کی زندگی بنادے۔ ایسی بیوی کو میاں وبال جان سمجھتا ہے۔

میاں بیوی کی تعلیم

یہ کتاب ۱۸۰ صفحے کی ہے جو حضرت خواجہ حسن نظامی اور محترمہ خواجہ بانو صاحبہ کی مشترکہ تصنیف ہے جس میں میاں بیوی دونوں کو سلیقہ مند اور خوش باش بنانے کے مضامین ہیں قیمت ایک روپیہ چار آنے

اس کتاب کا دوسرا حصہ بیوی کی تربیت صفحے ۱۲۰ قیمت ایک روپیہ

تیسرا حصہ اولاد کی شادی صفحے ۱۲۰ قیمت ایک روپیہ (عہ)

ملنے کا پتہ

دفتر اخبار منادی دہلی

Marfat.com

روحانی تاثیرات کا عقلی
مُناظرہ

جو ۵ ستمبر ۱۹۳۶ء کی شام کو حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب اور نواب خواجہ محمد شفیع صاحب کے درمیان دہلی ریڈیو میں نشر ہوا

نواب صاحب۔ آداب عرض کرتا ہوں۔ آج دلی ریڈیو نے عرصہ کے بعد آپ سے ملاقات کا موقع دیا۔

خواجہ صاحب۔ تسلیمات عرض ہے۔ جی ہاں آپ کی ملاقات گزشتہ ملاقاتوں سے دلچسپ بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ اگرچہ یہاں آپ کے اور میرے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے۔ لیکن کم ازکم ایک کروڑ عورت مرد ہم دونوں کی باتیں سننے کو یہاں موجود ہیں۔ روحانی لوگ اسی کو کہا کرتے ہیں کہ ہم موجود ہیں اور ہم موجود نہیں ہیں۔ اور شاعر اس کو کہہ مکرنی کہتے ہیں۔

نواب صاحب۔ میں انہی روحانی حضرات کے ایک دعوے کی نسبت آج آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا تعویذ گنڈے سے بیماریاں اسی طرح دور ہو سکتی ہیں جس طرح حکیموں اور ڈاکٹروں کے علاج سے دور ہو جاتی ہیں؟

خواجہ صاحب۔ بے شک روحانی کمالات میں یہ طاقت ہے کہ وہ بیماریوں کو دور کر سکتے ہیں اور انسان کی سب ضروریات اور مرادوں کو پورا کر سکتے ہیں۔ مگر روحانی لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جیسے حکیم ڈاکٹر کی دوا میں خدا اثر دیتا ہے۔ ایسے ہی روحانی لوگوں کے تعویذ گنڈہ کا اثر بھی خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔

نواب صاحب۔ ہم ڈاکٹری دواؤں کا اثر ہر کس و ناکس کو آنکھوں سے دکھا سکتے ہیں۔ کیا روحانی لوگ بھی تعویذ گنڈہ کی تاثیر اسی طرح دکھا سکتے ہیں؟

خواجہ صاحب۔ بھائی جان آنکھوں سے وہ چیز دیکھی جا سکتی ہے جو مادی ہو۔ روحانی چیزیں اور کیفیات اور ذائقے آنکھوں کو نظر نہیں آیا کرتے۔ کیا کوئی بھوک کو دکھا سکتا ہے؟ پیاس کو

اور آپ کے دادا نواب عبدالرحیم خاں صاحب بھی مانتے تھے۔ اور آپ کے نانا نواب محمد کرم اللہ خاں صاحب بھی مانتے تھے۔ اور میں اُن کے واقعات سُنا سکتا ہوں۔

نواب صاحب:۔ مانا کہ سرسید تعویذ گنڈہ کو مانتے تھے۔ بھوت پریت کے بھی قائل تھے بچھل پیری پر بھی اُن کا ایمان تھا۔ تاہم اِس کے یہ معنے نہیں کہ یہ تمام چیزیں عقلی دلائل سے ثابت کی جا سکتی ہیں۔ سرسید مانتے تھے مانا کریں۔ ہم تو اُس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک کوئی منوا نہ دے۔ اگر سرسید نے کوئی کتاب چڑیل اور بچھل پیری کی حمایت میں لکھی ہو تو پیش کیجئے۔ بندہ اُس کو پڑھے گا۔ ورنہ اُن کے اعتقادات کو بغیر سمجھے بوجھے ماننے کے لئے تو یہ ناچیز تیار نہیں ہے۔

ہم معتقد دعوے باطل نہیں ہوتے ؛ پہلو میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

خواجہ صاحب:۔ میں نے یہ نہیں کہا۔ کہ سرسید اُن جاہلانہ باتوں کو بھی مانتے تھے۔ جن کا نام آپ لے رہے ہیں۔ کیونکہ اُن کی نسبت تو یہ مشہور تھا کہ وہ فرشتوں اور جنات کے وجود کو بھی نہیں مانتے پھر بھوتوں وغیرہ کو کیوں کر مانتے۔ میں تو اُن کے اور مولانا حالی اور آپ کے دادا صاحب اور نانا صاحب کے ایسے واقعات سُنانے چاہتا ہوں۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ روحانی کمالات کو مانتے تھے ان واقعات کے سُننے سے آپ کو اور سب سُننے والوں کو نتیجہ نکالنے میں آسانی ہو گی۔

نواب صاحب:۔ گویا آپ میرے اور سُننے والوں کے جذبات پر ایسا اثر ڈالنا چاہتے ہیں جو ہم سب کو عقل سے ہٹا کر جذبات کی طرف متوجہ کر دے۔ اور ہم عقلی دلائل کا مطالبہ ترک کر دیں۔

خواجہ صاحب:۔ جذبات پر تو ساری دنیا کا کارخانہ چل رہا ہے۔ میں جذبات کو عقل کا دشمن خیال نہیں کرتا۔ یہ واقعات بیان کرنے سے غرض یہ ہے کہ ہندوستان میں علم و عقل کی بنیاد رکھنے والے بھی روحانی قوتوں کو مانتے تھے۔

نواب صاحب:۔ سنائیے میں سُن لوں گا۔ مگر پھر میں بھی کوئی قصہ سناؤں گا۔ تاکہ واقعات سے واقعات کی تردید ہو جائے۔

خواجہ صاحب:۔ میں نے نواب مصلح الدین صاحب سے سنا ہے (جو سرسید کے پوتے سر راس مسعود

Marfat.com

کے حقیقی ماموں ہیں۔ اور دہلی میں موجود ہیں۔ کہ سرسید کے والد سید متقی صاحب حضرت شاہ غلام علی صاحب کے مرید تھے۔ اور جب سرسید پیدا ہوئے تو اُن کے والد نے مراقبہ کرکے سرسید کے مستقبل کو دیکھا۔ اُن کو مراقبہ سے معلوم ہوا۔ کہ یہ لڑکا انگریزی لباس اور انگریزی خیال اختیار کرے گا۔ یہ حالت دیکھ کر سید متقی اپنے پیر کے پاس گئے۔ اور اپنے مراقبہ کا ذکر کیا۔ تب اُن کے پیر خود سید متقی صاحب کے گھر میں آئے اور سرسید کے کان میں اذان کہی اور مراقبہ کرکے بتایا۔ کہ یہ لڑکا مسلمانوں کی بہت مدد کرے گا۔ اور پکا مسلمان ہوگا اور اُس کا خاتمہ بالخیر ہوگا۔ اس کا انگریزی لباس اور انگریزی خیالات ہندوستان کو فائدہ پہنچائیں گے۔

یہ واقعہ شاہ غلام علی صاحب کے ایک مرید نے جو مراقبہ مذکور کے وقت موجود تھا سرسید کو علی گڈھ میں نواب محسن الملک وغیرہ کی موجودگی میں سنایا تو سرسید رونے لگے اور روتے روتے بے ہوش ہوگئے اور سرسید نے حضرت شاہ غلام علی صاحب کے روحانی کمالات اور مراقبہ کی طاقت کو سب کے سامنے تسلیم کیا۔ یہ واقعہ اُن کی وفات کے قریب کا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرسید مراقبہ اور روحانی قوتوں کو مانتے تھے۔ اور آخری وقت تک مانتے رہے۔ آپ کے مکان کے قریب نواب دوجانہ کی مسجد کے سامنے کاؤس جی پارسی نے ناٹک کے تماشہ کا منڈوا بنایا تھا۔ دلی کے مسلمانوں نے آپ کے نانا نواب محمد کرم اللہ صاحب کو اپنی ناراضی کا محضر دیا۔ نواب صاحب نے وہ ڈپٹی کمشنر صاحب دہلی کو بھیجدیا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے مسلمانوں کے خلاف فیصلہ کیا۔ اور آپ کے نانا صاحب کو امن و انتظام کا ذمہ دار بنادیا۔ جس سے دہلی کے مسلمانوں میں بہت جوش پھیل گیا۔ اور پھر تین چار دن تماشہ ہوتا رہا۔ اس کے بعد ایک فقیر آپ کے نانا کے پاس آیا۔ اور اُس نے زمین سے خاک کی مٹھی بھر کر اٹھالی اور اُس پر کچھ پڑھ کر دم کیا۔ اور خاک ناٹک گھر کی طرف پھینک دی۔ اُس کا اثر یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن کاؤس جی خود بخود اپنے تماشہ گھر کو یہاں سے اٹھا کر لے گئے۔ یہ قصہ آپ کے دادا نواب عبدالرحیم خاں صاحب نے مجھ سے بیان

کیا تھا۔ تو بتایئے کہ خاک کی چٹکی نے یہ کیا اثر کیا؟ اور فقیر کے دم کرنے میں کیسی عجیب تاثیر تھی؟

نواب صاحب :۔ آفت تو یہی ہے کہ ہمارا دماغ ہم کو غلط طرف لئے جاتا ہے۔ جب سوجھتی ہے اندھی ہی سوجھتی ہے۔ معاملہ یہ تھا کہ جس مقام پر اُس نے منڈوا بنایا تھا وہ جگہ مسلمانوں کی آبادی کے منجھ میں واقع ہے۔ سمجھدار آدمی تھا۔ ڈرا کہ رات برات کو کسی نے آگ لگادی تو کیا ٹھاٹھ ہے ایک پردہ بھی سلامت نہیں بچے گا۔ بے چارہ چلا گیا۔ یاروں نے فقیر صاحب کے سر سہرا باندھا۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر کہیں اِس تماشہ میں آگ لگ جاتی تو یہ فقیر صاحب ہی ذمہ دار ٹھہرائے جاتے کہ کمال کا بزرگ تھا۔ دیکھا آگ لگادی۔ میاں مجھے بڑے کال پڑے ہوئے ہیں۔ اور سرسید کے قصہ سے تعویذ گنڈہ کا ثبوت کہاں نکلا۔ آپ نے تو مراقبہ کی ایک نئی خلاف عقل بات سُنادی۔

خواجہ صاحب :۔ مولانا حالی آپ کے نانا کے ہاں دہلی میں آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ اور میں اُن سے ملنے جایا کرتا تھا۔ ایک دن مولانا حالی نے مجھ سے فرمایا۔ کہ میرے نواسہ کو مرگی ہے۔ نہ ڈاکٹری علاج سے فائدہ ہوتا ہے نہ یونانی علاج سے۔ اب کوئی درویش بتاؤ جو دعا تعویذ کا علاج کرے۔ میں نے ضلع راولپنڈی کے ایک درویش کا ذکر کیا کہ وہ سورۂ مزمل کے عامل ہیں۔ اور صرف یَا اَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ پڑھ کر بیماروں کو اچھا کر دیتے ہیں۔ مولانا حالی کے لڑکے مولانا سجاد حسین صاحب راولپنڈی میں انسپکٹر تعلیمات تھے۔ مولانا حالی نے اُن کو لکھا۔ اور مولانا سجاد حسین صاحب اُن عامل صاحب سے ملے۔ عامل صاحب نے پانی پت کی طرف رُخ کر کے انگلی کا اشارہ کیا۔ اور یا ایھا المزمل ایک دفعہ پڑھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا حالی کے نواسہ کی مرگی جاتی رہی۔ اور پھر کبھی دورہ نہ ہوا۔ کیا یہ روحانی کمال کی تاثیر نہ تھی؟

نواب صاحب :۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایسا ہوا ہوگا۔ مگر میں تو عقلی دلیلیں چاہتا ہوں۔ اب ذرا ان واقعات کی تردید میں میرا بھی ایک واقعہ سُن لیجئے۔

میرے جاننے والے ایک صاحب تھے۔ اُن کا پہلا بچہ (لڑکا) گزر گیا۔ دوسرا لڑکا جب

Marfat.com

پیدا ہوا تو اُس کے کان میں بندہ ڈالنے کی تجویز پیش کی گئی۔ تو کان چھیدنے کے واسطے چو خصی کی سوئی منگائی گئی تھی۔ اور اب بھی آپ کسی پرانی بڑھیا سے پوچھ لیجئے۔ یہ عمل یوں ہی کیا جاتا ہے۔ اور یہ بندہ شادی کے بعد زوجہ محترمہ سینہ پر پاؤں رکھ کر اتارتی ہیں۔ علاوہ ازیں میرے کنبہ میں ایک بڑی بی تھیں۔ وہ بچپن میں بڑی اللہ آمیں پیر سلامی کی تھیں۔ جب اُن کے بڑے نہ رہے تو وہ بیچاری خود اپنی دیکھ ریکھ کرتی رہتی تھیں۔ اتفاق سے ایک مرتبہ بیمار ہوئیں روزانہ ایک بکرے کا خون ہوتا تھا۔ نتیجہ یہاں تک پہنچا کہ جب بکرے کی بھینٹ کافی نہ سمجھی گئی تو ایک بزرگ نے فرمایا کہ بھینسا ذبح کرو۔ ہم تک اطلاع ہوئی۔ میرا بچپن تھا۔ ہم بھی دیکھنے گئے۔ اور تماشہ یہی ہوا۔ ملاحظہ کیجئے۔ کہ رات کو ایک کھونٹا انگنائی میں گاڑا گیا۔ اور اس سے بھینسے کو پابجولاں کیا۔ اور اُس کا ایک پاؤں ان بڑی بی کی چارپائی کے پایہ سے باندھا گیا۔ رات کے بارہ بجے ہوں گے کہ شور وغل کی آواز بلند ہوئی۔ میری بھی آنکھ کھلی تو گھر کے ایک کونہ میں سب جمع تھے۔ اور چیخ پکار مچ رہی تھی۔ ماجرا یہ تھا کہ بھینسا گھبرا گیا۔ کہ میری دم میں یہ کھٹکھٹا کیسا بندھا ہے۔ اور وہ کھونٹا تڑا کر بھاگا۔ اُن کی چارپائی ساتھ ساتھ۔ انھوں نے غل مچانا شروع کیا۔ بڑی مشکل سے رسّی کاٹی گئی۔ اور وہ بڑی بی اس عمل سے اچھی تو ہوئیں نہیں اور موئی بے شک ہو گئیں۔ تو خیال کیجئے کہ جب روزانہ ایسے ہزاروں واقعات پیش آئیں تو میں کیونکر مان لوں کہ ان عملیات میں کوئی اثر ہے۔

خواجہ صاحب:۔ آپ نے بہت دلچسپ قصہ سُنایا جس کی زبان بھی بڑی مزہ دار تھی کیوں نہ ہو دلی کی شستہ زبان تو آپ کے گھروں سے نکلی تھی۔ مگر اس قصہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ روحانی علاج کا اس سے کچھ بھی تعلق نہ تھا۔ کسی جاہل عامل نے یہ علاج بتایا ہوگا۔ جو قطعی غلط تھا۔ کیونکہ اصلی عامل ترک حیوانات کے پابند ہوتے ہیں۔ اور کسی جانور کی بھی جان لینا جائز نہیں سمجھتے پس بکرے کاٹنے اور بھینسا کاٹنا روحانی علم والوں کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ اور اس واقعہ سے روحانی علاج کی تردید ثابت نہیں ہوتی۔

Marfat.com

نواب صاحب:۔ مانا کہ وہ بکروں کا خون کسی جاہل کی گردن پر ہوا۔ اور بھینسے کی ہتھیا بھی اُسی کے سر پر رہی۔ پھر یہ عرض ہے کہ اب کوئی عامل صاحب کچھ کر کے دکھا دیں تو ہم جانیں۔
خواجہ صاحب:۔ بے شک اب بھی ایسے کامل عامل موجود ہیں۔ جو آپ کو یہ کمالات دکھا سکتے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ نئے سائنس والوں نے انسان کے وجود کے اندر جو بے شمار قوتیں ہیں اُن کی سائینٹیفک تحقیقات نہیں کی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو روحانی قوت کو مان جاتے اور دعا تعویذ کا اثر بھی اُن کو عقل کے موافق معلوم ہونے لگتا۔ اور انسانی وجود کی باطنی قوتوں سے دنیا کے ہزاروں کام لیتے۔ جیسے کہ وہ نباتات، جمادات اور حیوانات اور عناصر یعنی ہوا بجلی، پانی وغیرہ سے کام لے رہے ہیں۔ ڈاکٹر موت کے علاج، بڑھاپے کے علاج اور بیماریوں کے اسباب کی تحقیقات بے شک کرتے رہتے ہیں۔ مگر اُنھوں نے ابھی آنکھوں اور تصور اور خیال اور اُن برقی اور مقناطیسی قوتوں کو معلوم کرنے کا کوئی کام نہیں کیا۔ جو انسان کے اندر خدا نے پیدا کی ہیں۔ یہ حکیم اور ڈاکٹر اور وید سب مانتے ہیں کہ بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی ایک طاقت جسم کے اندر ہوتی ہے۔ جس کو طبیعت کہتے ہیں۔ اُس کو مضبوط کرنے کے لئے دوائیں دی جاتی ہیں۔ ورنہ دوائیں بیماریوں کو دور نہیں کرتیں۔ لیکن حکیم ڈاکٹر جسم کی کہربائی اور برقی اور روحانی قوتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ حالانکہ وہی قوتیں دعاؤں اور تعویذوں اور گنڈوں اور دم کرنے میں اثر کرتی ہیں۔
نواب صاحب:۔ بارِ ثبوت مدعی پر ہوتا ہے۔ روحانی قوتوں کے آپ دعوے دار ہیں۔ آپ ثبوت بہم پہنچایئے۔ ڈاکٹر تو اِن کے وجود ہی کے قائل نہیں۔ پھر تحقیقات کس چیز کی کریں
بندہ نواز:۔ جہاں تک تصور، خیال اور خواب وغیرہ کا تعلق ہے اِس پر اتنی تحقیقات کی گئی ہے کہ ایک بہت بڑا کتب خانہ صرف ان کتابوں کا قائم کیا جا سکتا ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ بے شک اِس مقناطیسی قوت کے نہ ہم قائل ہیں نہ اِس کی ہم تحقیقات کریں۔ اِس کے آپ دعوے دار ہیں اِس کی تحقیقات کرنا یا نہ کرنا آپ کا فعل ہے۔ ہم تو صرف یہ کہتے

ہیں۔ کہ اگر کسی عامل میں مقناطیسی طاقت ہے تو وہ مجھ کو میری جگہ سے ایک انچ بھی اگر سرکادیں تو میں ایمان لے آؤں۔ اور برخلاف اِس کے ہم اپنی بجلی کے زور سے بڑے سے بڑے عامل صاحب کو گز دو گز با آسانی جنبش دیدیں گے۔ اور نہایت تیزی کے ساتھ۔ بہر کیف اگر آپ بزرگوں نے اِس معاملہ میں کوئی تحقیقات کی ہو تو فرمائیے۔

خواجہ صاحب:۔ کیا شک ہے آپ کی بجلی بچارے عامل ہی کو نہیں بلکہ ہمالیہ پہاڑ کو میلوں اونچا اٹھا سکتی ہے۔ میں سائنس کی معلوم کی ہوئی قوتوں سے کب انکار کرتا ہوں۔ میرا کہنا تو یہ ہے کہ سائنس دانوں نے انسانی وجود کی روحانی قوتوں کو جانا نہیں۔ اور نہ اُن کی تحقیقات کی۔ ورنہ اُن کی اور آپ کی عقل میں روحانیت کا فلسفہ آجاتا۔ اور آپ شک و شبہ میں نہ رہتے۔

روحانی علاج کرنے والوں نے اِس کی ایسی ہی تحقیقات کی ہے۔ جیسے سائنس والے نئی ایجادوں کی تحقیقات کرتے رہتے ہیں۔ البتہ آج کل ایسے محقق بہت کم ہوگئے ہیں۔ اور اناڑی بازاری تعویذ گنڈوں کو بدنام کرتے پھرتے ہیں۔ اور اِس سوال کا جواب کہ عاملوں کی تحقیقات عقل میں آسکتی ہے یا نہیں۔ یہ ہے کہ ریل۔ تار۔ ٹیلی فون۔ سینما۔ ریڈیو کے کمالات کی وجہ بھی ہر عقل میں کہاں آسکتی ہے؟ سوائے گنتی کے چند آدمیوں کے جو اِس کے سائنس کی باریکیوں کو جانتے ہیں۔ اِسی طرح دعا تعویذ اور گنڈہ وغیرہ کی تاثیرات کا فلسفہ اور سائنس بھی اُن ہی کی عقل میں آسکتا ہے۔ جن کی عقل علم کے ذریعہ اتنی بڑی ہو جو ہر چیز کے سائنس اور فلسفہ کو سمجھ سکے۔

نواب صاحب:۔ مانا کہ ہماری ناقص عقل میں اِس مقناطیسی طاقت کا فلسفہ نہ آسکے۔ تاہم اس کا مشاہدہ ہم کو کرادیا جائے۔

خواجہ صاحب:۔ جس حد تک روحانی کمالات کا مشاہدہ ممکن ہے مشاہدہ کرایا جاسکتا ہے۔ اور یہ مشاہدہ تو ہر شخص کر رہا ہے کہ روحانی کمالات والے رحم دل ہیں۔ اور اُن میں دوسروں

کی ہمدردی ہے اور وہ خود غرضی سے پاک ہیں۔ اور سائنس والے لوہے اور بجلی اور بھاپ کے محکوم ہو گئے ہیں۔ اور محبت و ہمدردی اُن کے دل سے دور ہو گئی ہے۔ بے شک سائنس کی ایجادوں نے دنیا کو فائدہ پہنچایا ہے۔ مگر نقصان بھی پہنچایا ہے۔ روحانی لوگوں نے اگر نظر آنے والی چیزیں پیش نہیں کیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے کمالات انسان کی جسمانی نظر میں آتے کیونکر؟ وہ تو بہت لطیف ہوتے ہیں جسم کی مادی نگاہ اُن کو اسی طرح نہیں دیکھ سکتی جس طرح ہوا، بجلی وغیرہ کو نہیں دیکھ سکتی۔

میں اس کو مانتا ہوں کہ روحانی قوتوں کو غلط استعمال کرنے والوں نے یا اُن لوگوں نے جو روحانی کمالات نہ رکھتے تھے اور فرضی روحانی بن گئے تھے۔ ہندوستانیوں کو نقصان پہنچایا اور اب بھی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اور وہ نتائج بھی درست ہیں جو آپ نے پیش کئے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ دعا تعویذ اور روحانی قوتوں کی تاثیرات غلط ہیں۔ یا خلافِ عقل ہیں۔

نواب صاحب:۔ میں یہ نہیں مانتا کہ موجودہ ایجادات کی وجہ سے زمانہ ترقی یافتہ لوہے اور بھاپ کا محکوم ہو گیا ہے۔ بندہ نواز غور کیجئے کہ اگر میں اپنے ہاتھوں سے کوئی کام لیتا ہوں تو یہ کہنا کہ میں اپنے ہاتھوں کا محکوم ہوں کس قدر غلط ہوگا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے ہاتھ میرے تابعدار ہیں جب چاہتا ہوں اور جو چاہتا ہوں اُن سے کروا لیتا ہوں۔ یہی کیفیت لوہے اور بھاپ کی ہے۔ اور نہ صرف لوہا اور بھاپ بلکہ وہ قدرتی طاقتیں جو اَب تک ہماری تباہی اور بربادی کا باعث ہوتی تھیں۔ آج ہمارے قابو میں آکر ہمارے حکم پر چلتی ہیں۔ مثلاً بجلی جو اَب تک ہلاکت کا دیوتا سمجھی جاتی تھی آج تمام دن ہم کو پنکھا جھلتی رہتی ہے اور تمام رات شمع لئے کھڑی رہتی ہے۔ یہ خیال کہ بھاپ، بجلی اور دیگر چیزوں کو ہم نہیں دیکھ سکتے قطعاً غلط ہے۔ موجودہ ایجاد کی مدد سے ہم ہر ایک مادی چیز کو جس سے ہم کام لے رہے ہیں دیکھ سکتے ہیں۔ اور اُس کا پوری طرح مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یہ کمال کہ نادیدہ چیز پر حکومت کریں صرف

Marfat.com

عاملوں کو حاصل ہے۔ ہم ایسا دعویٰ جس کو ثابت نہ کرسکیں نہیں کرتے۔ اور نہ ایسے دعوؤں کو ماننے ہی کے لئے تیار ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ اصحاب باطن نے ایسی چیزیں پیش نہ کیں جو نظر آسکیں یہی ہمارا بھی کہنا ہے۔ کہ وہ چیزیں جن کا ہم اپنے احساسات اور عقل سے ادراک نہ کرسکیں ان کو ہم ماننے کے لئے تیار نہیں۔

خواجہ صاحب:۔ اچھا میں آپ کی عقل اور ادراک کے قابل کچھ باتیں سناتا ہوں۔ سنیئے جس طرح خدا نے دواؤں میں تاثیر رکھی ہے اور وہ بیماریوں کو دور کرتی ہیں۔ اسی طرح خدا نے آدمی کے اندر ایسی برقی اور کہربائی اور مقناطیسی اور روحانی قوتیں بھی رکھی ہیں جو بیماریوں کو دور کرسکتی ہیں۔ اور آدمی کے خیالات اور حالات کو بدل سکتی ہیں۔ گویا دواؤں کا اثر بھی خدا کی طرف سے ہے اور دعاؤں کا اثر بھی خدا کی طرف سے ہے۔ اور جس طرح دواؤں سے کام لینے کے لئے حکیم ڈاکٹر علم طب حاصل کرتے ہیں اور انسانی جسم کی حقیقت کو معلوم کرتے ہیں۔ اسی طرح روحانی لوگ روحانی قوتوں سے کام لینے کے لئے روحانیت کا علم بھی حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر عملی تعلیم کے لئے مجاہدے کرتے ہیں۔ جس سے اُن کی نگاہوں میں اور سانس میں اور ہاتھوں میں ایسی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کہ جب وہ اِس ارادہ سے کسی کو دیکھتے ہیں کہ اُس کا خیال بدل جائے۔ بُرے حالات اچھے ہو جائیں۔ بیماریاں دور ہو جائیں تو عامل کی نظر اور ارادہ کی نظر نہ آسکنے والی لہریں عامل سے جدا ہو کر معمول کے اندر چلی جاتی ہیں اور اُس کی بیماریوں کو دور کر دیتی ہیں۔ اور اُس کی برائیوں کو بدل دیتی ہیں۔ اور اُس کی خواہشات کو پاکیزہ بنا دیتی ہیں۔

تعویذ کا فلسفہ بھی یہی ہے۔ کہ عامل کی باطنی قوتیں دل اور دماغ اور مقام مدع سے عامل کے ارادہ اور تصور میں آتی ہیں۔ اور پھر ہاتھوں کی انگلیوں کے ذریعہ تعویذوں کی تحریر میں جذب ہو جاتی ہیں۔ اور وہ تعویذ بیماریوں کو دور کر دیتے ہیں۔ اور اُن کے اثر سے انسانی

Marfat.com

ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔

نواب صاحب:۔ تاثیر ہر چیز میں خدا ہی نے دی ہے۔ لیکن ہم جب اس تاثیر سے کام لینا چاہتے ہیں تو اُس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو کروا سکتے ہیں۔ یہی درخواست ہماری اصحاب باطن سے ہے۔ کہ اُس مقناطیسی طاقت کا جو اُن کی رائے میں اُن کی انگلیوں میں موجود ہے۔ ہم کو مشاہدہ کروا دیں۔ ہم قائل ہو جائیں گے۔

بندہ نواز عقل اور عقیدہ میں جنم جنم کا بیر ہے۔ اِن کی لاگ ڈانٹ ضرب المثل ہے عقیدہ کے آگے عقل نہیں چلتی اور عقل کے سامنے عقیدہ کے پاؤں لڑکھڑا جاتے ہیں۔ جہاں تک عقائد کا سوال ہے میں بھی اپنے نانا ہی جیسا خوش اعتقاد یا ضعیف الاعتقاد ہوں۔ لیکن کیا کروں عقل نہیں مانتی۔ میری رائے ناقص میں جناب نے اب تک ایک بھی عقلی دلیل ایسی پیش نہیں کی۔ جو مجھ کو یا اور کسی صاحب فہم کو یہ منوا دے کہ تعویذ گنڈہ میں اثر ہے۔

خواجہ صاحب:۔ ممکن ہے کہ آپ کو اطمینان نہ ہوا ہو۔ لیکن مناظرہ سُننے والے صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں۔ کہ میں نے روحانی کمالات اور تعویذ گنڈوں کی تاثیرات کا فلسفہ عقل میں آنے کے قابل بیان کیا یا نہیں کیا؟ اور اگر میں بالفرض جواب دینے میں ناکام بھی رہا تب بھی میرے ضمیر کو یہ اطمینان ہے کہ خود میری عقل نے میری دلیلوں کو مان لیا اور یہی بات میرے لئے اور میرے ہم عقیدہ لوگوں کے لئے کافی ہے۔ کہ ہم روحانی کمالات کی تاثیر کو ہر وقت اور ہر جگہ دیکھتے ہیں۔ اور اِسی وجہ سے اُن کو مانتے ہیں۔

اعمال حزب البحر

۹۶ چھیانوے صفحے۔ روحانی قوت حاصل کرنے کے طریقے قیمت دس آنے دوسرا حصہ کتاب تسلی صفحے ۱۲۰ اس میں بھی روحانی کمالات حاصل کرنے کے طریقے درج ہیں قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ دفتر اخبار منادی دلی

Marfat.com

امام حسینؑ کی شہادت

خواجہ صاحب کی تقریر جو عشرہ محرم ۱۳۵۵ھ کی شام کو خود خواجہ صاحب نے دلی ریڈیو میں سنائی۔

اب ذرا دل تھام لینا۔ ایسی باتیں سُننے کا وقت آگیا۔ جو آدمیت رکھنے والے انسان کے دل کی برداشت سے بڑھ کر ہیں۔ سُننے والے اپنے اپنے تصور میں ایک خیالی تصویر میرے بیان سے بناتے جائیں تو کربلا کی اصلی حالت سامنے دکھائی دینے لگے گی۔

دس محرم کو دن کے ایک بجے تک حضرت امام حسینؑ کے بھائی اور لڑکے اور ساتھی جو سب مل کر ۷۲ آدمی تھے۔ اُس زمانہ کے دستور کی موافق ایک ایک کرکے میدانِ جنگ میں گئے اور بڑی بہادری سے لڑے اور مارے گئے۔ حضرت امام حسینؑ گھوڑے پر سوار کھڑے رہتے تھے۔ اور اپنے بچوں اور ساتھیوں کے قتل کے وقت مقتل میں پہنچ جاتے تھے۔ اور اُن کے ساتھی اور بچے اپنے باپ اور آقا کی گود میں سر رکھ کر جان دیتے تھے آخر جب کوئی مرد باقی نہ رہا تو حضرت امام حسینؑ عورتوں کے خیمہ میں گئے۔ عورتیں پہلے ہی سے ایک جگہ جمع تھیں۔ حضرت امام حسینؑ کی بہن زینبؑ اور بیوی شہر بانو جو شہنشاہ ایران یعنی کسریٰ کی بیٹی تھیں۔ اور حضرت کی لڑکیاں سکینہؑ وغیرہ حضرت کے چاروں طرف جمع ہوگئیں۔ اور حضرت کی بےکسی اور تنہائی کو دیکھ کر رونے لگیں۔ تو حضرت کے منجھلے لڑکے علیؓ اوسط جن کو زین العابدینؓ اور سجاد کہتے تھے۔ اور جو بیمار تھے بستر سے اُٹھ کر باپ کے پاس آئے۔ اور اُنھوں نے میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت مانگی۔ اور کہا۔ "بابا اولاد اسی دن کے لئے ہوتی ہے۔ کہ ماں باپ پر قربان ہوجائے۔" حضرت نے جواب دیا: بیٹا! تمہارے سب بھائی مارے گئے۔ تمہارے سوا کوئی بھی باقی نہیں رہا جس سے رسولؐ اللہ تمہارے باپ دادا کی نسل قائم رہے۔ اور تم بیمار بھی ہو۔ میں ان عورتوں کو تمہارے حوالے

Marfat.com

کرتا ہوں۔ دشمن میرے مرنے کے بعد ان کو بے آبرو نہ کرنے پائیں۔

بیٹا تمہارے دادا اور میرے باپ علیؓ نے اسلام اور رسول اللہ کو بچانے کے لئے بدر کی لڑائی، اُحد کی لڑائی اور خندق کی لڑائیوں میں یزیدی خاندان کے بڑے بڑے سرداروں کو قتل کیا تھا۔ آج یزید کی فوج اسی کا بدلہ مجھ سے اور میری اولاد سے لے رہی ہے۔ میرے نانا اور میرے باپ نے اسلام کو بچانے اور مسلمانوں کو حملوں سے بچانے کے لئے جنگ کی تھی اور میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے بچاؤ کے لئے یہ قربانیاں دے رہا ہوں۔ صبر و ہمت سے کام لینا۔ تمہارے بڑے بھی مصیبت کے وقت صبر کرتے تھے۔ تم بھی صبر کرنا۔ پھر عورتوں سے فرمایا "تم رسول اللہ کی آل اولاد ہو۔ مصیبت سے گھبرا نہ جانا۔ اس دنیا میں مصیبت بھی ہمیشہ نہیں رہتی۔ اور راحت بھی فنا ہو جاتی ہے۔ لیکن صبر اور بے صبری کی یاد ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ یہ کہہ کر حضرت نے رسول اللہ کا عمامہ اپنے سر پر باندھا۔ اور حضرت علیؓ کی تلوار ہاتھ میں لی۔ اور سب کو خدا حافظ کہہ کر گھوڑے پر سوار ہوئے۔ اور میدان جنگ میں دشمن کی صفوں کے سامنے آ کر یزید کی فوج کے سپہ سالار عمر سعد اور دوسرے سرداروں شمر بن ذی الجوشن وغیرہ کو مخاطب کر کے فرمایا "اے عمر سعد تو سعد بن وقاص فاتح ایران کا بیٹا ہے۔ تو مجھے اور تیرا باپ میرے باپ کو اور میرے نانا کو جانتا تھا۔ تم نے میرے نانا محمد رسول اللہ کا دین اسلام قبول کیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ ہم ہاشم کی اولاد میں جو کعبہ کے متولی تھے۔ اور سارے ملک عرب میں ان کی عزت تھی۔ اس لئے ہاشم کا بھائی اُمیہ ان کی عزت سے حسد کرتا تھا۔ پھر ہاشم کے بیٹے عبدالمطلب اور ان کے بیٹے ابو طالب جو میرے باپ علیؓ کے باپ تھے کعبہ کے متولی ہوئے۔ اور اُمیہ کی اولاد ان کی عزت کی دشمن رہی۔ اور جب خدا نے عبدالمطلب کے پوتے محمدؐ کو اپنا رسول بنایا تو اُمیہ کی اولاد کو بہت زیادہ حسد ہوا۔ اور یزید کا دادا ابو سفیان رسول اللہ سے بدر، اور اُحد اور خندق کے میدانوں میں لڑا اور میرے باپ علیؓ نے ہمیشہ اُمیہ کی اولاد کو شکست دی۔ یزید کی دادی ہند نے

Marfat.com

رسول اللہ کے چچا حمزہؓ کو قتل کرایا۔ اور اُن کا کلیجہ چبایا۔

اے لوگو! میں حکومت کا شوقین نہیں ہوں۔ میرے باپ بھی حکومت و خلافت کے طلب گار نہیں تھے۔ کیا رسول اللہ نے اپنے آخری حج کے بعد ایک لاکھ مسلمانوں کے سامنے یہ تقریر نہیں کی تھی۔ کہ جس کا میں حاکم ہوں علیؓ بھی اُس کے حاکم ہیں۔ مگر میرے باپ علیؓ نے رسول اللہ کی وفات کے بعد حکومت نہیں چاہی اور ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ خلیفہ ہوگئے۔ اور میرے باپ نے اِن تینوں کی حکومتوں کو مدد دے کر کامیاب کیا۔ اور عثمانؓ کے قتل کے بعد جب مسلمانوں نے بے حد مجبور کیا تب میرے باپ نے خلافت اور حکومت قبول کی۔ مگر تم نے دھوکہ سے اُن کو قتل کر دیا۔ پھر تم نے اصرار کر کے میرے بڑے بھائی حسنؓ کو اپنا خلیفہ بنایا اور انھوں نے چھ مہینے حکومت کی۔ آخر معاویہ کی بغاوت ہوئی۔ اور میرے بھائی نے مسلمانوں کو خانہ جنگی سے بچانے کے لئے حکومت معاویہ کو اس شرط پر دیدی۔ کہ اُن کے بعد اُن کا بیٹا یزید بادشاہ نہ ہو۔ بلکہ وہ بادشاہ ہو کہ جس کو سب مسلمان مل کر انتخاب کریں۔ مگر معاویہ نے میرے بھائی کو زہر دلوا دیا۔ اور اپنے بیٹے یزید کو مسلمانوں کی عام رائے کے خلاف بادشاہ بنا دیا۔ یزید اسلام کا پابند نہیں ہے اور وہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں اُس کی بادشاہی قبول کرلوں۔

تم اس بات کو اسی طرح جانتے ہو جس طرح اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو جانتے ہو۔ کہ ساری دنیا کے مسلمان میرے نانا کا کلمہ پڑھتے ہیں اور تم بھی پڑھتے ہو۔ اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ قرآن میں خدا نے میرے خاندان کو پاک خاندان فرمایا ہے۔ اس لئے حجاز اور مصر اور عراق اور ایران اور خراسان و افغانستان کے سب مسلمان میرے حامی ہیں۔ مگر میں خونریزی کرنا نہیں چاہتا۔ اور یہاں تم سے لڑنے نہیں آیا تھا۔ بلکہ میرے باپ کے پایہ تخت کوفہ کے سرداروں نے مجھے ملنے کے لئے بلایا تھا۔ اگر میں حکومت اور لڑائی چاہتا تو ایران اور خراسان سے لاکھوں فوجیں بُلا کر لاتا۔ اور زمین پر اُمیہ کی اولاد کا ایک آدمی زندہ نہ چھوڑتا۔ اگر لڑنے آتا تو اپنے ساتھ عورتوں اور بچوں کو نہ لاتا۔

Marfat.com

اے عمر سعد تو نے رسول اللہ کے گھر والوں پر پانی بند کر دیا۔ اور میرے بچوں کو میری آنکھوں کے سامنے کئی دن پیاسا رکھ کر قتل کر دیا۔ تو دنیا کے لالچ میں ہے۔ میں آخرت کے خیال میں ہوں۔ میں نے اپنا سب کچھ اسلام کی آزادی اور حق کی آزادی اور جمہوریت کی آزادی پر قربان کر دیا۔ اب بس میری ایک جان رہ گئی ہے۔ اور میں اس کو بھی خدا کے راستہ میں قربان کرنے آیا ہوں۔ اے سعد وقاص کے بیٹے سامنے آ۔ جس طرح میرے باپ نے یزید کے باپ معاویہ کو صفین کی لڑائی میں پکارا تھا۔ کہ مسلمانوں کو کیوں قتل کراتا ہے۔ تو خود میرے سامنے آ۔ ہم تم لڑلیں اور مسلمانوں کو بچالیں۔ مگر وہ چھپ گئے اور سامنے نہ آئے۔ آج میں بھی تجھ کو پکارتا ہوں۔ دیکھ میں تین دن کا پیاسا ہوں اور میرے چاروں طرف میرے جوان بیٹے اور دودھ پیتے بچے اور ساتھی مرے پڑے ہیں۔ اور خیمہ میں فقط پیاسی اور بے کس عورتیں رہ گئی ہیں۔ اور ایک آدمی بھی اس وقت میرا مددگار نہیں ہے۔ کیا ایسے وقت میں دنیا کا کوئی آدمی اپنے حواس قائم رکھ سکتا ہے؟ مگر میں حسین علی کا بیٹا۔ ابو طالب کا پوتا۔ محمد رسول اللہ کا نواسہ چونکہ حق پر ہوں اس واسطے میرا دل مضبوط ہے۔ اور میں ان مصیبتوں سے کچھ بھی نہیں گھبرایا۔ آگے بڑھ اور مقابلہ کر۔ عمر سعد یہ تقریر سُن کر چھپ گیا۔ اور اپنی فوج کو اشارہ کیا جس نے آگے بڑھ کر چاروں طرف سے حضرت امام حسینؓ پر تلواروں اور تیروں اور برچھوں سے حملہ کیا۔ اور حضرت امام حسینؓ نے سیکڑوں کے وار بچانے شروع کئے اور خود بھی وار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ دشمنوں کی صفیں ٹوٹ گئیں۔ اور وہ چیخ چیخ کر کہنے لگے۔ بچو ابو طالب کے پوتے کے وار سے بچو۔ فاطمہ کا بیٹا دائیں طرف سے آیا ہے اُدھر سے ہٹو۔ بائیں طرف والے پکارتے تھے۔ علیؓ کے بیٹے کو گھیر لو۔ وہ پیاسا ہے۔ اور اکیلا ہے۔ تم ڈرتے کیوں ہو؟ بھاگتے کیوں ہو؟۔

امام حسینؓ نعرے لگاتے تھے۔ اَنَا ابْنُ رَسُوْلِ اللّٰہِ۔ اَنَا ابْنُ اَسَدِ اللّٰہِ۔ اَنَا سَیْفٌ۔ اَنَا سَھْمٌ۔ اَنَا رُمْحٌ۔ اَنَا حَقٌّ۔ اَنَا اٰیَۃٌ مِنْ اٰیَاتِ

Marfat.com

اللہ یعنی میں رسولؐ اللہ کا فرزند ہوں میں شیرِ خدا کا بیٹا ہوں ۔ میں ایک تلوار ہوں ۔ میں ایک تیر ہوں ۔ میں ایک نیزہ ہوں ۔ میں حق ہوں ۔ میں ایک نشانی ہوں خدا کی نشانیوں میں ۔

آخر سب بڑے بڑے افسروں نے مل کر حملہ کیا ۔ حضرت امام حسینؓ کے ستر زخم لگ چکے تھے ۔ اور دھوپ بہت تیز تھی ۔ دو بجے کا وقت تھا ۔ اور وہ تین دن کے پیاسے بھی تھے ۔ گھوڑا زخمی ہو کر گرا ۔ اور وہ بھی زمین پر گرے ۔ اور انھوں نے اپنی عورتوں کے خیمہ کی طرف دیکھا ۔ اور پھر آسمان کو دیکھا اور فرمایا ۔ یا اللہ تیرے سوا ان غریب عورتوں کا کوئی حافظ و ناصر نہیں ہے ۔

قتل حضرت زخموں سے چور زمین پر پڑے تھے ۔ مگر اس قدر ہیبت تھی کہ کسی دشمن کو آگے بڑھنے اور سر کاٹنے کی جرأت نہ ہوتی تھی ۔ عمر سعد اور شمر بار بار پکارتا تھا ۔ کہ ڈرتے کیوں ہو وہ مر چکا ہے ۔ سر کاٹ لو ۔ مگر کوئی آگے نہ بڑھتا تھا ۔ آخر خولی بن یزید آگے بڑھا ۔ اور اُس نے خنجر میان سے نکالا ۔ اور اپنے دونوں گھٹنے امام حسینؓ کے سینہ پر رکھے ۔ اور خنجر گلے پر بڑھایا حضرت نے تیز نظر سے اُس کو دیکھا ۔ وہ کانپنے لگا ۔ حضرت نے کمزور آواز میں کہا ۔ تو پہلے اپنا سینہ دکھا ۔ میرے باپ نے کہا تھا حسین کے قاتل کے سینہ پر سفید داغ ہوں گے ۔ اور اُس کے دو دانت بڑے بڑے آگے کو نکلے ہوئے ہوں گے ۔ خولی نے سینہ دکھایا تو اُس پر سفید داغ تھے ۔

حضرت نے فرمایا " اے شخص میرے چند سانس باقی ہیں ۔ میں خود ہی مر جاؤں گا ۔ اس کے بعد سر کاٹ لیجو ۔ زندہ کا سر کاٹے گا تو قیامت تک لوگ کہیں گے " کہ خولی ابنِ رسول اللہ کا قاتل تھا ۔ اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی مسلمان بھی میری وجہ سے بدنام ہو ۔ خولی نے جواب دیا " اے حسینؓ تجھ جیسا بہادر زمین پر پیدا نہ ہوا ہو گا ۔ تو مرتے وقت بھی مسلمانوں کی بدنامی کا خیال کرتا ہے ۔ مگر میں یزید اور عمر سعد اور ابن زیاد حاکم کوفہ کے حکم سے تیرا سر جدا کرتا ہوں ۔ اور جانتا ہوں کہ تو حق پر ہے ۔ اور تیرا قتل سب سے بڑا گناہ ہے ۔ مگر حاکم کے حکم

Marfat.com

کا پورا کرنا میرے لئے ضروری ہے

یہ کہہ کر خولی نے حضرت کے گلے پر خنجر چلایا۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور گلا پیاس کے سبب اتنا خشک تھا۔ کہ خنجر اچھی طرح چلتا نہ تھا۔ خولی نے ایک ہاتھ سے حضرت کی زلفیں پکڑلیں۔ اور دوسرے ہاتھ سے خنجر چلایا۔ اور سرکاٹ کر زلفوں میں لٹکالیا۔ اور کھڑا ہوگیا۔ اور دیوانوں کی طرح چیخا۔ دیکھو۔ یہ حسینؑ بن علیؑ کا سر ہے۔ یہ ابوطالب کے پوتے کا سر ہے۔ یہ فاطمہؑ کے بیٹے کا سر ہے۔ جو یزید کی حکومت کو نہ مانتا تھا۔ اور جس کے باپ نے یزید کے بزرگوں کو قتل کیا تھا۔ آج میں یزید کے دربار سے سب سے بڑے انعام کا مستحق ہوں۔ کہ میں نے دنیا کے سب سے بڑے آدمی کا سر کاٹا ہے۔ اور بدر کے مقتولوں کا بدلہ لیا ہے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ اُس کا سُننا کسی آدمی سے برداشت نہ ہو سکے گا۔ بس یوں سمجھ لو کہ ظلم و ستم کی انتہا کردی گئی۔ جب خیمے جلائے گئے۔ اور حضرت کی عورتوں کو لوٹا اور ستایا گیا۔

محرّم نامہ

صفحات ۱۲۸۔ یہ وہ کتاب ہے جو بیس سال سے شیعہ اور سُنی مجالس میں پڑھی جاتی ہے بارہ دفعہ چھپ چکی ہے قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر اخبار منادی دہلی

سیرت امام حسینؑ } ۳۲ صفحے قیمت چار آنے۔ اور ان کے علاوہ یزید نامہ صفحات ۱۴۴ قیمت ایک روپیہ چار آنے اور طمانچہ بر رخسار یزید ڈرامہ صفحات ۱۱۴ قیمت ایک روپیہ۔ بھی اس سلسلے کی نہایت عمدہ کتابیں ہیں یہ سب حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کی لکھی ہوئی ہیں۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر اخبار منادی دہلی

Marfat.com

میرے پانچ بادشاہ

تاج پوشی لندن کی تقریب میں

خواجہ حسن نظامی صاحب کی تقریر جو ۱۰ مئی ۱۹۳۷ء کو دہلی ریڈیو میں ہوئی تھی

آج سب کے کان لندن کی تاج پوشی کا غلغلہ سن رہے ہیں۔ سب کی آنکھیں اور دل اُسی منظر کی طرف متوجہ ہیں۔ پھر میری بات کون سنے گا؟ مگر کوئی سنے یا نہ سنے۔ دیکھے یا نہ دیکھے مجھے اپنا ایک جذبہ ادا کرنا ہے۔ وہ جذبہ نہیں جو محکوموں کو حکم دے کر ابھارا جاتا ہے۔ بلکہ وہ جذبہ جو ایسے حالات کے وقت خود بخود ہر آدمی کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے جمائی لینے والے کو دیکھ کر دوسروں کو جمائی آنے لگتی ہے۔ بس میں بھی تاج پوشی کی چہل پہل میں آپ ہی آپ یہ بولنا چاہتا ہوں۔ کہ میرے جدِ اعلیٰ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے چھ سو برس پہلے اپنی ۹۵ برس کی زندگی میں سات بادشاہ دیکھے تھے۔ یا سات بادشاہوں کی حکومت دیکھی تھی غیاث الدین بلبن۔ معز الدین کیقباد۔ جلال الدین خلجی۔ علاء الدین خلجی۔ قطب الدین خلجی۔ غیاث الدین تغلق۔ محمد تغلق۔

اور میں نے اپنی ۶۱ برس کی عمر میں پانچ بادشاہ دیکھے ہیں۔ یا پانچ بادشاہوں کی حکومت دیکھی ہے۔ ملکہ وکٹوریہ۔ ایڈورڈ ہفتم۔ جارج پنجم۔ ایڈورڈ ہشتم۔ جارج ششم اور پانچ کے عدد سے جو مذہبی مناسبت مجھے ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ میری زندگی انہی پانچ میں ختم ہو جائے گی۔

میں نے بچپن کی بے خبری سے ہوش کی دنیا میں قدم رکھا تو ملکہ وکٹوریہ کا نام سنا۔ لفافہ اور کارڈ اور روپے پیسہ پر ملکہ کی تصویریں دیکھیں جو ملکہ کے شباب کی تھیں۔ اپنی اماں سے ملکہ کی تعریفیں بھی بہت سنیں۔ اور یہ بھی سنا کہ عدد ۱۹۰۰ء کے ایک سال بعد ہی ملکہ

Marfat.com

نے معافی کا عام اعلان شائع کیا تھا۔ اور آگرہ کے ایک مولوی صاحب کو لندن بلا کر اردو سیکھی اور مخفی اسلام قبول کیا تھا۔ یہ ملکہ کے بڑھاپے کے ٹکٹ بھی دیکھے۔ گر ہر زمانہ کی صورت میں ایک وقار پایا۔ نیک خیالی اور ہمدردی کے نشان چہرہ پر دیکھے۔ پھر ملکہ کے بیٹے ایڈورڈ ہفتم کا زمانہ آیا۔ وہ ڈاڑھی والے۔ بھاری بھرکم۔ بڑی بڑی کٹورہ سی آنکھوں اور چوڑے سینے بلند پیشانی کے انگریز تھے۔ اُن کی حکومت کا زمانہ بھی ملکہ دکٹوریہ کی طرح امن اور خوش حالی کا زمانہ تھا اور وہ پیس میکر یعنی "امن ساز" کے لقب سے مشہور تھے۔

جارج پنجم } ایڈورڈ ہفتم کے بعد اُن کے بیٹے جارج پنجم بادشاہ ہوئے۔ اور وہ بھی ڈاڑھی رکھتے تھے۔ اور اُن کی آنکھیں بھی بڑی اور خوبصورت تھیں۔ جب وہ ولی عہد تھے اور پرنس آف ویلز کہلاتے تھے۔ تو اپنی ملکہ میری کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ اور جب درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ میں آئے تو میں نے اُن سے ملاقات کی تھی۔ اور ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا۔ جس سے اُن کی نیک دلی ظاہر ہوتی تھی۔ اور وہ واقعہ یہ تھا کہ جب وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مزار کے سامنے آکر کھڑے ہوئے تو میں نے اردو زبان میں اُن سے کہا۔ کہ یہ وہ مقام ہے۔ جہاں ترک اور افغان اور مغل شہنشاہ اظہار ادب کے لئے اپنے سر اس چوکھٹ پر رکھ دیتے تھے۔

میری بات کا انگریزی ترجمہ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سر چارلیس ریواز نے اُن کو سنایا جو اُن کے ساتھ تھے۔ تو انھوں نے اپنی ٹوپی اتار لی۔ اور اپنے سر کو مزار کی طرف جھکا کر مجھ سے کہا۔ کہ میں بھی اِن وَلی کا ادب کرتا ہوں"۔

اس واقعہ کا لوگوں پر بہت زیادہ اثر ہوا۔ اور جب یہ خبر اخباروں میں شائع ہوئی۔ تو تمام ہندوستان میں شہزادہ کی تعریف کی گئی تھی اسی دن ایک اور دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا تھا جب پرنس اپنی گاڑی میں سوار ہوتے اور مسٹر ہمفریز ڈپٹی کمشنر دہلی نے گاڑی کا دروازہ بند کیا۔ تو درگاہ کے ایک بوڑھے آدمی نے پرنس سے کہا۔ شہزادہ صاحب یہ ہمارے ڈپٹی کمشنر

Marfat.com

بہت اچھے آدمی ہیں۔ دیکھئے انھوں نے کوچوان کی طرح آپ کی گاڑی کا دروازہ بند کیا ہے۔ اپنے والد سے ان کی سفارش کیجئے گا تاکہ ان کو کوئی اور بڑا عہدہ مل جائے۔

جب اس دلچسپ بات کا ترجمہ پرنس کو سنایا گیا۔ تو وہ اور ملکہ دونوں ہنسنے لگے اور اُن کو اس بات سے بہت لطف آیا۔

جارج پنجم کی تصویر ٹکٹ اور سکہ میں دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ بہت مضبوط جسم کے ہیں۔ مگر وہ بہت دبلے اور کمزور تھے۔ اور شیشہ کی ایک صراحی میں دودھ اُن کے ساتھ رہتا تھا۔ جس کو تھوڑی دیر کے بعد پیتے تھے۔ چنانچہ مذکورہ درگاہ میں بھی ایک چبوترہ پر بیٹھ کر انھوں نے دودھ پیا تھا۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں جب وہ بادشاہ ہو کر آئے تب بھی انھوں نے اس درگاہ کو یاد رکھا۔ اور ایک رقم بھیجکر درگاہ کے پردے بنوائے۔

ایڈورڈ ہشتم } جارج پنجم کے ولی عہد بھی بحیثیت پرنس آف ویلز ہندوستان میں آئے تھے۔ جو تخت نشینی کے بعد ایڈورڈ ہشتم کے لقب سے مشہور ہوئے تھے۔

یہ ڈاڑھی مونچھ منڈاتے ہیں۔ اور اُن کی آنکھیں بھی بڑی اور خوبصورت ہیں۔ میں اُن سے وقت مقرر کر کے کیمپ دہلی میں ملنے گیا تھا۔ ملاقات کا وقت پانچ منٹ مقرر ہوا تھا مگر انھوں نے پندرہ منٹ تک بات کی تھی۔

میں نے پوچھا۔ آپ نے دہلی کو پسند کیا۔ اُنھوں نے جواب دیا۔ وہ میرا پایۂ تخت ہے۔ مگر میں تم لوگوں کی طرح آزادی کے ساتھ اس شہر کو نہیں دیکھ سکا۔ کیونکہ مجھے ایک مقررہ پروگرام کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ جس کو میں پسند نہیں کرتا۔

پرنس کے اس فقرے سے میں نے اُن کی آزاد خیالی کا اندازہ لگایا تھا۔ جو بادشاہ ہونے کے بعد ساری دنیا کے سامنے آگیا۔ کہ اُنھوں نے اپنی خوشی اور آزادی کا مالک رہنے کے لئے تاج و تخت چھوڑ دیا۔

Marfat.com

جارج ششم (ایڈورڈ ہشتم کی دست برداری کے بعد اُن کے چھوٹے بھائی جارج ششم کے نام سے تخت نشین ہوئے۔ جن کی تاج پوشی کا یہ جلسہ ہو رہا ہے۔

یہ بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح ڈاڑھی مونچھ منڈاتے ہیں۔ اور اپنے بڑے بھائی سے صورت شکل میں بہت مشابہ ہیں۔ میں نے اُن کی فقط تصویر دیکھی ہے۔ خود اُن کو نہیں دیکھا۔ یہ پانچویں بادشاہ ہیں۔ جو میری عمر میں ہندوستان کے حکمراں ہوئے ہیں میری عادت خوشامد کی نہیں ہے۔ میں بغیر کسی دباؤ اور خوشامد کے یہ کہتا ہوں۔ کہ یہ پانچوں بادشاہ اپنی رعایا سے محبت رکھنے والے اور اُن کے دُکھ سکھ سے تعلق رکھنے والے تھے۔

ملکہ وکٹوریہ کو تو خدا نے اقبال ایسا دیا تھا۔ کہ اُنہی کے زمانہ میں ہندوستان برطانی حکومت میں داخل ہوا تھا۔ اور اُن کی حکومت کا سارا زمانہ امن سے گزرا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ کو اردو زبان کا بہت شوق تھا۔ اور انھوں نے آگرہ کے ایک مسلمان کو لندن بلا کر اردو زبان سیکھی تھی۔ اور وہ اردو زبان میں اپنے دستخط کر لیتی تھیں۔ چنانچہ میں نے اُن کے اردو دستخط دیکھے ہیں۔

ایڈورڈ ہفتم کا زمانہ بھی امن و امان کا زمانہ تھا۔ البتہ جارج پنجم کے زمانہ میں جنگ یورپ ہوئی تھی۔ ایڈورڈ ہفتم کی مہماں نوازی کا ایک قصہ سُنانے کے قابل ہے۔ کہ ایک دفعہ اُن کے ہاں شہنشاہ ایران مہمان تھے۔ کھانے کے بعد انگریزی رواج کی موافق کٹوروں میں پانی آیا جس میں انگلیاں ڈبو کر صاف کر لی جاتی ہیں۔ اس پانی میں گلاب کے پھول پڑے ہوئے تھے۔ شاہ ایران اس رواج سے واقف نہ تھے انھوں نے خیال کیا کہ یہ پانی پینے کے لئے آیا ہے۔ اس لئے انھوں نے وہ پانی پی لیا۔ ایڈورڈ ہفتم نے اپنے مہمان کو یہ پانی پیتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے بھی وہ پانی پی لیا۔ تا کہ مہمان کو شرمندگی نہ ہو۔ اور میز پر جتنے بڑے بڑے لارڈ بیٹھے تھے سب نے وہ پانی پی لیا

جارج پنجم باوجود بڑھاپے اور جسم کی کمزوری کے آخری سانس تک خدمت خلق کا

Marfat.com

کام کرتے رہے تھے

ایڈورڈ ہشتم بھی بہت اچھے بادشاہ تھے۔ مگر نئے زمانہ کے نوجوانوں کی طرح اُن میں آزادی کا جذبہ زیادہ تھا۔ اور وہ پُرانے رسم ورواج کی پابندی نہ کرنی چاہتے تھے۔ اِس لئے انھوں نے تاج وتخت چھوڑ دیا۔

جارج ششم بھی آزاد خیال نوجوان ہیں۔ لیکن وہ اپنی قوم اور اپنے دربار کے رواج کے پابند ہیں۔ اور وہ ہر رواج اور دستور کے حامی ہیں۔ اُن کی بیوی بہت خوبصورت اور نیک سیرت ہیں۔ اور یہ دونوں صاحب اولاد بھی ہیں۔ اور ایڈورڈ ہشتم جب بادشاہ تھے تو کہا کرتے تھے کہ میرے بھائی کو خدا نے اپنی برکت عطا فرمائی ہے۔ یعنی وہ صاحب اولاد ہیں۔

ہندوستان کے تمام باشندے نرم ہوں یا گرم سب ہی برطانیہ کے شاہی خاندان سے محبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستان کی سب ہندو مسلمان قومیں ہمیشہ سے شاہی خاندان کے ساتھ محبت کرتی آئی ہیں۔

طرز حکومت سے بعض اوقات بعض لوگوں کو اختلاف بھی ہوتا ہے۔ مگر شاہی خاندان کی کبھی کسی شخص نے مخالفت نہیں کی۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ہندوستانی لوگ شاہی خاندان سے محبت رکھتے آئے ہیں۔

آج اگرچہ تاج پوشی کا دربار لندن میں ہو رہا ہے جو ہندوستان سے سات ہزار میل دور ہے۔ تاہم تمام ملک کی ہندو مسلمان قوموں میں اس دربار کا چرچہ ہے۔ اور ہر ایک کی زبان پر بادشاہ اور اُن کی ملکہ کا ذکر موجود ہے۔

خدا کرے جارج ششم کی تاج پوشی برطانیہ کے لئے اور شاہی خاندان کے لئے اور ہندوستان کے لئے مبارک ہو۔ آمین۔

جارج پنجم کی رحم دلی کا ایک قصہ } اسی سلسلہ میں سابق شہنشاہ جارج پنجم کی رحم دلی کا ایک قصہ بھی سُنانے کے قابل ہے۔ کہ جب وہ پرنس آف ویلز کی حیثیت میں

Marfat.com

دِلی آئے تو میں نے اُن کو اردو زبان میں ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا۔ کہ اے برطانیہ کے ولی عہد آپ کو معلوم ہو کہ دِلی شہر آخر زمانہ میں مغل بادشاہوں کا پایۂ تخت تھا۔ اور آخری مغل بادشاہ دہلی کی اولاد اِس شہر میں اب بھی بکثرت موجود ہے۔ ان میں سے بعض کے نام آپ کی گورمنٹ نے پانچ روپے ماہوار گزارہ مقرر کر دیا ہے۔ اور بہت سے عورت و مرد شہزادے ابھی ایسے موجود ہیں جن کے نام گزارہ مقرر نہیں ہوا ہے۔ اول تو پانچ روپے ماہوار میں بادشاہ کی اولاد کو گزارہ کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ ہر چیز مہنگی ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ جن شہزادوں کا گزارہ مقرر نہیں ہوا۔ وہ محنت اور کام کے عادی نہ ہونے کے سبب کوئی پیشہ نہیں کر سکتے۔ اور فاقہ کشی میں مبتلا ہیں۔ ان میں بعض اندھے ہیں اور بعض بہت بوڑھے ہیں۔ اور اکثر پردہ نشین عورتیں ہیں۔ آج کی رات آپ کی میز پر اتنا کھانا بچ جائے گا جس کو سو پچاس آدمی اپنا پیٹ بھرنے کو کافی سمجھیں گے۔ مگر آج ہی کی رات بہت سے شہزادے اور شہزادیاں اور اُن کے چھوٹے چھوٹے بچے بھوکے سوئیں گے۔ کیونکہ اُن میں سے اکثر کو ایک وقت بھی بہت مشکل سے روٹی میسر آتی ہے۔ اگر آپ اپنی حکومت ہند اور حکومت دہلی کو بحیثیت ولی عہد سلطنت برطانیہ کے حکم دیں تو ان باقی شہزادوں کی گزر اوقات کا سامان بھی ہو جائے۔ اور وہ سب آپ کی اور تمام شاہی خاندان کی صحت و سلامتی کے لئے دعائیں کریں۔

اِن شہزادوں میں ایک شہزادہ نصیر الملک ہے۔ جو بہادر شاہ کا پوتا ہے۔ اور اُس کے دونوں پاؤں فالج سے خراب ہو گئے ہیں۔ اور وہ چل پھر نہیں سکتا۔ اِس واسطے اپنے دونوں ہاتھوں کے سہارے گھسٹ کر بازار میں جاتا ہے۔ اُس کے گلے میں ایک جھولی پڑی رہتی ہے۔ وہ بازار میں راہگیروں کو دونوں طرف حسرت سے دیکھتا جاتا ہے اور آنسو بہاتا جاتا ہے۔ کیونکہ اُس کو یاد آتا ہے کہ میں ہندوستان کے سابق شہنشاہ کا پوتا ہوں۔ اور کسی زمانہ میں یہی راہگیر اِسی شہر کے بازاروں میں مجھے سلام کرتے تھے۔ اور جب میں

لال قلعہ سے گھوڑے پر سوار ہو کر ان بازاروں میں سیر کرنے کے لئے آتا تھا تو سب دکاندار میری تعظیم کے لئے اپنی دکانوں سے اتر کر نیچے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور مجھے جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ اور جب میں آگے بڑھ جاتا تھا تو آپس میں کہتے تھے۔ کتنا خوبصورت شہزادہ ہے اور کیسا اچھا لباس ہے۔ اور کس قدر قیمتی گھوڑے پر سوار ہے۔ یہ وہی شہزادہ ہے۔ جس نے کل جامع مسجد دہلی میں ایک ہزار فقیروں کو کھانا کھلایا تھا۔ اور ایک ہزار کمبل بانٹے تھے۔ تاکہ وہ سردی سے محفوظ رہ سکیں۔ مگر آج انقلاب کے بعد یہ سارا شہر مجھے بھول گیا۔ اور کوئی مجھے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ کہ مجھے کئی کئی وقت روٹی میسر نہیں آتی اور سردی کا کپڑا بھی میرے پاس نہیں ہے۔ اور بیماری کے علاج کے لئے ایک پیسہ بھی موجود نہیں ہے۔ جو لوگ میری اس بری حالت پر رحم کرتے ہیں تو ایک پیسہ میری جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ مگر وہ بھی یہ نہیں جانتے کہ میں سابق شہنشاہ ہند کا پوتا ہوں۔ بس یوں ہی محتاج اور اپاہج فقیر سمجھ کر مجھے پیسہ دیدیتے ہیں

جب میں نے یہ خط پرنس آف ویلز کو بھیجنا چاہا۔ تو میرے دوستوں نے مجھے منع کیا۔ کہ ایسا خط بھیجنا بہت بڑی گستاخی ہے۔ مگر میں نے جواب دیا کہ پرنس آف ویلز کو میں نے کل اپنی درگاہ میں دیکھا تھا۔ اور ان سے ایک بات کہی تھی۔ جس پر انہوں نے فوراً عمل کیا تھا۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ وہ میرے اس خط سے ناراض نہیں ہوں گے اور ان کو گزشتہ زمانہ کے بادشاہ کی اولاد پر ضرور رحم آئے گا۔ اور اگر انہوں نے اس خط کو گستاخی سمجھا اور اس کی وجہ سے مجھے جیل خانہ میں جانا پڑا تب بھی کچھ حرج نہیں ہے۔ کیونکہ مجھے اپنی نیت کا ثواب مرنے کے بعد خدا کے ہاں مل جائے گا۔

چنانچہ میں نے یہ خط پرنس آف ویلز کو بھیجدیا۔ اور انہوں نے اپنے سکرٹری سے میرے خط کا ترجمہ سنکر ڈپٹی کمشنر صاحب دہلی کو حکم دیا۔ کہ سابق بادشاہ کی اولاد کی تکلیف کو فوراً دور کر دیا جائے۔ چنانچہ جب پرنس آف ویلز دہلی سے چلے گئے تو ڈپٹی کمشنر

Marfat.com

صاحب دہلی نے سب شہزادوں کی تنخواہیں ڈبل کردیں۔ یعنی جن کو پانچ روپے ماہوار ملتے تھے اُن کے دس روپے ماہوار کر دئے۔ اور بہتر شہزادوں کے نام نئی تنخواہیں دس دس روپے ماہوار جاری کر دی گئیں۔ اُن لوگوں میں جن کے نام نئی تنخواہیں جاری ہوئی تھیں میرزا نصیر الملک بھی تھے۔ اور بہت سے شہزادے اور شہزادیاں بھی تھیں جو آنکھوں کی معذوری یا کسی اور مجبوری کے سبب کچھ کام نہ کر سکتی تھیں۔ اور آج تک یہ تنخواہیں اُن کے نام جاری ہیں۔ اور جو مر گئے اُن کی تنخواہیں بند ہو گئی ہیں۔ چنانچہ مرزا نصیر الملک کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔

اِس قصہ سے سابق شہنشاہِ برطانیہ جارج پنجم کی رحمدلی اور قوت برداشت ظاہر ہوتی ہے۔ کوئی اور بادشاہ ہوتا تو میرے خط سے خفا ہو جاتا۔ اور مجھ کو ایسا خط لکھنے کی سزا دیتا۔ مگر یہ برطانیہ کے شاہی خاندان کی ایک خوبی تھی کہ پرنس آف ویلز نے بُرا نہ مانا۔ اور سابق شہنشاہ کی اولاد کو فاقہ کشی سے بچا لیا۔ جب شہنشاہ جارج پنجم کے بیمار ہونے کی خبر آئی تو میں نے سُنا تیموری شہزادوں کے گھروں میں بڑھیا عورتیں دعائیں مانگ رہی تھیں کہ یا اللہ اُس بادشاہ کو سلامتی دے جس نے بے کسی اور بے بسی کی بھوک پیاس میں ہماری مدد کی تھی۔

تاریخ غدر دہلی

یہ کتاب بارہ حصوں میں شائع ہوئی ہے جو حسب ذیل ہیں۔ بیگمات کے آنسو ۱۲ انگریزوں کی بپتا ۱۲ محاصرہ دہلی کے خطوط ۱۲ بہادر شاہ کا مقدمہ ۱۲ غدر کے اخبار ۱۲ غدر کی صبح شام ۱۲ غدر کا نتیجہ ۱۲ غالب کا روزنامچہ ۱۲ دلی کی آخری شمع ۱۲ دہلی کی جاں کنی ۱۲ دہلی کا آخری سانس وغیرہ حصے ہیں۔ بارہ حصوں کی قیمت بارہ روپے

ملنے کا پتہ:۔ دفتر اخبار منادی دہلی

شادی کی بری رسمیں

۱۰ مئی ۱۹۳۷ء کی شام کو خواجہ صاحب کی زبان سے دلی ریڈیو کے ذریعہ نشر ہوئی

دلی ریڈیو میں پرانے زمانہ کی شادیوں کا قصہ سُن کر ایک مسلمان بیوی نے اپنے شوہر سے کہنا شروع کیا۔ جب کہ وہ کھانا کھاکر آرام کرسی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔

سُنتے بھی ہو! خدا رکھے تمہارا بیٹا بھی شادی کے قابل ہوگیا۔ پندرہ برس کی عمر ہوگئی اور بیٹی بھی بارہ سال کی ہے۔ اب اُس کو بٹھائے رکھنا اچھا نہیں ہے۔ اِن دونوں کی شادیوں کا فکر کرنا چاہیے۔ میں کئی دفعہ کہہ چکی ہوں۔ مگر تم پروا نہیں کرتے۔ اِس کان سُنتے ہو۔ اُس کان اڑا دیتے ہو۔

میاں نے حقہ کا دُھواں منہ سے اڑاتے ہوئے کہا "تمہیں تو رات دن شادیوں کا خلجان رہتا ہے۔ خبر بھی ہے کہ شاردا ایکٹ پاس ہوگیا ہے۔ اب کسی لڑکے کی شادی اٹھارہ برس کی عمر سے پہلے اور لڑکی کی شادی چودہ برس سے پہلے نہیں ہو سکتی۔ اور جو اس کے خلاف کرے گا اُس کو سرکار کی طرف سے سزا دی جائے گی۔ تمہارے لڑکے کی عمر ابھی پندرہ سال کی ہے۔ اور لڑکی بارہ برس کی ہے۔ دونوں کی شادیوں میں ابھی تین تین برس کی دیر ہے۔

بیوی نے خفا ہو کر کہا "سرکار کو شادی بیاہ کے معاملہ سے کیا تعلق؟ بیٹا بیٹی ہمارے ہیں ہم جب چاہیں اُن کی شادیاں کریں۔ سرکار رد کنے والی کون ہوتی ہے؟

میاں نے کہا "سرکار نے ہمارے ہی فائدہ کے لئے یہ قانون بنایا ہے۔ سب حکیم ڈاکٹر کہتے ہیں کہ "بچپن کی شادیوں سے بہت نقصان ہوتا ہے" اور خدا نے بھی قرآن مجید میں اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ کا لفظ فرمایا ہے"

بیوی نے کہا "اِس آیت کا کیا مطلب ہے"

Marfat.com

میاں نے کہا " یہ مطلب ہے کہ جب بیٹا بیٹی بالغ ہو جائیں۔ یعنی شادی کی عمر کو پہنچ جائیں تب نکاح کرنا چاہیئے۔

یہ سُنکر بیوی بولیں " اگر خدا نے قرآن میں یہ کہا ہے تو خدا کا حکم سر آنکھوں پر۔ اور تین برس ٹھہر جاؤں گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان بچوں کے سہرے کے پھول نہیں کھلے۔ اور بڑے بوڑھے کہہ گئے ہیں کہ شادیاں جب ہی ہوتی ہیں۔ کہ جب بچوں کے سہرے کے پھول کھلتے ہیں۔ خیر اگر تین برس کے بعد شادیاں کرنی ہیں تب بھی سامان تو ابھی سے کرنا چاہیئے۔ سونا اگرچہ آجکل مہنگا ہے پھر بھی پانچ چار چیزیں بنوانی ضروری ہیں۔ کپڑا جاپانی اگرچہ سستا ہے مگر وہ نقلی ہوتا ہے۔ اور جلدی خراب ہو جاتا ہے۔ اصلی ریشم کا کپڑا ابھی آنا چاہیئے۔ ہم کو دوہرا خرچ کرنا ہے۔ لڑکے کے لئے بری اور سانچق اور لڑکی کے لئے جہیز۔ تین سال بات کرتے گزر جائیں گے آج کا کام کل پر نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ چیزیں ابھی سے آجائیں گی تو میں سہج سہج تیاری کرتی رہوں گی۔ اور تین برس میں سب سامان ہو جائے گا۔

میاں نے کہا " تین برس کا زمانہ بہت بڑا زمانہ ہوتا ہے۔ اُس وقت تک خبر نہیں رواجوں میں کیا کیا تبدیلیاں ہو جائیں گی۔ اور کپڑے اور زیور کے فیشن بھی بدل جائیں گے لہذا جب وقت آئے گا اُس وقت دیکھا جائے گا۔ ابھی مناسب نہیں ہے۔

بیوی بولیں " اے سبحان اللہ۔ میں کیا انگریزن ہوں۔ جن کے ہاں روز روز فیشن بدلتے ہیں۔ اُن کے ہاں صبح کچھ اور فیشن۔ دوپہر کو کچھ اور۔ اور شام کو وہ بھی بدل گیا۔ اور رات کو سوتے وقت وہ بھی باقی نہ رہا۔ میں تو ہندوستان کی پیدائش ہوں اور لکیر کی فقیر بنی بیٹھی ہوں۔ اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے گی مگر میں اپنے پُرانے رسم و رواج کو نہیں چھوڑوں گی مجھے فرنگیوں کی ایک ادا بھی نہیں بھاتی۔ اُن کے ہاں صبح کے کھانے کے کپڑے اور۔ دوپہر کے کھانے کے اور۔ اور رات کے کھانے کے اور۔ کھیل کے کپڑے اور سونے کے کپڑے اور

Marfat.com

وہ تو اگر چھینکنا اور کھانسنا بھی چاہتے ہیں، تو کھانسی اور چھینک سے کہتے ہیں کہ ذرا ٹھہر جانا میں ذرا کھانسی اور چھینک کے کپڑے پہن لوں۔ پھر کھانسوں گا اور چھینکوں گا اور ان کی شادیاں بھی ایسی ہوتی ہیں جن سے میرے دل کو کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ بیٹے بھی اور بیٹیاں بھی اپنی مرضی سے بر تلاش کر لیتے ہیں۔ بھلا دیکھو تو ان کی کچی عمریں۔ ناسمجھی کا زمانہ۔ تجربہ نام کو نہیں۔ وہ بیچارے کیا سمجھیں گے کہ جہاں ہم شادی کر رہے ہیں ان کا خاندان کیسا ہے؟ اور چال چلن کیسا ہے؟ اور مزاج کیسا ہے؟ عادت اور خصلت کیسی ہے؟ ہمارے ہاں ماں باپ اور کنبہ رشتہ والے بر تلاش کرتے ہیں اور اچھی طرح سوچ اور سمجھ کے اور تجربہ سے کام لے کے بر کا انتخاب کرتے ہیں اور نئی روشنی والوں کی شادیاں بھلا شادیاں ہیں۔ کہ نہ ڈھول نہ تاشا۔ نہ باجہ نہ گاجا۔ نہ مہمان داری۔ بس نکاح کے دو بول پڑھائے اور اپنے اپنے گھروں کو چلتے بنے۔ میرے ہاں ان دو چھونسٹروں کے سوا اور کون ہے جہاں میرے ارمان نکلیں صاف بات ہے۔ میرے ہاں ڈھول تماشے بھی ہوں گے۔ انگریزی باجے بھی ہوں گے۔ نقال اور بھانڈ بھی آئیں گے۔ رنڈیاں بھی آئیں گی۔ آرائش بھی ہوگی۔ آتش بازی بھی ہوگی اور تین رات دن مہمان داری بھی ہوگی۔ دولھا دلہن مایوں بھی بٹھیں گے۔ ان دونوں کے کنگنا بھی باندھا جائے گا اور اُبٹنا بھی ملا جائے گا۔ مہندی بھی لگائی جائے گی۔ ساچق بھی ہوگی آرسی مصحف بھی ہوگا۔ اور میرے بیٹے اور داماد کو آرسی مصحف کے وقت یہ بھی کہنا پڑے گا بیوی آنکھیں کھولو میں تمہارا غلام ہوں"۔

بیوی کی یہ باتیں سُنکر میاں بہت ہنسے اور انھوں نے حقہ ایک طرف ہٹا دیا اور کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور کہا کہ ہر قوم کی اور ہر ملک کی رسمیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ بیشک میں نئی روشنی کے اس دستور کو پسند نہیں کرتا کہ وہ ہر کام کے لئے الگ الگ کپڑے پہنتے ہیں۔ کیونکہ اس میں فضول خرچی ہے۔ مگر یہ تو تم بھی مانو گی کہ اس دستور میں صفائی اور تمیز داری تو بہت ہے اور یہ بھی مانتا ہوں کہ نئی روشنی کا یہ رواج اچھا نہیں ہے

کہ بیٹا بیٹی بے حجاب ہو کر آپس میں شادی کی باتیں کریں۔ مگر تم بھی اِس پرانے رواج کی خرابیوں پر ذرا غور کر لو کہ نہ بیٹا ہونے والی بیوی کی صورت سے واقف ہے نہ عادت خصلت سے واقف ہے۔ اور نہ لڑکیاں ہونے والے شوہر کی کسی بات کو جانتی ہیں۔ ماں باپ جہاں چاہتے ہیں آنکھ بند کر کے شادی کر دیتے ہیں۔ اور یہ تو تم کو معلوم ہے کہ سب لوگ سمجھدار نہیں ہوا کرتے۔ ہزار دو ہزار آدمیوں میں ایک دو ایسے ہوتے ہیں جو سمجھداری سے رشتے کرتے ہوں۔ ورنہ یوں ہی قسمت اور تقدیر پر بھروسہ کیا اور رشتہ ہو گیا۔ اور میں تاشہ باجے اور ناچ رنگ اور کھانے دانے اور ساچق اور بری اور جہیز اور دھوم دھام کے بھی خلاف ہوں کیونکہ ان میں بہت سی رسمیں تو فضول خرچی کی ہیں۔ اور فضول خرچی سے ہزاروں لاکھوں گھر تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ اور بہت سی رسمیں ایسی ہیں جن کو اسلام نے حرام کر دیا ہے۔ اور اگر ان رسموں کو کیا جائے تو مسلمان بہت گنہگار ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات کافر ہو جاتا ہے۔ ہم مسلمانوں نے ہندوستان میں اکثر فضول خرچی کی رسمیں سیکھی ہیں۔ اور جہیز کی فضول خرچی کا رواج بھی ہندوؤں کی دیکھا دیکھی ہوا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں بیٹی کو ورثہ دینے کا دستور نہیں ہے اس واسطے وہ شادیوں کے موقع پر لڑکیوں کو بہت سا جہیز دیتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے ہاں لڑکی کو آدھا حصہ دیا جاتا ہے۔ تاکہ آدھا حصہ ماں باپ سے ملے۔ اور باقی کا آدھا شوہر کے ہاں سے مہر کی صورت میں مل جاتے۔ پھر مسلمان لڑکیوں کو بہت سا جہیز کیوں دیا جاتے۔

میاں کی یہ باتیں سُنکر بیوی بولیں۔ اچھا یہ بتاؤ کہ ہمارے رسولؐ کی بیٹی حضرت بی بی فاطمہؓ کی شادی میں کیا کیا رسمیں ہوئی تھیں میں بس تو حضرت بی بی کی شادی کی تقلید کروں گی اور سب فضول باتیں چھوڑ دوں گی۔

میاں نے کہا۔ لو سنو! میں تم کو حدیث کی معتبر کتابوں سے رسول اللہؐ کی بیٹی حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کی شادی کا حال سُناتا ہوں۔

حضرت بی بی فاطمہؓ کی عمر ساڑھے پندرہ برس کی تھی۔ اور حضرت علیؓ کی عمر اکیس سال کی

Marfat.com

تھی جب حضرت ابوبکرؓ صدیق اور حضرت عمرؓ فاروق حضرت علی کی طرف سے رشتہ کا پیغام لیکر رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور درخواست کی کہ آپ حضرت بی بی فاطمہؓ کا عقد حضرت علیؓ سے کر دیجئے۔ رسولؐ خدا نے فرمایا فاطمہؓ ابھی کم عمر ہے۔ اس کے بعد جو حضرت علیؓ شرماتے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔ اور سر جھکا کے چپکے سے حرف مطلب عرض کیا۔ ادھر حضرت علیؓ نے درخواست کی۔ اُدھر اُسی وقت حکم خدا نازل ہوا کہ علیؓ کی درخواست قبول کر لو۔ اِس واسطے رسولؐ خدا نے فوراً اقرار کر لیا۔

اِس کے بعد رسولِ خدا نے اپنے خادم انسؓ سے فرمایا۔ جاؤ ابوبکرؓ۔ عمرؓ۔ عثمانؓ طلحہؓ اور زبیرؓ کو بلا لاؤ۔ جب یہ سب لوگ آ گئے تو آپ نے خود خطبہ پڑھ کر چار سو شقال چاندی کے مہر پر حضرت علیؓ سے حضرت فاطمہؓ کا نکاح کر دیا۔ اور نکاح کے بعد چھواروں کا ایک طباق حاضرین میں تقسیم فرمایا۔

پھر حضرت اُم ایمنؓ کے ساتھ حضرت فاطمہؓ کو حضرت علی کے گھر بھیجدیا۔ اور جب حضرت فاطمہؓ حضرت علیؓ کے گھر میں پہنچ گئیں تو رسول خدا اُن کے گھر میں تشریف لے گئے۔ اور اپنی بچی فاطمہؓ سے فرمایا۔ پانی لاؤ۔ وہ اگرچہ نئی دلہن تھیں مگر فوراً اٹھ کھڑی ہو گئیں اور لکڑی کے پیالہ میں پانی لے آئیں۔ حضورؐ نے پانی کی کلی منہ میں لے کر اس پیالہ میں ڈالدی اور حضرت فاطمہؓ کے سر اور سینہ پر پیالہ کے پانی کا تھوڑا سا چھینٹا دیدیا۔ اِس کے بعد فرمایا پیٹھ پھیر کر کھڑی ہو جاؤ۔ وہ کھڑی ہو گئیں تو آپ نے اُن کے شانوں پر وہی پانی چھڑک دیا اور دونوں دفعہ یہی فرمایا۔ یا اللہ اِن دونوں کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ دیتا ہوں۔ اس کے بعد حضرت علیؓ سے پانی منگوایا۔ اور اُن کے چہرہ اور سینہ پر بھی پانی کا چھینٹا دیا۔ مگر اُن کی پشت پر چھینٹا نہ دیا۔ اور اُن کے لئے بھی دعا فرمائی۔ پھر کہا بسم اللہ کی برکت کے ساتھ اپنے گھر میں رہو۔

حضرت فاطمہؓ کا جہیز۔ حضرت فاطمہؓ کو اُن کے باپ رسولِ خدا نے یہ جہیز دیا تھا

دو سوسی کی قسم کی بچھانے کی چادریں۔ دو بچھونے جن میں السی کی چھال بھری ہوئی تھی اور چار گدے ایک کملی۔ ایک تکیہ۔ ایک چکی۔ پانی کا ایک مشکیزہ اور پانی کی ایک گھڑیا اور بعض روایتوں میں ہے کہ ایک پلنگ بھی تھا۔ زیوروں میں صرف چاندی کے دو بازوبند تھے۔

بس یہ اُس جہیز کی کائنات تھی جو دونوں جہان کے شہنشاہ نے اپنی بیٹی کو دیا۔ اور یہ کروفر تھی جو رسولؐ خدا کی پیاری بیٹی کے عقد میں ہوئی۔

ولیمہ ۔ دوسرے دن حضرت علیؓ نے ولیمہ کی دعوت کی۔ جس میں دس بارہ سیر وزن کی جو کی روٹیاں تھیں (حدیث میں کئی صاع آئے ہیں۔ اور ایک صاع ایک چھٹانک اوپر ساڑھے تین سیر کا ہوتا ہے) کچھ خرمے یعنی چھوارے یا کھجوریں تھیں۔ کچھ میدہ تھا۔ اللہ اللہ۔ یہ مولائے کائنات کے گھر کا ولیمہ تھا۔

اس سادہ شادی کی کیفیت میں یہ چند باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ منگنی میں بہت زیادہ ردوکد نہیں ہوئی۔ دوسرے یہ کہ شرطیں پیش نہیں ہوئیں۔ تیسرے یہ کہ خود دولھا نے اپنی زبان سے عرض کر دیا۔ چوتھے یہ کہ ساڑھے پندرہ سال کی عمر کو بھی حضور نے کم فرمایا۔ پانچویں یہ کہ دولھا دلہن کی عمر میں ساڑھے پانچ برس کا فرق تھا۔ جس سے ثابت ہوا کہ دولھا کو دلہن سے بڑا ہونا چاہیے۔ چھٹے یہ کہ رسولؐ خدا نے برات کی دھوم دھام زیادہ نہ کی۔ اور بہت سے لوگوں کو نہ بلایا۔ صرف پانچ چھ خاص خاص احباب کو بلا لیا۔ ساتویں یہ کہ اعلان نکاح کی ضرورت سمجھی۔ اور پانچ چھ آدمیوں کو شریک کرنا ضروری سمجھا گیا۔ آٹھویں یہ کہ جہیز میں صرف روزمرہ کی ضروری چیزیں دی گئیں۔ نام نمود اور تکلفات کی کوئی چیز نہیں دی گئی۔ نویں یہ کہ وداع میں کچھ تکلف نہ کیا گیا۔ دسویں یہ کہ حضرت فاطمہؓ سسرال میں جاکر گھونگٹ نکال کر نہ بیٹھیں۔ اور شوہر کی موجودگی میں باپ نے پانی مانگا تو خود کھڑی ہو کر پانی لے آئیں۔ اور ہندوستان کی طرح شرم سے کونے میں چھپی نہ بیٹھی رہیں گیارہویں یہ کہ ولیمہ میں زیادہ تکلفات نہیں کیے گئے۔ اور بہت اختصار کے ساتھ

Marfat.com

سادہ کھانا پکایا گیا۔

ان تمام نتائج کو سمجھنے کے بعد ہر مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنے رسولؐ اور اپنے آقا اور ہادی کی سُنت کو سامنے رکھے اور شادیوں کے فضول تکلفات کو ضروری نہ سمجھے۔ اور اپنے نام اور عزت کو رسولؐ خدا کے نام اور عزت سے بڑھانے کا خیال نہ کرے۔ اس میں نہ بَری کا ذکر ہے نہ جوڑے کا نہ چڑھاوے کا۔ نہ اُن فضول شرائط کا جن کے سبب شادیاں کرنا ایک بڑے ملک کے فتح کرنے سے بھی زیادہ مشکل کام ہو گیا ہے۔ خدا ہم سب کو سنت رسولؐ کی پیروی نصیب کرے

رسولؐ خدا کی سب سے پہلی بیوی حضرت خدیجہؓ کا مہر پانچ سو درم تھا۔ یا اسی قیمت کے اونٹ جو رسولؐ خدا کے چچا اور حضرت علیؑ کے والد حضرت ابوطالبؑ نے ادا کئے تھے۔

حضرت اُم سلمہؓ کا مہر ایک برتنے کی چیز تھی۔ جس کی قیمت دس درم سے زیادہ نہ تھی۔ حضرت جویریہ رضؓ کا مہر چار سو درم اور حضرت اُم حبیبہؓ کا مہر چار سو دینار تھے جو حبشہ کے بادشاہ نے اپنے ذمہ رکھے تھے۔ حضرت سودہ رضؓ کا مہر چار سو درہم تھے اور ولیمہ میں حضرت اُم سلمہ رضؓ نے اپنے پاس سے جَو کا کھانا پکا کر دیا تھا۔ حضرت زینب رضؓ بنت جحش کے ولیمہ میں ایک بکری ذبح ہوئی تھی۔ اور گوشت روٹی کھلائی گئی تھی۔ حضرت صفیہ رضؓ کی شادی کے وقت صحابہ رضؓ نے اپنے پاس سے جمع کر کے ولیمہ کیا تھا۔

سب سے پیاری بیوی حضرت عائشہ رضؓ کی شادی میں ولیمہ بالکل سادہ تھا۔ یعنی نہ اونٹ ذبح ہوا نہ بکری۔ نہ کچھ اور مکلف کھانا۔ بس حضرت سعد رضؓ بن عبادہ کے گھر سے دودھ کا ایک پیالہ آیا تھا۔ وہی ولیمہ بنا کر تقسیم کر دیا گیا۔

ان حالات سے معلوم ہوا کہ حضرت خدیجہ رضؓ کا مہر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت ابوطالبؑ نے ادا کیا۔ اس واسطے مہر وارث بھی ادا کر سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ حضرت اُم سلمہ رضؓ کا مہر صرف دس درہم مقرر کیا گیا تھا تاکہ کم سے کم مہر کی مقدار معلوم ہو جائے تیسرے یہ کہ چار سو اشرفی

کا مہر بھی مقرر ہوا۔ تاکہ زاید مہر کا جواز ثابت ہو سکے۔ چوتھے یہ کہ رسولؐ خدا کی بیویوں میں آپس کی ایسی محبت تھی کہ حضرت اُم سلمہؓ نے سوکن کی شادی کا ولیمہ اپنے پاس سے کیا۔ پانچویں یہ کہ بہت سے لوگوں کی مجموعی تعداد سے بھی ولیمہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ صحابہ نے چندہ کر کے ولیمہ کیا۔ چھٹے یہ کہ ولیمہ میں یہ ضروری نہیں کہ بڑی مقدار میں ہو۔ بلکہ جو کچھ میسر آئے وہی کھلا دینا چاہئے۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ کے ولیمہ کے وقت میں ہوا۔ حالانکہ حضرت عائشہؓ کنواری بیوی اور بہت ہی چاہیتی اور بہت ہی خوش جمال تھیں۔ خدائے تعالیٰ سب مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ اپنی اپنی حالت اور بساط کے موافق شادیوں میں مہر جہیز اور ولیمہ کا بندوبست کیا کریں۔ اور حد سے بڑھ کر خرچ نہ کریں۔

اولاد کی شادی

ایک سو بیس (۱۲۰) صفحے کی کتاب ہے اس میں بیٹا بیٹی کی شادی سے پہلے کے مشورے اور شادی کے وقت کی ہدایتیں درج ہیں۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کی لکھی ہوئی کتاب ہے اور شادی بیاہ کے موقع پر بہت لوگ اس کو منگا کر پڑھتے ہیں قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ

دفتر اخبار منادی دہلی

Marfat.com

یہ ۲۶ر جون ۱۹۳۷ء کی شام کو ساڑھے سات بجے دہلی ریڈیو میں خواجہ صاحب کی

سر سوامی انند سروپ جی کی وفات

۲۵ر جون ۱۹۳۷ء کو مدراس سے خبر آئی کہ رادھا سوامی ست سنگ کے پیشوائے اعظم سر سوامی انند سروپ صاحب جی مہاراج کا مدراس میں دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ ہندوستان کا بچہ بچہ صاحب جی مہاراج کو جانتا تھا کوئی قوم اور کوئی فرقہ ہندوستان میں ایسا نہیں ہے جس میں بیشمار مداح سر صاحب جی مہاراج کے نہ ہوں اُن کی عمر مرنے کی نہ تھی وہ ابھی جوان معلوم ہوتے تھے گورا رنگ تھا۔ میانہ قد تھا۔ دُبلا بدن تھا۔ چہرہ نورانی۔ آواز نہایت شیریں اور بلند طرزِ کلام باوقار اور خود دار۔ بات کرتے وقت ہنس مکھ معلوم ہوتے تھے۔ رادھا سوامی جماعت ایک ہندو جماعت ہے لیکن یہ ایک ایسی جماعت ہے جو مذاہب کے اختلاف سے بہت اونچی ہے اس فرقے میں ہندو مسلمان عیسائی ہو سائی کا کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی یہ لوگ سب انسانوں کو محبت اور ہمدردی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ صاحب جی جب رادھا سوامی جماعت کی گدی پر بیٹھے تو رادھا سوامی فرقہ کچھ زیادہ مشہور نہ تھا۔ سر صاحب جی مہاراج نے اس فرقے کو چار چاند لگا دئے۔ انھوں نے اپنی بے مثل عملی زندگی سے رادھا سوامی جماعت کو خصوصاً ہندو صوفیوں کو بہت بلند کر دیا ورنہ آج کل کے زمانہ میں ہندو اور مسلمان سادھو اور صوفی اس وجہ سے نفرت اور حقارت سے دیکھے جاتے تھے کہ وہ اپنی معیشت کا بوجھ یعنی روزی کا بوجھ مریدوں اور ماننے والوں پر ڈالتے تھے اور خود کچھ کام نہ کرتے تھے۔ بلکہ خود محنت سے اپنی روزی حاصل کرنا درویشی اور فقیری کے خلاف سمجھتے تھے مگر سر صاحب جی مہاراج نے اپنی روزی بھی ذاتی محنت اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ حاصل کرنی شروع کی اور دوسروں کی روزی کا بوجھ بھی خود اٹھا لیا مگر اس طرح نہیں کہ لنگر خانے جاری کر دئے اور ہزاروں آدمی بیکاری اور آرام طلبی سے مفت کی روٹی کھانے لگے۔ بلکہ انھوں نے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو جن میں ہندو مسلمان اور چیلے اور غیر چیلے کی تفریق نہ تھی ہنر مند بنا دیا۔ اور روزی سے لگا دیا۔ میں نے دیال باغ آگرہ میں اُن کے قائم کئے ہوئے کالج اور اسکول اور بہت سے کارخانے خود جا کر دیکھے تب معلوم ہوا کہ سر صاحب جی مہاراج نے بیشمار ہندوستانیوں کی روزی کا سہارا

سب سے بڑی خصوصیت میری نظر میں یہ تھی کہ اُنکی زندگی دین اور دنیا کا مجموعہ تھی اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دنیا کو مقدم رکھتے ہیں یا دین کو مقدم رکھتے ہیں کیونکہ وہ دونوں چیزوں کو ساتھ ساتھ لیکر چلتے تھے

سرصاحب جی مہاراج اپنے ہندو مذہب میں بہت پکے تھے اور میں اپنے اسلامی مذہب میں پکا تھا مگر ہم دونوں آپس میں ایکدوسرے کو بھائی کہتے تھے اور بھائی سمجھتے بھی تھے میرے بچے اپنے گھر میں سرصاحب جی مہاراج کا ذکر کرتے تھے تو اُن کو چچا کہتے تھے اور غالباً اُن کے بچے بھی ایسا ہی سمجھتے ہوں گے۔

یورپ اور امریکہ میں بھی اُنکی شخصیت اور اُنکے کاموں کی بہت دھوم تھی بڑے بڑے مشہور لکھنے والے دیال باغ میں آتے تھے اور اُن سے ملتے تھے اور اُنکے کارناموں کو دیال باغ میں دیکھتے تھے تو یورپ اور امریکہ میں جاکر اپنے اخباروں اور کتابوں کے صفحے کے صفحے تعریفوں سے بھر دیتے تھے اور غالباً ہندوستان میں مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر سر ٹیگور کے علاوہ اور کوئی بھی ایسی شخصیت نہیں ہے جس کی یورپ اور امریکہ میں اتنی تعریف ہوتی ہو۔ ابھی حال میں میرے دوست مسٹر اٹیس براؤن اُن سے ملنے گئے تھے اور جب انگلستان جاکر انھوں نے ہندوستان پر کتاب لکھی تو سب سے زیادہ تعریف سر صاحب جی مہاراج کی کی تھی۔ وہ بہت منکسر المزاج تھے۔ معمولی معمولی آدمیوں کے ساتھ اکیلے اپنے کارخانے دکھانے کیلئے چلے جاتے تھے اور مہمانوں کو خود سامنے بیٹھکر کھانا کھلاتے تھے وہ صبح کیوقت چہلقدمی بھی کرتے تھے اور رات تک اُن کے سب اوقات مقررہ کاموں کے لئے تقسیم تھے اور وہ روز پچھلی رات کو بیدار ہوتے تھے اور سورج نکلنے سے پہلے تین ہزار مریدوں کی روحانی اصلاح کیلئے تقریر کرتے تھے اور اور خاص مراسم ادا کیا کرتے تھے اور ایسے ہی شام کو یعنی دونوں وقت یہ کام کرتے تھے۔ دیال باغ میں تین ہزار مرید ایسے رہتے ہیں جو ترک وطن کرکے دیال باغ میں آباد ہو گئے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں اُنکی شہرت اُنکی شخصیت اور بےغرض خدمت خلق کی وجہ سے تھی اور اُن کی تصنیفات کی بھی ہندوستان اور یورپ میں بہت قدر کیجاتی تھی وہ بہت سیر چشم ہندوستانی تھے ایک دفعہ کلکتہ کے ایک مرید نے پچاس ہزار روپے کا چک کسی نیک کام کیلئے نذر کیا سرصاحب جی مہاراج نے پوچھا اتنی بڑی رقم دیتے وقت تمہارے دل کو کچھ تکلیف تو نہیں ہوئی مرید نے جواب دیا جی ہاں کچھ تھوڑا سا خیال تو آیا کہ اتنی بڑی رقم جیب سے جارہی ہے یہ سُن کر سرصاحب جی مہاراج نے پچاس ہزار روپیہ کا چک پھاڑ کر پھینک دیا اور فرمایا کہ جب تک دل ہر بیرونی لگاؤ سے پاک نہ ہو جائے۔ میں روپیہ نہیں لے سکتا۔

(جگہ کی کمی کے سبب یہ تقریر پوری درج نہیں ہو سکی) (حسن نظامی

Marfat.com

محرم کا چاند

یہ تقریر ۲۲ مارچ ۱۹۳۶ء ہفتہ کے دن رات کے پونے دس بجے دہلی ریڈیو میں خود خواجہ صاحب نے سنائی

کربلا کی بنیادی تاریخ مسلمانوں کا نیا سال محرم سے شروع ہوتا ہے اور وہ آپس میں نئے سال کی مبارکباد اس واسطے نہیں دے سکتے کہ اس مہینہ کے پہلے دس دن میں اُن کے رسولؐ کے سگے نواسہ حضرت امام حسین علیہ السلام اور اُن کے بچے قتل ہوئے تھے۔ اور تعزیئے اسی واقعہ کی یاد میں بنائے جاتے ہیں۔

میں اُن ہندوستانیوں کی معلومات کے لئے جو محرم کے واقعات اور ان کے اسباب کو نہیں جانتے آج اول سے آخر تک کے حالات بیان کرنے آیا ہوں۔ یہ سب باتیں معتبر تاریخوں کی ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کا مبالغہ یا طرفداری نہیں ہے۔

سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پردادا کا نام ہاشم تھا۔ اور ہاشم کے ایک سگے بھائی کا نام اُمیہ تھا۔ ہاشم کے بیٹے عبدالمطلب تھے اور عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ تھے۔ اور عبداللہ کے بیٹے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ اور رسول اللہ صلعم کو ان کے چچا ابوطالب نے پالا تھا۔ اور ابوطالب کے بیٹے علیؓ تھے۔ جن سے رسول اللہ نے اپنی چھوٹی بیٹی فاطمہؓ کا نکاح کیا تھا اور علیؓ اور فاطمہؓ سے دو لڑکے پیدا ہوئے تھے۔ بڑے کا نام حسنؑ تھا اور چھوٹے کا نام حسینؑ تھا۔

اس نسب نامہ کو سمجھنے کے بعد اب یہ سمجھئے۔ کہ ہاشم کعبہ کے متولی تھے۔ اور ہاشم کے بھائی امیہ کو اس کا رشک تھا۔ اور وہ ہاشم کی سرداری اور عزت کو برداشت نہ کرسکتا تھا ہاشم کے بعد عبدالمطلب کعبہ کے متولی ہوئے۔ یہ بات اُمیہ کے بیٹے حرب کو ناگوار ہوئی

عبدالمطلب کے بعد اُن کے بیٹے ابوطالب حضرت علیؑ کے والد کعبہ کے متولی ہوئے تو حرب کے بیٹے ابوسفیان کو ناگوار ہوا۔

اور جب ہاشم کے پڑوتے حضرت محمدؐ نے دعویٰ کیا کہ میں خدا کا رسول ہوں تو اُمیہ کی ساری اولاد اور اُمیہ کے پوتے ابوسفیان نے کھلم کھلا رسولؐ اللہ کی مخالفت شروع کر دی۔ اور بدر کے میدان میں رسولؐ اللہ کی اور اُمیہ کی اولاد کی لڑائی ہوئی۔ جس میں رسولؐ اللہ کے ساتھ تین سو تیرہ آدمی تھے اور اُمیہ کی اولاد کے ساتھ ایک ہزار آدمی تھے۔ رسولؐ اللہ کے ساتھیوں میں ہاشم کی اولاد بھی تھی۔ اور دوسرے مسلمان بھی تھے اور اُمیہ کی فوج میں اُمیہ کی اولاد بھی تھی۔ اور دوسرے قبیلوں کے مشہور لڑنے والے بھی تھے۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کو فتح ہوئی اور حضرت علیؑ کے ہاتھ سے اُمیہ کی اولاد کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ مگر ابوسفیان بدر کی لڑائی میں موجود نہ تھا۔ اس لئے وہ بچ گیا۔ اور ابوسفیان اور اس کی بیوی ہندہ نے قسمیں کھائیں کہ ہم اولاد ہاشم اور محمدؐ اور علیؑ سے بدر کے مقتولوں کا بدلہ لیں گے۔ چنانچہ دوسرے سال اُحد کے میدان میں ابوسفیان ایک بڑی فوج لے کر آیا۔ اور مسلمانوں سے بدلہ لیا۔ اور رسولؐ اللہ کے چچا حضرت حمزہؑ کو قتل کر دیا اور ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے حضرت حمزہؑ کا کلیجہ نکال کر چبایا۔ اس کے بعد ابوسفیان بارہ ہزار فوج لے کر لڑنے آیا۔ اور خندق نام کی مشہور لڑائی ہوئی۔ جس میں ابوسفیان کو شکست ہوئی۔

آخر رسولؐ اللہ اور اولاد ہاشم اور دوسرے مسلمانوں نے مل کر مکہ فتح کر لیا۔ جو ابوسفیان اور اولاد اُمیہ وغیرہ کے قبضہ میں تھا۔ اور مکہ فتح ہونے کے بعد ابوسفیان اور اس کے بیٹے معاویہ مسلمان ہو گئے اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں معاویہ ملک شام کے گورنر بنائے گئے۔ اور جب حضرت علیؑ خلیفہ ہوئے تو معاویہ نے ان کی خلافت کو قبول نہیں کیا اس لئے صفین کے میدان میں علیؑ اور معاویہ کی بہت بڑی لڑائی ہوئی۔ جو صلح کی صورت میں ختم ہوئی معاویہ کی سازش سے حضرت علیؑ قتل ہو گئے۔ اور اُن کے بڑے بیٹے حضرت حسنؑ نے

Marfat.com

اپنی سلطنت کا حق معاویہ کو اس شرط پر دیا کہ معاویہ کے بعد اُن کا بیٹا یزید بادشاہ نہیں ہوگا بلکہ مسلمان جس کو چاہیں گے بادشاہ چن لیں گے۔ اس عہدنامہ کے بعد حسنؑ کو معاویہ نے ایک عورت کے ذریعہ زہر دلوایا۔ اور اُن کی شہادت کے بعد معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو عہدنامہ کے خلاف اپنا ولی عہد بنا دیا۔ اور جب معاویہ نے وفات پائی تو یزید بادشاہ ہوا۔ جو اسلام کے احکام کا زیادہ پابند نہ تھا۔ اور علانیہ شراب پیتا تھا۔ حضرت حسنؑ کے چھوٹے بھائی حضرت حسینؑ نے یزید کی بادشاہی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کوفہ اور بصرہ مسلمان فوجوں کی دو بڑی چھاؤنیاں تھیں۔ اور کوفہ حضرت علیؑ کا پایۂ تخت بھی تھا۔ اور کوفہ اور بصرہ میں اولاد ہاشم اور حضرت علیؑ اور حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کے ماننے والے بھی بہت تھے۔ ان لوگوں نے سُنا۔ کہ حضرت حسینؑ نے یزید کی بادشاہی قبول نہیں کی۔ تو انھوں نے مدینہ میں حضرت حسینؑ کو خط لکھے۔ کہ آپ یہاں آ جائیے۔ ہم سب آپ کی حمایت میں یزید سے جنگ کریں گے۔

حضرت حسینؑ نے اپنے چچازاد بھائی مسلمؑ کو حالات معلوم کرنے کے لئے کوفہ بھیجا۔ مسلمؑ نے حضرت حسینؑ کو اطلاع دی۔ کہ چالیس ہزار کوفیوں نے میرے ہاتھ پر عہد کیا ہے۔ کہ حسینؑ کا ساتھ دیں گے۔ حضرت حسینؑ اپنے بیوی بچوں اور ۷۲ ساتھیوں کو لے کر کوفہ گئے۔ راستہ میں ان کو خبر ملی کہ کوفہ والے یزید کے گورنر ابن زیاد سے مل گئے ہیں۔ اور انھوں نے مسلمؑ کو قتل کر دیا ہے اور اُن کے دو معصوم بچوں کو بھی مار ڈالا ہے۔ اور جب حضرت حسینؑ کوفہ کے قریب کربلا نامی مقام پر پہنچے تو ابن زیاد کی فوجوں نے اُن کو گھیر لیا۔ اور حضرت حسینؑ کو مجبور کیا کہ وہ یزید کی بادشاہی کو قبول کر لیں۔ حضرت حسینؑ نے جواب دیا۔ میں لڑنا نہیں چاہتا۔ میرے بھائی نے بھی مسلمانوں کو خانہ جنگی سے بچانے کے لئے معاویہ کو بادشاہی دے دی تھی۔ میں بھی دے دیتا مگر یزید عہدنامہ کے خلاف مسلمانوں کے انتخاب سے بادشاہ نہیں ہوا بلکہ زبردستی بادشاہ بنا ہے۔ اور اس کے اعمال بھی اسلام کے خلاف ہیں۔ اس واسطے نہ اُس کی اطاعت کروں گا نہ اس سے لڑوں گا۔ بلکہ مدینہ میں جا کر خاموش بیٹھ جاؤں گا۔ ابن زیاد کی فوج نہ مانی اور

اُس نے حضرت حسینؓ کا پانی بند کر دیا۔ اور محرم کی دس تاریخ کو حضرت حسینؓ اور اُن کے سب بچے اور ساتھی بڑی بے رحمی سے قتل کر دئے گئے۔ اور لاشیں گھوڑوں سے روندی گئیں عورتوں کے خیمے لوٹے گئے اور جلائے گئے۔ اور اُن کے ہاتھوں میں رسیاں باندہ کر اونٹوں پہ سوار کیا گیا۔ اور بڑی ذلت اور ایذا کے ساتھ یزید کے پایۂ تخت دمشق میں بھیجا گیا۔

یزید نے دربار میں حضرت حسینؓ کا سر دیکھ کر کہا کہ آج بدر کی لڑائی کا بدلہ پورا ہوا۔ یعنی بدر کی لڑائی میں اولاد اُمیہ کے جو سردار حضرت علیؓ کے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے۔ اُن کا انتقام اُمیہ کی اولاد نے ہاشم کی اولاد سے لے لیا۔

حضرت حسینؓ کے صرف ایک بیمار بیٹے زین العابدینؓ زندہ بچے تھے۔ انہی سے حضرت علیؓ کی اولاد چلی جو آج کل سید کہلاتی ہے اور اسی واقعۂ کربلا کی یاد محرم میں منائی جاتی ہے۔

یہ تو مختصر تاریخی بیان تھا جس سے محرم اور کربلا کے غم اور اس کے اسباب معلوم ہوئے اب میں چند غم ناک واقعات کی تفصیل بیان کرتا ہوں۔ جن سے بنی امیہ یعنی اولاد امیہ کی سفاکی اور بے رحمی اور بنی ہاشم یعنی اولاد ہاشم کی مظلومیت ظاہر ہوتی ہے۔

مگر پہلے یہ بتانا ضروری ہے۔ کہ شیعہ سُنی کا اختلاف حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے سبب نہیں ہے۔ بلکہ اس کی بنیاد دوسری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور اُن کے بعد حضرت عمرؓ اور ان کے بعد حضرت عثمانؓ اور ان کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے تھے۔ شیعہ فرقہ کا عقیدہ ہے کہ خلافت کا حق حضرت علیؓ کا تھا۔ کیونکہ وہ رسول اللہؐ کے بھائی تھے اور داماد تھے۔ اور رسول اللہؐ نے آخری حج کے بعد ایک لاکھ مسلمانوں کے سامنے تقریر کی تھی۔ جس میں فرمایا تھا کہ "جس کا میں آقا ہوں اس کے علیؓ بھی آقا ہیں" شیعہ کہتے ہیں رسول اللہؐ کے اس ارشاد میں یہ اشارہ تھا۔ کہ میرے بعد علیؓ خلیفہ ہونگے اس لئے حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ برحق خلیفہ نہ تھے۔ سُنی کہتے ہیں چونکہ مسلمانوں کی عام رائے سے ان تینوں کا انتخاب ہوا تھا اس واسطے وہ برحق خلیفہ تھے اور

Marfat.com

رسول اللہ نے کوئی صاف حکم حضرت علیؑ کی خلافت اور جانشینی کا نہیں دیا تھا۔

محرم اور واقعہ کربلا کے ادب اور غم والم میں شیعہ سُنی کا کچھ اختلاف نہیں ہے۔ دونوں فرقے بلکہ مسلمانوں کے سب فرقے حضرت امام حسینؑ اور ان کے بچوں اور ساتھیوں کی غم ناک شہادت کی یاد میں شریک ہوتے ہیں۔ اور تمام اسلامی دُنیا میں اس دردناک واقعہ کی یاد منائی جاتی ہے۔ تعزیئے کے جلوس نکلتے ہیں مجلسوں میں واقعات کربلا کو بیان کیا جاتا ہے۔ اور نظم مرثیے پڑھے جاتے ہیں اور شیعہ فرقہ کے عورت مرد ماتم بھی کرتے ہیں

تعزیہ عربی لفظ ہے۔ اس کے معنی ماتم پرسی کے ہیں۔ ہندوستان کے ہر شہر میں تعزیہ کے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ ہزاروں ہندو بھی تعزیئے بناتے ہیں۔ اور لاکھوں ہندو تعزیوں کے جلوس میں اور نذر نیاز میں شریک ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی ہندو ریاستوں میں لاکھوں روپے کے خرچ سے محرم کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔

واقعہ کربلا کے اشخاص } کربلا کے واقعہ کے بیان میں حسب ذیل اشخاص کے نام بہت آتے ہیں۔ لہٰذا ان کا تعارف ضروری ہے کیونکہ اکثر ہندوستانی واقف نہیں ہیں کہ یہ کون تھے

(۱) حضرت امام حسینؑ رسول اللہ کے نواسہ (۲) حضرت علی اکبر حضرت امام حسینؑ کے اٹھارہ سالہ بیٹے (۳) حضرت علی اصغر امام حسینؑ کے دودھ پیتے بیٹے (۴) حضرت عباسؑ حضرت امام حسینؑ کے بھائی (۵) حضرت سکینہ امام حسینؑ کی چھوٹی لڑکی (۶) حضرت شہربانو حضرت امام حسینؑ کی بیوی جو شاہ ایران کی بیٹی تھیں (۷) حضرت زینب امام حسینؑ کی بہن (۸) حضرت صغریٰ امام حسینؑ کی بیمار لڑکی جو سفر کربلا میں ساتھ نہ تھیں (۹) دُلدُل امام حسینؑ کا گھوڑا (۱۰) شیریں امام حسینؑ کی لونڈی (۱۱) حُر یزیدی فوج کا ایک افسر جو امام حسین کی حمایت میں قتل ہوا۔ (۱۲) خولی بن یزید امام حسینؑ کا قاتل (۱۳) عمر بن سعد یزیدی فوج کا کمانڈر جو سعد بن وقاص فاتح ایران کا بیٹا تھا (۱۴) ابن زیاد کوفہ کا یزیدی گورنر (۱۵) یزید جو معاویہ گورنر شام کا بیٹا اور ابو سفیان کا پوتا اور حرب کا پڑپوتا تھا۔ اور جس کے حکم سے امام حسین اور ان کے بچوں اور ساتھیوں کو قتل کیا گیا تھا۔

Marfat.com

یزید کی حکومت میں اتنے ملک تھے پورا حجاز یعنی ملک عرب یمن سمیت اور پورا ملک شام وفلسطین اور پورا مصر اور عراق اور پورا ایران وافغانستان اور وسط ایشیا کے بعض حصے کربلا ملک عراق میں ہے۔ جس کو مسوپٹیمیا کہتے ہیں۔ یہ مقام بغداد کے قریب ہے۔ فرات دریا کے کنارہ یہ مقام ہے۔ عراق میں گرمی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور واقعۂ کربلا تیز گرمی کے زمانہ میں ہوا تھا۔ یزیدی فوج نے امام حسینؓ کا محاصرہ کر کے کھانا پانی بند کر دیا تھا۔ اور فرات دریا پر پہرے لگا دئے تھے۔ امام حسینؓ اور اُن کے بچوں اور عورتوں کو عراق کی تیز گرمی میں کئی وقت پانی نہ ملا۔ اور ان کے لڑکے اور بھائی اور ساتھی اسی پیاس کی حالت میں لڑے اور قتل ہوئے۔ امام حسینؓ کے ڈیڑھ سالہ بچے علی اصغر کو ایک یزیدی سپاہی نے باپ کی گود میں دیکھا تو اس نے بچہ کے تیر مارا۔ جو علی اصغر کے حلق میں لگا۔ جس کے صدمہ سے بچہ باپ کی گود میں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ حضرت عباسؓ مشک لے کر دریا پر پانی لینے گئے۔ اور دشمن سے مقابلہ کر کے مشک میں پانی بھر لیا۔ مگر دشمن نے اُن کو قتل کر دیا۔ یزیدی فوج کے سپاہیوں کو ڈیڑھ سیر جَو روزانہ ملتے تھے۔ یہی ان کی تنخواہ تھی۔ یزیدی فوج کے سب سپاہی مسلمان تھے۔ اور پانچوں وقت نماز پڑھتے تھے۔ اور ہر نماز میں رسولؐ اللہ کی اولاد پر سلام پڑھتے تھے۔ کیونکہ ہر مسلمان عورت مرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ رسولؐ اللہ کی آل اولاد پر درود سلام بھیجے۔ مگر یزیدی فوج کے دل ایسے سخت تھے۔ کہ آل رسولؐ پر نماز میں سلام بھیجتے تھے۔ اور میدان میں آکر اُن کے سینوں پر برچھیاں چلاتے تھے اور تلواروں سے اُن کے سر کاٹتے تھے۔ ان میں بہت سے سپاہی اور افسر ایسے تھے جنہوں نے رسولؐ اللہ کو دیکھا تھا۔ اور یہ بھی دیکھا تھا کہ رسول اللہؐ اپنے پیارے نواسہ حسین کو اپنے کندھے پر بٹھاتے تھے۔ اور حسینؓ کے منہ میں اپنی زبان ڈالتے تھے۔ اور ان کا منہ چومتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ جو مجھ سے محبت رکھنی چاہتا ہے اس کو حسنؓ اور حسینؓ اور ان کے ماں باپ سے بھی محبت کرنی چاہئیے۔

Marfat.com

محرم کی دسویں تاریخ کو کربلا کے میدان میں یہ لڑائی ہوئی اور سورج چھپنے سے پہلے حضرت امام حسینؓ اور ان کے سب بچے اور ساتھی جو ۷۲ آدمی تھے قتل ہو گئے مگر امام حسینؓ نے آخر وقت تک یزید کی اطاعت اور بادشاہی قبول کرنے سے اس بنا پر انکار کیا کہ یزید اسلامی اصول جمہوریت کی موافق عام انتخاب سے بادشاہ نہیں ہوا اور اس کا چال چلن اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔

درحقیقت اس کو لڑائی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ۷۲ آدمیوں پر ہزاروں ہتھیار بند فوج نے حملہ کیا تھا۔ اور وہ ۷۲ آدمی بھوک پیاس سے ادھ موئے ہو چکے تھے۔

محرم کے چاند کو دیکھ کر آج میرے دل پر کیا اثر ہو رہا ہے اور میں خیالات کی دُنیا میں اپنے دل سے خیالی زبان میں کیا باتیں کر رہا ہوں۔ اس کو ریڈیو کے سُننے والے بھی سننا چاہیں تو سُنیں۔ سُناتا ہوں۔

ارے او آسمان سے جھانکنے والے چاند سے ٹکڑے تو آج اُداس اُداس کیوں معلوم ہوتا ہے۔ تیرا نام تو چاند ہے ہر پیاری شکل کو تجھ سے مشابہت دی جاتی ہے۔ تو عید کی چاندرات کو ہر عورت مرد چھوٹے بڑے مسلمان کو پیارا معلوم ہوا کرتا ہے۔ اور سب تجھ کو دیکھنے گھروں سے باہر آجاتے ہیں۔ آج بھی تو ویسا ہی چھوٹا سا ہے۔ اور چمک دمک بھی ویسی ہے لیکن ذرا غمگین نظر آتا ہے تیری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں۔

پیارے چندا ذرا مُنہ سے بول۔ دل کی لگی سُنا۔ تیرا کیا حال ہے۔ تو کیوں افسردہ ہے اور کیوں نڈھال ہے۔ دیکھ میں ہوں حسن نظامی، دلی والا حسینؓ شہید کربلا کی اولاد۔ اور تو محرم کا چاند ہے۔ وہ محرم جو ہجری سال کا پہلا مہینہ ہے۔ تو نے آج طلوع ہو کر آسمان کے کنارہ پر چمک کر سب کو بتا دیا۔ کہ ۱۳۵۵ھ ختم ہوا اور ۱۳۵۶ھ شروع ہو گیا۔ تو یہ بھی کہتا ہے۔ کہ حسن نظامی آج ساٹھ برس کا ہو گیا۔ کیونکہ وہ دوسری محرم کو پیدا ہوا تھا۔

کیا تجھ کو وہ وقت یاد آرہا ہے۔ جب حسینؓ شہید کربلا اپنے نانا محمد رسول اللہ صلی اللہ

Marfat.com

علیہ وآلہ وسلم کے مزار پر آخری سلام کرنے گئے۔ اور اُنھوں نے نانا کی قبر مبارک کو دیکھ کر کہا۔ بابا میں آپ کا لاڈلا حسینؑ ہوں۔ جس کا منہ چوما کرتے تھے۔ اور جس کو گود میں لے کر پھرا کرتے تھے۔ اور جس کی ماں فاطمہؑ کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک فرمایا کرتے تھے۔ بابا میں اپنی فاطمہؑ کا چھوٹا بیٹا ہوں۔ جو آپ کی چھوٹی بیٹی تھیں۔ اور جن سے آپ کو سب سے زیادہ محبت تھی اور جنہوں نے اپنے ہاتھ آپ کو دکھائے تھے۔ کہ بابا گھر کی چکی پیستے پیستے دیکھو میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ مجھے کوئی لونڈی عنایت کیجئے۔ جو گھر کے کام میں میرا ہاتھ بٹائے تو آپ نے فرمایا تھا بیٹی تو میری لخت جگر اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ میں بھی دوسروں کی خدمت کے لئے خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔ اور رات دن محنت کرتا ہوں۔ تو بھی اپنا کام دوسروں پر نہ ڈال اور اپنے ہاتھ سے سب کام کر۔

بابا آپ دُنیا سے خدا کے پاس تشریف لے گئے تو چھ مہینہ کے بعد آپ کی بیٹی فاطمہؑ میری ماں بھی دُنیا سے بیزار ہو کر رخصت ہو گئیں۔ پھر میرے باپ علیؑ شیر خدا کو بھی شہید کر دیا گیا۔ پھر میرے بڑے بھائی حسنؑ بھی زہر دے کر ختم کر دئے گئے۔ اب مجھے اُمیہ کی اولاد نے گھیرا ہے۔ معاویہ کا بیٹا یزید تخت پر بیٹھا ہے اور کہتا ہے۔ کہ میں اس کی اطاعت کا حلف اُٹھاؤں۔ ورنہ وہ میری زندگی ختم کر دے گا۔ مجھے مدینہ میں بھی چین نہیں دیتے۔ مکہ جاتا ہوں تو وہاں بھی ستاتے ہیں۔ میں حکومت نہیں چاہتا۔ مگر نااہل کی حکومت بھی نہیں چاہتا مجھے میرے باپ کے پایۂ تخت کوفہ میں بلایا جاتا ہے۔ میں وہاں جا رہا ہوں اور مجبوراً جا رہا ہوں لے محرم کے چاند کیا تو حسینؑ شہید کربلا کی بیمار بیٹی فاطمہ صغریٰ کے خیال سے غمگین ہے جب کہ اُس کو اُس کے باپ نے کربلا کے سفر میں بیماری کے سبب ساتھ نہ لیا تھا۔ اور وہ اپنی نانی ام سلمہ کے پاس رہتی تھیں اور روز دروازہ پر آ کر مسافروں سے اپنے باپ کا حال پوچھتی تھی۔ اور کہتی تھی کہ کوئی کوفہ جانے والا ہو تو میرے بابا سے کہدے کہ آپ کی بیٹی آپ کو یاد کرتی ہے۔ مجھے اماں یاد آتی ہیں۔ بھائی علی اکبر یاد آتے ہیں۔ اور بہن سکینہ یاد آتی

ہے اور بھُورے بھُورے لمبے لمبے بالوں والا ننھا سا بھائی علی اصغر یاد آتا ہے جس کو میں گود میں لے کر جی بہلایا کرتی تھی۔ بابا میرے سب بہن بھائی ماں باپ کے پاس ہیں بس میں ایک اکیلی یہاں رہ گئی ہوں۔ اے قاصد کہد یجیو جب عراق کی طرف سے خاک اُڑتی دکھائی دیتی ہے تو مجھے یہی خیال آتا ہے کہ میرے بابا آ گئے۔ میرے چچا عباسؓ آ گئے۔ میرے بھائی علی اکبر آ گئے۔ میری بہن سکینہ بھی آ گئی۔ اور میرا ننّا بھائی علی اصغر بھی آ گیا۔ مگر کوئی نہیں آتا۔ میں دروازہ پر سارا سارا دن کھڑی راہ دیکھا کرتی ہوں۔

اے محرم کے چاند شاید تجھ کو کربلا کا میدان یاد آ گیا جو تو آج کچھ چُپ چُپ سا معلوم ہوتا ہے۔ تو خیال کرتا ہوگا کہ حسینؓ ابن رسول اللہؐ نے عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لئے خندق کھود دی تھی۔ اور اس میں آگ جلائی تھی۔ اور موسم بھی گرمی کا تھا اور دشمن نے پانی بھی بند کر دیا تھا۔ اور رسولؐ کے گھر والے عورت مرد اور بچے پیاس سے بلبلا رہے تھے۔ ان کے حلق سوکھ گئے تھے۔ اور شہنشاہ ایران کی بیٹی شہر بانو اپنے شوہر حسینؓ سے کہتی تھیں کہ میرے معصوم بچہ علی اصغر کو تو پانی منگا دو۔ دشمن سے کہو کہ ہمیں پانی نہ دیں ان کے گنہگار ہیں۔ اس بچہ نے کیا گناہ کیا ہے جو اس کا پانی بھی بند کیا ہے اور حسینؓ کہتے تھے کہ میری غیرت دشمن سے التجا کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ میں اس بچہ کو گود میں لے جاتا ہوں اگر اس کو دیکھ کر دشمنوں کو خود خیال آ گیا اور پانی دیدیا تو خیر ورنہ میں اپنی زبان سے پانی نہ مانگوں گا۔ اور جب حسینؓ خیمہ کے باہر آئے اور بچہ ان کی گود میں دشمن کی فوج نے دیکھا تو ایک سفاک یزیدی سپاہی نے تیر چلایا۔ جو امام حسینؓ کے بازو کو چھید کر علی اصغر کے حلق کے پار ہو گیا۔ اور بچہ باپ کی گود میں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اور حسینؓ بچہ کی لاش کو گھر میں لائے اور اس کی ماں کو وہ لاش دیدی اور کہا لو۔ تمہارا بچہ موت کا پانی پی کر آیا ہے۔ یہ مجھ سے پہلے بہشت میں چلا گیا۔ اور پھر امام حسینؓ نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا اور کہا اے خدا تو گواہ رہیو۔ کہ حسینؓ اس امتحان میں پورا رہا ہے اور اس کے ارادہ میں کچھ بھی فرق نہیں آیا ہے۔

Marfat.com

اے محرم کے چاند کیا تجھ کو علی اکبرؑ کا مرنا یاد آرہا ہے۔ جب باپ نے اُن کو اپنے ہاتھ سے ہتھیار پہنائے۔ اور مقابلہ کے لئے میدان میں بھیجا۔ اور علی اکبر نے چھاتی پر برچھی کھائی اور شہید ہوئے کیا تو حسینؑ کے بھائی عباسؑ کے غم میں رو رہا ہے جب کہ اُنھوں نے پانی کی مشک دونوں ہاتھ کٹ جانے کے بعد دانتوں سے پکڑ کر اٹھائی تھی۔ اور کہا تھا کہ میں اپنے بھائی کی معصوم لڑکی سکینہ کے لئے پانی ضرور لے کر جاؤں گا۔

رنجیدہ چاند تجھ کو حسینؑ کا وہ وقت یاد آرہا ہوگا۔ جب کہ اُن کے سب بچے اور سب قرابت دار اور سب ساتھی ایک ایک کر کے کٹ گئے۔ اور حسینؑ اکیلے رہ گئے۔ اور اپنی عورتوں سے رخصت ہوتے گئے۔ اور اُن کے بیمار لڑکے عابدؑ نے کہا مجھے تلوار دو۔ میں بھی باپ کی بات پر قربان ہونا چاہتا ہوں اُنگی پھپی زینب اور ماں نے روک لیا۔ اور باپ نے کہا۔ بیٹا اب بس تو ایک باقی رہگیا ہے۔ جو علیؑ اور فاطمہؑ کے گھر کی نشانی ہے۔ تو بھی مرجائے گا۔ تو یہ نسل ہی ختم ہو جائے گی اس کے بعد سکینہ کو پیار کیا اور کہا بیٹی اب تم قیدی بنائی جاؤ گی۔ صبر و ہمت سے کام لینا۔ پھر بہن کو اور بیوی کو صبر کی تلقین فرمائی اور میدان میں آکر لڑے اور ایسے لڑے کہ ستر زخم کھائے۔ آخر گھوڑے سے گرے اور خولی بن یزید نے اُن کے سینہ پر گھٹنے رکھ کر سر کاٹ لیا۔ اور سب شہیدوں کی لاشوں پر گھوڑے دوڑائے۔ پھر امام حسینؑ کے خیمہ کو لوٹا اور جلایا۔ عورتوں کے سروں سے چادریں اُتار لیں۔ اور اُن کے ہاتھوں میں رسیاں باندھی گئیں۔ اور اُن کو اونٹوں پر ننگے سر بٹھایا گیا۔ اور امام حسینؑ کی لڑکی سکینہ کے طمانچے مارے گئے۔ اور ان قیدیوں کو کربلا سے ملک شام کے شہر دمشق میں لے گئے۔ آگے آگے مقتولوں کے کٹے ہوئے سر تھے۔ جن کو برچھیوں کی نوکوں پر چڑھایا گیا تھا۔ اور پیچھے پیچھے امام حسینؑ کی عورتیں اور بچے تھے اور راستہ کے شہروں میں ہزاروں آدمی ان قیدیوں کو دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔

اے محرم کے چاند تو نے اس زمین کے بے شمار خونی تماشے دیکھے ہوں گے۔ مگر سچ بتا کہ کیا حسینؑ شہید کربلا سے زیادہ غمناک واقعہ بھی تو نے کبھی دیکھا ہے؟ یقیناً آج تو اسی لئے اداس

اور رنجیدہ ہے۔ کہ تجھ کو کربلا کا دن اور کوفیوں اور یزیدیوں کے ظلم یاد آرہے ہیں۔ تو گواہ رہیو کہ میں حسینؑ کی اولاد ہوں اور میرے جسم میں اس جوان مرد کا خون ہے تو میں بھی صبر و ہمت سے کام لوں گا اور دُنیا کے کسی ظالم اور بے حق و نااہل آدمی کے آگے اپنے حق پرست سر کو نہ جھکنے دوں گا۔

سکینہ کی پیاس

دیکھو وہ سامنے اپنی ماں کے پاس امام حسینؑ کی چھوٹی لڑکی سکینہ کھڑی ہیں۔ محرم کی دسویں تاریخ ہے۔ سکینہ کے بڑے بھائی علی اکبر قتل ہو چکے ہیں چھوٹے بھائی علی اصغر کی خون میں ڈوبی ہوئی لاش سکینہؑ کے بابا گود میں لے کر خیمہ میں آئے ہیں اور سکینہ کی ماں اپنے دودھ پیتے بچہ کی لاش باپ کی گود سے لے کر چھاتی سے لگا رہی ہیں۔ اور رو رو کر کہہ رہی ہیں۔ کیوں بیٹا پانی پی لیا؟ میرے لال تم تو سو گئے۔ تم نے آنکھیں بند کر لیں۔ تم اپنی ماں سے روٹھ گئے۔ دیکھوں تمہارے نازک حلق میں تیر کہاں لگا؟ لو اپنی بہن سکینہ کی گود میں جاؤ جس سے بہت مانوس تھے۔ لو سکینہ اپنے ننھے بھائی کو لو۔ یہ بہت پیاسے تھے انھوں نے موت کے پانی کا ٹھنڈا گھونٹ پیا ہے اور کیسے بے خبر سوتے ہیں۔

سکینہ نے بھائی کی لاش کو گود میں لے لیا۔ سکینہ کو خبر نہ تھی کہ بھائی مر گیا ہے۔ انہوں نے بھائی کے گلے اور کرتہ کو خون میں بھرا دیکھا تو گھبرا کر کہا۔ اُمّی یہ خون کیسا ہے؟ ماں نے کہا یہ خون تمہارے باپ کا ہے۔ اور تمہارے نانا محمد رسول اللہ کا ہے اور تمہارے دادا علیؑ مشکل کشا کا ہے۔ یہ خون ظلم و ستم کے تیر نے بہایا ہے۔ یہ خون یزید کی بے رحم فوج نے دکھایا ہے۔ تمہارا بھائی مر گیا۔ اس کو ظالموں نے مار ڈالا۔ یہ پانی کی ایک ایک بوند سے ترستا ہوا دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ کہہ کر بچہ کی لاش سکینہ سے لے لی اور جھولے میں لٹادی اور دونوں ہاتھ مل کر کہا۔ ایک کونپل جوان باپ میدان میں مارا گیا۔ ایک کونپل یہ سامنے مرجھائی ہوئی پڑی ہے۔ میری گود خالی ہو گئی۔ مجھے دشمنوں نے لوٹ لیا۔ میرے روشن گھر میں اندھیرا کر دیا۔ قیامت آجائے تو عرش کا پایہ پکڑ کر خدا سے فریاد کروں گی کہ میرے بچوں کو مار ڈالا۔ سکینہ نے ماں کی باتیں سُنتے سنتے کہا۔ اُمّی دیکھو میری زبان۔ پیاس سے کانٹے پڑ گئے ہیں۔ حلق میں بھی کانٹے ہیں۔ مجھے پانی منگا دو۔ دریا

پاس ہے۔ بابا سے کہدو کہ وہ پانی لادیں یا کسی کو بھیجکر منگادیں۔

ماں نے جواب دیا۔ پیاری دریا فاطمہؑ کی اولاد کے لئے سوکھ گیا۔ یزید کے گھوڑے، گدھے اور کتے اس کا پانی پیتے ہیں۔ فرات کی لہریں یزید کی فوج پر مہر کرتی ہیں۔ ہم آلِ رسولؐ ہیں ہمارے لئے اس کا پانی بند ہے اور ہم اس کی ایک ایک بوند سے محروم ہیں۔ سکینہ نے ماں کی بات کو نہ سمجھا اور ماں کی چادر پکڑ کر کہا۔ ہمیں پیاس لگی ہے ہم نے کئی دن سے پانی نہیں پیا۔ ہمیں پانی منگادو۔ بابا کہتے تھے آلِ رسولؐ کو خدا نے حوض کوثر دیا ہے تو اسی کا پانی منگادو۔ کیا وہ حوض یہاں سے دور ہے؟ کیا اس پر بھی یزید اور شمر نے پہرے لگادئے ہیں؟ کیا وہ بھی ان کے قبضہ میں چلا گیا ہے؟ وہ تو ہمارے بابا کا تھا۔ کیا وہ بھی شمر نے چھین لیا؟

میں نے کہا بیٹی حوض کوثر آسمان پر ہے۔ تمہارے بھائی علی اکبر اور علی اصغر پانی لینے گئے ہیں۔ سکینہ نے کہا بھائی علی اصغرؑ کہاں گئے وہ تو سوتے ہیں۔ بھائی علی اکبر بھی لڑنے گئے ہیں حوض کوثر پر تو کوئی بھی نہیں گیا۔ مجھے تو پیاس لگ رہی ہے اماں جان میں سچ کہتی ہوں مجھے بہت پیاس ہے میں تو مدینہ میں سب کو ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پلایا کرتی تھی۔ آج مجھے کوئی بھی پانی نہیں دیتا۔ اب میں مدینہ جاؤں گی تو بہن صغریٰ سے کہوں گی کہ مجھے کربلا میں کسی نے پانی نہیں دیا تھا تم بھی کسی کو پانی نہ دو۔ اور میں بھی شمر کی بیٹی کو پانی نہیں دوں گی۔

سکینہ کی باتیں سن کر اُن کی پھپی زینب نے سکینہ کو گود میں اُٹھالیا اور کہا میری بیٹی بڑی صبر والی ہے ابھی اپنی بیٹی کو پانی منگادوں گی۔ چچا عباسؑ مشک لے کر دریا پر گئے ہیں۔ پانی لاتے ہوں گے خوب پینا اور ہم کو بھی دینا۔ ہم نے بھی کئی دن سے پانی نہیں پیا۔ سکینہ نے کہا آپ تو بڑی ہیں اور ہم بچے ہیں۔ پہلے ہم کو پانی منگادو۔ ہم پی لیں پھر آپ کو بھی دیں گے، ہم تو مدینہ میں آپ کو بھی پانی پلایا کرتے تھے۔ کیا ہوا چچا عباسؑ اب تک نہیں آئے؟ خبر نہیں اتنی دیر کیوں لگائی کیا ان کو بھی دشمنوں نے مار ڈالا؟ پھپی پیاس لگی ہے۔ اُمّی تمہاری سکینہ پیاسی ہے۔ پانی۔ ہائے پانی۔ دم آنکھوں میں آگیا۔ پانی۔ یہ کہتے کہتے غش کھا کر گر پڑیں۔

Marfat.com

کربلا کی باتیں ! سُنتی ہو گنگا جی۔ میں ہوں فرات۔ عراق کا مشہور دریا۔ میں ہندوستان کی گنگا جی سے کربلا کی باتیں کرنی چاہتا ہوں۔ کیا اچھا ہو کہ تمہاری بہن جمنا بھی ہوں۔ تو اپنے کنارہ کی ایک دکھ بھری کہانی سُناؤں۔ گنگا جی نے جواب میں کہا:-

کیا کہتے ہو بھائی فرات۔ میں گنگا ہوں اپنی بہن جمنا جی سے ملی ہوئی۔ الہ آباد سے جواب دے رہی ہوں۔ میں تم کو جانتی ہوں میرے اور میری بہن جمنا کے کنارہ سیکڑوں برس سے تمہارا نام مرثیوں میں لیا جاتا ہے۔ سناؤ وہ کیا داستان ہے؟ کس کے دُکھ کی بپتا ہے؟ فرات نے جواب دیا۔

بہنو! آج سے کچھ کم چودہ سو برس پہلے کا ذکر ہے عرب ملک کے مشہور رسول حضرت محمدؐ کے نواسہ حسینؑ اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ میرے کنارہ پر آکر ٹھہرے یہ حسینؑ اپنے باپ علیؑ کے زمانہ میں جب کہ شہر کوفہ میں ان کا پایہ تخت تھا۔ اور وہ ایک تہائی دُنیا پر وہاں بیٹھ کر حکومت کرتے تھے۔ میرے کنارہ گھوڑے دوڑانے آیا کرتے تھے۔ بڑی سُندر صورت تھی۔ لمبے لمبے بال کندھوں پر پڑے رہتے تھے۔ عراق کے لاکھوں عورت مرد انکے آگے جھک جاتے تھے۔ جب ان کو دیکھتے تھے مگر جب کا قصہ میں کہہ رہا ہوں۔ اس وقت وہ آئے تو ان کی اور ان کے باپ کی بادشاہی پر یزید نامی ایک انیائی اور ظالم راجہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ یزید کی فوج کا سیناپتی عمر سعد تھا۔ اور اُس نے حسینؑ کو گھیر لیا اور میرے کناروں پر پہرے لگا دئے کہ فرات کے پانی کی ایک بوند حسینؑ اور اُن کے بچوں اور عورتوں کو نہ ملے۔ اُس زمانہ میں بڑی گرمی تھی۔ اور میرے کنارہ کی زمین کا ریتا بھاڑ کی بھوبل کی طرح تپتا تھا۔ اور حسینؑ کی عورتیں اور بچے کئی دن کی پیاس سے تڑپ رہے تھے۔ وہ سب میرے کنارہ پر تھے اور میرے بہتے پانی کو دیکھ سکتے تھے اور میں ان کے سوکھے ہونٹوں اور پیاسی شکلوں کو دیکھ سکتا تھا۔ حسینؑ کے بھائی عباسؑ مشک لے کر لڑتے بھڑتے میرے اندر آگئے اور انہوں نے پانی بھر لیا۔ اور دونوں ہاتھوں میں پانی لے کر پینا چاہا۔ مگر کچھ سوچ کر بولے۔ میرے بھائی پیاسے ہیں۔ میرے بھائی کی عورتیں پیاسی ہیں میرے بھائی کے چھوٹے چھوٹے بچے پیاسے ہیں اور سکینہ بھی پیاسی ہے۔ میرے بھائی حسینؑ کی چھوٹی لڑکی جس نے مجھے پانی لینے بھیجا ہے۔ میں

Marfat.com

اُن پیاسوں سے پہلے کیوں کر پانی پیوں۔ یہ بڑی بےمروتی کی بات ہے یہ کہہ کر عباسؑ نے پانی ہاتھ سے پھینک دیا اور مشک لے کر چلے دشمنوں نے تیر برسانے شروع کئے اُن کی مشک چھلنی ہو گئی پانی بہنے لگا۔ پھر اُن کے دونوں ہاتھ کٹ گئے اور مشک گر پڑی تو اُنہوں نے دانتوں سے مشک کو اُٹھا لیا۔ بہنوں یہ آدمی بڑا بہادر معلوم ہوتا تھا۔ مگر میرے ہی کنارہ مارا گیا۔ اور اُس کے بھائی حسینؑ گھوڑا دوڑا کر آئے اور اپنے مرنے والے بھائی کی لاش اُٹھا کر لے گئے۔

بہن گنگا۔ اور بہن جمنا۔ ہم تم کو ہر وقت بہنا پڑتا ہے۔ اور ہم سب نے اپنے اپنے کناروں پہ بڑے بڑے دُکھ دینے والے کام دیکھے ہیں۔ مگر جیسا دُکھ بھرا قصہ میں نے اپنے کنارے دیکھا۔ ایسا قصہ دُنیا کے کسی دریا نے نہ دیکھا ہوگا۔ جب حسینؑ اور اُن کے سب بچے اور سب ساتھی ایک ایک کر کے قتل ہو گئے۔ تو یزیدی فوج نے بڑی بے رحمی سے عورتوں کے خیموں کو لوٹا۔ اور پردہ والی عورتوں کے سروں سے چادریں بھی چھین لیں۔ اور ان کے بچوں کو بھی مارا۔ اور ستایا۔ اور اُن کے خیموں میں آگ بھی لگائی۔ تم خیال کرو گے کہ یزید کی فوج کو ایسے بُرے کام کے لئے بڑی دولت یزید نے دی ہوگی۔ نہیں بہنوں یہ بات نہ تھی۔ اُن کو تو فقط ڈیڑھ سیر چنے فی آدمی روزانہ ملتے تھے

گنگا جی نے جواب دیا۔ بھائی فرات تمہاری کہانی سُن کر ہم دونوں کو بہت دُکھ ہوا۔ ہمارے دیش میں بھی جمنا کے کنارہ راجہ کنس نے بڑے بڑے ظُلم کئے تھے مگر ایسا ظلم جس کا تم نے حال بیان کیا راجہ کنس نے بھی نہیں کیا۔ اُس نے اپنی بہن کے بچوں کو راج چھین لینے کے ڈر سے مارا تھا۔ پر ایسا دُکھ نہیں دیا تھا۔ جیسا یزید کی فوج نے حسینؑ اور اُن کے بیوی بچوں کو دیا۔ مگر بھائی فرات اس میں بھی بھگوان کی ایک لیلا تھی اور امام حسینؑ اس لیلا کو خوب جانتے تھے۔ جب ہی تو وہ اسنتوش اور بے صبر نہیں ہوئے۔

فرات نے جواب دیا سچ کہتی ہو۔ میری بہنو۔ یزید کی فوج اور اس کے سنیاپتی ابن سعد اور شمر بڑے ہی کٹھور دل کے تھے۔ مگر حسینؑ کی بہادری بھی سارے سنسار کی بہادری سے بڑی تھی بولو اللہ کے پیارے حسینؑ کی جے۔ فاطمہؑ کے سپوت کی جے۔

پان کی گلوری

شاہی پنواڑی کی آوازیں } کہتے ہیں۔ غدر سے پہلے دہلی میں عوام کو حقہ پلانے والے ساقی اور پان بیچنے والے پنواڑی بازار میں بڑی شان سے نکلتے تھے۔ اور موزوں فقرے خوش آوازی سے عوام کو سُناتے تھے۔ اور ہندو مسلمان دونوں ایسے پنواڑیوں سے پان خرید کر کھاتے تھے اس زمانہ کے ایک پنواڑی کا قصہ سُناتا ہوں۔ جس کا نام حسینی تھا۔ خانم کے بازار میں رہتا تھا۔ جو اب موجود نہیں ہے۔ اور اُس جگہ پریڈ کا میدان نظر آتا ہے۔

حسینی پنواڑی بازار میں آتا تو لال پگڑی باندھے۔ لال انگرکھا پہنے صاف ستھرا۔ ایک تھال ہاتھ میں لئے جس کے اندر پان کی گلوریاں چاندی کے ورق لگی بھری ہوئی۔ چوک میں کھڑا ہوتا۔ اور یوں بلند آواز سے گاتا تھا۔ "لے لو پان کی گلوری" گوری چبائے لال بن جائے جیسے لیلےٰ کے ہاتھ۔ اور مجنوں کا جگر۔ اور آسمان کی شفق۔ ہرا ہرا پان ہے۔ لال لال شان ہے۔ بدخشاں کی کان ہے یہ پان ہے، یہ پان ہے کھا لو بیڑا لے لو میرا بیڑا یہ بیڑا ہے پان کا۔ بڑھیا دکان کا۔ جدائی کی رات میں ساتھ رہتا ہے۔ ملاپ کی رات میں مزا دکھاتا ہے۔ میرے پان کا یہ بیڑا۔

میں پان کا بے پاری۔ یہ پان ہے سرکاری۔ اس کو کھاتے ہیں درباری۔

ہریالہ ہے۔ متوالہ ہے۔ اچھے جوبن والا ہے میرے پان کا بیڑا۔

دل داری کی ایک شان ہے یہ پان اُسکی جان ہے اور جان بھی ایک پان ہے۔ لے لو میرے پان کی گلوری۔

کُندن کو شرماتی ہے۔ جُوبَن کو چمکاتی ہے۔ اچھے منہ کو سُہاتی ہے گوری جب چباتی ہے ہونٹوں آگ برساتی ہے۔ لے لو گوری کے لئے گلوری۔

غدر سے پہلے دلی کے سب دُکان دار اُجلے رہتے تھے۔ اور اپنی چیزوں کو بھی صاف ستھرا رکھتے

تھے۔ حقہ پلانے والے ساقی۔ اور پان بیچنے والے پنواڑی بھی بہت صاف ستھرے رہتے تھے۔ ان کے پان بھی بہت صاف ہوتے تھے۔ وہ پہلے ایک ایک پان کو پانی سے اچھی طرح دھوتے تھے کیونکہ پان کی رگوں میں خشخش کے دانوں سے بھی چھوٹے چھوٹے کیڑے چمٹے رہتے ہیں۔ اور اُن کو پانی سے صاف نہ کیا جائے تو پان کھانے والوں کے پیٹ میں جاکر طرح طرح کی بیماریاں پیدا کر دیتے ہیں۔ اور پان کھانے والوں کے مسوڑھوں اور دانتوں اور حلق میں بھی ان کیڑوں کے زہر سے بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ پُرانے زمانہ میں پنواڑی لوگ بھی اور گھر کی عورتیں بھی پانوں کو دھو دھوکر اور پانوں کی رگیں صاف کر کے اُجلی صافیوں میں رکھتی تھیں۔ اور کتھہ بھی صاف پانی میں پکاکر کلھیوں میں ڈھک کر رکھا جاتا تھا اور چونہ کی بھی خاص احتیاط صفائی کی رکھی جاتی تھی سب اونیٰ اعلیٰ گھروں میں پان دان اور پٹاریاں ہوتی تھیں۔ جن کے اندر کتھے چونہ کی کلھیاں زردہ چھالیہ کی ڈبیاں۔ الائچیوں اور بُن چکنی وغیرہ کی ڈبیاں الگ الگ ڈھکنوں سے ڈھکی ہوئی پٹاری کے اندر رہتی تھیں۔ اور سگھڑ عورتیں سویرے اُٹھ کر سب سے پہلے پاندان اور پٹاری کی صفائی کا انتظام کرتی تھیں۔ کتھہ چونہ کی چمچیوں کو روزانہ دھوتی تھیں۔ اور ہر عورت کا سگھڑاپا اُس کے پان دان کی صفائی سے ظاہر ہو جاتا تھا۔

مگر آج کل نہ پان بیچنے والے پنواڑی صاف ستھرے ہوتے ہیں نہ گھروں کی عورتیں پانوں کی صفائی اور نہ پاندان کی صفائی کا خیال کرتی ہیں صوبہ بمبئی میں ہاتھ کی انگلی سے پان پر چونہ لگاتے ہیں۔ اور سوکھا کتھہ چھڑک دیتے ہیں۔ یہ بہت معیوب عادت ہے۔ کسی کے ہاتھ میلے ہوں تو اس طرح انگلیوں کا زہر پان کو لگ جاتا ہے اور اُس سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور پان کی رگوں کو نظر نہ آنے والے چھوٹے کیڑوں سے صاف کرنے کا تو آجکل کسی پنواڑی کو خیال آتا ہے۔ نہ گھر کی عورتوں کو۔ شہروں اور قصبات اور دیہات سب ہی جگہ پان کا رواج ہو گیا ہے غدر سے پہلے ایسا عام رواج نہ تھا۔ مگر اب تو سوائے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کے سب عورت مرد ہندوستانی پان کھانے لگے ہیں۔ مگر جتنا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ اتنی ہی صفائی سے بے توجہی بھی ترقی کر رہی ہے۔ اول تو پان

بیچنے والوں کی دُکانیں بہت میلی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ پانوں کے مٹھے بہت گندے اور بہت میلے کپڑوں میں رکھ کر پارسلوں میں بھیجے جاتے ہیں۔ پان چھاریوں کے سڑے ہوئے اور پھٹے ہوئے نہایت میلے لہنگوں پر لپیٹ کر ٹوکریوں میں بھر کر پارسل کئے جاتے ہیں۔ ان پُرانے کپڑوں کو جو عموماً گاڑھے کے ہوتے ہیں۔ لسیمہ کہا جاتا ہے۔ اگر پان بیچنے والوں سے کہو کہ تم ایسے گندے اور ایسے میلے کپڑوں میں پان کیوں فروخت کرتے ہو۔ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ پان ایسے ہی کپڑوں میں خوش رہتا ہے۔ مگر ان کا یہ جواب غلط ہے۔ دراصل پان کو تری کی ضرورت رہتی ہے۔ باریک کپڑے میں پان لپیٹے جائیں۔ تو کپڑا جلدی سوکھ جاتا ہے۔ اس واسطے پان بیچنے والے موٹی کھدر کے کپڑے کو پانی میں گیلا کر کے پانوں پر لپیٹ دیتے ہیں اور محض کنجوسی کے سبب پاک اور اُجلی کھدر نہیں خریدتے۔ اور کہتے یہ ہیں کہ پان میلے کپڑوں میں اچھے رہتے ہیں۔ سرکار کے طبی محکمہ کے ذریعہ ان پان فروشوں کو مجبور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ میلے کپڑوں میں پان فروخت نہ کریں۔ ایسے ہی ہر مقام کی میونسپل کمیٹیاں تنبواڑیوں کی دُکان کو صاف رکھنے کا حکم دیں۔ کمیٹیاں حلوائیوں نان بائیوں اور قصائیوں کو صفائی کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ کھانے کی چیزیں فروخت کرتے ہیں۔ تو تنبواڑیوں کو بھی مجبور کرنا چاہئے کہ وہ بھی اپنی دُکانوں کو صاف رکھیں اور اپنے لباس کو صاف رکھیں اور پانوں کو صاف اور اُجلے کپڑوں میں لپیٹا کریں۔ اور کتھے چونے کی کلھیوں کو ڈھک کر رکھا کریں تاکہ اُن کے اندر زہریلی چیزیں گرنے نہ پائیں۔ اور کتھے چونے کی چمچیوں کو بھی روزانہ دھو لیا کریں۔ اور پان بنانے سے پہلے ہر پان کی رگوں کو پانی سے دھو کر صاف اُجلے کپڑے سے صاف کر لیا کریں۔ اور جو تنبواڑی ایسا نہ کرے اس کے پان کوئی ہندو مسلمان نہ خریدے۔

میں دوبارہ کہتا ہوں کہ پہلے پان فروشوں کے کپڑوں کو دیکھو۔ پھر اُن کے ہاتھوں کو دیکھو۔ پھر اس برتن کو دیکھو۔ جس میں بنے ہوئے پان یا گلو۔ یاں رکھی ہوں۔ پھر کتھہ چونہ کو دیکھو۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی میلی ہو۔ تو ایسے تنبواڑی سے ہرگز پان نہ خریدو۔

Marfat.com

پان کی پیک پان ہندوستان کی چیز ہے۔ ہندوستان کے باہر کہیں اس کا رواج نہیں ہے۔ البتہ برما کے ملک میں جواب ہندوستان سے الگ کر دیا گیا ہے۔ پان کا رواج ہندوستان سے بھی زیادہ ہے۔

ہندوستان میں پان کھانے کا رواج صدیوں سے ہے حضرت امیر خسروؒ نے آج سے چھ سو برس پہلے اپنی تصنیفات میں پان کا ذکر کیا ہے۔ اور اسپین کے مشہور سیاح ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفرنامہ میں پان کا حال لکھا ہے۔ کہ سلطان محمد تغلق شہنشاہِ ہندوستان کی دعوتوں میں کھانے سے پہلے شربت پلایا جاتا تھا۔ اور کھانے کے آخر میں پان کی گلوری دی جاتی تھی اور پان کے رواج کے ساتھ ہی ہر جگہ پیک دان یا اُگالدان بھی رکھے جاتے تھے۔ پہلے زمانہ والے آجکل کے لوگوں کی طرح نہیں تھے۔ جو پان کھا کر پان کی پیکیں دیواروں پر اور سیڑھیوں پر اور گھروں کے اُجلے فرش پر تھوکتے پھرتے ہیں۔ یہ بہت بے تمیزی کی بات ہے۔ خود پان کھاؤ۔ یا کسی مہمان کو پان دو۔ تو پہلے اُگالدان اپنے پاس رکھ لو۔ یا مہمان کے پاس رکھ دو۔ اور مہمانوں کو سمجھا دو کہ وہ پان کی پیکیں دیواروں یا فرش پر نہ تھوکیں۔ بلکہ اُگالدان میں تھوکیں۔ میرے ہاں درگاہ میں سالانہ دو عرس ہوتے ہیں۔ اور ہر عرس میں ہزاروں مہمان میرے مکانوں میں ٹھہرتے ہیں۔ اس لئے میں مہمانوں کے لئے سیکڑوں اُگالدان تیار رکھتا ہوں۔ اور سب مکانوں میں تقسیم کرا دیتا ہوں لیکن عرس ختم ہونے کے بعد دیکھتا ہوں تو اُگالدان خالی رکھے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ مہمان فرش کی دریاں اٹھا اٹھا کر زمین پر تھوکتے رہتے ہیں۔ ایسے بے تمیز آدمیوں کو سدھارنا جانوروں کو آدمی بنانے کی برابر ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس قسم کی بے تمیزیاں وہ لوگ کرتے ہیں۔ جو پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ کیونکہ مجھے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو انگریزی اور عربی اور فارسی علوم کے فاضل ہیں۔ مگر ان بے تمیزیوں میں بھی کامل ہیں۔ اس واسطے میرا خیال ہے کہ گاؤں والوں سے زیادہ شہروں اور قصبوں کے باشندے اصلاح اور سدھار کے قابل ہیں۔ خصوصًا پان کھانے کے مسئلہ میں تو عورت مرد یکساں شریک ہیں

Marfat.com

میں بھی بیس پچیس برس سے پان کھاتا ہوں۔ میرے گھر کے ہر غسلخانے اور پاخانہ میں ایک ایک اُگال دان رکھا رہتا ہے۔ اور جن زینوں سے میں اپنے گھر میں آتا جاتا ہوں وہاں بھی اُگالدان رکھے رہتے ہیں۔ میرے رہنے کے گھر میں سات آٹھ جگہ ایسی ہیں۔ جہاں میں پچھلی رات کو بیدار ہوکر لکھنے کا کام کرتا ہوں۔ اس واسطے میری بیوی ہر شام کو ہر مقام پر قلم دوات اور کاغذ اور بنے ہوئے پان اور ایک ایک اُگالدان رکھوا دیتی ہیں۔ کیونکہ کوئی نہیں جانتا۔ کہ آج پچھلی رات کو میں کس جگہ بیٹھ کر تحریری کام کروں گا۔ اور لکھتے وقت مجھے پان کھانے کی بہت زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔ اور بغیر پان کھائے میں دو فقرے بھی موزوں طریقہ سے نہیں لکھ سکتا۔

عورتوں سے درخواست } آخر میں تمام ہندوستان کی تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ عورتوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ پانوں اور پاندانوں اور اُگالدانوں کی صفائی کو گھر کے سب کاموں سے مقدم سمجھیں۔ اگر وہ ایسا کریں گی تو اُن کے گھروں کی سینکڑوں بیماریاں دور ہو جائیں گی۔ اور ان کو دانتوں اور مسوڑھوں اور حلق اور معدہ کی کوئی بیماری ستانے نہ پائیگی

ایڈورڈ ڈائری

یہ کتاب حضرت خواجہ حسن نظامی کی بالکل تازہ تصنیف ہے جو ۱۹۳۶ء میں تمام ہندوستان کی اُردو کتابوں کا سرتاج اور شاہکار مانی جاتی ہے اور جو آٹھ دن میں ہاتھوں ہاتھ بک گئی اور جس کا انگریزی ترجمہ بھی بہت مقبول ہوا قیمت ایک روپیہ (عہ)

ملنے کا پتہ

دفتر اخبار منادی دلی

Marfat.com

بے جان کی زبان اور جان کے کان

ذیل میں حضرت خواجہ حسن نظامی کی ان سترہ تقریروں کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جو دہلی ریڈیو اسٹیشن میں ۲۳ جولائی ۱۹۳۶ء جمعرات کو دن کے ایک بجے گراموفون کے ۹ دور خے ریکارڈوں کے تعارف میں براڈکاسٹ (نشر) کی تھیں۔ اور جن کو سن کر ہندوستان کے ہندو مسلمان سننے والوں نے بے حد پسندیدگی ظاہر کی تھی۔

ہستی کا غم } جس طرح آدمی کا بچہ پیدا ہوتے ہی روتا ہے اسی طرح جب اس دنیا کی ہستی ظاہر ہوئی تو اس نے اپنے وجود کا غم اس نغمہ سے ظاہر کیا اس ریکارڈ کے نغمے موجودات کے نوحے ہیں

کائنات کی خوشی } جب ہستی اپنے وجود پر رو چکی تو اس نے ایک خوشی کا ترانہ بھی گایا تاکہ وجود کی زندگی اکتا نہ جائے۔ جہاں خوشی اور غم جوڑواں پیدا ہوتے ہیں۔

عناصر کا ماتم } جب انسان دنیا میں نمودار ہو گیا تو یہاں کے سب عناصر اس کی برائی کو دیکھ کر رونے لگے اور انھوں نے یوں اظہار غم کیا۔

سمندروں کا غصہ } آدمی نے سمندروں پر حکومت کرنی چاہی تو سمندروں نے غصہ میں یہ ترانا گایا۔ اس ریکارڈ میں موجیں ہیں۔ لہریں ہیں اور غصہ ہے۔

آکاش کا نوحہ } آدمی ہوائی جہاز لے کر آکاش میں اڑنے لگا۔ تو آکاش اور فضا نے ریڈیو کی لہروں کے ذریعہ یہ نوحہ ہر جگہ گایا۔

جمادات کی فریاد } آدمی نے سونے چاندی لوہے پتھر سے خدمت لینی شروع کی تو ان سب نے مل کے یوں صدائے فریاد بلند کی

نباتات اور حیوانات کا افسوس } جب آدمی نباتات اور حیوانات کو کھانے لگا تو ان سب نے مل کر اس طرح اپنے رنج و افسوس کو ظاہر کیا۔

حُسن کا شکوہ } جب بُلبُل نے پھول کے اور پروانہ نے روشنی کے حُسن پر محبت کا دعویٰ کیا تو حُسن نے خفا ہو کر اس رعنائی سے اپنی برہمی ظاہر کی۔

لنگڑے سچ کا گیت } کہا جاتا تھا جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے مگر دیکھا یہ کہ جھوٹ کے سنو پاؤں ہیں اور سچ لنگڑا ہے۔ بلکہ اس کے دونوں پاؤں نہیں ہیں اور اس کو جھوٹ کے پاؤں کے سہارے سے چلنا پڑتا ہے تو بیچارہ سچ بے بس ہو کر رونے لگا اور یوں گایا۔

مان ابھمان } جب ہر آدمی اپنے مان اور عزت اور اقتدار کا دیوانہ بنا اور ابھمان اور غرور سے دوسرے آدمیوں کو بے عزت کرنے لگا تو نرک یعنے دوزخ کی شکتیوں طاقتوں نے اس کو یہ گیت سُنایا۔

چُپ کے بول } تار چپ تھا۔ لکڑی چپ تھی۔ کھال چپ تھی۔ خدا نے کہا سوکھے تار، سوکھی لکڑی، سوکھی کھال۔ میرے حکم سے بول۔ تو باجہ کے خاموش تار بجنے لگے۔ لکڑی کا باجہ بولنے لگا کھال کے ڈھول بھی بولنے لگے اور ان سب نے مل کر کہا یہ ہماری آواز نہیں خدا کی آوازیں ہیں ہم تو فقط گراموفون کے ریکارڈ کی طرح ہیں جو بے آواز اور بے جان ہوتا ہے مگر بولتا ہے۔

فٹ بال کا گیت } جب فٹ بال کو کھیل کے میدان میں سب ٹھوکریں مار رہے تھے اور وہ ہر کھلاڑی کے پاس پناہ لینے دوڑ رہی تھی مگر کوئی پناہ نہ دیتا تھا۔ تو گیند رونی اور اس نے یہ گا گا کر کہا کہ میرے اندر خود پسندی کی ہوا نہ ہوتی اور میں گھمنڈ سے پھولی ہوئی نہ ہوتی تو مجھے یوں ٹھکرایا نہ جاتا۔ اور میرے ہم جنس چمڑہ کا بوٹ میرے ٹھوکر نہ مارتا۔

غیبی آوازیں } اس ریکارڈ کی آوازیں غیبی ہیں اور سننے والے آدمیوں سے کہتی ہیں کہ وہ سب آپس میں ایک ہو جائیں ایک دوسرے سے محبت کریں۔ اور ایک دوسرے کو امداد دیں اور حسد ترک کر دیں کہ زندگی آپس کے میل اور خوشی کا نام ہے۔

Marfat.com

حضرت خواجہ حسن نظامی کی تصنیفات

الف

(۱) ایڈورڈ ڈائری اردو (۲) ایڈورڈ ڈائری انگریزی (۳) ایک بات (۴) اولاد کی شادی (۵) امام آخرالزماں کی آمد (۶) اردو سبق (۷) اچھا قاعدہ (۸) اردو کے کلمے یا لکھنے کی باتیں (۹) آسان سبق (۱۰) آسان قاعدہ (۱۱) آسان قاعدہ کا تصویر (۱۲) آپ بیتی (۱۳) اسلامی رسول صلعم (۱۴) اسلامی توحید (۱۵) اردو کھانے کے مضامین (۱۶) اردو محاورے (۱۷) اتالیق خطوط نویسی (۱۸) آواز (۱۹) اسلامی رسول کے معجزات (۲۰) اردو خطبے (۲۱) اسلام کے ضروری عقائد (۲۲) اسکول کی عادتیں (۲۳) انگریزوں کو دعوت اسلام

ب

(۲۴) بہادر شاہ کا مقدمہ (۲۵) بہادر شاہ کا روزنامچہ (۲۶) بیگمات کے آنسو (۲۷) بیتابیاں (۲۸) بیوی کی تربیت (۲۹) بیوی کی تعلیم (۳۰) بچوں کی کہانیاں (۳۱) بلاوا (۳۲) بوتل کا کاک

پ

(۳۳) پنواڑی کی دکان (۳۴) پردیس کے سترہ باجی (۳۵) پیکی دست پناہ

ت

(۳۶) تفسیر قرآن عام فہم (۳۷) تشریح بخاری (آٹھ حصے) (۳۸) تعلیم القرآن (۳۹) تاکید نماز (۴۰) ترکیب نماز (۴۱) تسکین احساس (۴۲) تین پرائیویٹ (۴۳) تین شہید (۴۴) تیاکو ناصہ (۴۵) تعلیم خدمتگاری (۴۶) تعلیم تصوف (۴۷) تسلی (۴۸) ترغیب حجاب (۴۹) تبلیغی اشتہار (۵۰) تبلیغی مرثیے (۵۱) تاریخ

ج

(۵۲) جرمن نامہ (۵۳) جرمنی خلافت (۵۴) جاں باز مسلم (۵۵) جگ بیتی کہانیاں

چ

(۵۶) چٹکیاں اور گدگدیاں (۵۷) چالیس آیت (۵۸) چار درویش

ح

(۵۹) حسن نظامی کا پیام (۶۰) حزب البحر (۶۱) حلوائی کی تعلیم (۶۲) حلال خور (۶۳) حق پرستوں پر ستم

خ

(۶۴) خوشامدی اور سرکش (۶۵) خدائی انکم ٹیکس (حرفی) (۶۶) خدائی انکم ٹیکس (کلامی)

د

(۶۷) دعا کی تاثیر کا فلسفہ (۶۸) دہلی کی جاں کنی (۶۹) دس سبق

ر

(۷۰) روپیہ عالم سکرات میں (۷۱) روزنامچہ ۱۹۲۳ء، ۲۴ء (۷۲) رسول کی عیدی

ز

(۷۳) زیارت نامہ

س

(۷۴) سلاطین بہمنی (۷۵) سترہ سورہ (۷۶) سادھو سنگٹ (۷۷) سیرت نبوی (۷۸) سلاطین عباسیہ حصہ اول (۷۹) سلاطین عباسیہ حصہ دوم (۸۰) سفرنامہ ہندوستان (۸۱) سفرنامہ مصر و فلسطین و شام و حجاز (۸۲) سیر دہلی (۸۳) سجدہ تعظیم (۸۴) سی پارہ دل (۸۵) سفرنامہ افغانستان (۸۶) سناتن سندیسہ (۸۷) سکھوں اور مسلمانوں کا راستہ (۸۸) سکھ قوم

ش

(۸۹) شریعت و طریقت کا فرق (۹۰) شیطان کا طوطا (۹۱) شیخ سنوسی (۹۲) شامی جہاد

ط

(۹۳) طمانچہ بر رخسار یزید

ع

(۹۴) عید کارڈ (۹۵) عورت نامہ (۹۶) عرب کا ارتداد

غ

(۹۷) غالب کا روزنامچہ (۹۸) غدر کا نتیجہ (۹۹) غدر کی صبح شام (۱۰۰) غدر دہلی کے اخبار (۱۰۱) غازی مرقع (۱۰۲) غزنی نامہ (۱۰۳) غزنوی جہاد

ف

(۱۰۴) فلسفہ شہادت (۱۰۵) فیضان سنوسی (۱۰۶) فرام قبلہ نو شملہ (۱۰۷) فاطمی دعوت اسلام

ق

(۱۰۸) قبروں کے غیبی نوشتے (۱۰۹) قرآنی بول چال (۱۱۰) قرآن کا ہندی ترجمہ

ک

(۱۱۱) کانا باتی (۱۱۲) کرشن جیون (۱۱۳) کم و شمرت (۱۱۴) کتاب الکلام (۱۱۵) کائنات بیتی

گ

(۱۱۶) گھریلو دھوبی گھاٹ (۱۱۷) گیارھویں نامہ (۱۱۸) گیارہ سورہ (۱۱۹) گرفتار شدہ خطوط (۱۲۰) گاندھی نامہ

ل

(۱۲۱) لاہوتی آپ بیتی (۱۲۲) لڑائی کا گھر (۱۲۳) لے دوڑ کا اسلام

م

(۱۲۴) محمد درشن (۱۲۵) مسلمان مہارانا (۱۲۶) مسلمان مہارانا کی تقریر (۱۲۷) مفلسی کا مجرب علاج (۱۲۸) محاصرہ دہلی کے خطوط (۱۲۹) مجالس حسنہ (۱۳۰) محرم نامہ (۱۳۱) میلاد نامہ (۱۳۲) مرگ نامہ

ن

(۱۳۳) نمونہ جنگ صفین (۱۳۴) ذکری (۱۳۵) نمازوں کا بیان (۱۳۶) نادان وہابی

ہ

(۱۳۷) ہردیال کی گھر بال (۱۳۸) ہندو مذہب کی معلومات

ی

(۱۳۹) یزید نامہ

حضرت امیر خسروؒ

جو ۱۷ اگست ۱۹۳۶ء عیسوی کو نشر ہوئی

حضرت امیر خسروؒ لاچین نسل کے ترک تھے۔ اُن کی والدہ ہندو نسل کی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ امیر خسروؒ ہندی زبان جانتے تھے اور اُن کی ہندی شاعری اُن کے زمانہ میں خود اُن کی ایجاد معلوم ہوتی تھی کیونکہ حضرت امیر خسروؒ کے وقت میں مسلمانوں کو ہندی شاعری کی طرف توجہ نہ تھی۔

امیر خسروؒ پٹیالی میں پیدا ہوئے جو علی گڈھ کے قریب ایٹہ کے ضلع میں ایک پرانا قصبہ ہے اُن کے نانا اسلامی سلطنت میں ایک بڑے ہندو جاگیردار تھے۔ ان کے والد کا نام امیر سیف الدین محمود تھا۔ جو امیر خسروؒ کو ۹ برس کا چھوڑ کر انتقال کر گئے تھے۔

امیر محمود فوجی آدمی تھے۔ اور امیر خسروؒ کی پیدائش کے وقت ہندوستان میں حکومت بھی ترکوں کی تھی۔ اس لئے امیر محمود حکمراں خاندان کے ہم قوم تھے۔

ہندوستان میں ترکوں کی حکومت غلاموں کی حکومت کہی جاتی ہے کیوں کہ سلطان شہاب الدین محمد غوری نے جب ہندوستان فتح کر کے اسلامی سلطنت کی بُنیاد رکھی تو اپنے سپہ سالار قطب الدین ایبک کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا۔ اور خود غزنی و غور کی طرف واپس چلا گیا۔ قطب الدین ایبک قوم کا ترک اور شہاب الدین غوری کا غلام تھا۔ اس لئے ایبک کی حکومت غلام خاندان کی حکومت مشہور ہو گئی حالانکہ ایبک اور اس کے بعد کے سب بادشاہ کسی کے غلام نہ تھے۔ ایبک کے بعد بڑا اور مشہور شہنشاہ شمس الدین التمش ہوا پھر اس کی بیٹی رضیہ سلطان ہوئی۔ التمش کی قبر قطب مینار کے نیچے ہے۔ اور رضیہ سلطان کی قبر دہلی کے محلہ چتلی قبر کے قریب بلبلی خانہ میں ہے۔

رضیہ کے بعد بڑا شہنشاہ غیاث الدین بلبن ہوا اور بلبن کے بعد اس کا پوتا معز الدین کیقباد ہوا۔ جس پر غلام یعنے ترک سلطنت ختم ہو گئی اور جلال الدین خلجی حاکم سامانہ پٹیالہ نے دہلی

میں آ کر کیقباد کو اس کے مشہور قصر کے اندر گھس کر قتل کر دیا اور لاش کمبل میں لپیٹ کر جمنا دریا میں ڈال دی جو قصر کے نیچے بہتا تھا۔ یہ قصر اس مقام پر تھا جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب پرنسپل جامعہ ملیہ نے اپنی قومی یونی ورسٹی کی نئی عمارات بنانی شروع کی ہیں گویا جہاں غلامی دریا میں ڈوبی تھی اب وہاں علمی آزادی کی عمارتیں بن رہی ہیں۔

حضرت امیر خسروؒ اپنے والد امیر محمود لاچین اور اپنے بڑے بھائی امیر اعزالدین علی شاہ لاچین کے ساتھ دلی میں آئے تو سلطان بلبن کی حکومت تھی۔ امیر محمود کو فوج کا ایک بڑا عہدہ دیا گیا۔ اور امیر خسروؒ دہلی میں رہنے لگے مگر سال میں ایک دفعہ اپنے نانا راوت عرض کی جاگیر پٹیالی میں بھی جایا کرتے تھے۔

مریدی کا واقعہ امیر خسروؒ نو برس کے تھے اور شعر اس عمر میں بھی خوب کہتے تھے۔ ایک دن ان کے والد امیر سیف الدین محمود نے دونوں لڑکوں سے کہا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اس وقت دلی میں بڑے بزرگ ہیں چلو میں تم دونوں کو ان کے پاس لے چلوں وہ تم کو دُعا دیں گے اور تم اُن کے مرید بھی ہو جانا۔

چنانچہ یہ تینوں حضرت کی خانقاہ کے دروازے پر آئے۔ جو اب بھی ہمایوں کے مقبرہ کے گوشہ شرق و شمال میں موجود ہے۔ جمنا دریا خانقاہ کی دیوار کے نیچے بہتا تھا۔ امیر خسروؒ نے باپ سے کہا کہ اندر نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ جب تک خود میرے اندر مرید ہونے کی عقیدت پیدا نہ ہو۔ مرید ہونا نہیں چاہتا۔ باپ نے بڑے بیٹے سے پوچھا انھوں نے جواب دیا کہ آپ میرے باپ ہیں آپ وہی کام کریں گے جو میرے لئے اچھا ہوگا اس واسطے میں اندر جاؤں گا اور حضرت کا مرید ہوں گا۔ چنانچہ امیر خسروؒ باہر بیٹھ گئے اور امیر سیف الدین محمود اپنے بڑے لڑکے علی شاہ کے ساتھ اندر چلے گئے۔ اور علی شاہ حضرت کے مرید ہو گئے۔

امیر خسروؒ نے باہر بیٹھے بیٹھے دل ہی دل میں ایک رباعی موزوں کی اور خیال کیا کہ اگر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ میرے پیر بننے کے قابل ہیں تو میرے دل کی بات کو معلوم کر کے

اس رباعی کا جواب بھیجیں گے ورنہ میں واپس چلا جاؤں گا۔ وہ رباعی فارسی میں تھی اور یہ تھی،

توآں شاہے کہ بر ایوان قصرت   کبوتر گر نشیند باز گردد
غریبے مستمندے بر در آمد   بیاید اندروں یا باز گردد

یعنے آپ ایسے بادشاہ ہیں کہ اگر آپ کے محل کی منڈیر پر کوئی کبوتر آن بیٹھے تو برکت کے اثر سے باز بن جائے۔ باز مشہور شکاری پرندہ کو کہتے ہیں جو پرندوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے آپ کے دروازہ پر ایک غریب اور ناچیز آدمی آیا ہے اندر آجائے یا واپس چلا جائے؟

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ علی شاہ کو بیعت کر کے خاموش بیٹھے تھے سیکڑوں آدمی مجلس میں حاضر تھے اور وہ سب بھی ادب سے چپ تھے۔ یکایک حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے گردن اونچی کی اور اپنے خدمت گار مبشر نامی کو پکارا مبشر دوڑا ہوا قریب آیا۔ حضرت نے فرمایا۔ دیکھو باہر ایک ترک بچہ بیٹھا ہے اس کے پاس جاؤ اور یہ رباعی پڑھ کر چلے آؤ۔ سوائے رباعی پڑھنے کے اور کوئی بات نہ کرنا وہ رباعی یہ تھی ۔

بیاید اندروں مرد حقیقت   کہ با مایک نفس ہم راز گردد
اگر ابلہ بود آں مرد ناداں   ازاں راہے کہ آمد باز گردد

یعنے حقیقت کے میدان کا مرد اندر آجائے۔ تاکہ ہمارے ساتھ کچھ دیر ہم راز بن جائے لیکن اگر وہ آدمی نادان اور ناسمجھ ہے تو جس راستہ آیا ہے الٹا چلا جائے۔

جس وقت مبشر خدمت گار نے حضرت کی یہ رباعی امیر خسروؒ کے سامنے پڑھی امیر خسروؒ رونے لگے اور خانقاہ کے اندر جا کر حضرت کے قدموں میں ۔ رکھدیا۔ اور مرید ہونے کی درخواست کی۔ حضرت نے امیر خسروؒ کو مرید کر لیا اور فرمایا میرے پاس رہو اور کچھ پڑھو۔ چنانچہ امیر خسروؒ حضرت کی خانقاہ کے حجرہ میں رہنے لگے اور حضرت سے تعلیم ظاہری اور تعلیم باطنی حاصل کرنے لگے۔

مشہور مورخ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک دن حضرت خواجہ نظام الدین

اولیاؒ اپنے مریدوں کے ہجوم کے ساتھ دہلی کے بازار سے گزر رہے تھے اور امیر خسروؒ بھی ساتھ تھے۔ امیر خسروؒ نے دیکھا۔ بازار میں نان بائی کی دکان پر ایک خوبصورت لڑکا بیٹھا ہے امیر خسروؒ اس کے پاس گئے اور اس سے پوچھا روٹی کس بھاؤ فروخت کرتے ہو؟ لڑکے نے امیر خسروؒ کو غور سے دیکھا اور ہنس کر کہا میری دکان کا دستور ہے کہ روٹی تول کر دی جاتی ہے۔ ترازو کے ایک پلڑہ میں روٹی رکھتا ہوں اور گاہک سے کہتا ہوں کہ دوسرے پلڑہ میں اشرفیاں ڈالو۔ اور جب اشرفیوں کا پلڑہ جھک جاتا ہے تب گاہک کو روٹی دی جاتی ہے امیر خسروؒ نے پوچھا۔ اگر کسی کے پاس اشرفیاں نہ ہوں؟ لڑکے نے کہا۔ تب دل کا درد لیا جاتا ہے۔ یہ جواب سُن کر امیر خسروؒ رونے لگے۔ اور خانقاہ میں آکر حضرت سے واقعہ عرض کیا۔ مگر حضرت نے کچھ جواب نہ دیا۔ امیر خسروؒ اپنے حجرہ میں چلے آئے اور تین رات دن حجرہ کے اندر روتے رہے نہ کھانا کھایا نہ سوئے نہ باہر نکلے۔

چوتھے دن وہ لڑکا حضرت کے پاس روتا ہوا آیا اور اُس نے کہا میں نے اپنی دُکان راہ خدا میں لٹا دی مجھے مرید کرلو اور خدا کا راستہ بتاؤ۔ حضرت نے فرمایا ابھی مرید ہونے کا وقت نہیں آیا۔ پہلے تم تعلیم حاصل کرو۔ اس کے بعد پوچھا خسروؒ کہاں ہے۔ اس کو بلاؤ اور کہو کہ اس لڑکے کو اپنے سبق میں شریک کرلے۔ امیر خسروؒ سامنے آئے روتے روتے آنکھوں پر ورم آگیا تھا۔ حضرت نے نان بائی کے لڑکے سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے۔ لڑکے نے جواب دیا۔ میرا نام حسن ہے علا سنجری بھی کہتے ہیں۔ حضرت نے امیر خسروؒ سے کہا جاؤ حسن علا سنجری کے ساتھ پڑھا کرو۔ حسن نے عرض کی مجھے شاعری کا شوق ہے فرمایا۔ خسروؒ بھی شاعر ہے تم دونوں شعر کی مشق بڑھاؤ۔ اس سے لیاقت پیدا ہوتی ہے۔

تاریخ فرشتہ کا بیان ہے کہ اسی تعلیم و تربیت کے زمانہ میں امیر خسروؒ کے والد امیر سیف الدین محمود لاچین کا انتقال ہوگیا۔ اور امیر خسروؒ نے اپنے والد کا ایک بہت اچھا مرثیہ لکھا جس کا پہلا شعر فرشتے نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے جو یہ ہے۔

Marfat.com

سیف از سرم گزشت دل من دو نیم شد دریائے من رواں شدہ در یتیم ماند

یعنی تلوار (باپ کے سیف الدین نام کا اشارہ کیا ہے) میرے سر سے گزر گئی۔ اور میرا دل دو ٹکڑہ ہو گیا۔ میرا دریا روانہ ہو گیا اور میں در یتیم اکیلا رہ گیا۔ امیر خسروؒ کی یتیمی کے بعد پیر کی شفقت و محبت اور زیادہ ہو گئی۔

اس زمانہ میں بلبن کا ولی عہد محمد خاں ملتان اور دیبال پور کی گورنری سے دہلی میں آیا یہ شاعروں کا بڑا قدردان تھا اس نے سُنا کہ حضرت کے دو شاگرد بہت اچھے شاعر ہیں تو اس نے اپنے باپ شہنشاہ بلبن کے ذریعہ حضرت کی خدمت میں عرض کرائی کہ خسرو اور حسن کو مجھے دیدیجئے میں ان کو اپنا مصاحب بنانا چاہتا ہوں حضرت نے اس درخواست کو قبول کر کے خسرو اور حسن کو وہاں بھیجدیا۔ اور یہ دونوں شہزادہ ولی عہد کے ساتھ ملتان چلے گئے۔ شہزادہ ولی عہد نے امیر خسروؒ کو دوات اٹھانے کا عہدہ دیا۔ اور حسن کو قرآن شریف اُٹھانے کی خدمت دی جو ترک حکومت میں سب سے بڑی عزت کی نوکریاں تھیں)۔

کچھ عرصہ کے بعد ہندوستان پر مغلوں کا حملہ ہوا اور شہزادہ محمد خاں عصر کی نماز پڑھ رہا تھا کہ مغل فوج نے حملہ کر کے اسے قتل کر دیا اور امیر خسروؒ اور حسن مغلوں کے قیدی ہو گئے مغلوں نے ان دونوں شاعروں کو بہت ایذا دی ان کے ہاتھوں میں رسیاں باندھیں اور گھوڑوں کے ساتھ ان کو دوڑایا۔ غرض بہزار دقت یہ دونوں مغلوں کی قید سے چھوٹ کر دہلی میں آئے۔ اور امیر خسروؒ نے شہنشاہ بلبن کے دربار میں اس کے ولی عہد کا مرثیہ ایسے دردناک انداز سے پڑھا کہ شہنشاہ اور سب درباری زار و قطار رونے لگے شہنشاہ نے امیر خسروؒ کو ملک الشعراء یعنی سب شاعروں کا بادشاہ خطاب دیا۔ اور حسن کو فوج کا ایک بڑا عہدہ دیا گیا۔

امیر خسروؒ دربارداری کے زمانہ میں بھی روزانہ اپنے پیر کے پاس جاتے تھے اور حسن بھی جاتے تھے۔ مگر حسن کو حضرت نے اب تک مرید نہیں کیا تھا۔ اور حسن بری صحبت میں مجھ

Marfat.com

کر شراب پینے لگے تھے۔ ایک دن حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء حضرت خواجہ قطب صاحبؒ کے مزار پر گئے۔ امیر خسروؒ اور سب مرید ساتھ تھے۔ شمسی تالاب کے کنارے دیکھا کہ حسن اپنے دوستوں میں بیٹھے شراب پی رہے ہیں۔ حضرت وہاں کھڑے ہو کر حسن کو دیکھنے لگے۔ حسن نے بھی حضرت کو دیکھا اور جام و صراحی ہاتھ سے رکھ کر نشہ میں بہکتے ہوئے حضرت کے قریب آئے۔ اور کہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اچھی صحبت میں اچھا اثر ہوتا ہے۔ میں سالہا سال سے آپ کے پاس جاتا ہوں مگر مجھ پر تو آپ کی صحبت کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ دیکھ لیجئے کس حال میں ہوں۔ حضرت یہ بات سُن کر خاموش ہو گئے کچھ جواب نہ دیا۔ مگر امیر خسروؒ آگے بڑھے اور کہا۔ حسن دیوانہ ہوا ہے شراب نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ دیکھ پانی کا خاصہ ہے کہ وہ ہر بدبودار چیز کو دھو کر صاف کر دیتا ہے مگر مچھلی پانی کے اندر رہتی ہے اس کی بو پانی دور نہیں کر سکتا مگر یہ قصور پانی کا نہیں ہے۔ بلکہ مچھلی کی ذات کا ہے۔ ایسے ہی حضرت کی صحبت سب کو نیک بنا دیتی ہے۔ مگر تیری اندرونی بدی اتنی زیادہ ہے کہ وہ حضرت کی صحبت سے بھی دور نہیں ہوتی۔ حسن نے امیر خسروؒ کو دیکھا اور چاہتے تھے کہ اُن کو جواب دیں کہ حضرت نے اپنے دونوں ہاتھ اونچے اٹھائے۔ یعنی اشارہ کیا کہ بحث نہ کرو۔ پھر حسن کی طرف دیکھ کر فرمایا "بابا حسن در صحبت اثر ہاست" یعنے بیٹا حسن اچھوں کے پاس بیٹھنے میں بہت بڑا اثر ہوا کرتا ہے" خبر نہیں اس سادہ اور معمولی فقرہ میں کیا جادو تھا۔ کہ حسن نے بہت زور سے ہائے کا نعرہ مارا اور حضرت کے قدموں میں سر رکھ دیا اور اپنا یہ شعر پڑھا

اے حسن توبہ آں زماں کردی کہ ترا طاقت گناہ نماند

اے حسن تو نے ایسے وقت گناہوں سے توبہ کی کہ تجھ میں گناہ کرنے کی طاقت ہی نہ رہی اس کے بعد اپنا ایک اور شعر حضرت کو مخاطب کر کے پڑھا۔

بندہ حسن بصد زباں گفتہ کہ بندۂ توام تو بزباں خود بگو بندہ نواز کیستی

یعنے آپ کے غلام حسن نے سینکڑوں زبانوں سے عرض کیا کہ میں آپ کا غلام ہوں۔ ذرا

Marfat.com

آپ بھی تو بتائیے کہ آپ کس غلام کو نوازنے والے ہیں۔؟ حضرت نے امیر خسرو رحؒ کی طرف دیکھ کر تبسم فرمایا۔ امیر خسروؒ نے ہاتھ جوڑکر عرض کی آج میرے دوست کو مرید کر لیجئے۔ حضرت نے فرمایا "یہ نشہ میں ہے اس کا نشہ اتر رہا ہے۔ اس کو ایسا نشہ درکار ہے جو کبھی نہ اترے۔ لا ہاتھ بڑھا۔ میں نے تجھ کو نوازا۔ آج سے تو میرا ہو گیا۔ اور میں بھی تیرا ہو گیا۔ گناہ تجھ سے ہٹ گئے۔ خسرو دیکھ حسن کو دیکھ" کہتے ہیں جس وقت حضرت نے یہ فرمایا سب نے ایک ایسی چکاچوند دیکھی کہ ہر شخص کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ پھر بھی حسن نہایت مقبول مریدوں میں ہو گئے اور انھوں نے حضرت کا ایک روزنامچہ لکھا جس کو آج تک لاکھوں نظامی قرآن مجید کی تلاوت کے بعد روزانہ پڑھتے ہیں۔ اس روزنامچہ کا نام **فوائد الفواد** یعنی دل کے فائدے ان کا مزار اورنگ آباد کے قریب خلدآباد میں ہے اور ان کی قبر کے برابر ان کی کتابوں کی قبر بھی ہے جو ان کی وصیت کے مطابق دفن کی گئیں تھیں امیر خسروؒ کہا کرتے تھے کہ کاش میری دو سو تصنیفات حسن کے نام ہوتیں اور حسن کا لکھا ہوا مقبول روزنامچہ میرے نام ہوتا کیونکہ میرے محبوب کو حسن کا لکھا ہوا روزنامچہ اتنا پسند ہے کہ ہر جمعہ کو سنتے ہیں امیر خسروؒ کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ لفظ ترک سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ جو اس زمانہ میں محبوب کے لئے بولا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت اپنے ایک شعر میں امیر خسروؒ کی نسبت فرماتے ہیں

گر برائے ترکِ ترکم ارّہ بر تارک نہند ترک تارک گیرم و ہرگز نہ گیرم ترکِ ترک

اگر میرے ترک کو مجھ سے جدا کرنے کے لئے میری پیشانی پر آرہ رکھ دیا جائے تو میں اپنی پیشانی پر آرہ چلوا لوں گا مگر اپنے ترک کو ہرگز نہ چھوڑوں گا۔

ایک دفعہ امیر خسروؒ نے حضرت کو مخاطب کر کے کہا۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

حضرت نے سن کر فرمایا۔

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔

یعنی امیر خسروؒ نے کہا میں تجھ میں تو مجھ میں۔ میں تن تو جاں۔

Marfat.com

حضرت نے جواب دیا۔ تاکہ پھر کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ تم اور رہو اور میں اور رہوں۔ ایک دفعہ حضرت نے فرمایا کہ اگر شریعت اجازت دیتی تو میں وصیت کرتا کہ امیر خسروؒ کو بھی میری قبر کے اندر دفن کیا جائے۔ پھر فرمایا اگر قیامت کے دن خدا مجھ سے پوچھے کہ نظام الدین میرے لئے دُنیا سے کیا لائے تو عرض کر دوں گا۔ خسرو کے دل کا سوز۔

ایک دفعہ کوئی سائل حضرت کے پاس آیا اس وقت کچھ دینے کو موجود نہ تھا۔ حضرت نے اپنی جوتیاں سائل کو دیدیں۔ سائل واپس چلا گیا۔ امیر خسروؒ شہنشاہ کے ساتھ بنگال گئے ہوئے تھے۔ واپسی میں ایک سرائے میں قیام تھا۔ چونکہ شہنشاہ کے مصاحب تھے۔ بہت سے ہاتھی گھوڑے لونڈی غلام ساتھ تھے۔ یکایک امیر خسروؒ نے کہا بوئے پیر می آید۔ بوئے پیر می آید پیر کی خوشبو آتی ہے۔ پیر کی خوشبو آتی ہے۔ لوگوں نے کہا ایک مسافر دلی سے آیا ہے شاید حضرت کے پاس گیا ہو۔

امیر خسروؒ اس کے پاس گئے اور اس کا حال پوچھا۔ مسافر نے کہا ہاں میں حضرت کے پاس گیا تھا۔ کیونکہ مجھے روپے کی ضرورت تھی مگر حضرت نے یہ دو جوتیاں مجھے دی ہیں۔ امیر خسروؒ نے مسافر سے پوچھا تم یہ جوتیاں فروخت کرتے ہو؟ مسافر نے کہا کیا دو گے؟ امیر خسروؒ نے جواب دیا سب ہاتھی گھوڑے سب لونڈی غلام سب روپیہ پیسہ لیلو اور جوتیاں دیدو۔ مسافر نے کہا تم مجھ سے مذاق کرتے ہو۔ امیر خسروؒ نے اسی وقت سب چیزیں اس کے حوالہ کر دیں اور جوتیاں اس سے لیکر اپنی دستار میں باندھ لیں۔ اس وقت امیر خسرو لکھنؤ میں تھے۔ وہاں سے دلی تک ننگے پاؤں اکیلے پیدل آئے۔ اور جب حضرت کے سامنے پہنچے تو حضرت نے مسکرا کر فرمایا "ترک جوتیاں بہت سستی خرید لیں"۔

حضرت کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ میں آپ کا انتقال ہونے لگا تو امیر خسروؒ بنگال کے سفر میں تھے۔ حضرت نے فرمایا خسرو واپس آئے تو میری قبر پر نہ آنے دینا ورنہ قبر شق ہو جائے گی اور میں قبر سے باہر آجاؤں گا۔ چنانچہ چھ مہینہ کے بعد

۱۸ر شوال ۷۲۵ھ کو امیر خسروؒ بنگال سے واپس آئے۔ اُنھوں نے پیر کے غم میں گریبان چاک کر لیا تھا۔ اور زار و قطار رو رہے تھے۔ جب مزار کے سامنے پہنچے تو لوگوں نے روکا اور کہا کہ حضرت حکم دے گئے ہیں کہ خسرو کو میری قبر کے پاس نہ آنے دینا۔ یہ سُنکر خسرو نے قدم روکا۔ اور نہایت حسرت کی نظروں سے حضرت کے کچے مزار کو کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ پھر اپنا دا اپنا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا۔ اور روتے روتے اپنا یہ ہندی دوہا پڑھا۔

گوری سوئے سیج پر اور مکھ پر ڈالے کیس چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چوندیس

محبوب سیج پر سو رہا ہے۔ اور اس نے اپنے چہرہ پر اپنے بال ڈال رکھے ہیں۔ چل خسرو تو بھی اپنے گھر چل کہ چاروں دیس میں شام ہو گئی۔ یہ کہہ کر آہ کی اور گر پڑے۔ دیکھا تو جسم میں جان نہ تھی جس جگہ انتقال ہوا اُسی جگہہ قبر کھودی گئی۔ اور دفن کر دیا گیا۔ یہ وہی امیر خسروؒ تھے جن کی شاعری کو ہندوستان کے ہندوؤں نے مانا۔ مسلمانوں نے مانا۔ یہاں تک کہ ایران نے بھی مانا۔ اور حضرت شیخ سعدی نے شہزادہ محمد خاں کے دعوت نامہ کے جواب میں لکھا کہ میں بڑھاپے کے سبب ہندوستان نہیں آسکتا۔ تمہارے پاس خسرو جیسا شاعر موجود ہے۔ جس کے کلام کی ایران کے ہر گھر میں دھوم ہے اُسی کی قدر میری قدر ہے۔

حضرت امیر خسروؒ کی عظیم الشان زندگی کا یہ ایک چھوٹا سا حصہ ہندوستانیوں کے سامنے پیش کر کے اس بیان کو ختم کیا جاتا ہے اگر ان کی پوری زندگی کے واقعات سُنائے جائیں تو کئی مہینے درکار ہوں گے۔ خصوصاً ان کی ہندی شاعری تو ایسی چیز ہے جس کو ہندو مسلم اتحاد کی پہلی بنیاد کہہ سکتے ہیں۔

میں نے یہ مضمون تیار کر کے پہلے حضرت امیر خسروؒ کے مزار کے پاس بیٹھ کر بلند آواز سے پڑھا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ حضرت امیر خسروؒ نے قبر کے اندر اُس کو سُنا اور خوش ہوئے۔ ان کا مزار میرے گھر سے دس قدم کے فاصلہ پر ہے۔ اور میں روز اُن کی قبر کی زیارت کر کے تحریری کام شروع کرتا ہوں۔

Marfat.com

خواجہ حسن نظامی دھلوی کی تقریر

مہمان بلائے جان

جو ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء کی شام کو نشر ہوئی

دسمبر کے مہینہ کا ذکر ہے خوب سردی تھی۔ رات کے بارہ بجے کا وقت۔ بجلی چمک رہی تھی بادل گرج رہے تھے اور بارش بھی ہو رہی تھی میرے نوکر اپنے گھروں میں پڑے سوتے تھے اور میرے بیوی بچے بھی اپنے لحافوں میں دبکے ہوئے بے خبری کی نیند کا مزہ لے رہے تھے۔ اور میں بھی دو لحافوں میں دبا ہوا پڑا سوتا تھا کیونکہ ایک لحاف سے میری سردی دور نہیں ہوتی - ایکا ایکی میرے مکان کے بڑے پھاٹک پر کسی کے چیخنے اور کواڑ کھٹکھٹانے کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ کئی آدمی مل کر آواز دے رہے تھے۔ خواجہ صاحب کو جگاؤ۔ مہمان آئے ہیں دروازہ کھولو ہم بھیگے جاتے ہیں۔ پیارے شاہ پشاوری کا حجرہ پھاٹک کے پاس تھا۔ اور ایک نوکر بھی ان کے حجرہ میں تھا مگر سردی اور بارش کے سبب وہ بولتا نہ تھا اور یا دن بھر کی محنت کے سبب اس کی نیند ایسی غفلت کی تھی کہ اُس کی آنکھ نہ کھلی۔ میری آنکھ کھلی تو میں کمبل اوڑھ کر باہر نکلا۔ سردی سے کانپتا جاتا تھا۔ دانت بج رہے تھے بات منہ سے نہ نکلتی تھی۔ مگر گھر پر آئے ہوئے مہمان کے آرام کا خیال تھا جو میں پھاٹک پر گیا۔ کنڈی کھولی۔ اتنے میں نوکر بھی اُٹھ بیٹھا اور میری آواز سُن کر باہر گیا۔ دیکھا پانچ آدمی ہیں بارش سے تر کھڑے کانپ رہے ہیں۔ بستر کسی کے پاس نہیں ہے۔

اندھیرا تھا میں کسی کی صورت نہ دیکھ سکا نہ آواز سے معلوم ہوا کہ پہلے کبھی سُنی ہو۔ تاہم ان پانچوں کو مردانہ کمرہ میں لایا۔ بجلی کا ٹمک دبایا روشنی ہو گئی۔ ان کو کرسیوں پر بٹھایا اور حال پوچھا کہ اس آدھی رات کے وقت کہاں سے آنا ہوا۔ اور آپ کون لوگ ہیں۔ ایک صاحب نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ پہلے سوکھے اور گرم کپڑے منگائیے سردی ہوش لینے دے تو بات کریں۔

Marfat.com

میں نے نوکر سے کہا۔ صندوق کھول۔ تہمد اور کمبل نکال۔ اور ان کو دے۔ مہمان صاحب بولے یہ سردی اور تہمد! جناب گرم پاجامے اور گرم قمیص منگائیے۔ میں نے کہا کمبل اور لحاف تو مہمانوں کے لئے میرے ہاں رہتے ہیں مگر گرم پاجامے اور قمیص تیار نہ کرانے کی غلطی ہوئی معاف فرمائیے اس وقت تو گیلے کپڑے اتارئے تہمد باندھئے کمبل اوڑھئے۔ میں ابھی آگ منگاتا ہوں گرمائی آجائیگی مہمان صاحب نے بگڑ کر کہا۔ ہم تو یہ سمجھ کر آئے تھے کہ درویش کا گھر ہے مہمانوں کے لئے ہر چیز موجود ہوگی مگر یہاں تو ڈھاک کے تین پات ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اچھا بھئی لا تہمد ہی لا۔ ایسا نہ ہو نمونیہ ہو جائے ایک گھنٹہ سے گیلے کپڑے بدن پر ہیں۔

یہ کہتے ہی دوسرے سانس میں ارشاد ہوا کہ اچھا چا بنانے کے لئے بھی کہدیجئے۔ کھانا ذرا ٹھیر کر کھائیں گے ابھی تو چا پینی ہے ذرا گرم کر دیگی۔ اگر لونگیں اور دار چینی بھی چا میں ڈال دی جائے تو گرمی اور لذت بڑھ جائیگی۔ اور کھانے میں انڈے تیار کرنے کو کہدیجئے۔ انڈوں میں مرچیں ذرا زیادہ ڈلوائیے۔

میں اب تک تو مہمان کی دل جوئی کے خیال سے درگزر کر رہا تھا مگر جب میں نے دیکھا کہ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام کا معاملہ ہے اور ان لوگوں میں دوسرے کی تکلیف کا کچھ احساس ہی نہیں ہے تو میں نے ہنس کر کہا۔ نہیں جناب اس وقت تو لحاف اوڑھ کر سو جائیے۔ آدھی رات کے وقت چا بہت نقصان دیتی ہے اور کھانا تو اس وقت زہر کا کام دیگا اور اگر ذکر جہر کیا جائے تو بہت جلدی گرمائی آجائیگی اتنے میں نوکر آگ لایا انگیٹھی چارپائیوں کے بیچ میں رکھدی گئی اور مہمانوں نے قہقہہ مار کر کہا لو بھئی یہ شاہ جی تو پتھر معلوم ہوتے ہیں یہاں جونک نہیں لگے گی۔ پھر کہنے لگے سنئے جناب ہم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ ناگدا ریلوے کا راستہ ایسا اجاڑ ہے کہ کہیں کھانا ملتا ہی نہیں گاڑی لیٹ بھی تھی بارہ بجے نظام الدین اسٹیشن پر اترے۔ بابو سے پوچھا کہاں ٹھہریں؟ اس نے آپ کا نام بتایا۔ کہ درویش ہیں اور بڑے ہی مہمان نواز ہیں۔ سیکڑوں مہمانوں کی ٹھہرنے کی جگہ تیار رہتی ہے۔

میں نے کہا سنئے میں جب کسی کے گھر میں مہمان جانا چاہتا ہوں تو آٹھ دن پہلے میزبان کو اطلاع

Marfat.com

دیتا ہوں کہ فلاں وقت پہنچوں گا۔ ایک نوکر ساتھ ہوگا میں چاول نہیں کھاتا۔ چاء نہیں پیتا۔ بستر میرے ساتھ ہوگا۔ صرف ایک رات آپ کے ہاں ٹھہروں گا۔ اور اسی طرح میرے ہاں جو مہمان آتے ہیں ان سے بھی اسی برتاؤ کی توقع رکھتا ہوں۔ اور اسی چیز کا نام شرافت ہے جس کو انگریزی میں جنٹلمینی کہتے ہیں اور جو مہمان اس کے خلاف کرتا ہے یعنی بے اطلاع۔ بے وقت۔ بے جان پہچان کے آجاتا ہے تو میں ایسے مہمان کو بلائے جان تصور کرتا ہوں۔

یہ سنتے ہی مہمان بگڑے اور بولے تو یوں کہئے حضور کو نئی روشنی کی ہوا لگ گئی ہے۔ ہم نے بڑی غلطی کی جو اس گھر میں آئے آئندہ کو کان ہوتے اب کبھی نہ آئیں گے۔ لیکن اس وقت تو چاء اور کھانا ضروری ہے۔ چاء نہ پی۔ اور کھانا نہ کھایا تو صبح تک ہم سب کا خاتمہ ہو جائیگا اور آپ کو پانچ قبریں تیار کرانی پڑیں گی اور پانچ کفن دینے پڑیں گے۔

میں نے کہا کیا مضائقہ ہے قبریں بنوانیں اور کفن دینے بڑے ثواب کا کام ہے۔ میں یہ خدمت بسر و چشم انجام دوں گا۔ اور اگر کوئی وصیت جناب کرنی چاہیں تو اس کو بھی سنوں گا۔ اور اس کو پورا بھی کروں گا۔

ایک صاحب ان میں مولوی بھی تھے انھوں نے مہمانوں کی مدارات اور مہمان نوازی کے فضائل بیان کرنے شروع کئے اور فرمایا کیسا بُرا زمانہ آیا ہے آپ جیسے لوگوں نے بھی مہمانوں کی برکت کو اپنے دلوں اور عمل سے بالکل دُور کر دیا ہے۔ آپ کے حضرت سلطان جیؒ صاحب تو وفات کے وقت بھی یہی دریافت کرتے تھے کہ کوئی مہمان آیا ہو تو اس کی مدارات کرو۔

میں نے کہا یہ کچھ کم مدارات ہے کہ اس سردی اور اس بارش میں لحاف چھوڑ کر یہاں آیا۔ اور آپ کو پناہ دی نوکر بھی آخر آدمی ہے دن بھر کام کر چکا ہے میں اس کو کیوں کر کہوں کہ وہ اس وقت چاء بنائے۔ یہ گاؤں ہے دودھ اس وقت نہیں ملیگا۔ وہ بولے ڈبہ کا دودھ گھر میں ہوگا میں نے جواب دیا۔ اول تو میں ڈبہ کے دودھ کو پسند نہیں کرتا اور پسند کرتا بھی تو نہ بیوی کو ایسے وقت چاء بنانے کی تکلیف دینی چاہتا ہوں نہ نوکر کو۔ اچھا خدا حافظ۔ شب بخیر۔ زندگی ہے تو صبح ملونگا

Marfat.com

وہ بولے تو کیا رات بھر ہم قل ھو اللہ پڑھتے رہیں ۔میں نے کہا جی ہاں ۔ پہلے اعوذ باللہ پڑھئے گا ۔ پھر بسم اللہ اور پھر قل ہو اللہ تاکہ اس کی برکت سے آپ کو خدا آدمیت عطا فرمائے اور اس طرح آدھی رات کے وقت مان نہ مان میں تیرا مہمان بننے کی جرأت پھر کبھی آپ کو نہ ہو۔

اس کے بعد میں نے نوکر کو اشارہ کیا اور وہ چار اور انڈے اور بسکٹ لایا ۔ اور میں رات کے دو بجے تک جاگتا رہا ۔ اور جب مہمان کھا پی کر سو گئے تب میں بھی اپنے بستر پر چلا گیا ۔

مہمان دس بجے بیدار ہوئے گرم پانی سے حمام کیا ۔ نوکر نے رات کے گیلے کپڑے آگ پر سکھا دئے تھے وہ پہنے ۔ ناشتہ کرنے کے بعد مہمان نوازی کے مسئلہ پر جناب مولانا مبلغ اسلام صاحب سے گفتگو شروع ہوئی ۔

میں نے کہا مولانا رات کو میں نے جو باتیں کی تھیں وہ اگر ناگوار ہوئی ہوں تو معاف کیجئے گا مولانا نے فرمایا آپ کا برتاؤ معاف کرنے کے لائق نہیں ہے ۔ آپ نے ہمارا مذاق اڑایا ۔ اور علماء کی جوتی کا مذاق بھی کیا جائے تو آدمی کافر ہو جاتا ہے ۔

میں نے جواب دیا شاید آپ کو معلوم نہیں مجھ پر پانچ دفعہ ڈیڑھ ڈیڑھ سو مولویوں کے دستخطوں سے کفر کے فتوے لگ چکے ہیں پس جو پانچ گنا کافر ہو اس کے کفر میں آپکی توہین کے سبب اور کیا اضافہ ہو سکیگا ۔

فرمانے لگے کیا تم جانتے ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مہمانوں کی کتنی خاطر کرتے تھے ۔ ان کے ہاں تو آسمانی فرشتے بھی مہمانوں کی شکل میں آتے تھے ۔ اور ہمارے حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو غیر مہمانوں کی مدارات بھی کرتے تھے اور اپنے گھر کا سارا کھانا مہمان کو کھلا کر خود بھوکے سو جاتے تھے اور اپنا بستر غیر مسلم مہمان کو سونے کے لئے دیدیتے تھے ۔ ایک دفعہ ایک غیر مسلم مہمان نے آپ کے بستر پر پاخانہ کر دیا اور اندھیرے سے بھاگ گیا تو حضرت نے مہمان کا پاخانہ اپنے ہاتھ سے دھویا ۔ اصحاب رسول اللہ نے ہر چند اصرار کیا کہ لائیے ہم اس گندگی کو دھو ڈالیں مگر حضرت نہ مانے ۔ اور فرمایا کہ میرے مہمان کا پاخانہ ہے میں خود اپنے ہاتھ سے یہ دھوؤں گا ۔ اتفاق سے وہ مہمان اپنی بھولی ہوئی چیز کو لینے کے لئے واپس آیا اور حضرت کو اپنی

گندگی دہوتے ہوئے دیکھا تو قدموں میں گر پڑا اور فوراً مسلمان ہو گیا۔ یہی حال آپ کے پیشوا اور امام اوّل حضرت علیؑ کا تھا اور یہی عادت تمام اولیاء اللہ کی تھی۔ اگر آپ حضرت ابراہیمؑ کو مانتے ہیں اور حضرت رسول اللہ کو مانتے ہیں تو آپ کو مہمانوں کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرنا چاہئے جیسا کہ رات کو آپ نے ہمارے ساتھ کیا

میں نے جواب دیا۔ جناب مولانا صاحب میں پیغمبروں اور ولیوں اور مسلمانوں کی مہمان نوازیوں کو جانتا ہوں اور مانتا بھی ہوں۔ لیکن جس زمانہ میں سڑکیں نہ تھیں۔ ریلیں نہ تھیں۔ موٹریں نہ تھیں اور مسافروں کے لئے سرائیں اور ہوٹل نہ تھے۔ اس وقت انسانی ہمدردی کا تقاضا یہ تھا کہ مسافروں کو مہمان بنانا ثواب اور فخر اور عزت کا کام سمجھا جاتا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا کہ راستوں کی مشکلات کے سبب لوگ سفر بھی بہت کم کرتے تھے۔ اور سفر کو سقر کہا جاتا تھا مگر اب ریل اور موٹریں صبح سے شام تک ہزاروں لاکھوں مسافروں کو ادہر سے ادہر لاتی لے جاتی ہیں ہر جگہ سرائیں اور ہوٹل موجود ہیں اب مہمان نوازیوں کی ضرورت نہیں رہی۔ اور چونکہ بہت سے بیکار اور بے روزگار آدمیوں نے ناخواندہ مہمان بننے اور اسباب چوری ہو جانے کا بہانہ کر کے گدایہ مانگنے کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ اس واسطے میں انہی مہمانوں کی مدارات کرتا ہوں جو مجھے اطلاع دے کر آئیں یا جن سے میری واقفیت ہو۔ پیشہ ور مہمانوں کو بلائے جان سمجھتا ہوں۔ آپ سے میں نے جو معافی مانگی تھی وہ بھی میری جنٹلمینی تھی۔ ورنہ میری رائے اب تک یہی ہے کہ میں نے جو کچھ رات کو کہا تھا وہ بالکل ٹھیک کہا تھا۔ اور میں اپنے مریدوں کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ وہ آپ جیسے ناخواندہ مہمانوں کی مہمان داری سے احتیاط کریں۔ اور شادی غمی کے موقعہ پر جو رسمی مہمانداریاں ہوتی ہیں ان کے بھی خلاف ہوں۔ یہاں تک کہ ولیمہ کی دعوت کو بھی میں آجکل کے زمانہ میں نمود اور ریاکاری سمجھتا ہوں۔

مبلغ اسلام مولانا صاحب یہ سُنکر غصہ سے بے تاب ہو گئے اور اپنے ساتھیوں سے کہا ایسے شخص کے ہاں ٹھہرنا اور کھانا پینا حرام ہے مولانا کے چاروں ساتھی خاموش رہے اور مولانا بار بار ان سے فرمانے لگے کہ چلو اٹھو میں یہاں نہیں ٹھیرونگا تب میں نے مسکرا کر مولانا سے کہا ارشاد

Marfat.com

ہو تو نمک پانی منگاؤں مولوی صاحب نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا کیوں ؟ میں نے کہا اس لیئے کہ رات کو اور ابھی جو حرام چیزیں آپ نے کھائی ہیں اور پی ہیں اُن کو قے کر دیجئے ۔ اور نمک پانی کے بغیر قے نہ ہو سکیگی ۔ یا مور کا پر منگاؤں ۔ اس کو حلق میں پھیرنے سے قے جلدی ہو جاتی ہے ۔

یہ سُن کر مولانا کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ لعنت ہے اس شخص پر جو تمہارے ہاں پھر کبھی آئے اور اس کی عورت پر تین طلاق جو تمہارے ہاں مہمان ہو کر کچھ کھائے پئے ۔ میں نے دونوں ہاتھ جوڑے اور دست بستہ کہا اگر حضور اپنی اہلیہ کے رہنے کا پتہ بتادیں تو میں ان کو آج خط لکھ دوں گا کہ مولانا صاحب نے تم کو پانچ مسلمانوں کے سامنے طلاق دیدی ۔ یہ فقرہ سُن کر مولانا کے ساتھیوں نے قہقہہ لگایا اور مولانا کو بھی ہنسی آگئی اور وہ بیٹھ گئے اور پھر سنجیدہ صورت بنا کر بولے شاہ جی آپ کی کھری باتوں سے بہت خوشی ہوئی اور یہ تو آپ نے کمال کیا جو ہمارے بستروں کی چوری کا ذکر باتوں باتوں میں کر دیا ۔ آپ بڑے پہنچے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ۔ ہمارے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا کہ پانچوں آدمیوں کا اسباب ریل میں چوری ہو گیا ۔ اور اب ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے جو ہم اپنے گھروں کو پہنچ سکیں کم از کم کرایہ تو ہم پانچوں کو دینا ہی پڑیگا ۔ میں نے کہا بسر و چشم میرے ہاں کتابوں اور اخباروں کے کاغذ موڑنے کا کام کیجئے ۔ دونوں وقت کی روٹی کے علاوہ دو آنہ فی کس اجرت دوں گا ۔ جب اتنی رقم ہو جائے کہ آپ اپنے گھروں کو جا سکیں تو چلے جائیگا اور اس صورت میں آپ کو وہ مکان دیا جائیگا ۔ جہاں نوکر رہتے ہیں ۔ مولانا کو پھر غصہ آیا اور انھوں نے گالیاں دینی شروع کیں اور ان کے اصرار سے ان کے چاروں ساتھی بھی اُٹھ کر چلے گئے اور اس پر مہمان بلائے جان کا قصہ تمام ہوا ۔

مہمان بلائے جان عنوان کی فرمائش کی گئی تھی اس لئے میں نے اپنی آپ بیتی کا ایک قصہ سُنا دیا اور اس قسم کے قصے تو مجھے اکثر پیش آتے رہتے ہیں دہلی ریڈیو اسٹیشن نے بھی مجھے اس عنوان پر تقریر کرنے کے لئے غالباً اصلاح کی نیت سے لکھا ہوگا ۔

مگر اب تصویر کا دوسرا رُخ دکھانے کی بھی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ مہمان نوازی اور

مہمان داری۔ ایشیائی تہذیب اور مشرقی اخلاق کا سب سے بڑا جوہر ہے اگر خرابیوں کی اصلاح کر دی جائے اور مذکورہ پیشہ ور مصنوعی مہمانوں کے واقعات سے الگ ہو کر مہمان نوازی اور مہمان داری کو قائم رکھا جائے تو ایشیا اور مشرق کی ایک بڑی عمدہ صفت کی حفاظت ہو گی۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے مجھ کو دو واقعات اپنے سفر یورپ کے سُنائے تھے کہ ایک دفعہ وہ کسی انگریز کے مہمان تھے اور میز پر کھانا اتنی مقدار میں موجود تھا کہ کئی فالتو آدمی کھا سکتے تھے۔ اسی اثنا میں ایک غریب انگریز وہاں آیا اور اُس نے صاحب خانہ سے کہا کہ وہ تین وقت سے بھوکا ہے۔ صاحب خانہ نے جواب دیا تم فلاں خیرات خانہ میں جا سکتے ہو اور جب وہ چلا گیا تو صاحب خانہ نے حکیم صاحب سے کہا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ شخص واقعی بھوکا تھا کیونکہ اکثر بدچلن آدمی فرضی باتیں بنایا کرتے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد حکیم صاحب ترکوں کے پایۂ تخت قسطنطنیہ میں گئے اور ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ شام کو پیدل سیر کرنے بازار میں جا رہے تھے کہ ان کو لب سڑک ایک باغ دکھائی دیا۔ حکیم صاحب نے اس کو عام باغ سمجھا اور اس کے اندر چلے گئے۔ اس باغ میں کسی ترک پاشا کی پردہ نشین خانم رہتی تھیں (یہ ذکر ۱۹۱۱ء کا ہے جبکہ ترک عورتیں پردہ کرتی تھیں) ایک نوکر عورت نے حکیم صاحب کو دیکھا تو چیخ کر کہا تم کون ہو جو پردہ باغ میں آ گئے۔ حکیم صاحب نے جواب دیا میں مہمان ہوں۔ مہمان کا لفظ سُنکر عورت نے کہا مہمان میرے سر پر اور آنکھوں پر تم سامنے کے کمرہ میں بیٹھ جاؤ۔ پاشا باہر گئے ہیں۔ خانم پردہ میں ہیں میں ابھی ناشتہ لاتی ہوں حکیم صاحب نے کہا۔ میں ہوٹل میں ٹھہرا ہوں مجھے ناشتہ کی ضرورت نہیں ہے۔ عورت نے کہا ایک مسلمان ترک کے گھر میں مہمان آئے اور کچھ کھائے پئے بغیر چلا جائے یہ ناممکن ہے اور ترک کی سب سے بڑی ذلت اور توہین ہے۔ حکیم صاحب یہ سُن کر کمرہ میں بیٹھ گئے وہ عورت پہلے تازہ اخبار دے گئی۔ اور پھر ایک خوان لائی جس میں میوہ تھا اور مٹھائی تھی اور چاء تھی اور خانم کی طرف سے کہا کہ میں مہمان کا شکریہ ادا کرتی ہوں جو میرے گھر پر آیا۔ افسوس ہے پاشا موجود

Marfat.com

نہیں ہیں ورنہ وہ مہمان سے مل کر بہت خوش ہوتے جب وہ آئیں گے تو میں ان کو مبارک باد دونگی کہ ایک ہندوستانی مسلمان ان کے گھر میں مہمان آیا تھا۔

ان دونوں واقعات سے مشرق ومغرب اور ایشیا اور یورپ کی مہمان داری کا فرق ظاہر ہو سکتا ہے اسی سنہ ۱۹۱۱ء میں میرا سفر بھی اسلامی ممالک میں ہوا تھا۔ میں نے دمشق کے ایک ہوٹل میں کھانا کھانے گیا تو وہاں میز پر کئی ترک اور عرب پہلے سے کھانا کھا رہے تھے۔ میں السلام علیکم کہہ کر میز کے پاس بیٹھا اور ہوٹل والے نے مجھے کھانا کھلایا جو ترک اور عرب کھا رہے تھے وہ السلام علیکم کہہ کر چلے گئے اور میں نے ہوٹل والے سے اپنا بل مانگا تو اس نے کہا کہ تمہارے کھانے کی قیمت ترک دے گئے ہیں۔ میں نے کہا کیوں؟ وہ کیوں دے گئے۔ میری تو ان سے واقفیت نہیں تھی نہ میں ان کو جانتا تھا نہ وہ مجھ کو جانتے تھے۔

ہوٹل والے نے کہا وہ مسلمان تھے اور آپ بھی مسلمان ہیں وہ پہلے سے بیٹھے تھے اور آپ بعد میں آئے تھے اس لئے ان پر آپ کی مہمان داری لازم ہوگئی تھی اور مہمان سے واقفیت کچھ ضروری چیز نہیں ہوتی انہوں نے آپ کے کھانے کی قیمت دے کر آپ پر احسان نہیں کیا بلکہ اپنا مسلمان ہونا ثابت کیا۔

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہمان نوازی اور مہمان داری مشرق والوں کی ایک ایسی اعلیٰ صفت ہے جس کو بلائے جان مہمانوں کی برائیوں کے سبب ضائع کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ ہم مغرب سے یہ سیکھ سکتے ہیں کہ مہمان داریوں کی برائیوں سے بچیں مگر مہمان نوازی کے وصف کو ترک کرنا اپنی تہذیب اور اپنے اخلاق حسنہ سے منہ موڑنا ہے۔

روزنامچہ حضرت خواجہ حسن نظامی

مہمان بلائے جان کے دلچسپ قصے ہر ہفتے حضرت خواجہ حسن نظامی کے روزنامچہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں یہ روزنامچہ ہفتہ وار اخبار منادی دلی میں شائع ہوتا ہے۔ سالانہ قیمت ہے

پتہ :- دفتر اخبار منادی دِلی

Marfat.com

جاٹ کی کھاٹ

جو مئی ۱۹۳۶ء کی شام کو خود خواجہ حسن نظامی نے پڑھی

میری کہانی سننے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ تمام پور گاؤں کے رہنے والے ایک زمیندار جاٹ کا یہ قصہ ہے۔ گاؤں والے چارپائی کو کھاٹ کہتے ہیں۔ اور گاؤں کے مکھیا یا نمبردار یا ذیل دار یا بڑے آدمی گاؤں کی چوپال میں ایک چارپائی پر بیٹھ کر اپنے گاؤں اور برادری کے جھگڑوں کے فیصلے کرتے ہیں۔ گویا زمیندار کی کھاٹ تھانہ دار کی کرسی بھی ہے۔ اور مجسٹریٹ اور جج کی کرسی بھی ہے اور ذاتی بات چیت اور غپ شپ کے کلب گھر کی کرسی بھی ہے۔

زمیندار کی کھاٹ یعنے چارپائی کا نام سُن کر سُننے والے اپنے گھروں کی نواڑی مسہریوں اور پلنگوں اور ہلکی بانس کی چارپائیوں کا تصور نہ کریں۔ کیونکہ یہ جاٹ کی کھاٹ چارپائی نہیں۔ چارپایہ ہوتی ہے۔ اس کو گاؤں کی زبان میں ماچا کہتے ہیں۔ اس کی چوڑان بعض جگہ دو تین گز کی ہوتی ہے اور لمبان پانچ گز کی۔ اور بعض جگہ اس سے ذرا کم ہوتی ہے۔ اس کی پٹیاں اور پائے بہت بھاری ہوتے ہیں۔ ان کو مونجھ کے بان سے بُنا جاتا ہے۔ اس کو دس بارہ آدمی مشکل سے اُٹھاتے ہیں۔ اس واسطے جاٹ کی کھاٹ قطب از جانمی جنبد کی طرح بس ایک ہی جگہہ بچھی رہتی ہے۔

چوپال گاؤں کے اس مکان کو کہتے ہیں جو کچے مکانوں کے بیچ میں ایک پکا مکان سب گاؤں والے مل کر بنا لیتے ہیں اور وہاں روز شام کو جمع ہوتے ہیں۔ بڑے آدمی ماچے یعنی کھاٹ کے اوپر ہوتے ہیں اور چھوٹے آدمی کھاٹ کے سامنے مٹی سے لپی ہوئی زمین پر اکڑوں حلقے بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور پھر حقہ اور باتوں کا دور چلتا ہے۔ اور جب کسی گاؤں والے کا کوئی مہمان آتا ہے تو وہ بھی چوپال میں ٹھیرتا ہے اور جب کسی کے ہاں برات

Marfat.com

آتی ہے تو وہ بھی چوپال میں ٹھہرائی جاتی ہے اور بڑے ماچے (کھاٹ) کے آس پاس اور بہت سی چھوٹی چھوٹی چارپائیاں بچھادی جاتی ہیں - اور جب تحصیل کا چپراسی یا تھانہ کا سپاہی آتا ہے تو وہ بھی چوپال میں ٹھیرتا ہے اور اُس کو روٹی یا لسی یا دودھ یہاں بھیجدیا جاتا ہے اور جب تھانہ دار صاحب یا تحصیل دار صاحب کسی مقدمہ کے لئے آتے ہیں تو وہ بھی چوپال میں بیٹھ کر مقدمے طے کرتے ہیں - ورنہ روزمرہ گاؤں کے چودہری اور بڑے آدمی حقہ پینے اور باتیں کرنے اور دن بھر کی محنت کی تھکن اُتارنے کو یہاں جمع ہوتے ہیں - اب ذرا سُنئے میں نظام پور گاؤں کی چوپال اور کھاٹ کی اپنے الفاظ میں ایک تصویر دکھاتا ہوں جس میں گاؤں سدہار کی باتیں اس طرح کہہ جاؤں گا کہ گاؤں والوں پر بھی ان کا اثر ہو اور حکومت کے افسر بھی گاؤں سدہار کی ضروری باتوں کو جان جائیں اور شہروں کے رہنے والے وہ آدمی بھی اس سے فائدہ اُٹھا سکیں جو اپنے ملک کے دیہات کی اصلاح کا کام کرنا ایک سیوا اور نیکی سمجھتے ہیں

چودہری لال سنگھ چوپال کے ماچے پر بیٹھے ہیں اور چاروں طرف گاؤں والے جمع ہیں اور حقہ کا دور چل رہا ہے

چودہری لال سنگھ نے سب کو مخاطب کر کے کہا { آج سانج (شام) کو میں گڑگانوہ سے آیا تو لالو کی ماں بولی ذپہرے (دوپہر کو) لالہ اجاگرمل کڑکی (قرقی) لایا تھا۔ مور سنگھہ کے سب ڈھور ڈنگر کڑک کر لئے۔ مور سنگھہ کی چھوری (لڑکی) آج ہی تڑکے (صبح) سا سرے (سسرال) سے باپ دہورے (باپ کے پاس) آئی تھی اور گہنا ٹوم چھلا پہر رکھا تھا (بہت سا زیور پہنے ہوئے تھی) لالہ نے وہ بھی کڑک کرالیا۔ مور سنگھہ نے کہا لالہ جی میری لالی کی ماں نہیں ہے اور یہ ٹوم چھلا ہمارا دیا اوڑ نہیں ہے۔ یہ تو لالی کے سورے (خسر) نے بنایا ہے تم اس کو کیوں کڑک کرد ہو تو لالہ نے ایک نہ مانی۔ اور لالی کی سگری (سب) ٹوم اتروالی۔ لالی رڈن جاؤں تھی (روئے جاتی تھی) اور مور سنگھہ اپنا ماتہہ تھامے بیٹھا تھا۔ اور سگرے گاؤں کے بیر بانی (عورت مرد) اکٹھے تھے۔ اور سب ہی کہیں تھے کہ لالہ تو ایسا کھنور (سنگدل) کیوں

Marfat.com

ہو گیا ہے چھوری پرا نیائے (ظلم) نہ کر۔ مور سنگھ کے ڈھور ڈنگرے لے چھوری کی ٹوم کو نہ لے۔ اس کا سورا سنیگا تو کہیگا مور سنگھ نے چھوری کی ٹوم لے لی ہوگی۔ پر لالہ نے کسی کی نہ منی۔ اور سگری ٹوم سنگوالی۔ اور جب لالہ ڈھوروں کو لے چلا تو مور سنگھ کا چھوٹا چھورا اپنی گؤ (گائے) کو چپٹ گیا۔ وہ کہے تھا میں اپنی گؤ تجھ کو نہیں دوں گا۔ یہ میرے دودھ پینے کی ہے۔ اور تاؤ لال سنگھ نے مجھے دی تھی جب وہ لڑائی سے آیا تھا اور گھنے روپے لایا تھا۔ پر لالہ نے مور سنگھ کے چھورے کو ایسا دھکیلہ دیا کہ چھورا دور جا پڑا۔ اور لالہ نے کہا میں کیا جانوں لال سنگھ کون ہے مور سنگھ نے چھوری کے بیاہ پہ پانچ سو روپے لئے تھے دو برس ہوگئے نہیں دئے۔ نوتا بھی کھا گیا۔ کہتا تھا نوتہ کے روپے آئیں گے تو ہاتھ کے ہاتھ گنوا دوں گا۔ میں نوتہ کے دن چوپال میں بیٹھا رہا۔ ساڑھے تین سو روپے نوتہ کے آئے مگر مور سنگھ نے کہدیا کہ برات تین دن ٹھہر گی چھ وقت کی روٹی دینی ہے برات چلی جائے تو تیو جب دوں گا۔ برات کے بعد ایا تو بھی مور سنگھ نے کچھ نہ دیا۔ بیاج بٹہ مل کر ہجار (ہزار) روپے ہو گئے ہیں۔ لیتے وقت تو تم میں سے کسی نے کچھ نہ کہا اب تم سب کہتے ہو کہ انیائے نہ کر۔ میں اپنا روپیہ چاہتا ہوں یا انیائے کرتا ہوں یہ کہہ کر لالہ سب ٹوم اور ڈھور لے کر چلا گیا۔ اور یہ بھی کہتا گیا کہ لال سنگھ آئے تو کہدینا کہ وہ بہت ڈینگ مارا کرتا ہے کہ میں لام پر گیا تھا اور تھانہ دار تحصیل دار میرا خیال کرتے ہیں۔ اب میں اس کے گاؤں سے یہ ٹوم اور ڈنگرے جاتا ہوں اس سے کچھ ہو سکے تو میرا بگاڑ لے۔

چودھری لال سنگھ نے اپنی بیوی کی کہی ہوئی یہ حکایت بیان کر کے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا اور کہا کہ اس بنیہ نے چلتے چلتے مجھے ایسی بات کہی ہے کہ اگر مور سنگھ کے ڈنگر اور اس کی چھوری کی ٹوم الٹی نہ لاؤں تو میرا نام لال سنگھ نہیں۔

کیوں رے مور سنگھ تو نے اس کے روپے کیوں نہیں دئے تھے۔ اگر روپے دیدیتا تو سگرے گاؤں کی لاج ایک بنیہ یوں خراب نہ کرتا۔ تیری لالی کے سا سرے والے کیا کہیں گے کہ لال سنگھ اتنا بڑا آدمی وہاں تھا پھر بھی ان کی بہو کی ٹوم بنیہ نے اتار لی۔ اس بنیہ نے میری ناک

Marfat.com

کاٹ ڈالی۔ اور میرے گاؤں کی عزت بھی خاک میں ملا دی۔

لال سنگھ کی یہ باتیں سُن کر مور سنگھ بولا۔ چودھری تو جو کہے ٹھیک ہے۔ برات کے شکرانہ میں خرچہ زیادہ ہو گیا اور نوتہ کے سب روپے خرچ ہو گئے۔ میں بنیہ کو کہاں سے دیتا لال سنگھ نے کہا۔ میں کہوں تھا زمیندارہ بنک سے روپیہ لے لے وہاں یہ لوٹ کھسوٹ نہیں ہوتی مگر نہیں مانا اور کہنے لگا کہ لالہ اجاگر مل پیڑیوں کے ساہوکار ہیں اور ہمارے پرکھوں (باپ دادا) کے وقت سے لین دین اس کے ہاں ہوتا آیا ہے۔ اچھا میں کل تڑکے تحصیل میں جاؤں گا۔ اور لالی کی ٹوم اور تیرے ڈھور چھڑا لاؤں گا۔ اپنے چھورے سے کہہ دے کہ اس کی ٹوم بھی آجائے گی جو میں نے اس کو دی تھی۔

مور سنگھ نے کہا چودھری تو ہمارا باپ ہے تو ہماری کہبر (خبر) نہ لیگا تو کون لے گا۔ مجھے تو چھوری لالی کا بڑا دُکھ ہے وہ ٹوم لے جانے کے بعد سے برابر رُوں جائے ہے اور کہے ہے کہ میں تو کوئیں میں ڈوب مروں گی اور سسرال نہیں جاؤں گی وہاں لوگ کہیں گے کہ اس کے باپ نے ٹوم لے لی ہوگی۔ ایسی لاج کی بات سُننے سے تو مر جانا اچھا ہے۔

لال سنگھ نے کہا۔ جا ابھی لالی کو کہبر دیدے کہ میں تڑکے اس کی ٹوم لینے جاؤں گا وہ کسی بات کی چنتا (فکر) نہ کرے۔

یہ بات ختم ہوئی تو ایک بڈھے جاٹ نے حقہ دوسرے جاٹ کی طرف سرکایا اور کہا لے رے حقہ پی۔ حقہ ہر کا لاڈلا۔ سب کا رکھے مان۔ بھری سبھا میں یوں پھرے جو گوپین میں کان۔ (حقہ خدا کا پیارا ہے سب کو خوش کرتا ہے بھرے جلسہ میں اس طرح چکر لگاتا ہے جیسے کہنیا جی گوپیوں میں چکر لگایا کرتے تھے) پھر کہا۔ بھرلے تکہ مارلے گھونٹ بہتا چھا گئی چاروں کھونٹ (حقہ بھر اور اس کا ایک کش لے ساری دُنیا دُکھ میں مبتلا دکھائی دیتی ہے) ایک جاٹ بولا کیوں رے من سنگھہ تیرے بیل مارٹے (دُبلے) کیوں ہوتے جاتے ہیں۔ من سنگھہ نے کہا۔ چارہ بھی خوب دوں ہوں۔ ٹہل بھی گھر والی بہت کرے ہے پر کسی نے کچھہ ایسا کیا ہے کہ بیل سوکھے

Marfat.com

ہی چلے جائیں ہیں۔ ابھی گنگا جی کے میلہ پر گئے تھے تو مارے نہ تھے۔

لال سنگھہ نے بات کاٹ کر کہا۔ یہ جو نیا لاٹ آیا ہے اُس نے آتے ہی دلی میں کہا کہ میری شادی کو پچیس برس ہو گئے اور میں نے آج تک روٹی نہیں دی۔ کل ساری دلی کے ہندو مسلمانوں کو میری طرف سے روٹی کھلا دو۔ لاٹ کے نوکروں نے یہ حکم سنتے ہی کھانے پکوانے شروع کر دئے اور دوسرے دن ہزاروں آدمیوں کو کھانا کھلایا گیا۔ مور سنگھہ نے یہ بات سُنی تو کہا کیوں چودھری کہیں لاٹ نے اجاگرمل سے روپیہ لے کر تو کھانا نہیں کیا تو کل دلی جائے تو لاٹ سے کہد یجیو کہ اجاگرمل کے بہی کھاتہ سے چوکس (ہوشیار) رہے یہ ایک کے دو لکھ لیتا ہے۔ لال سنگھہ نے کہا۔ پاگل ہوا ہے لاٹ صاحب کو لالہ سے روپیہ لینے کی کیا ضرورت ہے وہ تو بنک سے روپیہ لیتے ہیں۔

ایک جاٹ نے کہا۔ کیوں چودھری کہیں ہیں کہ دیبی نے ایسا پرکاش کیا ہے اور ایسا چمت کار دکھایا ہے کہ ایک آدمی اپنے گھر کے اندر بیٹھ کر بات کرتا ہے یا گانا گاتا ہے تو ہزاروں کوس تک سب چھوٹے بڑے اس کی آواز کو اور بات کو سن لیتے ہیں۔

لال سنگھہ نے کہا۔ اس کو ریڈیو کہتے ہیں اس میں دیبی کی کوئی بات نہں ہے آکاش میں جو بجلی ہوتی ہے وہ آواز کو ہر جگہہ لے جاتی ہے۔ نئے لاٹ نے حکم دیدیا ہے اب یہ ہمارے گاؤں میں بھی لگ جائے گی۔ اور ہم بھی گھر بیٹھے ساری دُنیا کے گانے اور باتیں سُن لیا کریں گے۔

پھر لال سنگھہ نے کہا۔ لاٹ صاحب یہ چاہیں ہیں کہ گاؤں کے گریب (غریب) مانسوں (آدمیوں) کی سیوا کریں اور اس کارن انھوں نے ریڈیو بھی گاؤں درگاؤں لگانے کا حکم دیا ہے۔ وہ ہم کو اپنے گھر صاف رکھنے اور کپڑے اور بدن صاف رکھنے کی باتیں بتائیں گے اور کھیت کیار کی باتیں بھی بتائیں گے۔

ایک جاٹ بات کاٹ کر بولا۔ مگر لالہ لوگوں سے ہمارے کھیتوں اور گھروں اور ڈھور ڈنگر دں

کو بھی بچائیں گے یا نہیں۔ ہمیں تو سب سے زیادہ ان لالہ لوگوں کا دُکھ ہے۔
لال سنگھ نے جواب دیا۔ گھبراؤ نہیں سرکار سب سے پہلے تمہارے قرضہ کا فکر کرے گی۔ پھر گاؤں کے نائی کی طرف دیکھ کر کہا جو دُور بیٹھا باتیں سُن رہا تھا کیوں رے مکھن تو دلی کی اچھوت سبھا میں ہمارے گاؤں کے چوڑے چماروں کو بھی لے جانا چاہے ہے۔ یاد رکھیو اگر تو نے ان کو بگاڑا تو تجھے اس گاؤں میں رہنا مشکل ہو جائیگا۔
مکھن نائی نے کہا۔ نہیں چودھری تم سے یہ کسی نے جھوٹ کہا ہے اچھوت سبھا کے کوئی سادھو اچھوتانند آئے تھے وہ چوڑوں چماروں کو نیوتہ دے گئے ہیں میرے گھر بھی آئے تھے۔ میں نے کہا میں نائی ہوں عزت دار آدمی ہوں چوڑوں چماروں کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ چماروں نے بھی یہی جواب دیا کہ ہم چوڑوں کے ساتھ نہیں جائیں گے۔ ہاں مہتر سب جانے کو کہتے ہیں۔
یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک بھاٹ آگیا اور اس نے چودھری لال سنگھ کی تعریف میں گیت سُنانے شروع کئے۔ اور کہا۔ جب چودھری لال سنگھ کھاٹ پر بیٹھ کر حقہ ہاتھ میں لیتے ہیں تو بے جان حقہ ان کے ہونٹوں کے پاس جاکر بولنے لگتا ہے اور گڑگڑا کر کے اپنا دکھ ان کو سناتا ہے۔ اور وہ اس کا دکھ بھی ایسا ہی دور کرتے ہیں جیسے وہ اپنے گاؤں اور آس پاس کے سب گاؤں والوں کے دکھ دُور کرتے ہیں۔ ان کی کھاٹ لال قلعہ کا تخت ہے۔ وہ بھرت پور کے راجہ سورج مل کی اولاد ہیں جن کی آواز سُن کر شیر بھاگ جاتے تھے لال سنگھ کے گھر میں کبھی چولھا ٹھنڈا نہیں ہوتا دور دور کے کھانے والے ہر وقت جمع رہتے ہیں اور کھاتے ہیں۔
لال سنگھ بھاٹ کی یہ تعریف سُن کر خوش ہوئے اور حکم دیا کہ اس بھاٹ کو گڑ کی ایک بھیلی اور پانچ سیر گیہوں دیدو۔ اس کے بعد سب جاٹ چوپال سے چلے گئے اور گھروں میں جاکر سو گئے۔ اور دوسرے دن چودھری لال سنگھ نے لالہ سے فیصلہ کرا دیا۔

Marfat.com

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کی تقریر

کربلا کی آخری رات

جو ۹ محرم ۱۳۵۶ھ مطابق ۲۳ مارچ ۱۹۳۷ء کی رات کو ہوئی

آج محرم کی ۹ تاریخ ہے ہندوستان کی ہر چھوٹی بڑی آبادی میں اور دُنیا کے اُن سب مقامات پر جہاں مسلمان آباد ہیں۔ حضرت امام حسینؑ کے غم میں مجلسیں ہو رہی ہیں۔ تعزیوں کے جلوس نکل رہے ہیں۔ اور عورت مرد اور بچے کربلا کے دردناک واقعہ کو یاد کر کے رو رہے ہیں۔ جو لوگ محرم کی حقیقت کو نہیں جانتے اُن کو آگاہ کرنے کے لئے اتنا لکھ دینا کافی ہے۔ کہ کربلا ملک عراق یعنی مسوپٹیمیا میں شہر بغداد کے قریب فرات دریا کے کنارہ ایک مقام ہے۔ جہاں مسلمانوں کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سگے نواسہ حضرت امام حسینؑ کو اور ان کے ۷۲ ساتھیوں کو جن میں اُن کے بھائی اور بچے اور کنبہ دار اور غلام تھے۔ تین رات دن بھوکا پیاسا رکھ کر یزید کی فوج نے قتل کر دیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ حضرت امام حسینؑ نے یزید کو بادشاہ ماننے سے انکار کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ یزید اسلام کی تعلیم کے خلاف چلتا ہے اور یزید کو مسلمانوں کی عام رائے نے بادشاہ نہیں بنایا۔ بلکہ وہ زور اور طاقت سے رائے عامہ کے خلاف بادشاہ ہو گیا ہے اس لئے اس کی بادشاہت اسلام کے خلاف ہے۔

یزید امیہ کا پڑوتا تھا۔ اور حضرت امام حسینؑ امیہ کے سگے بھائی ہاشم کے پڑوتے تھے۔ گویا دونوں ایک دادا کی اولاد تھے۔ حضرت امام حسینؑ کے باپ حضرت علیؑ تھے۔ اور ماں حضرت فاطمہؑ محمد رسول اللہؐ کی بیٹی تھیں۔

یزید کی فوج کا سپہ سالار ابن سعد تھا۔ جو سعد وقاصؓ کا بیٹا تھا۔ اور سعد وقاص وہ مشہور سپہ سالار تھے جنہوں نے دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ کے حکم سے ایران فتح کیا تھا۔ حضرت امام حسینؑ کی بیوی

Marfat.com

شہنشاہ ایران یزدگرد کی بیٹی حضرت شہر بانو تھیں۔ جو مسلمانوں اور ایرانیوں کی لڑائی کے وقت ایران کے پایۂ تخت مدائن سے اپنے باپ شہنشاہ یزدگرد کے ساتھ مقام حلوان جا رہی تھیں کیونکہ مسلمانوں نے پایۂ تخت پر قبضہ کر لیا تھا۔ راستہ میں سعد وقاصؓ کے بھیجے ہوئے ایک افسر ابن عتبہ نے حضرت شہر بانو کو ان کی محافظ فوج کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ کیونکہ شہر بانو اپنے باپ کی فوج سے پیچھے رہ گئیں تھیں۔ اور ان کی محافظ فوج کم تھی۔

ابن عتبہ شہر بانو کو عزت کے ساتھ اسلامی سپہ سالار سعد وقاصؓ کے سامنے لایا۔ اور سعد وقاصؓ نے حضرت عمرؓ کے پاس ان کو مدینہ میں بھیج دیا۔ اور حضرت عمرؓ نے اُن کی شادی رسول اللہؐ کے نواسہ حضرت امام حسینؓ کے ساتھ کر دی۔

کربلا کی لڑائی میں حضرت امام حسینؓ کے سب بچے قتل ہو گئے۔ مگر شہر بانو کے ایک بیمار لڑکے زین العابدینؓ زندہ بچے تھے۔ ان ہی سے امام حسینؓ کی نسل چلی۔ جو ہندوستان میں سید کہلاتی ہے۔ اور باہر کے ملکوں میں شریف کے نام سے مشہور ہے۔

اسلامی دُنیا میں صرف ایران ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں شیعہ مسلمان بہت زیادہ ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت امام حسینؓ کی نسل شہنشاہ ایران یزدگرد کی بیٹی شہر بانو سے چلی تھی۔

سید بھی اس بات پر فخر کرتے ہیں۔ کہ ان کے دادا امام حسینؓ رسول اللہ کے نواسہ اور شہنشاہ ایران کے داماد تھے۔ اور ان میں عربی اور ایرانی خون شریک ہے۔

کربلا کی آخری رات کربلا کا خونی ڈرامہ ۱۰ محرم کو ہوا تھا۔ اور ۹ محرم کو آخری رات تھی۔ جب کہ امام حسینؓ اور اُن کے ۷۰ ساتھی ہزاروں یزیدیوں کے محاصرہ میں تین دن کے بھوکے پیاسے رات بھر جاگے تھے۔

اسی آخری رات کا ذکر ہے کہ عورت مرد نماز اور عبادت سے فارغ ہوئے تو پچھلی رات کو حضرت شہر بانو نے اپنی ایرانی لونڈی شیریں سے باتیں کرنی شروع کیں۔ شیریں نے کہا۔ کیوں بیوی وہ رات یاد ہے؟ جب کہ تمہارے والد شہنشاہ یزدگرد فوج کے ساتھ حلوان کی طرف جانے

Marfat.com

لگے تو تم کو میں نے بہت جگایا مگر تمہاری نیند ایسی غفلت کی تھی کہ تم نہ جاگیں اور مجبوراً ہمارے محافظوں کو شہنشاہ کا ساتھ چھوڑنا پڑا۔ اور وہ تمہاری حفاظت کے لئے حلوان نہ گئے اور شہنشاہ یہ کہہ کر چلے گئے کہ سونے دو۔ نہ جگاؤ۔ صبح جب بیدار ہو تو لے آنا۔ اور سورج نکلنے سے پہلے ابن عتبہ کی فوج نے ہم کو گھیر لیا اور ہمارے محافظوں کو مار ڈالا۔ اور ہم کو گرفتار کر لیا۔

شہر بانو نے جواب دیا۔ ہاں شیریں مجھے سب کچھ یاد ہے میری اُسی رات کی نیند نے میرے باپ اور میرے ملک کی عزت تباہ کر دی۔ اور میں قیدی بن کر سعد وقاصؓ کے پاس آئی۔ یہ وحشی اور جنگلی لوگ تھے۔ مگر انہوں نے شریف اور مہذب لوگوں کا سا برتاؤ کیا۔ اور ہم مسلمانوں کے شہنشاہ عمرؓ کے پاس مدینہ میں بہت آرام سے پہنچائے گئے۔ شیریں نے کہا۔ اور بیوی وہ بات بھی یاد ہے کہ جب ابن عتبہ کی فوج ہمارا سامان لوٹ رہی تھی۔ تو ان کو تمہارے محافہ کا جڑاؤ کام حیرت زدہ کر رہا تھا۔ اور وہ جواہرات کی چمک دمک کو اس طرح دیکھتے تھے گویا اُنہوں نے پہلے کبھی جواہرات نہ دیکھے تھے۔ شہر بانو نے جواب دیا۔ ہاں شیریں وہ میرے محافہ کی رنگ آمیزی اور مینا کاری کو جُھک جُھک کر دیکھتے تھے۔ اور عربی زبان میں خبر نہیں کیا کیا کہتے تھے۔

نامم } حضرت امام حسینؑ کی بہن حضرت زینب نے کہا۔ کیوں بانو اس رات اور آج کی رات میں کیا فرق ہے؟ شہر بانو نے جواب دیا۔ اُس رات میں شہنشاہ ایران کی بیٹی تھی۔ اور خالص ایرانی تھی۔ اور میرا نام شہ زن اور شہ ران تھا۔ اور آج کی رات میں مسلمانوں کے شہنشاہ اور رسولؐ کے نواسہ کی بیوی بھی ہوں اور مجھے عربوں سے رشتہ کا فخر بھی حاصل ہے۔ اور دُنیا میں جہاں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے اور جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں وہ سب اور ان کی عورتیں اور ان کے بچے مجھے اپنی ملکہ مانتے ہیں۔ اگر میرے باپ کی حکومت قائم رہتی تو میں صرف ایران کی شہزادی کہلاتی مگر آج ایران اور خراسان اور افغانستان اور مصر اور شام اور عراق اور حجاز وغیرہ سب ملکوں کی ملکہ ہوں۔ اور میرے شوہر پر ہر مسلمان عورت مرد اپنی نمازوں میں پانچوں وقت درود پڑھتا ہے۔ اور مجھ پر بھی کہ آل محمدؐ ہوں۔

Marfat.com

حضرت زینب نے پوچھا کیوں شہربانو اور شہ زن تم کو وہ وقت بھی یاد ہے۔ جب تم خلیفہ عمرؓ کے سامنے قید ہو کر آئی تھیں۔ اس وقت کی کوئی بات یاد ہو تو کہو۔ شہر بانو نے کہا۔ کہ ہم سب قیدیوں کی صف میں کھڑے تھے۔ اور میرے باپ کا خزانہ خلیفہ عمرؓ کے سامنے ڈالا جا رہا تھا۔ جب میرے باپ کے دربار کا فرش لایا گیا۔ تو جواہرات کی چمک سے ان سب کی آنکھوں میں چکا چوند ہو گئی۔ اور اس فرش کی تقسیم پر آپس میں بحث کرنے لگے۔ اور ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس قیمتی فرش کو کیوں کر تقسیم کریں۔ تو انہوں نے اس کو کاٹ ڈالا اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے بانٹ دیا۔ اور بعد میں مجھے معلوم ہوا۔ کہ اس فرش کا ایک ایک ٹکڑا بیس بیس ہزار اشرفی کو بکا۔ شیریں نے کہا اور بیوی وہ بھی یاد ہے کہ تمہارے باپ کی پوشاک ایک عرب کو پہنائی گئی تھی۔ شہر بانو نے کہا۔ ہاں۔ ابن رواحہ ایک عرب مسلمان کو میرے باپ کی شاہانہ پوشاک پہنائی گئی اور اس کے سر پر تاج رکھا گیا اور سب مسلمانوں نے دیر تک ابن رواحہ کو دیکھا۔ تب خلیفہ عمرؓ نے ایک عبرت ناک تقریر کی اور کہا دیکھو یہ زمانہ کا انقلاب ہے۔ خدا نے قرآن مجید میں کہا ہے۔ کہ خدا دُنیا میں اسی طرح انقلاب پیدا کرتا رہتا ہے۔ جو لوگ اس دُنیا اور اس کے کر و فر کے دھوکے میں آجاتے ہیں اور اس کی شان و شوکت پر مغرور ہو کر خدا کو اور انقلاب کو بھول جاتے ہیں۔ ان کا یہ انجام ہوتا ہے۔

پھر خلیفہ عمرؓ نے پہلے خلیفہ حضرت ابو بکرؓ کے بیٹے کو دس ہزار درہم دئے۔ اور عثمانؓ کو جو عمرؓ کے بعد خلیفہ ہوئے تھے۔ دس ہزار درہم دئے۔ اور میرے شوہر اور اُن کے بھائی کو بیس بیس ہزار درہم دئے۔

اور جب خلیفہ عمرؓ کے بیٹے عبداللہؓ نے اسی مجمع میں کہا۔ اے باپ مجھ کو بھی میرا حصہ دیجئے تو خلیفہ عمرؓ نے اپنے بیٹے کو ایک ہزار درہم دئے اور کہا ہر ایک کی خدمت کی موافق اس کو حصہ دیا جائیگا۔ اے شیریں مجھ پر خلیفہ عمرؓ کی اس بات کا بڑا اثر ہوا کہ وہ کیسا بے غرض بادشاہ ہے۔ کہ دوسروں کو زیادہ دیتا ہے اور اپنے بیٹے کو اتنا کم دیتا ہے۔

شیریں نے کہا اے بیوی وہ بھی سناؤ۔ جب کہ تمہارے زیورات اتارنے کا شورہ ہوا۔

شہر بانو نے کہا۔ہاں میرے بدن پر بہت قیمتی زیورات تھے۔اور ہجوم ان زیورات کو دیکھ رہا تھا۔آخر ایک شخص آگے بڑھا۔اور اس نے میرا زیور اُتارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔تو میں نے ایک دوہتڑ اس کے سینہ پر ماری اور کہا۔دور رہو میرے پاس سے میں ایران کے شہنشاہ کی بیٹی ہوں۔تو مجھ کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔تب ایک دوسرا آدمی مجھے کوڑا مارنے کے لئے آگے بڑھا۔تو میرے شوہر کے باپ علیؑ نے ڈانٹ کر کہا "خبردار ہاتھ نہ اُٹھائیو۔عورت پہ ہاتھ اُٹھانا اسلام میں جائز نہیں ہے۔پھر خلیفہ عمرؓ سے علیؑ نے خطاب کیا۔اور کہا اے عمرؓ مجھ سے رسولؐ اللہ نے فرمایا تھا۔کہ جب کسی قوم کا سردار ذلیل اور مغلوب ہو کر تمہارے پاس آئے تو تم اس کی عزت کرنا پس یہ لڑکی ایران کے شہنشاہ کی بیٹی ہے اس کی عزت ہم سب مسلمانوں پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی بموجب ضروری ہے۔

خلیفہ عمرؓ نے جواب دیا۔ہاں اے علیؑ تم سچ کہتے ہو میں اس لڑکی کی پوری عزت کروں گا۔اور اس کی شادی ایسے شخص سے کروں گا جو ہم سب کے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیارا ہے اور جس کو ہم نے دیکھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس کا مُنہ چومتے تھے۔اور اپنے کندھے پر بٹھاتے تھے۔اور اپنی زبان اس کے مُنہ میں دیتے تھے اور وہ تیرا بیٹا حسینؑ ہے اور ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام ہیں۔اور ان کے محبوب نواسہ کے بھی غلام ہیں۔اور رسولؐ اللہ کا پیارا نواسہ ہم سب کا آقا ہے۔اس کے بعد میرا حسینؑ بن علیؑ کے ساتھ نکاح کر دیا گیا۔

لڑائی } عورتیں یہ باتیں کر رہی تھیں کہ صبح کی نماز کا وقت ہو گیا۔اور سب نے نماز پڑھی۔پھر حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھی اور ان کے بھائی اور ان کے لڑکے لڑائی کے لئے ہتھیار لگا کر باہر میدان میں چلے گئے۔

شہر بانو کی لونڈی شیریں کا بیان ہے کہ اس دن گرمی بہت سخت تھی۔اور ہم سب پر دشمن نے پانی بند کر دیا تھا۔اور ہم نے تین رات دن سے پانی نہ پیا تھا۔اور بچے پیاس سے تڑپتے تھے شہر بانو کی گود میں ڈیڑھ سال کا ایک بچہ علی اصغر پیاس سے بہت روتا تھا۔دوپہر کو جب بہت سے آدمی قتل ہو چکے۔اور حسینؑ لڑائی کے میدان سے اپنے جوان بیٹے علی اکبرؑ کی لاش خیمہ میں لائے۔تو خیمہ

Marfat.com

میں عورتیں اس خوبصورت اٹھارہ سالہ جوان کو خون میں نہایا ہوا دیکھ کر رو رہی تھیں۔ اور علی اکبرؑ کی ماں ام لیلیٰ لاش کے سرہانے کھڑی کہہ رہی تھیں۔ دیکھو میرے دولہا کو اس کی چھاتی پر برچھی ماری ہے میرے اس لال کی شکل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کتنی مشابہ ہے۔ ان سنگ دل یزیدیوں نے میرے لال کو مارتے وقت یہ خیال بھی نہ کیا۔ کہ یہ اُن کے رسولؐ کا ہم شکل ہے۔

تو شہر بانو نے اپنے شوہر حسینؑ سے کہا۔ کہ دشمن کے لشکر کا سردار وقاصؓ فاتح ایران کا بیٹا عمر سعد ہے سعد وقاصؓ نے میری گرفتاری کے وقت میری عزت کی تھی۔ اس کا بیٹا بھی میری عزت کا خیال کریگا تم میرے اس دودھ پیتے بچہ کو لے جاؤ۔ اور کہو کہ اس بچہ نے یزید اور اس کی فوج کا کوئی گناہ نہیں کیا اس کا پانی کیوں بند کیا ہے۔ اس کو تو پانی دیدیں۔ حسینؑ نے جواب دیا میں اپنے دشمن سے کوئی چیز اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے نہیں مانگوں گا۔ ہاں حجت تمام کرنے کے لئے جاتا ہوں تاکہ دنیا دیکھ لے کہ میں مظلوم ہوں۔ اور دشمن ظالم ہے۔ یہ کہہ کر علی اصغرؑ کو گود میں لیا۔ اور عمر سعد کی فوج کے سامنے کھڑے ہوئے اور بلند آواز سے کہا۔ اے سعد وقاصؓ کے بیٹے یہ شہنشاہ ایران کا نواسہ اور میرا بیٹا ہے اور تین دن سے پیاسا ہے۔ کیا تم مسلمان ہو۔ اور کیا تم کو اسلام نے رحم اور بچوں سے ہمدردی نہیں سکھائی؟ یہ بچہ معصوم ہے اس کا پانی کیوں بند کیا ہے؟ اگر تمہارے اندر اسلام کے رحم کا کچھ بھی اثر ہے تو اس کا ثبوت دو۔ اور اس بچہ کو پانی پلا دو۔ یہ تقریر سُن کر ابن سعد تو خاموش کھڑا رہا۔ مگر اس کے ایک سپاہی نے ایک تیر بچے کی طرف چلایا۔ جس نے بچہ کے حلق کو چھید ڈالا۔ اور بچہ باپ کی گود میں تڑپ کر مر گیا۔ اور حسینؑ اس بچہ کی لاش کو گود میں لئے ہوئے خیمہ میں آئے۔ اور بچہ کی لاش شہر بانو کی گود میں دیدی شہر بانو نے خیال کیا کہ بچہ کو پانی دیدیا گیا ہے اور وہ سو گیا ہے۔ اس لئے انہوں نے خوش ہو کر کہا۔ کیا اس کو نیند آگئی؟ بہت پیاسا تھا۔ پانی پیتے ہی سو گیا۔ سعد وقاصؓ کے بیٹے نے اپنے باپ کی طرح شرافت کا ثبوت دیا۔ اور شہنشاہ ایران کے نواسہ اور علیؑ و فاطمہؑ بنت رسول اللہ کے پوتے کو پانی پلایا مگر جب انہوں نے بچہ کو گود میں لیا۔ اور اس کو خون میں نہایا ہوا دیکھا۔ اور اس کے سر کے لمبے لمبے بال خون میں تر دیکھے۔ تو بے اختیار اُن کے منہ سے ہائے نکلی۔ اور انہوں نے کہا۔ کاش میرا باپ زندہ

Marfat.com

ہوتا۔ اور اُس کی حکومت باقی ہوتی۔ اور کاش بچہ کا دادا زندہ ہوتا جس نے خلیفہ عمرؓ کے سامنے میری حمایت کی تھی۔ اور کاش میرا شوہر ایرانیوں کو خبر دیدیتا اور ان کو اپنی مدد کے لئے بلالیتا۔

میرا بچہ۔ میرا لال۔ ہائے اُس کو مار ڈالا۔ اس کو تیر کی نوک کا پانی پلایا۔ مجھے کیا خبر تھی یہ یزیدی ایسے سنگ دل ہیں۔ میں اس کو میدان میں نہ بھیجتی۔

امام حسینؓ نے کہا۔ بانو صبر کرو۔ خدا نے قرآن مجید میں کہا ہے کہ ہم آدمی کو جان و مال کے نقصان سے آزماتے ہیں۔ تاکہ معلوم ہو کہ آدمی حق اور سچائی کے کام میں ثابت قدم رہتا ہے یا نہیں؟ آج ہم سب نے دیکھ لیا۔ کہ دُنیا اور حکومت اور دولت کی حرص و ہوس نے ان مسلمانوں کی آنکھیں بند کر دی ہیں۔ اور عمرؓ خلیفہ دوئم نے ایران کی فتوحات کو سامنے دیکھ کر جو کچھ کہا تھا۔ کہ دولت آدمی کو غافل کر دیتی ہے۔ وہ ہو بہو سامنے نظر آ رہا ہے۔

میں حق اور صداقت پر قائم ہوں اور میرا دل ان سخت امتحانوں میں مضبوط ہے۔ تم بھی شہنشاہ ایران کی بیٹی ہو اور ایک بڑی مصیبت اپنے باپ کی بربادی کی برداشت کر چکی ہو آج بھی اس مصیبت میں صبر کرو۔

خیمہ کی لُوٹ ۔ دس محرم کی سہ پہر کو جب سب قتل ہو چکے اور حضرت امام حسینؑ بھی شہید ہو چکے تو ابن سعد کی یزیدی فوج حضرت امام حسینؑ کے خیمہ میں گھسی اور اس نے خیمہ کا سامان لوٹا۔ اور خیموں میں آگ لگا دی۔ اور عورتوں کے سروں سے چادریں بھی چھین لیں۔

لیکن جب ایک یزیدی سپاہی نے حضرت شہربانو کے سر سے چادر اتارنی چاہی۔ تو انہوں نے ڈانٹ کر کہا دور ہو۔ میں مسلمانوں کی ملکہ ہوں۔ میں شہنشاہ ایران کی بیٹی ہوں۔ خلیفہ عمرؓ کے سامنے جب تم نے میرا زیور لینا چاہا تھا تو علیؓ نے تم کو روکا تھا۔ آج تم نے علیؓ کی اولاد کو خاک و خون میں ملا دیا۔ تو کیا ہوا۔ علیؓ کا خدا میری حفاظت کرے گا۔ یہ سُن کر وہ دشمن ہٹ گیا۔ اور امام حسین کے بیمار لڑکے زین العابدینؑ کو قتل کرنے کے لئے آگے بڑھا۔

تب زینبؑ اور شہربانو دوڑیں۔ اور زین العابدینؑ کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ زینب نے کہا یہی ایک بچہ باقی رہ گیا ہے اس کو بھی مار ڈالو گے تو حسینؑ کی نسل ختم ہو جائے گی۔ ہم اس کو نہ مارنے دیں گے

Marfat.com

پہلے ہم کو مار ڈالو۔ تب اس بچہ کو مارو۔ ابن سعد نے کہا۔ اچھا چھوڑ دو۔ اور ان سب کو قید کر لو۔

سپاہیوں نے پہلے بیمار لڑکے زین العابدینؓ کے ہاتھوں میں رسی باندھی۔ پھر حسینؓ کی چھوٹی لڑکی سکینہ کے ہاتھوں میں رسی باندھی۔ پھر سب عورتوں کے ہاتھوں میں رسیاں باندھیں۔ اور جب شہر بانو کے ہاتھ میں رسی باندھنے لگے تو انہوں نے کہا۔ یاد کرو۔ اُس وقت کو جب تمہارے باپ سعد وقاصؓ نے مجھے گرفتار کیا تھا۔ تو میرے محافہ کا پردہ بھی نہ کھولا تھا۔ اور پوری عزت کے ساتھ مجھے خلیفہ عمرؓ کے پاس مدینہ میں لائے تھے۔ آج تم میری اتنی بے عزتی کیوں کرتے ہو۔ کیا اس لئے کہ میرا باپ نہیں ہے۔ اور میرے باپ کی حکومت نہیں ہے۔ اور میرے شوہر کو تم نے مار ڈالا ہے۔ اور میرا کوئی وارث باقی نہیں چھوڑا ہے۔ ڈرو خدا سے کہ وہ تمہارے اس ظلم کو دیکھ رہا ہے۔ ابن سعد نے کہا۔ تیرے شوہر نے یزید کی بادشاہی سے انکار کیا۔ اُس کو اس کی سزا ملی۔ اب تم سب کو یزید کے دربار میں لے جائیں گے یزید کے گورنر ابن زیاد کا حکم ہے۔ کہ حسینؓ کی عورتوں کو رسیاں باندھ کر اور بے چادر اونٹوں پر بٹھا کر بازاروں میں پھراؤ۔ تاکہ سب دیکھیں کہ بادشاہ وقت سے سرکشی کرنے والوں کا یہ انجام ہوتا ہے۔

چنانچہ سب عورتوں کو رسیاں باندھ کر ننگی پیٹھ کے اونٹوں پر سوار کیا گیا۔ اور بیمار لڑکے زین العابدینؓ کو بھی اونٹ پر اسی طرح سوار کیا گیا۔ اور کوفہ کے بازار میں جہاں یزید کے گورنر ابن زیاد کا پایہ تخت تھا پھرایا گیا۔ آگے آگے شہیدوں کے سر نیزوں پر تھے۔ اور پیچھے قیدیوں کے اونٹ تھے۔ اسی طرح یہ قیدی منزل بہ منزل دمشق میں پہنچائے گئے۔ جہاں یزید کا پایہ تخت تھا۔ یزید نے ان کو ایک تنگ و تاریک قید خانہ میں بند کر دیا۔ اور دوسرے دن اپنے سامنے بھرے دربار میں بلایا۔ امام زین العابدینؓ راستہ کی تکلیف اور گزشتہ بیماری کے سبب بہت کمزور ہو گئے تھے۔ عورتیں بھی یزید کے دربار میں صف بنا کر کھڑی کی گئیں۔ اور امام حسینؓ کا کٹا ہوا سر سونے کے ایک لگن میں یزید کے سامنے رکھا گیا۔ یزید نے اپنی چھڑی امام حسینؓ کے سر کے دانتوں کو لگائی۔ اور کہا۔ اس شخص کے دانت کس قدر خوب صورت تھے۔

یہ حالت دیکھ کر ایک مسلمان نے چیخ کر کہا۔ جو دربار میں کھڑا تھا۔ اے یزید اپنی چھڑی ہٹا کے

Marfat.com

خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تھا۔ کہ وہ اپنے اس نواسہ کے ہونٹوں اور دانتوں کو چومتے تھے۔ آج تو اس جگہ پر چھڑی مارتا ہے۔ تجھ کو شرم نہیں آتی۔

پھر زینب سے مخاطب ہو کر یزید نے کہا۔ دیکھا اپنے بھائی کی ضد کا انجام؟

زینب نے جواب دیا۔ ہاں دیکھا۔ اور اب اس ظلم کا انجام دیکھنا باقی ہے۔ جو میرے بھائی پر ہوا۔

پھر شہر بانو سے کہا تیرا خاوند چاہتا تھا کہ میرا ملک مجھ سے چھین لے۔ شہر بانو نے جواب دیا۔ ملک کا مالک اللہ ہے۔ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ تو ایران پر بھی قابض ہے۔ مگر ایران میرے باپ کا ملک تھا۔ اور اس کی حکومت میرے شوہر کا حق تھی۔ جس پر تو نے ناحق قبضہ کر لیا ہے۔

پھر یزید نے امام زین العابدینؓ سے کہا۔ تیرے باپ سے میری قرابت تھی۔ میں اور وہ ایک دادا کی اولاد ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ تیرے باپ کو قتل کیا جائے۔ یہ ابن زیاد گورنر کوفہ کی زیادتی ہے۔ کہ اس نے تیرے باپ کو مار ڈالا۔

اے لڑکے حکومت کا یہی دستور ہوتا چلا آیا ہے کہ اُس کے لئے ماں باپ اور اولاد اور کنبہ والوں کی رعایت نہیں کی جاتی۔ پس جو کچھ ہوا حکومت کے لئے ہوا۔ اب میں تم کو آزاد کرتا ہوں جاؤ تم مدینہ میں جا کر رہو۔ اگر تم نے بھی اپنے باپ کی طرح میری حکومت کا مقابلہ کیا تو میری تلوار تم کو ٹھیک کر دیگی۔ ورنہ تم ہمیشہ امن سے زندگی بسر کرو گے۔ امام زین العابدین نے جواب دیا تیرے باپ نے جو کچھ کیا حق کیا۔ اور حق کے لئے کیا۔ اور حق ادا کر دیا۔ اور میں نے بھی ناحق کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ آئندہ وہی ہوگا جو حق کے حامی خدا کو منظور ہوگا۔

تبلیغی مرثیے

حضرت خواجہ حسن نظامی کے لکھے ہوئے تبلیغی مرثیوں کا مجموعہ جو نثر میں ہیں اور کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکے ہیں ہر محرم میں یہ مرثیے ہزاروں کی تعداد میں بک جاتے ہیں۔ قیمت ایک آنہ

ملنے کا پتہ:۔ دفتر اخبار منادی دہلی

Marfat.com

بہادر شاہ کے حلال خور کا قصہ

جو ۸ر اپریل ۱۹۳۷ء کو حضرت خواجہ حسن نظامی نے ریڈیو میں سنایا

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے چند سال پہلے کا ذکر ہے کہ آخری مغل شہنشاہ ابو ظفر بہادر شاہ لال قلعہ کے دیوان خاص میں بیٹھے تھے۔ کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب کے حاضر ہونے کی خبر چوب دار لایا۔ جہاں پناہ نے فرمایا حکیم جی کو آنے دو۔

بادشاہ دیوان خاص کے برابر والے دالان میں مسند تکیہ سے لگے بیٹھے تھے۔ سامنے پیچوان حقہ رکھا تھا اور قریب ہی ملکہ زینت محل بیگم صاحبہ بیٹھی تھیں۔

حکیم صاحب بادشاہ کے سامنے آئے تو جھک گئے اور سات دفعہ فرش کو ہاتھ لگا کر سلام کیا بادشاہ نے فرمایا آؤ حکیم جی رات کو مجھے نیند نہیں آئی۔ ذرا نبض تو دیکھو۔

حکیم صاحب نے پھر سلام کیا اور ادب سے نبض دیکھنے کو ہاتھ بڑھایا۔ اور نبض دیکھی۔ پھر نسخہ تجویز کیا۔ اور اُسی وقت چوب دار شاہی دواخانے سے دوا لے آیا۔ جس کو پہلے حکیم صاحب نے خود کھایا۔ تاکہ بادشاہ کو یہ شبہ نہ ہو کہ دوا میں کوئی زہریلی چیز ملی ہوئی ہے۔ اس کے بعد بادشاہ کے سامنے دوا پیش کی۔ بادشاہ نے دوا کھا کر فرمایا۔ حکیم جی تم نے سُنا۔ میرے حلال خور درباری نے اپنے لڑکے چندہ کا پیغام ریزیڈنٹ کے حلال خور کی لڑکی کے لئے بھیجا تھا۔ مگر اس نے جواب دیا کہ وہ عیسائی ہو گیا ہے۔ اس واسطے اپنی لڑکی چندہ کو نہیں دے سکتا۔ ہاں اگر چندہ بھی عیسائی ہو جائے تو شادی کر دی جائے گی۔

حکیم صاحب نے دست بستہ ہو کر یعنی دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ حضور فدوی نے بھی یہ حال سُنا تھا۔ اور درباری حلال خور سے تفصیلی حالات بھی معلوم کئے تھے۔ واقعہ اسی طرح ہے جس طرح جہاں پناہ نے ارشاد فرمایا۔

Marfat.com

بادشاہ نے کہا۔ تو تم ریزیڈنٹ کے حلال خور کو سمجھا دو کہ وہ شاہی حلال خور کا پیغام رد نہ کرے کیونکہ اس سے ما بدولت کی توہین ہوتی ہے۔ کہ ہمارے حلال خور کے لڑکے کا پیغام رد کر دیا گیا۔ پھر ارشاد کیا۔ کہ اچھا چوب دار جائے اور درباری کو بلا لائے۔

تھوڑی دیر میں درباری حاضر ہوا۔ لال مخمل کا چوغہ پہنے ہوئے۔ سر پہ مندیل (پگڑی) بندھی ہوئی اور اس میں مور کا پر لگا ہوا۔

دور سے اُس نے فارسی کے اشعار پڑھ کر بادشاہ کو دعائیں دیں۔ اور دونوں ہاتھ باندھ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔

بادشاہ نے حکیم جی کو اشارہ کیا۔ اور حکیم صاحب نے پوچھا۔ کیوں درباری تیرے لڑکے کا پیغام ریزیڈنٹ کے حلال خور کے ہاں کب گیا تھا۔ اور اُس نے کیا جواب دیا تھا؟

درباری حلال خور نے کہا۔ جان کی امان پاؤں تو جو گزری ہے حرف بہ حرف پیش کر دوں۔ حکیم صاحب نے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ بادشاہ نے ہوں کر دی۔ حکیم صاحب نے کہا جہاں پناہ نے تیری جان تجھ کو بخشی۔ کہہ جو تو کہنا چاہتا ہے۔

درباری ذرا آگے بڑھا اور دونوں ہاتھ جوڑے۔ کمر اور گردن کو ذرا جھکایا پھر کہنے لگا۔ اقبال و جلال جہاں پناہ تا ابد قائم رہے۔ کمترین کو خبر نہ تھی کہ ریزیڈنٹ کا مہتر کرسٹان ہو گیا ہے غلام زادہ چندہ نے اُس کی لڑکی کو کسی شادی میں دیکھ پایا تھا۔ گھر میں آیا تو اوٹی کھٹوٹی لے کر پڑ گیا اُس کی ماں نے بہت پوچھا نہ بتایا۔ مجھے خبر ہوئی۔ میں گھبرایا ہوا گیا۔ اُس کے سر کو اپنے زانو پہ رکھا پیار کیا۔ اور حال پوچھا۔ مگر اس نے مجھ سے بھی دل کی بات نہ کہی۔ آخر اس کے ایک ہم جولی لڑکے کو بلایا۔ جو شادی میں ساتھ گیا تھا۔ اور الگ لے جا کر ماجرا دریافت کیا تو اُس نے کہا چندہ نے بنا کی لڑکی لالی کو دیکھا ہے۔ اور ایک دل ہزار جان سے اُس پہ فریفتہ ہو گیا ہے اور کہتا ہے کہ جب تک لالی سے شادی نہ ہو گی نہ دانہ کھاؤں گا نہ پانی پیوں گا۔

یہ خبر سنکر فدوی بنا حلال خور کے پاس گیا۔ اور اُس سے چندہ کے رشتہ کی بات کی۔ بنا نے

Marfat.com

پوچھا چندہ نے کچھ پڑھا ہے۔ فدوی نے جواب دیا۔ ہاں گلستان بوستان تک تعلیم پائی ہے اُستاد ذوق سے غزل میں اصلاح لی ہے۔ میرا ایک ہی بچہ ہے۔ اس کے سوا نہ کوئی لڑکا نہ لڑکی بنّا نے میری تنخواہ پوچھی۔ میں نے جواب دیا۔ جہاں پناہ کے صدقہ سے خدا نے سب کچھ دیا ہے۔ ایک روپیہ مہینہ تنخواہ ہے۔ عید بقر عید اور نوروز پر طلائی کڑے اور جوڑے ملتے ہیں۔ ہر مہینہ شاہی مسہل کے وقت چاندی کے کڑے اور دوشالہ مرحمت ہوتا ہے اور روزانہ دہلی شہر کے نیارئیے جو سونے چاندی کو صاف کرنے کا کام کرتے ہیں وہ شاہی پاخانہ سات روپے کا روزانہ خرید کرلے جاتے ہیں۔ کیونکہ حضور جہاں پناہ معجونوں میں جو طلائی ورق نوش فرماتے ہیں۔ وہ سونا نیارئے پاخانہ سے نکال لیتے ہیں۔ اور اس وقت میرے گھر میں دو لاکھ روپے کے کڑے موجود ہیں۔ اور دو لاکھ روپے کے جوڑے اور دوشالے بھی جمع ہیں بنّا نے کہا۔ مگر تمہاری تنخواہ تو بہت کم ہے یہ انعام اکرام تو عارضی ہیں۔ تنخواہ اصل چیز ہے اور وہ فقط ایک روپیہ ماہوار ہے۔ مجھے ریزیڈنٹ صاحب بہادر ۵ روپے مہینہ دیتے ہیں اور بڑے دن پر ایک پرانا کوٹ پتلون اور ۲ روپے نقد بھی دیتے ہیں۔ اس واسطے میں اپنی لڑکی لالی کا رشتہ تمہارے لڑکے سے نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ تم لال بیگی حلال خور ہو۔ اور میں عیسائی ہوگیا ہوں۔ میرا تمہارا رشتہ کیونکر ہوسکتا ہے۔

اس کے بعد شاہی حلال خور نے رو کر کہا۔ بس حضور یہ قصہ اس فدوی کا ہے جس دن سے یہ انکار ہوا ہے چندہ کی حالت غیر ہے۔ نہ کھانا ہے نہ سونا۔ بس اُس کو رات دن رونا ہے چہرہ زرد ایسا کہ ہلدی کھنڈی ہوئی ہے۔ ہونٹ خشک ہیں ہر وقت ٹھنڈے سانس لیتا ہے۔ میری اور اپنی ماں کی جان کھوتا ہے۔

جہاں پناہ نے حکیم صاحب کو پھر کچھ اشارہ کیا! اور حکیم صاحب نے درباری سے کہا۔ جاؤ بادری میں بنّا کو بلا کر ابھی رشتہ کا انتظام کردیتا ہوں۔

چنانچہ حکیم صاحب نے بنّا کو بلا کر سمجھایا۔ اور ریزیڈنٹ صاحب کو بھی لکھا۔ اور انہوں نے

Marfat.com

بھی اپنے حلال خور کو رشتہ کی فہمائش کی اور منگنی قرار پائی۔

چند مہینے کے بعد کا ذکر ہے کہ ایک دن چندہ اُستاد ذوق کے پاس گیا اور کہا کہ دلّی کے سب نوجوان لڑکے علم مجلسی سیکھنے کو طوائفوں کے ہاں جاتے ہیں اس لئے میں نے بھی جوئی طوائف کے ہاں نشست کی اطلاع بھیجی تھی اُس نے جواب دیا۔ کہ حلال خور کا لڑکا امرا اور شرفا کے ساتھ کیونکر بیٹھ سکتا ہے۔

اُستاد ذوق نے کہا۔ تو جب اپنے باپ کا کام نہیں کرتا۔ اور پاک صاف رہتا ہے اور عملاً مسلمان ہے تو تجھ کو اعلیٰ مجلسوں میں جانے سے کون روک سکتا ہے۔ میں جوئی کو کہلا بھیجوں گا۔

چنانچہ اُستاد ذوق نے جوئی کو کہلا بھیجا۔ اور چندہ جوئی کے ہاں جانے لگا۔

ریزیڈنٹ کے حلال خور بنا کی لڑکی لالی جوئی کے ہاں کماتی تھی یعنی جوئی کے ہاں صفائی کا کام کرتی تھی۔ مگر چندہ چونکہ شام کے وقت جوئی کے ہاں جاتا تھا۔ اور لالی صفائی کے لئے صبح جاتی تھی۔ اس لئے کبھی لالی نے چندہ کو جوئی کے ہاں نہ دیکھا تھا۔ اور جوئی کو بھی خبر نہ تھی کہ لالی کا رشتہ چندہ سے ہو چکا ہے۔

ایک دن صبح کے وقت لالی کمانے آئی تو اُس نے ہنس کر جوئی سے کہا کیوں بی کبھی تم کو کسی سے محبت بھی ہوئی ہے۔ جوئی نے کہا۔ ہم بازاری لوگ ہیں۔ محبت ہمارے ہاں کہاں ہم تو فرضی محبت کی باتیں بنا کر لوگوں کو فریب دیتے ہیں۔ ہاں ایک حلال خور زادہ چندہ کی صورت اور آواز مجھے بہت پسند ہے جب وہ یہاں دوستوں میں بیٹھ کر غزل پڑھتا ہے یا گاتا ہے تو میں اپنا گانا بھی بھول جاتی ہوں۔ غضب کی آواز اُس نے پائی ہے۔ اور خوش کلامی کا تو یہ عالم ہے کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ جب سے چندہ نے یہاں آنا شروع کیا ہے میرا دل ہر وقت بے قرار رہتا ہے۔ مگر میں اپنی محبت ظاہر نہیں کر سکتی کیونکہ یہ بات دستور اور رواج کے خلاف ہے۔ ہم بازاری عورتوں کے ہاں جو لڑکے علم مجلسی سیکھنے آتے ہیں اُن سے کوئی بازاری عورت ناجائز تعلق نہیں کر سکتی۔ نہ لگاؤ کے اشارہ کنایہ کی بات ہی کر سکتی ہے۔ ورنہ پھر ہمارے ہاں

شرفا ماد سے کبھی بھی نہ آئیں۔ کیونکہ یہ بات بہت معیوب ہے اور ہم سب لوگ دستور اور رواج کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتے۔

چندہ کا نام سن کر لالی شرما گئی۔ اور چپ ہو گئی۔ جوئی نے حیران ہو کر کہا۔ کیا تو چندہ کو جانتی ہے لالی نے کہا۔ ہاں اس سے میری منگنی ہو چکی ہے۔ یہ بات سن کر جوئی دل میں جل گئی۔ مگر اس نے ظاہرداری کا سو کھا منہ بنا کر کہا۔ کہ لالی تو بڑی خوش نصیب ہے۔

دوسرے دن جب لالی جوئی کے ہاں آئی تو جوئی نے اس کو مٹھائی دی۔ اور کہا رات کو چندہ یہ مٹھائی لایا تھا۔ میں نے بھی کھائی تو بھی کھائیو۔

لالی وہ مٹھائی لے کر گھر گئی اور اس نے وہ مٹھائی کھائی۔ کھاتے ہی اس کو قے ہوئی اور تھوڑی دیر میں دو چار قے ہونے کے بعد مر گئی۔ کیونکہ جوئی نے زہر ملا کر مٹھائی دی تھی۔

لالی کے مرنے کی خبر دربار ی اور چندہ کو بھی ہوئی تو چندہ نے اپنا گریبان پھاڑ ڈالا۔ اور بہت رویا۔ اور پھر روزانہ لالی کی قبر پر جا کر رویا کرتا تھا۔ اور غم کے گیت گایا کرتا تھا۔

لالی کی قبر ایک نالہ کے کنارے تھی۔ برسات میں سیلاب آیا تو قبر نالہ میں گر پڑی۔ اور لالی کی ہڈیاں نالہ کے ایک غار میں دب گئیں۔

اس زمانہ میں برف کا رواج نہ تھا۔ اس لئے کمہار لوگ سردی کے موسم میں جب اولے برستے تھے تو جہاں اولے جمع ہوتے تھے وہاں سے مٹی اٹھا کر لاتے تھے اور برتن بناتے تھے اور گرمی کے موسم میں بڑی بڑی قیمتوں پر وہ برتن فروخت کرتے تھے۔ کیونکہ اولوں کی مٹی کے برتنوں میں پانی بہت ٹھنڈا ہوتا تھا۔

ایک شام کا ذکر ہے۔ چندہ حلال خور جوئی کے مکان میں بیٹھا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔ کالی گھٹا آسمان پر چھائی ہوئی تھی۔ بادل گرج رہا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی۔ چندہ نے جوئی سے کہا آج تو شراب پینے کا دن ہے جوئی نے یہ سن کر اپنے نوکر سے کہا۔ جا کمہار کے ہاں جا۔ اور اولوں کی مٹی کے بنے ہوئے برتن خرید لا۔ کیونکہ شراب اولوں کی مٹی کے بنے ہوئے برتنوں میں بہت

Marfat.com

اچھی معلوم ہوگی۔

نوکر بازار گیا۔ اور آدمیوں کی مٹی سے بنی ہوئی ایک صراحی اور دو چار جام یعنی آبخورے خرید لایا۔ جوئی نے اُن کو دھویا۔ اور پانی ملا کر شراب صراحی میں بھری اور ایک جام بھر کر چندہ کو دیا۔ چندہ نے جام اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ مگر اُس نے ایک گھونٹ بھی شراب کا نہ لیا تھا کہ ایک غیبی آواز مکان کی چھت سے آئی اور اُس آواز نے یہ شعر پڑھا۔

پس مردن بنائے جائیں گے ساغر مری گِل کے لب جاں بخش کے بوسے ملیں گے خاک میں مل کے

اِس آواز کو سُن کر جوئی نے گھبرا کر کہا۔ یہ تو لالی کی آواز ہے۔ لالی کا بھوت آیا۔ میں نے لالی کو زہر دیا تھا۔ لالی کا بھُوت مجھ سے بدلہ لینے آیا ہے۔ یہ کہہ کر جوئی غش کھا کر گر پڑی اور تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ کیونکہ اُس کے دل پر خوف اور خون اور بھوت کا وہم اتنا زیادہ ہوا تھا کہ وہ اُس کو برداشت نہ کر سکی۔

چندہ بھی یہ آواز سُن کر نیم دیوانہ ہو گیا۔ اور جام کو ہاتھ میں لئے ہوئے دیوانہ وار لالی کی قبر پہ چلا گیا۔ اور وہاں بیٹھ کر لالی کا شعر گانے لگا۔ یعنی وہی شعر جو غیبی آواز سے سُنا تھا گاتا تھا اور کہتا تھا کہ میری لالی کے ہونٹوں کی مٹی سے یہ جام بنا۔ اور اُس کے ہونٹ مرنے کے بعد میرے ہونٹوں تک آ گئے۔

درباری نے اپنے لڑکے چندہ کا بہت علاج کرایا۔ مگر اس کے جنون میں کمی نہ ہوئی اُس کا معمول تھا کہ روز سویرے لالی کی قبر پر چلا جاتا تھا۔ اور دن بھر وہاں گاتا تھا اور روتا تھا۔ یہاں تک ۱۸۵۷ء کا بلوہ ہوا اور مئی ۱۸۵۷ء سے ستمبر ۱۸۵۷ء تک دہلی میں جل چل رہی آخر ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب انگریزی فوج دہلی میں داخل ہوئی اور دہلی کے باشندے شہر چھوڑ کر بھاگے تو لوگوں نے دیکھا کہ چندہ لالی کی قبر پر بیٹھا ہے۔ اکتارہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ اور حضرت حافظ شیرازی کا یہ شعر گا رہا ہے اور اکتارہ بجا رہا ہے۔

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

بھاگنے والوں نے چندہ کو آواز دی کہ ارے او چندہ بھاگ گوروں کی فوج آرہی ہے وہ تجھ کو مار ڈالیں گے۔

چندہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔ جاؤ جاؤ تم زندہ ہو تو اپنی جان بچاؤ۔ میں تو مر چکا ہوں جس دن میری لالی مری اُسی دن میں مرا۔ پھر مرا ہوا آدمی اپنی جان کیا بچائے گا۔ اور مرے ہوئے کو کون مارنے آئے گا۔

بس یہ تھا گزشتہ زمانہ کی ایک صحبت کا حال جیتے رہے تو ۲۲ اپریل کو ایسی ہی ایک کوئی اور سنائیں گے۔

حلال خور

یہ مشہور کتاب حضرت خواجہ حسن نظامی کی لکھی ہوئی ہے اسی صفحے ہیں اس میں تمام ہندوستان کے ہندو مسلمان حلال خوروں کی تاریخ اور نہایت دلچسپ واقعات درج ہیں۔ قیمت صرف آٹھ آنے (۸/)

ملنے کا پتہ:۔۔ دفتر اخبار منادی دہلی

Marfat.com

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کی ریڈیو تقریر
۲۳ اپریل غدر سے پہلے کے چند ۱۹۳۷ء

دِلّی والوں کے حُلیئے

ستّر اسّی برس پہلے کے زمانہ کی صحبتوں کا ایک قصہ پہلے سُنا چکا ہوں۔ آج بہادر شاہ بادشاہ کے زمانہ میں جو مشہور لوگ دلی میں رہتے تھے اُن کا قصہ سناتا ہوں۔ جس سے اُن کی صورتوں اور لباسوں کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جائے گا۔ اس بیان میں کچھ تو میری ذاتی معلومات ہے اور کچھ جناب میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی کی کتاب آخری شمع سے اقتباسات ہیں جنہوں نے بڑی محنت کر کے بہت سے حلیے مشاہیر کے کتاب مذکور میں جمع کئے ہیں۔ اور جو بالکل سچے اور ٹھیک ہیں بہادر شاہ کا میانہ قد۔ دُبلا بدن۔ لمبوترا چہرہ۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں اوبھری ہوئی۔ لمبی گردن۔ پتلی ستواں ناک۔ بڑا دہانہ۔ گہری سانولی رنگت۔ سر منڈا ہوا۔ چھدری ڈاڑھی جو کلّوں پر بہت کم۔ ٹھوڑی پر ذرا زیادہ۔ لبیں کتری ہوئی۔ ستر برس کی عمر میں بھی ڈاڑھی کے کچھ بال کالے تھے۔ چہرہ پر جھرّیاں تھیں۔ مگر آواز میں مرتے دم تک کرارہ پن رہا بولتے تھے تو سُننے والا مرعوب ہو جاتا تھا۔

بھئی اماں تکیہ کلام تھا یعنی جب کسی سے بات کرتے تھے تو اماں کہہ کر بات شروع کرتے تھے جو ارے میاں کا مخفف تھا۔ جیسے کہ آجکل لکھنؤ کی بول چال ہے۔

لباس کم خواب کا پاجامہ جس کے پائنچے ایک بَر کے ہوتے تھے یعنے ڈھیلا پاجامہ پہنتے تھے جس کی موریاں نہ غرارہ دار کی طرح زیادہ ڈھیلی تھیں نہ تنگ پاجامہ کی طرح چُست۔ گرمیوں میں سفید ڈھاکہ کی ململ کا کرتہ۔ اس پر جامہ دار کی خفتان جس کو مغلوں کا چوغہ کہنا چاہئے۔ سر پر کارچوبی چوگوشیہ ٹوپی جو آج تک شہزادوں میں پہنی جاتی ہے۔

Marfat.com

بہت تیز چلتے تھے۔ شاہانہ وقار کے سبب بولتے کم تھے ہونوں کے اشارہ سے اکثر باتیں سنتے تھے دوسروں کے سامنے ہنستے نہ تھے۔ ہنسی کی بات ہوتی تو منہ پر رومال رکھ لیتے تھے اور یہ رواج اس زمانہ میں عام تھا۔ اور اُردو میں محاورہ ہوگیا تھا کہ وہ منہ پر رومال رکھ کر ہنسے یعنی ان کو بہت زیادہ ہنسی آئی۔

میرزا فخرو } بہادر شاہ کے آخری ولی عہد تھے غدر سے ایک سال پہلے مر گئے تھے فخر الدین نام تھا۔ فتح الملک لقب تھا۔ وہابی عقیدہ تھا۔ باپ یعنی بہادر شاہ کی صورت سے بہت مشابہ تھے یعنے جو حلیہ بہادر شاہ کا تھا وہی ان کا تھا فرق صرف جوانی اور بڑھاپے کا تھا۔ ان کی شادی میرزا الٰہی بخش صاحب کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ ان کے دو لڑکے تھے میرزا خورشید عالم اور میرزا فرخندہ جمال میرزا فرخندہ جمال کے دو لڑکے زندہ ہیں۔ بڑے میرزا احمد شاہ خزانہ دہلی کے دفتر میں ہیڈ کلرک ہیں۔

حکیم احسن اللہ خاں } بہادر شاہ بادشاہ کے طبیب خاص اور مشیر خاص گورا رنگ سفید بھری ہوئی ڈاڑھی گول چہرہ اس میں چیچک کے کچھ داغ آنکھوں میں ذہانت کی چمک سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنتے تھے۔ بادشاہ کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔

اُستاد ذوق } محمد ابراہیم نام تھا بہادر شاہ کے اُستاد تھے کابلی دروازہ کے پاس مکان تھا بہت چھوٹا سا صحن جس میں پلنگ بچھانے کی جگہ بھی مشکل سے ہوگی۔ صحن میں بان کی کھری چارپائی پر بیٹھے حقہ پیا کرتے تھے۔ میانہ قد۔ رنگ گہرا سانولا چہرہ پر چیچک کے داغ بہت تھے آنکھیں بڑی بڑی اور روشن نگاہیں تیز۔ چہرہ کا نقشہ کھڑا کھڑا۔ سفید تنگ پاجامہ۔ سفید کرتا۔ اور سفید انگرکھا پہنتے تھے۔ سر پر ململ کی ٹوپی گول چندوے کی اوڑھتے تھے۔ اُن کا مزار قدم شریف میں کلو بخشو کے تکیہ میں ہے جس کو حکیم حاجی عبدالحمید صاحب مالک دواخانہ ہمدرد دہلی نے ابھی حال میں بنوا دیا ہے۔

مرزا غالب } نواب اسد اللہ خاں مرزا نوشہ غالب نسل کے ترک بہت حسین اور خوش رو آدمی تھے قد اونچا اور ہاڑ بہت چوڑا چکلا۔ موٹا موٹا نقشہ سرخ و سپید رنگ پچاس برس کی عمر

میں آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے تھے ڈاڑھی بھری ہوئی تھی مگر گھنی نہیں تھی۔ سر منڈاتے تھے اس پر سیاہ پوستین کی ایک لمبی ٹوپی پہنتے تھے۔ جو کلاہ پاپاخ سے ملتی جلتی تھی۔ ایک برکا سفید پاجامہ اور سفید ململ کا انگرکھا اس پر ہلکے زرد رنگ کی جامہ وار کا چوغہ پہنتے تھے۔

نواب نیر ریاست لوہارو کے رئیس نواب ضیاء الدین احمد خاں نام۔ اردو شاعری میں تخلص رخشاں اور فارسی میں نیر مرزا غالب کے خلیفہ خاص تھے۔ چھوٹا قد۔ گورا رنگ۔ نازک نازک نقشہ غلافی آنکھیں چگی ڈاڑھی۔ چھریرا بدن ایک برکا سفید پاجامہ اور سفید ہی انگرکھا پہنتے تھے قالب چڑھی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی اوڑھتے تھے ایک بڑا شالی رومال سموسہ بنا کر شانوں پر ڈالتے تھے

نواب علائی لوہارو کے نواب صاحب کے ولی عہد تھے۔ میانہ قد۔ گندمی رنگ موٹا موٹا نقشہ۔ گول چہرہ۔ شربتی آنکھیں اور گھنی اور چڑھی ہوئی ڈاڑھی ٹخنے کا تنگ مہری کا پاجامہ۔ سفید جامدانی کا انگرکھا اس پر سینہ کھلی ہوئی سیاہ مخمل کی نیمہ آستین اور سر پر سیاہ مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی اوڑھتے تھے۔ غدر سے پہلے ایک انگریز کو مارنے کی سزا میں پھانسی پائی تھی۔

مولانا صہبائی امام بخش نام تھا صہبائی تخلص کرتے تھے۔ چیلوں کے کوچہ میں رہتے تھے کالج میں پڑھاتے تھے۔ کھلا ہوا گندم گوں رنگ منہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ سر پہ پٹھے۔ بدن دبلا پتلا ایک برکا سفید پاجامہ اور سفید انگرکھا پہنتے تھے۔ اوپر کشمیری کام کا چوغہ ہوتا تھا اور سر پہ چھوٹا سا سفید عمامہ باندھتے تھے مرزا غالب کے خاص دوستوں میں تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں قتل ہوئے کیونکہ کوچہ چیلاں کے سب مرد جمنا دریا کے کنارے قتل کئے گئے تھے۔ مرزا غالب نے اپنے خطوط میں صہبائی کے مارے جانے کا جگہ جگہ دردناک الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

حکیم سید مومن خاں حضرت خواجہ میر درد کے خاندان میں تھے ان کے جداعلیٰ نواب خان دوراں خاں پانی پت کے میدان میں نادر شاہ ایرانی کی فوج کے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے اور دوسرے دادا نواب روشن الدولہ نے چاندنی چوک دہلی میں سنہری مسجد بنوائی تھی جس کے اندر بیٹھ کر نادر شاہ نے دلی والوں کے قتل عام کا حکم دیا تھا اور تین لاکھ ہندو مسلمان

Marfat.com

قتل ہوئے تھے اور آصف جاہ نظام اول نے نادر شاہ سے کہہ سُن کر دلی والوں کو امن دلایا تھا

حکیم مؤمن خاں حکیم آغا جاں کے چھتے کے سامنے رہتے تھے۔ کشیدہ قامت سرخ و سپید رنگ بڑی بڑی روشن آنکھیں لمبی لمبی پلکیں کھنچی ہوئی بھویں۔ لمبی ستواں ناک۔ پتلے پتلے ہونٹ ان پر پان کا لاکھا جما ہوا مسی آلودہ دانت ہلکی مونچھیں خشخاشی ڈاڑھی بھرے بھرے بازو پتلی کمر۔ چوڑا سینہ لمبی لمبی انگلیاں سر پر گھونگروالے لمبے لمبے بال پشت اور شانوں پر بکھرے ہوئے۔ کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کانوں کے آس پاس کنپٹیوں پر بچھو کی ڈنک کی طرح مڑی ہوئی بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا جس کے نیچے کرتا نہ ہوتا تھا۔ اس لئے جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ ڈالے رہتے تھے اور اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ لٹکا رہتا تھا۔ کاکریزی رنگ کے ڈوپٹہ کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیتے تھے اور اس کے دونوں بھرے سامنے لٹکا لیتے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت رکھتے تھے۔ پاؤں میں سُرخ گلبدن کا پاجامہ مہریوں پر سے تنگ اور پر جا کر کسی قدر ڈھیلا کبھی کبھی ایک بر کا پاجامہ بھی پہنتے تھے مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ چوڑا سُرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئی جو کبھی لٹکی رہتی تھیں اور کبھی اُلٹ کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پر گلشن کی دو پلڑی ٹوپی اس کے کنارے پر باریک لیس ٹوپی اتنی نیڑی ہوتی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آجاتی تھی مگر اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے اور نظر آتے تھے۔

مفتی صدر الدین خاں گداز جسم سانولا رنگ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئی۔ بھری ہوئی ڈاڑھی۔ بدن پر ایک بر کا سفید پاجامہ سفید کرتہ اور سفید ہی عمامہ۔ ٹیا محل کے پاس ان کا مکان اب بھی موجود ہے جو خان بہادر نواب ابوالحسن خاں صاحب کے قبضہ میں ہے

نواب شیفتہ مصطفےٰ خاں نام تھا۔ شیفتہ تخلص تھا ان کے بیٹے نواب اسحاق خاں صاحب رام پور کے وزیر اور علی گڑھ کالج کے سکریٹری تھے اور اُن کے پوتے نواب محمد اسماعیل خاں

Marfat.com

ممبر اسمبلی یو پی میرٹھ میں رہتے ہیں ۔ نواب شیفتہ کا رنگ گہرا سانولا تھا لیکن ناک نقشہ غضب کا پایا تھا ۔ اس پر نیچی سیاہ گول ڈاڑھی بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی جسم کسی قدر بھاری اور قد میانہ تھا ۔ تنگ مہری کا سفید پاجامہ اور سفید کرتہ اور نیچی چولی کا سفید انگرکھا اور قبہ نما چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے

مشاعرہ کی محفل آج کی رات یہ چند حلیئے بیان کرکے غدر پہلے کے ایک مشاعرہ کا حلیہ بھی بیان کرتا ہوں کہ اُس زمانہ میں مشاعرہ کی محفلیں کیونکر آراستہ کی جاتی تھیں ۔

سُنئے :- جس مکان میں مشاعرہ ہونے والا ہوتا تھا وہاں سفیدی میں ابرک ملا کر قلعی کرائی جاتی تھی جس کی وجہ سے در و دیوار پڑے جگمگ جگمگ کرتے تھے ۔ صحن کو بھر وا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے جاتے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہو جاتے تھے تختوں پر دری اور اور چاندنی کا فرش اس پر قالینوں کا حاشیہ پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار چھت میں جھاڑوں ۔ فانوسوں ۔ ہانڈیوں ۔ اور دیواروں پر قمقموں ۔ دیوار گیریوں چینی قندیلوں اور گلدستوں کی آرائش ہوتی تھی سامنے کی صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ گنگا جمنی چوبوں پر سبز ریشمی طنابوں سے ایستادہ ہوتا تھا اس کے نیچے سبز مخمل کی کارچوبی مسند بچھے سبز کارچوبی گاؤ تکیہ سبز رنگ کی وجہ یہ تھی کہ دہلی کے بادشاہوں کا درباری رنگ سبز تھا شامیانے کی چاروں چوبوں پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس کسے ہوئے فانوسوں کے کنوں بھی سبز چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سہرے کی طرح لٹکے ہوئے بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلابتونی ڈوریوں سے جن کے سروں پر مقیش کے گچھے تھے اس طرح چوبوں پر کس دیا جاتا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے معلوم ہوتے تھے دیواروں میں جہاں کھونٹیاں ہوتی تھیں وہاں کھونٹیوں پر اور جہاں کھونٹیاں نہ ہوتی تھیں وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے ہار لٹکائے جاتے تھے پاس سرے سے اُس سرے تک سفید چھت گیری جس کے حاشیے بھی سبز ہوتے تھے ۔ کبھی ہوئی چھت گیری کے بیچوں بیچ موتیا کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف اس طرح کھینچ دیا جاتا تھا کہ پھولوں کی ایک

Marfat.com

چھتری ہو جاتی تھی۔ ایک صحن چی میں پانی کا انتظام ہوتا تھا۔ گورے گورے گھڑے رکھے جاتے تھے اور شورے میں جست کی صراحیاں لگائی جاتی تھیں دوسری صحن چی میں پان بنائے جاتے تھے۔ باورچی خانہ میں حقوں کا تمام سامان سلیقہ سے جمایا جاتا تھا۔ جابجا نوکر صاف ستھرے لباس پہنے دست بستہ مودب کھڑے رہتے تھے۔ تمام مکان مشک عنبر اور اگر کی خوشبو سے مہکتا تھا۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر حقوں کی قطار ہوتی تھی حقے ایسے صاف ستھرے ہوتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ابھی دکان سے منگائے ہیں۔ حقوں کے بیچ میں جو جگہ چھوٹ جاتی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھ کر ان پر خاصدان رکھدئے جاتے تھے۔ خاصدانوں میں لال قندکی صافیوں میں لپٹے ہوئے پان کی گلوریوں کو صافی میں اس طرح جمایا تھا کہ بیچ میں ایک تہ خوشبودار پھولوں کی بچھی ہوئی تھی۔ خاصدان کی برابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں ان میں الائچیاں اور چکنی ڈلیاں اور بن دھنیا مسند کے سامنے چاندی کے دو شمعدان۔ اندر کافوری بتیاں اور پر ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے کنول۔ شمعدان کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن لگنوں میں کیوڑا بھرا ہوا۔ جب مشاعرہ شروع ہوتا تھا۔ یہی شمعدان سب شعراء کے سامنے گردش کرتے تھے۔ اب یہ شمع رہی نہ شمعدان رہے۔ نہ محفل رہی نہ محفل والے رہے نہ پھول رہے نہ باغ رہے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

اونچے اونچے مکاں تھے جن کے بڑے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے — آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اس جا ہے آشیانۂ بوم
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے — نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے — استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے
ذات معبود جاودانی ہے — باقی جو کچھ بھی ہے وہ فانی ہے
صبحدم طائران خوش الحان — پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

Marfat.com

یہ تھا گذشتہ زمانہ کی صحبت کا حال جس کا ایک حصہ پہلے سنایا تھا ایک آج سُنایا۔ جی میں لہرآئے گی تو پھر کبھی اجڑنے والی محفلوں کی تصویر قلم کی زبان پر نظر آجائیگی۔ سُننے والے ہنیں گے رونے والے روئیں گے اور تاریخ لکھنے والے جوان دونوں جھگڑوں سے الگ ہیں اپنی تاریخی یادداشت کو آراستہ کریں گے۔

بولنے والے خاموش

اگر آپ نے کسی بولنے والے خاموش کو نہ دیکھا ہو۔ اور کسی خاموش کو بولتا ہوا دیکھنے کی خواہش ہو تو کتابوں کا مطالعہ کیا کیجئے جن کے حروف خاموش رہتے ہیں مگر آپ کی آنکھوں سے باتیں کیا کرتے ہیں۔

مگر ایسی کتابیں پڑھیئے جو آپ کے دماغ پر زیادہ بوجھ نہ ڈالیں اور اُن کے پڑھنے سے دل کو اور ذہن کو مزہ آئے۔ اور آپ کی اُردو بول چال اور تحریر درست ہو اور آپ کے بچے اور عورتیں بھی اچھی اُردو بولیں اور اچھی اُردو لکھیں۔ اس مقصد کے لئے خواجہ حسن نظامی صاحب کی لکھی ہوئی کتابیں آپ کو بہت مفید ہوں گی

جو دفتر اخبار منادی اور چمن اُردو بک ڈپو اور حلقہ مشائخ بک ڈپو اور اُردو کمپنی اُردو بازار دھلی سے ملیں گی

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کی تقریر

رسول ؐ کی

دیا کریا

جو ۲۴ مئی ۱۹۳۷ء کو بتقریب عید میلاد دلّی ریڈیو میں ہوئی

ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب دیش میں ایک مہا دیا لو کا جنم ہوا تھا۔ جن کا نام محمدؐ تھا۔ اور جن کو مسلمان خدا کا رسول یعنی منش اُدّھار کے لئے خدا کا بھیجا ہوا مانتے ہیں۔ آج ان کا جنم دن ہے۔ سارے سنسار میں جہاں جہاں مسلمان رہتے ہیں اُن کے جنم دن کی یاد میں سبھائیں کر کے اُن کے گُن گاتے ہیں۔ اس کارن آج دلی ریڈیو میں بھی مسلمانوں کے رسولؐ کے جیون سے دیا کریا کی باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ قرآن شریف پُستک میں شری محمدؐ جی کو سنسار بھر کیلئے رحمت آزہات دیالو کہا گیا ہے۔

شری مان محمدؐ جی مہاراج شمبل دیپ یعنی عرب دیش میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے پتا کا نام عبداللہ تھا اور اُن کی ماتا کا نام آمنہ تھا۔ اُن کی جاتی کا نام قریش تھا جو عرب دیش کے لوگوں میں برہمن سمان مانے جاتے تھے۔ مہا دیالو ماتا کے گربھ (حمل) میں تھے کہ اُن کے پتا عبداللہ کی مرتیو ہو گئی تھی۔ اور جب یہ پانچ برس کے ہوئے تو اُن کی ماتا بھی دُنیا سے سدھار گئی تھیں۔ پہلے اُن کو اُن کے دادا نے پالا پھر چچا نے پالا۔ اُن کے پیدا ہوتے ہی عرب دیش کے رواج انوسار ایک گاؤں میں دائی حلیمہ کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ جنہوں نے اُن کو دودھ پلایا۔ اور جب اُنہوں نے ہوش سنبھالا۔ تو اپنی دائی کی بکریاں چرانے لگے۔ مہا دیالو نے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا۔ کارن یہ کہ اُس سمے عرب دیش میں کوئی بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔

مہا دَیا لو ۲۵ پچیس برس کی اوستا تک بہت نیکی کا جیون بسر کرتے رہے اور پچیس ۲۵ برس کی اوستا میں چالیس برس کی ودھوا عورت خدیجہؓ سے ان کا بیاہ ہو گیا۔ خدیجہؓ بہت روپیہ والی عورت تھیں اور اُن کے ہاں بیوپار ہوتا تھا۔ اس کارن مہادیالو نے بھی بیوپار کرنا شروع کیا اور دُور دُور کے ملکوں میں بیوپار کرنے گئے۔ وہ مکہ شہر میں پیدا ہوئے اور مکہ کے بازار میں اُن کی دُکان تھی ایک دن انھوں نے بازار میں دیکھا کہ ایک اندھی عورت جا رہی ہے رستہ میں وہ عورت ٹھوکر کھا کر گری تو بازار کے لوگ اُس کے گرنے پر ہنسنے لگے۔ مہادَیا لو نے یہ حال دیکھا تو وہ اپنی دکان سے اُتر کر اُس عورت کے پاس گئے اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ پھر ہنسنے والوں سے کہا کہ کسی اندھی عورت یا مرد کی ہنسی کرنی مہا پاپ ہے۔ اگر ایشور تمہاری آنکھوں کی جوت بھی لے لے تو تمہارا بھی یہی حال ہو جائیگا۔ پھر اُس اندھی عورت کا ہاتھ پکڑ کر اس کے گھر تک ساتھ گئے اور اس سے پوچھا کہ تو بازار میں کیوں آئی تھی اُس عورت نے کہا نہ میرا کوئی پتی ہے نہ میری سنتان (اولاد) ہے میں ایک باغ کی رکھوالی کرنے جاتی ہوں اور وہاں سے مجھے کھانے کو مل جاتا ہے۔ مہادَیا لو نے کہا تو اپنے گھر میں بیٹھی رہ میں تجھ کو پکا پکایا بھوجن دے جایا کروں گا۔

پھر مہادَیا لو اپنی استری خدیجہؓ کے پاس گئے اور اُن سے کہا: لے آنکھوں والی اُن کی بعض پکا جن کی آنکھیں نہیں ہیں۔ اور لے اولاد والی اور اے پتی والی اُن پر دَیا کر جن کے پتی نہیں ہیں اور جن کے اولاد نہیں ہے اور جن کا کوئی سہایک نہیں ہے؟ مہادَیا لو کی استری خدیجہؓ نے اُتر (جواب) دیا۔ میں ہر سیوا کے لئے موجود ہوں۔ پھر انھوں نے روٹی پکا کر دی اور مہادَیا لو نے اُس اندھی عورت کو روٹی پہونچائی اور پھر ہمیشہ دونوں وقت خود اسس کو روٹی پہنچاتے تھے اور پانی بھی اُس کے گھر میں خود ہی بھر دیتے تھے اور پوچھتے تھے کہ بہن اور سیوا بتا۔

ایک دن مہادَیا لو اپنی دُکان پر بیٹھے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ ایک مزدور عورت لکڑیاں

Marfat.com

سر پر رکھے جارہی ہے اور وہ جوان ہے اور بازار کے بُرے آدمی اُس کو چھیڑ رہے ہیں یہ دیکھ کر مہادیا لو لوگوں کے پاس گئے اور کہا کہ ہر عورت کو اپنی ماں اور بہن اور بیٹی سمجھو۔ اور جو عورت تمہارے شہر میں رہتی ہے وہ تو تمہاری ماں اور بہن اور بیٹی کی برابر ہے

ایسے ہی ایک دن ایک آدمی بازار میں ایک عورت کو مار رہا تھا۔ مہادیا لو نے اُس آدمی کو روکا تو اُس آدمی نے اُتّر دیا کہ یہ میری استری ہے میں جو چاہوں کروں تم کو روکنے کا کوئی ادھیکار نہیں ہے۔ مہادیا لو نے کہا "مجھ کو اور ہر مرد کو ادھیکار ہے کہ عورت جاتی کو دُکھ سے بچائے۔ اگر تو پھر کبھی اپنی استری کو مارےگا تو میں تجھ کو مکہ سے نکال دوں گا۔

جس سمے مہادیا لو مکہ میں تھے اُس سمے عرب میں آدمیوں کا بیپار ہوتا تھا۔ یعنی عورت مرد لونڈی غلام بنائے جاتے تھے۔ ایک دن مہادیا لو نے ایک گھر میں دیکھا کہ ایک غلام چکی سے آٹا پیس رہا ہے اور روتا جاتا ہے۔ مہادیا لو اس غلام کے پاس گئے اور اس کے رونے کا کارن پوچھا۔ غلام نے کہا میں روگی (بیمار) ہوں اور میری شکتی بہت کم ہوگئی ہے۔ مجھ سے چکی چل نہیں سکتی مگر میرا مالک بڑا ہی انیائی (ظالم) ہے۔ وہ کہتا ہے تیری کیسی ہی دشا (حالت) ہو تجھکو چکی ضرور پیسنی پڑے گی۔ یہ سُن کر مہادیا لو اُس غلام کے پاس بیٹھ گئے۔ اور اس کو چکی کے پاس سے ہٹا دیا۔ اور خود چکی چلاکر اس کا آٹا پیس دیا۔ اور جب تک بندھو (غلام) اُس روگ سے اچھا نہ ہوا روز اُس کے پاس جاتے تھے اور اس کا آٹا پیس دیتے تھے۔

مہادیا لو کی استری خدیجہ رضؓ کے پاس ایک عیسائی بندھو تھا۔ ایک دن مہادیا لو نے اپنی استری سے کہا کہ اگر تو چاہتی ہے کہ تیری آتما کو شانتی ہو تو اس بندھو کو سوتنتر کردے۔ بیوی خدیجہ رضؓ نے اُتّر دیا کہ میں آپ کی ہر آگیا (حکم) کا پالن کروں گی اور اُسی سمے اُس بندھو کو آزاد کر دیا۔ بیوی خدیجہ پتی سیوا اور پتی آگیا پورن کرنے میں بہت اونچی تھیں۔

یہ سب باتیں جو بیان کی گئیں اس سمے کی ہیں جب کہ مہادیا لو کو ایشور نے اپنا اوتار

نہیں بنایا تھا کیونکہ وہ رسولؐ چالیسؒ برس کی اوستا (عمر) میں ہوئے تھے اور یہ سب باتیں پچیس برس کی اوستا سے چالیس برس کی اوستا تک کی ہیں۔ جب وہ چالیسؒ برس کی عمر میں خدا کے رسولؐ ہو گئے تب تو اُن کی دَیا کِرپا اَدھک (بہت) بڑھ گئی۔ اور چالیس برس کی عمر سے ترسیٹھ برس کی عمر تک وہ رات دن منش سیوا میں لگے رہتے تھے اور سچ مچ دَیا اوتار ہو گئے تھے۔

مکہ میں ایک بڑا امیر آدمی رہتا تھا جس کا نام ابوسُفیان تھا اُس امیر آدمی کے ہاں بہت سے لونڈی غلام تھے اور ابوسُفیان ان لونڈی غلاموں سے بڑے کٹھن کام لیتا تھا اور ان لونڈی غلاموں کو کھانا کپڑا بہت کم دیتا تھا۔ اور اُن کے دُکھوں میں سہائتا (مدد) نہ کرتا تھا۔ ایک رات مَہادَیالُو نے سُنا کہ ابوسفیان کا ایک غلام تین دن سے بیمار ہے اور کوئی اس کو پانی پلانے والا بھی نہیں ہے اُس سَمے عرب دیش میں دیا جلانے کی ریتی نہ تھی۔ سب لوگ رات کو اندھیرے میں رہتے تھے۔ مَہادَیالو رات کے اندھیرے میں ابوسُفیان کے بندھوا کے پاس گئے۔ تو دیکھا کہ وہ بیچارہ ایک جھونپڑی میں مٹی کے بچھونے پر پڑا ہے۔ مَہادَیالو اُس کے پاس بیٹھ گئے۔ اور اُس کے پاؤں دبانے لگے۔ اندھیرے میں غلام پہچان نہ سکا کہ میرے پاؤں کون دباتا ہے اور اُس کو خیال آیا کہ شاید میرے مالک ابوسُفیان نے کسی غلام کو میری سیوا کے لئے بھیجا ہے اس کارن اُس غلام نے کہا "کیا تجھ کو میرے مالک نے بھیجا ہے مَہادَیالو نے اُتر دیا کہ ہاں تیرے مالک نے مجھے بھیجا ہے کہ میں تیری سیوا کروں تو بھوکا ہو تو روٹی کھلاؤں تو پیاسا ہو تو پانی پلاؤں اور تیرے پاؤں دباؤں۔ غلام نے کہا "تو جا میرے لئے روٹی لا اور پانی لا۔" مَہادَیالو اپنے گھر گئے اور غلام کے لئے روٹی اور پانی لائے اور جب اُس نے روٹی کھالی اور پانی پی لیا تو وہ لیٹ گیا اور کہا "آ میرے پاؤں دبا" مَہادَیالو نے اُتر دیا "جو آگیا" اور اُس کے پاؤں دبانے لگے۔ آدھی رات بیت جانے کے بعد غلام نے کہا "تو کہاں کا رہنے والا ہے

Marfat.com

تو میرے پاؤں اچھے نہیں دباتا۔ میں اپنے مالک سے کہوں گا کہ تو نے میری اچھی سیوا نہیں کی جیسی سیوا میں اپنے مالک کی کرتا ہوں تو بھی ایسی ہی کر۔ اور جیسے میرا مالک میری سیوا کے سمے مجھ پر کرودھ (غصہ) کرتا ہے اور مجھے مارتا ہے تو میں بھی تجھ پر کرودھ کروں گا اور ماروں گا اور تجھ کو وہ سہن کرنا ہوگا۔ مہادیالو نے کہا اگر تیرا مالک سیوا کرنے کے بعد بھی تجھ کو مارتا ہے تو بُرا کرتا ہے تو اپنے مالک کی بُری باتوں کی ریس نہ کر۔ تاکہ ایشور تجھ کو غلامی سے چھڑا دے کیونکہ میں آدمیوں کو بُری باتوں سے بچانے آیا ہوں۔

جب ساری رات بیت گئی اور اُجالا ہو گیا تو اس غلام نے دیکھا کہ پاؤں دبانے والا تو مکہ کا سب سے بڑا سردار ہے جس کو لوگ ایشور کا رسولؐ اور اوتار سمجھتے ہیں تو وہ ڈر گیا اور اُس نے ہاتھ جوڑ کر شما مانگی۔ مہادیالو نے ہنسکر کہا۔ گھبرا مت میں بھی اپنے مالک کا غلام ہوں اور اسی کارن میں نے رات کو کہا تھا کہ تیرے مالک نے مجھے بھیجا ہے کیونکہ تیرا اور میرا مالک ایک ہی ہے۔ اور وہ ایشور ہے تو اگر ایک ایشور کو مان لے اور مجھے ایشور کا رسولؐ مان لے تو تیری سپھلتا (نجات) ہو جائیگی۔ وہ غلام یہ بات سنتے ہی مسلمان ہو گیا اور جب ابوسفیان نے یہ بات سُنی تو اس کو بہت کرودھ آیا۔ کیونکہ ابوسفیان اس مہادیالو کا رشتہ دار تھا اور بڑا شترو (دشمن) تھا۔ وہ بھاگا ہوا مہادیالو کے پاس آیا اور کہا کہ تو نے میرے غلام کو بگاڑ دیا تو نے اس کے پاؤں دبائے اب وہ میرے کام کا نہیں رہا۔ تو اس کی قیمت مجھے دے اور اس کو لیجا کیونکہ وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ میں مسلمان کو اپنی سیوا میں نہیں رکھ سکتا۔ مہادیالو نے ہنس کر کہا کہ اے ابوسفیان سب آدمی برابر کے بھائی ہیں اور جو ایک دوسرے کی سیوا کرتے ہیں یہ ایک طرح کا بیوپار ہے۔ پرنتو اگر تو اس کو رکھنا نہیں چاہتا تو مانگ اس کا مول کیا مانگتا ہے وہ غلام بازار کے بھاؤ پانچسو روپیہ کا تھا مگر ابوسفیان نے ایک ہزار روپے مانگے۔ مہادیالو اپنی استری خدیجہؓ کے پاس گئے اور کہا اگر تو چاہتی ہے کہ مرنے کے بعد تجھ کو لاکھوں روپیہ قیمت کے جڑاؤ زیور ملیں

Marfat.com

اور تو ہمیشہ سکھ سے رہے تو ایک آدمی کو غلامی سے آزاد کرانے میں سہائتا کر اور پھر ساری کہانی غلام کی اور ابو سفیان کی سُنائی۔ بیوی خدیجہؓ نے اُسی سمے ایک ہزار روپے مہادیالو کو دیئے اور مہادیالو نے غلام کو خرید کر آزاد کر دیا۔ غلام نے آزاد ہوتے وقت کہا کہ ایشور تجھ کو بہت سے لونڈی غلام دے یہ سُنکر مہادیالو ہنسے اور کہا یہ نہ کہہ بلکہ یوں کہہ کہ ایشور مجھکو ایسی شکتی دے کہ میں سارے سنسار کو ہر غلامی سے سُتنتر (آزاد) کرادوں۔

ابو سفیان کھڑا یہ تماشہ دیکھتا تھا اُس نے مہادیالو سے کہا اے محمدؐ میں نے سُنا تھا کہ تو بڑا بُدھی مان ہے مگر آج معلوم ہوا کہ تو بڑا مُورکھ ہے یہ ہزار روپے تو نے بیکار کھو دئے۔ مہادیالو نے اُتر دیا میں ایسے مورکھ پن کو مہا بُدھی سمجھتا ہوں۔ اور تجھ سے بھی کہتا ہوں کہ تو بھی ایسا ہی مورکھ بن جا۔ تیرا دادا اور میرا دادا ایک تھا۔ جو بدھی تیری ہے وہی میری ہے۔ اور جو خون تیرا ہے وہی میرا ہے پر کیا کروں کہ تیرے لئے ایشور نے کچھ اور لکھا ہے اور میرے لئے کچھ اور لکھا ہے۔ تجھ سے اور تیری سنتانؓ سے بڑے بڑے پاپ ہوں گے کیونکہ میں ہر چھپی بات کو جانتا ہوں اور ہر آنیوالی بات ہزاروں برس تک کی مجھے آج ہی دکھائی دے رہی ہے۔ ایشور نے یہ شکتیاں مجھے دی ہیں۔ ابو سفیان نے کہا کیا تو میری اولاد کا حال بھی جانتا ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ مہادیالو نے کہا "ہاں میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ تجھ کو بھی جو میرے سامنے کھڑا ہے اور تیری اولاد کو بھی جو ابھی دُنیا میں پیدا نہیں ہوئی۔ اُن کی تلواروں کو دیکھ رہا ہوں۔ اُن کے تیروں کو دیکھ رہا ہوں اُن کی برچھیوں کو دیکھ رہا ہوں۔ اُن کے خنجروں کو دیکھ رہا ہوں۔ جو نردوشوں کو ماریں گے اور بھوک پیاس کا دکھ دے کر بیگناہوں کا خون بہائیں گے اس سمے نہ میں ہوں گا۔ اور نہ تو ہو گا۔ مگر میری اور تیری یہ بات موجود ہو گی۔

اور ایسا ہی ہوا کہ ابو سفیان تین چار دفعہ مہادیالو شری محمدؐ جی مہاراج اور مسلمانوں کو ستانے کے لئے فوجیں لے کر آیا اور خوب لڑائیاں ہوئیں۔ اور ابو سفیان کی بیوی نے مہادیالو کے چچا حمزہؓ کا کلیجہ چبایا۔ جبکہ اُحد کی لڑائی میں وہ قتل ہو گئے تھے۔ اور ابو سفیان کی بیوی ہند

Marfat.com

نے حمزہؓ کے ناک کان کاٹ کر ایک ہار بنایا اور اس کو اپنے گلے میں پہنا۔
اور ابو سفیان کے بیٹے امیر معاویہ نے مہادیالو کے پرلوک سدھارنے کے بعد مہادیالو کے بھائی اور داماد علیؑ سے لڑائیاں لڑیں اور علیؑ کے بڑے بیٹے حسنؑ کو زہر دلوا کر مار ڈالا۔
اور چھوٹے بیٹے حسینؑ کو امیر معاویہ کے بیٹے یزید نے تین دن بھوکا پیاسا رکھ کر قتل کرا دیا حسینؑ کو اور اُن کے سب چھوٹے بڑے بچوں کو بھی یہاں تک کہ دودھ پیتے بچہ کو بھی۔ اور مہادیالو نے جو بات یزید کے دادا اور امیر معاویہ کے باپ ابوسفیان سے کہی تھی کہ ایسا ایسا ہوگا ویسا ہی ہوا۔ کارن یہ کہ مہادیالو سب گپت باتوں کو جانتے تھے جو آگے جا کر ہونیوالی تھیں
مہادیالو بچوں سے بہت پریم کرتے تھے جب مکہ مدینہ کے بچے اُن کو بازار میں دیکھتے تو دوڑ کر اُن کے ہاتھ پکڑ لیتے تھے اور مہادیالو کبھی اپنے ہاتھ نہ چھڑاتے تھے جب تک کہ بچے ہی اُن کے ہاتھ نہ چھوڑ دیتے۔ مہادیالو کہتے تھے کہ "جو بچوں کو پیار نہیں کرتا اور جو بوڑھوں کی سیوا نہیں کرتا وہ میری جاتی میں نہیں ہے"۔
مہادیالو نے کبھی کسی آدمی اور جانور کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ بہت سے دشمن اُن پر چڑھ کر آئے۔ اور وہ اپنے اور مسلمانوں کے بچاؤ کے لئے لڑے۔ مگر لڑائی میں بھی خود مہادیالو نے کبھی کسی کو نہیں مارا اور کسی پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔
اُحد کی لڑائی میں ابوسفیان کے آدمیوں نے مہادیالو کے دانت پتھر مار کر توڑ ڈالے اور مُنہ لہو لہان کر دیا۔ تو مسلمانوں نے مہادیالو سے کہا۔ آپ ان دشمنوں کو سراپ (بددعا) دیجئے جنہوں نے آپ کو گھائل کیا ہے۔ مہادیالو نے کہا میں کسی کو سراپ دینے نہیں آیا ہوں یہ دشمن مورکھ ہیں اور مجھے جانتے نہیں ہیں اس کارن میں کہتا ہوں کہ "اے ایشور تو ان کو بُدھی دے کہ یہ بچہ کو سمجھیں "۔ اور مجھ کو بھی جانیں کہ میں تیرا اوتار ہوں۔
مہادیالو جیسے منش جاتی پر دیا کرتے تھے ایسے ہی پشوؤں پر بھی اُن کی دیا تھی۔
ایک دن کوئی آدمی ایک بکری کو کھانے کے لئے کاٹنا چاہتا تھا اور وہ بکری پیاسی تھی

Marfat.com

اور پانی کی طرف دوڑتی تھی۔ مہاذیالو اُدھر جا نکلے اور انہوں نے اُس آدمی سے کہا "تو بکری کو پیاسا نہ مار کہ میرے خدا کو جیسے آدمی پیارے ہیں ایسے ہی جانور بھی پیارے ہیں"

ایک دن مہاذیالو نے ایک اونٹ کو دیکھا کہ بیمار ہے اور بوڑھا ہے اور اس پر بہت بوجھ لدا ہوا ہے۔ مہادیالو اونٹ والے کے پاس گئے۔ اور کہا "یہ بوڑھ ہے اور بیمار جانور پر بوجھ نہ لادو۔ اور رحم کرو۔ تم زمین والوں پر دیا کروگے تو آسمان والا تم پر دیا کریگا"

ایک دن مہاذیالو نے دیکھا کہ کوئی آدمی بکری کاٹنی چاہتا ہے اور بکری کے بچے پاس کھڑے چیخ رہے ہیں اور بکری مڑ مڑ کر اپنے بچوں کو دیکھ رہی ہے۔ مہاذیالو رونے لگے اور اُس آدمی سے کہا تو بچوں والی بکری کو نہ کاٹ۔ اور بچوں کے سامنے نہ کاٹ۔ کہ خدا اس کو بہت برا سمجھتا ہے۔ پھر وہ بکری مہاذیالو نے خرید لی۔ اور اس کی جان بچالی۔

ایک دن مہاذیالو نے اپنے دوست ابوبکرؓ سے کہا کہ جب لوگ چھوٹے چھوٹے پرندوں کا شکار کرتے ہیں تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے" کیونکہ یہ پنکھی ایشور کی شکتیوں کی شوبھا ہیں۔ ان کو دیکھا کرو۔ اور ان کی پیاری آوازیں سُنا کرو۔ اُن کو مارا نہ کرو۔

بس یہ تھی مہاذیالو سری محمدؐ جی مہاراج کی دیا کرپا کی کتھا۔ جو اُن گنت باتوں میں سے دس پانچ بیان کی ہیں۔ وقت زیادہ ہوتا تو اور بھی بیان کی جاتیں۔ ✦

منش جیون سُدھار کے لئے

آتم پتا کا جیون

حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مختصر سوانح عمری حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی نے اپنے مخصوص انداز تحریر میں لکھی ہے جس کا ہندوستان کی ہر زبان میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے اور جو عورتوں اور بچوں کے پڑھنے کے لئے لکھی گئی ہے اس لئے بہت آسان زبان میں ہے اس کا نام سیرت نبوی ہے اور اس کے ہر صفحے میں تین مضمون ہیں تاکہ ہر مضمون یاد رہے کیونکہ طویل عبارتیں عورتوں اور بچوں کی سمجھ میں نہیں آتیں اور یاد بھی نہیں رہتیں۔ یہ کتاب لڑکیوں کی شادی میں جہیز میں دینے کے قابل اور بچوں کو بطور انعام دینے کے لائق ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے پتہ: دفتر حلقہ مشائخ بکڈپو دہلی سے منگائیے

Marfat.com

پشاور ریڈیو کے لئے خواجہ حسن نظامی دہلوی کی تقریر

قدسیہ بیگم

جو ۲۴ رجولائی ۱۹۳۷ء کی شام کو پشاور میں نشر ہوئی

ہندوستانی سرحد کے پہاڑوں میں جان ہے۔ اور اُن کے کان بھی ہیں اور وہ بول بھی سکتے ہیں۔ دیکھنے میں چُپ ہیں کتابوں کے حروف کی طرح۔ مگر حقیقت میں ہر وقت بولتے رہتے ہیں جیسا کہ ایک بزرگ نے فرمایا ہے ؎ خاموشم و گویا نم چوں خط بکتاب اندر

شہزادی قدسیہ بیگم کی کہانی ایک ایسی کہانی ہے جس کو وسط ایشیا بخارا اور سمرقند اور افغانستان اور سرحد ہندوستان کے سب پہاڑ اور اُن پہاڑوں کے باشندے پہلے بھی سُن چکے ہیں کیونکہ قدسیہ بیگم کے باپ دادا انہیں پہاڑوں کے دروں سے گھوڑوں پر سوار نعرے لگاتے ہوئے گذرا کرتے تھے۔ اس پشاور نے قدسیہ بیگم کے باپ دادا کو بہت سی شکلوں میں دیکھا تھا۔ تاجداری کی شان میں بھی اور سپاہ گری کی شان میں بھی۔ لہٰذا آج کی رات وہ قدسیہ بیگم کی داستان بجلی کی لہروں کی زبان سے کان لگا کر سُنیں دیکھو قدسیہ بیگم خود سامنے کھڑی ہیں سنو قدسیہ بیگم خود بول رہی ہیں۔ چہرہ پر نقاب ہے ایک ہاتھ میں کتاب ہے۔ سامنے ریڈیو کا میکروفون ہے۔ آواز آتی ہے۔ سننے والو۔ میرا نام قدسیہ بیگم ہے بہادر بادشاہ کی بیٹی ہوں۔ مگر قسمت کی بیٹی ہوں میرے باپ دادا کا دعویٰ تھا کہ مغل اپنی قسمت خود بناتے ہیں مگر میں نے دلی کے لال قلعہ میں ہوش کی آنکھ کھولی تو شیخ سعدیؒ کی گلستاں پڑھی۔ اور اپنے باپ دادا کی تاریخ قصہ کہنے والوں سے سُنی تو یہ سمجھ میں آیا کہ میرے بزرگوں نے حکومت تو کی مگر اپنے گھر کی قسمت اور تقدیر اُن کو خلاق نہ آئی شہنشاہ بابر نے لودھی افغانوں سے ہندوستان کی حکومت لی مگر اپنی اولاد کی تقدیر کو نہ بنا سکے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اولاد آپس میں لڑی اور بابر کے جانشین شہنشاہ ہمایوں کو سوری افغان شیر شاہ کے سامنے سے ہٹنا پڑا اور ہندوستان چھوڑ کر ایران جانا پڑا۔ ایران کی مدد سے ہمایوں نے اپنی قسمت کو سنبھالا اور پھر ہندوستان

Marfat.com

پر قبضہ کر لیا لیکن عمر نے وفا نہ کی سلطنت اپنے نور چشم اکبر کے حوالہ کرکے دنیا کو چھوڑا ۔ اور ہمایوں بادشاہ ازبام افتا
سن کر دنیا سے منہ موڑا ۔ اکبر نے ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کو ایک بنا دیا لیکن اپنے گھر والوں کے دلوں
کو ایک نہ بنا سکے اُن کے لاڈلے جہانگیر نے خود باپ سے بغاوت کی اور جب جہانگیر کا زمانہ آیا تو اُن کے بیٹے
شاہجہاں نے باپ سے بغاوت کی اور جب شاہجہاں شہنشاہ ہوئے تو اُن کی اولاد میں بھی خانہ جنگی ہوئی یہاں
تک کہ چھوٹے بیٹے اورنگ زیب سلطنت کے مالک ہوئے اور شاہجہاں کو اولاد کا قیدی بننا پڑا ۔

غرض کہاں تک کہوں اورنگ زیب سے لے کر میرے باپ بہادر شاہ تک یہی تماشا ہر بادشاہ
کے دور میں دنیا دیکھتی رہی کہ باہر مغلوں کی دھوم تھی اور گھر میں آپس کی پھوٹ تھی جس سے ثا
ہوتا تھا کہ مغل دنیا پر تو حکومت کرتے تھے مگر اپنے گھر کی قسمت درست نہ کر سکتے تھے ۔

۱۸۵۶ء کا ذکر ہے میں اپنے باپ شہنشاہ سراج الدین محمد ابوظفر بہادر شاہ کے سامنے ادب سے
دوزانو بیٹھی تھی اور سامنے میرے بھائی شاہزادہ مرزا فخرالدین فتح الملک کا وکیل اپنے ہاتھوں
پر کالا رومال باندھے چپ چاپ کھڑا تھا ۔ جو علامت تھی اس بات کی کہ مرزا فتح الملک دنیا سے رخصت
ہوئے کیونکہ مغل بادشاہوں کو کسی کے مرنے کی خبر زبان سے نہیں دیتے تھے بلکہ مرنے والے کا وکیل اپنے ہاتھ
کو کالے کپڑے سے باندھ کر سامنے آکھڑا ہوتا تھا ۔ بادا حضرت نے جونہی بھائی کے وکیل کو کالا رومال ہاتھ
پر باندھے سامنے کھڑا دیکھا تو گھبرا کر پوچھا " بھئی اماں کیا ہوا ۔ خیر تو ہے ؟ " وکیل رونے لگا اور کہا " ولیعہد
بہادر حضور پر تصدق ہوئے " ۔ بادا حضرت کے برابر مسند پر میری سوتیلی والدہ ملکہ زمانی زینت محل بیگم
صاحبہ بیٹھی تھیں ۔ ہاتھ میں پیچوان کی نے تھی انھوں نے یہ خبر سنی تو " ہے ہے " کہہ کر حقے کی نے ہاتھ
سے پھینک دی اور پوچھا " کیا ہوا میرزا کی بیماری تو ایسی سننے میں نہ آئی تھی " ۔ بادا حضرت نے فرمایا " بیماری
تو ایک بہانہ ہے ۔ وقت آتا ہے تو سب دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں ۔ مجھے بڑھاپے میں یہ داغ دیکھنے تھ
سو دیکھے پہلا ولی عہد دارا بخت دنیا سے سدھارا دوسرا ولیعہد بھی یونہی نامراد و ناشاد رخصت ہوا ۔
اب تیسرا بھی چل بسا ۔ اگرچہ دشمنوں نے مرنے والے کو مجھ سے منحرف کر دیا تھا لیکن یہ تو دنیا میں ہوتی آئی ہے
کہ ہر بادشاہ کا ولیعہد باپ سے ناراض رہتا تھا اور میرے خاندان میں تو ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے کہ بادشاہ
اور ولیعہد میں موافقت رہی ہو خیر جو مرضی خدا کی ۔ جاؤ میری طرف سے ماتمی مراسم ادا کرو " ۔

اس کے بعد جہاں پناہ ظل سبحانی آیت رحمانی ابوظفر بہادر شاہ نے میری طرف دیکھا اور ارشاد
فرمایا " کیوں قدسیہ تو رات دن شیخ سعدیؒ کی گلستان پڑھتی رہتی ہے کچھ سمجھ میں آیا ؟ یہ دنیا کیسا گورکھ
دھندا ہے ؟ " یہ ارشاد سن کر میں کھڑی ہو گئی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر عرض کی " سعدیؒ نے بھی کائنات
کے معمہ کی نسبت بہت کچھ لکھا ہے مگر حافظؒ نے ایک شعر میں اس الجھاؤ کو ختم کر دیا ۔ کہتے ہیں ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو ۔ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمہ را

اے گیتی ستاں سلطان ! میں آپ کے چتر شاہی پر پروانہ وار قربان ہو جاؤں ۔ اس ہستی ناپائدار

کا راز آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کٹھ پتلی کا تماشا ہے۔ پتلیاں میدانِ حیات میں آتی ہیں۔ بولتی ہیں اپنا اپنا دکھڑا سناتی ہیں اور چھپ ہو جاتی ہیں اور آخر میں جب کٹھ پتلیوں کا تماشا ختم ہوتا ہے تو کہنے والا کہتا ہے ؎ یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور، اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

بادا حضرت نے میری باتیں سن کر ارشاد فرمایا۔ "اں قدسیہ سچ کہتی ہے، نہ تلوار کا راز کھلتا ہے نہ قلم کا۔ نہ رزم اپنی طلسم کشائی کرتی ہے نہ بزم اپنی آرائش کی پہیلی بوجھتی ہے۔ سورج نکلتا ہے اور چھپ جاتا ہے۔ چاند چمک دمک دکھاتا ہے اور غروب ہو جاتا ہے۔ ہوائیں چلتی ہیں آندھیاں آتی ہیں۔ اونچے اونچے درختوں کو گراتی ہیں۔ پامال شدہ خاک کو بازوؤں پہ بٹھاتی ہیں اور ان لوگوں کی آنکھوں میں جوتیوں سمیت گھسی چلی جاتی ہیں جو اس خاک کو پامال کیا کرتے تھے۔ نسیم سحر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی آتی ہے اور سونے والوں کے کان میں کہتی ہے؎

آشفتہ می دارد مرا زلف سمن بوئے کسے ہر صبحدم روئے کسے ہر شام گیسوئے کسے

فداشتنا آج ۱۸۵۷ء نہیں ہے بلکہ ستمبر ۱۹۵۷ء ہے۔ میں وہی قدسیہ شہنشاہ بادشاہ کی بیٹی ہوں مگر ویران اور سرگرداں پھر رہی ہوں۔ باپ کی حکومت کے انقلاب کے بعد دلی سے نکلی در در کی ٹھوکریں کھائیں۔ جگہ جگہ کی خاک چھانی۔ گیروا کرتا اور سر پہ فقیرانہ رومال باندھا۔ گلے میں تسبیح ڈالی۔ "یا قدوس۔ یا قدوس" کا وظیفہ پڑھتی پھرنے لگی۔ لوگ پوچھتے تم کون ہو؟ کہہ دیتی میں کوئی نہیں۔ بس جو کچھ ہے قدوس ہے۔ میرا مولا وہی زندہ ہے اور وہی قائم ہے۔ باقی جو کچھ دکھائی دیتا ہے سب فنا ہونے والا ہے۔ ایک کہتا یہ گلے میں منکا کیسا ہے؟ میں کہتی یہ میرے تن کی مالا ہے جب تک تن تن کرتی رہی ماری ماری رہی۔ بے سہارے اور بے ٹھکانے پھرتی رہی۔ اب "تو ہی تو" کہتی ہوں تو ایک ٹھکانے پر آ گئی ہوں۔ کیوں بھائی! ایک ترازو میں دو پلڑے ہوتے ہیں ایک پلڑے میں تن کا بٹہ رکھ دو اور دوسرے پلڑے میں بھی پورے ایک من کا بٹہ رکھ دو اور پھر دونوں من تولو تو بتاؤ۔ دو من تول میں ایک ہی من رہیں گے یا دو من ہو جائیں گے؟ نہیں بھائی تمہاری بھول ہے۔ دونوں من ترازو کی تول میں ایک ہی من رہیں گے۔ پس اگر تم چاہتے ہو کہ ہندوستان کے فنا ہونے والے شہنشاہ کی بیٹی سے اپنی زندگی کے دکھ دور ہونے کی نصیحت سنو۔ تو میں یہی کہوں گی کہ اپنے من کو مولیٰ سے لگا لو اور ذرا سر کو جھکا کر اپنی روح سے سنو وہ گا رہی ہوگی۔

"وہ اپنے مولا کی میں جوگن بنی۔ جوگن بنی میں بروگن بنی۔ اپنے مولا کی میں جوگن بنی۔

بس مجھ قدسیہ کی اتنی ہی کہانی ہے اور اس کے بعد جو کچھ ہے وہ سب دھوپ چھاں

یا چاردن کی چاندنی ہے جو فانی ہے اور آنی جانی ہے میں شہنشاہ کے گھر میں پیدا ہوئی اور اب بھکارن ہوں میں نے نہ پہلے کبھی غرور کیا تھا نہ اب کرتی ہوں کیونکہ غرور کا سر نیچا ہوتا ہے ۱۸۵۷ء کی باتیں ۱۹۳۷ء کے پوچھنے والے پوچھتے ہیں اب کیا حال ہے ۱۸۵۷ء سے لیکر آج تک کیا کیا بیتی اور اس زندگی کے کیسے کیسے تماشے دیکھے، تو کہہ دیتی ہوں سو برس سے زیادہ عمر ہوگئی منہ میں دانت ہے نہ پیٹ میں آنت آنکھوں سے سوجھتا نہیں۔ ہاتھ پاؤں قابو میں نہیں کیا کہوں کیا کیا گذری اور کیسی گذری غالب نے کہا تھا "ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام۔ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے"۔ اس دنیا میں ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۹۳۷ء تک ہندوستانیوں کی مروتیں بھی دیکھیں اور بے مروتیاں بھی۔ وفائیں بھی اور بے وفائیاں بھی۔ سچ کہا ہے کسی شاعر نے کسی نے دل جو لیا تو لُبھا لُبھا کے لیا، مگر حضور نے خنجر لگا لگا کے لیا۔ میں تو شروع سے مولا کی جوگن بن چکی تھی شادی بیاہ اور زندگی کی بہاروں کو اماں اباکی اور تاج و تخت کی سلامتی میں دل سے دور کر چکی تھی پھر بھی یہ پہاڑ سی عمر ایسی مصیبت سے گذری ہے کہ بس دل ہی جانتا ہے قدم قدم پر حسد اور کینے کے کانٹے تھے اور پاؤں میں آبلے تھے۔ دلہ کہنے کو جی چاہتا بھی تھا تو منہ سے "آہ" نکلتی تھی کوئی کہتا اس خاندان کے اعمال اسکے سامنے آئے تو کہہ دیتی تھی۔ ہاں بھائی سچ ہے بس خدا کسی کا وقت نہ بگاڑے۔ کوئی کہتا تھا یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ بادشاہ کی بیٹی نہیں ہے کھانے کمانے کیلئے بادشاہ کی بیٹی بنتی ہے تو میں ٹھنڈا سانس لیکر کہہ دیتی تھی۔ ہاں میاں سچ کہتے ہو کیا کروں پیٹ بُری بلا ہے پیٹ کیواسطے آدمی کو سبھی کچھ بننا پڑتا ہے کوئی کہتا ستائے ہوؤں کو کیوں ستاتے ہو جنکے دل ٹوٹے ہوئے ہیں اُنکو کیوں چھیڑتے ہو تو میں ہاں میں ہاں ملاتی تھی اور کہتی تھی ؎ نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی، تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں"۔ خلاصہ اس دُکھ بھری زندگی کا یہ ہے کہ سات سات وقت فاقوں میں گذر گئے لوگ یہ سُنکر کہ بادشاہ کی بیٹی ہوں اپنے گھروں میں جگہ دیتے ہوئے ڈرتے تھے۔ درگاہوں میں۔ قبرستانوں میں تکیوں میں بھوکی پیاسی پڑی رہتی تھی اور جانتی تھی کہ دنیا کے اسٹیج پر مجھے یہ پارٹ ادا کرنا ہے جب موت کا ڈراپ سین گرے گا تو نہ دُکھ رہے گا نہ سکھ۔ نہ شاہی رہے گی نہ گدائی نہ خار رہے گا نہ گل۔ بس ایک ہُو کا میدان اور وہ بھی سنسان رہ جائے گا۔

تاریخ تتمہ ۲ جولائی ۱۹۳۷ء باقی رہے سدا نام مولا کا۔ کانا باتی ختم ہوئی

ذوتاج

مضامین خواجہ حسن نظامی

سی پارۂ دل

حصہ اول

ساتواں ایڈیشن قیمت

Marfat.com